سلسلہ برصغیر میں تحریک آزادی میں علماء کا کردار

تحریکِ آزادی میں علماء کا کردار

(۱۸۵۷ء سے قبل)

برصغیر میں یورپی قوموں کی آمد سے لے کر ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے پہلے علماء کے زیر قیادت اُٹھنے والی آزادی کی تحریکوں اور انفرادی سرگرمیوں کا مفصّل بیان اور حوصلہ افزا داستان

ایک تحقیقی مطالعہ — ایک علمی جائزہ

فیصل احمد ندوی بھٹکلی

مجلسِ تحقیقات و نشریاتِ اسلام لکھنؤ

سلسلہ مطبوعات

۳۰۷

سلسلہ برصغیر کی آزادی میں علماء کا کردار - (۱)

تحریک آزادی
میں
علماء کا کردار

(۱۸۵۷ء سے پہلے)

فیصل احمد ندوی بھٹکلی

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ

بار چہارم
ربیع الاول ۱۴۳۶ھ - جنوری ۲۰۱۵ء

نام کتاب	:	تحریک آزادی میں علماء کا کردار
نام مؤلف	:	مولانا فیصل احمد ندوی بھٹکلی
صفحات	:	۵۸۲
تعداد اشاعت	:	۱۱۰۰
کمپوزنگ	:	اپروچ کمپیوٹر، لکھنؤ
طباعت	:	بیسٹ اینڈ ایڈوانس پریس، لکھنؤ
قیمت	:	۳۰۰/روپے

ناشر

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام

پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

فون نمبر: 0522-2741539

انتساب

میرے شیخ و مرشد

''حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی حسنی ندوی''

کے نام

جنہوں نے سالہا سال ملت اسلامیہ ہندیہ کی کشتی کی ناخدائی کی اور دسیوں دفعہ اس کو بھنور سے نکال لائے، جنہوں نے بے لوث ملک وملت کی خدمت کی، جنہوں نے ہندوستان کے باشندوں کو انسانیت کا پیغام دیا اور اس کی گرتی دیوار کو سہارا دیا۔ جن کے مساعی جمیلہ نے دنیا جہاں میں ہندوستان کا نام روشن کیا اور فخر سے ہندوستانیوں کا سر اونچا کیا، جن کی تقریروں اور تحریروں نے ملک سے محبت اور اہل وطن کی خدمت کے جذبہ کو عام کیا اور ہزاروں لوگوں میں انسانی ہمدردی اور وطن دوستی کا احساس پیدا کیا۔

جی چاہتا ہے کہ ان کا یہ جملہ سنہرے حروف میں لکھ کر ملک کے ہر گوشہ میں آویزاں کروں:

''سچی حب الوطنی یہ ہے کہ
ہمیں اپنے ملک کے کانٹے سے بھی محبت ہو۔''

سچ ہے کہ ان کی مجلسوں اور صحبتوں نے اس موضوع کی اہمیت کو اجاگر کیا اور اس پر لکھنے کے میرے ارادہ کو اور مہمیز کیا۔ میں نے حضرت سے اس کام کا ذکر کیا تھا تو بہت خوش ہوئے تھے اور بڑی ہمت افزائی فرمائی تھی۔ اگر آج وہ حیات ہوتے تو اس کو دیکھ کر بے انتہا مسرور ہوتے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب ان کے خوابوں کی تعبیر اور ان کے جذبات واحساسات کی عملی تصویر ہے۔

فہرست عناوین

تحریک آزادی میں علماء کا کردار

(اٹھارہ سو ستاون سے پہلے)

باب ششم

حضرت سید احمد شہید کا تحریک آزادی میں کردار

۳۰۹-۳۵۸

باب ہفتم
جماعت مجاہدین کا انگریزوں سے تصادم
۳۵۹-۴۰۵

باب یازدہم
کیرالا کی تحریک آزادی اور علماء
۴۷۷-۴۹۸

باب دوازدہم
مختلف مقامات پر علماء کی متفرق سرگرمیاں
۴۹۹-۵۲۱

ابتدائیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین و خاتم النبین محمد و علی الہ و صحبہ أجمعین و بعد،

اسلام نے انسانی ذہن میں اپنی تعلیمات کے ذریعہ جو تبدیلی پیدا کی، وہ آزادی کا تصور ہے، جو مسلمان کی زندگی کے ہر شعبہ میں ظاہر ہوتا ہے۔ آزادی اس معنی میں نہیں جس معنی میں مغربی مفکرین کے یہاں پائی جاتی ہے، جو نا قابل عمل ہونے کی وجہ سے صرف دینی اور اخلاقی قدروں سے آزادی میں محصور ہو کر رہ گئی ہے۔ اسلام میں آزادی کا تصور خدائے واحد کی مطلق غلامی سے مربوط ہے اور خدائے واحد کی جو مصرّف عالم ہے غلامی اختیار کرنے کے بعد انسان دوسری ساری غلامیوں سے آزاد ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ زندگی، جاہ و شرف، مال و ثروت کی بھی غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اور اپنی خواہش کو خدا کی مرضی کے تابع بنا دیتا ہے۔ سب سے زیادہ قیمتی چیز جان ہے۔ وہ اپنی جان کو خدا کی دی ہوئی ایک امانت سمجھتا ہے۔ اس لئے وہ خدا کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے اور خدا کی راہ میں جان دینے کو اپنے لئے سب سے بڑا شرف اور سعادت سمجھتا ہے۔

ایک مقصد کے لئے جان دینے پر بڑے اجر و ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اس میں "لتکون کلمة الله هي العليا" اور "في سبيل الله" کو جو درجہ حاصل ہے وہ تو مشہور و معروف ہے۔ لیکن جو اپنی حفاظت میں اپنے گھر کی حفاظت میں جس میں ملک کی حفاظت بھی ہے، جان دیتا ہے وہ شہید کا رتبہ حاصل کرتا ہے۔

ترمذی کی روایت ہے:

عن سعيد بن زيد قال سمعت رسول الله ﷺ يقول: من قتل دون ماله فهو شهيد، و من قتل دون دينه فهو شهيد، و من قتل دون دمه فهو شهيد، و من قتل دون أهله فهو شهيد. (الترمذی)

حضور ﷺ نے فرمایا جو اپنے مال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے، اور جو اپنے دین کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے اور جو اپنے خون کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے، اور جو اپنے اہل و عیال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے۔

یہ وہ تصور حیات و ممات ہے، جو دوسرے ادیان میں نہیں ہے۔ اس کی وجہ سے مسلمان کی زندگی حیات کے اعتبار سے اور ممات کے اعتبار سے مثالی زندگی ہے۔ اور یہی متوازن تصور مسلمانوں کے دنیا کے سارے نظاموں اور طاقتوں پر غلبہ کا سبب ہے۔ اور جب یہ متوازن تصور

حیات و ممات یعنی دونوں مالک حقیقی کے حکم اور مرضی کے مطابق ہوں، غالب آئے گا۔ مسلمانوں کو دنیا میں غلبہ حاصل ہوگا اور یہ تصور ان کو طاقت کے سامنے جھکانہ سکے گا۔

شاعر کہتا ہے ؎

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

زندگی گزارنے اور جان دینے کے جو اعلیٰ نمونے مسلمانوں کی تاریخ میں ملتے ہیں، وہ دوسری قوموں کی تاریخوں میں نہیں ملتے۔ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگی میں یہ اعلیٰ توازن بہت نمایاں نظر آتا ہے۔

بہتر زندگی اور بہتر موت مسلمان کا اس لحاظ سے شعار ہے، وہ فاتح عالم بھی ہے، اور معلم عالم بھی، وہ تمدن کا مؤسس اور بانی بھی ہے اور وہ حریت فکر اور بحث و تحقیق، مساوات اور انسانی قدروں کو فروغ دینے والا بھی۔

وہ انسان کی غلامی کو سب سے بڑی لعنت سمجھتا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ مقولہ جو انہوں نے والی مصر حضرت عمرو بن العاص کے صاحبزادہ کے قصہ میں کہا تھا، اس تصور کی سب سے اعلیٰ مثال ہے، انہوں نے کہا:

"متی استعبدتهم و قد ولدتهم امهاتهم أحراراً"

تم نے انکو کب سے غلام بنالیا جب کہ ان کو ان کی ماؤں نے آزاد پیدا کیا تھا۔

اس لئے انسان کی غلامی کا مسلمان سب سے بڑا دشمن اور اس کے مقابلہ میں سب سے زیادہ پیش پیش نظر آتا ہے۔ سامراج حقیقت میں انسان کو غلام بنانے کا نام ہے۔ فتح اسلامی اور سامراج دو متضاد چیزیں ہیں۔

فتح اسلامی انسان کو غلامی سے آزادی دلانے کے لئے ہے، جیسے حضرت ربعی بن عامر نے رستم کے سامنے فرمایا تھا:

"اللّٰهُ ابْتَعَثَنَا لِنُخْرِجَ الْعِبَادَ مِنْ عِبَادَةِ الْعِبَادِ إِلَى عِبَادَةِ اللّٰهِ وَحْدَهُ، وَمِنْ جَوْرِ الْأَدْيَانِ إِلَى عَدْلِ الْإِسْلَامِ"

یعنی اللہ نے ہم کو بھیجا ہے تاکہ ہم بندوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر خدائے واحد کی بندگی میں لائیں اور دوسرے ادیان کے جور و ستم سے نکال کر اسلام کے عدل و انصاف کے سایہ میں لے آئیں۔

یہ دونوں شکلیں اسلام سے پہلے پائی جاتی تھیں۔ مذہبی سامراج اور عسکری سامراج صرف مغلوب، مقہور اور مظلوم ہوتا ہے۔ اسلام نے مذہب اور سیاست اور اقتصادیات اور سماجیات اور انسان کے شرف و عزت کی حفاظت کی ہے اور مساوات پیدا کرنے پر زور دیا ہے۔ ناحق قتل نفس کو قرآن و حدیث میں سب سے بڑا گناہ قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ ایک نفس کے قتل کو پوری قوم کے قتل کے مساوی قرار دیا ہے۔ اور اس کے لئے سخت اصول و ضوابط مقرر کئے گئے ہیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں نے طویل مدت تک کم تعداد میں ہونے کے باوجود حکومت کی اور کسی بڑی بغاوت کا ان کو سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس لئے کہ انہوں نے ہندوستان کو علمی، تمدنی، اخلاقی لحاظ سے اعلیٰ تصور حیات عطا کیا۔ ہندوستان کو ایک متحدہ ملک کی حیثیت دی۔ اس کی سرحدوں کی حفاظت کی۔ سماجی ظلم سے اس کو نجات دلائی۔ مذہب کے نام پر بھی غلامی کے تصور کو ختم کیا۔ جیسا کہ علامہ اقبال نے کہا ہے ؎

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

آخری عہد میں جب اسلامی تعلیمات پر عمل کمزور ہو گیا تو اسطرح کے چیلنج مسلمانوں کے سامنے آئے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کا عہد اسکی مثال ہے۔ اس وقت کا معاشرہ اعلیٰ سیاسی سطح کا ہو یا عوامی سطح کا، علماء کی سطح کا ہو یا جہلاء کی سطح کا، اس پر سے اسلام کی گرفت کمزور پڑ گئی تھی۔ اور اس میں غلامی کی شکلیں اور استحصال کی وجوہ پیدا ہو گئی تھیں۔ عدل و انصاف کا معیار باقی نہیں تھا۔ اسلئے اندرونی اور بیرونی خطرات پیش آئے اور آخر کار وہ نظام ٹوٹ گیا، جو اپنے مقصد سے منحرف ہو گیا تھا۔

اس عہد کے علماء نے اس انحراف کا بھی مقابلہ کیا، اور سیاسی عسکری خطرات کا بھی مقابلہ کیا اور یہ ان کی مذہبی ذمہ داری تھی۔ انہوں نے اسلامی حکومت کو بچانے کی کوشش کی، جس نے متحدہ ہندوستان اور متحدہ سماج کا تصور دیا۔ عدل و انصاف قائم کیا۔ مساوات اور برادری کا تصور عام کیا۔ علم و تمدن کے مراکز قائم کئے۔ اسکے بعد جب باہری قوت نے حملہ کیا تو انہوں نے دوسرے طبقات کے مقابلہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، ملک کی آزادی کی حفاظت کیلئے اپنی جانیں قربان کیں۔ اسکو خود انگریز مؤرخین تسلیم کرتے ہیں۔ خاص طور پر حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک سے وابستہ علماء اور غیر علماء نے آزادی کی اس تحریک میں سب سے زیادہ نمایاں حصہ لیا۔ اسی لئے سب سے زیادہ انتقامی کارروائیوں کا ان کو ہی سامنا کرنا پڑا۔ اس کی تفصیلات خود انگریز مؤرخوں کی تحریروں میں ملتی ہے۔ اور اس کی سب سے بڑی مثال نئے حکمرانوں کا رویہ ہے جو انہوں نے مسلمانوں کے خلاف عام طور پر اور علماء دین کے خلاف خاص طور پر اپنایا۔ انہوں نے صرف ان کو بے دخل کرنے کی کوشش ہی نہیں کی، بلکہ ایسی تاریخ مرتب کی جس میں وہ ملک دشمن اور تہذیب دشمن ثابت ہوں۔

آزادی کی یہ تحریک جس کا سب سے زیادہ مظاہرہ ۱۸۵۷ء میں ہوا اور اس میں مسلمانوں نے ہی قیادت کی۔ بعد میں انہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ کچھ عرصہ کے لئے تعلیم و تربیت، ذہنی غلامی سے حفاظت کے میدان میں منتقل ہو گئی جس کی وجہ سے یہ سارے تعلیمی و تربیتی ادارے نظر آرہے ہیں، جن کی وجہ سے سامراج کے زمانہ میں ذہنوں کی تبدیلی اور غلام ذہنیت پیدا کرنے کی ساری کوششوں کے باوجود مسلمانوں میں حریت فکر اور جوش عمل اور ملک کی خدمت کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ اور وہ آزمائش کے وقت قربانی دینے میں دوسروں سے آگے رہتے ہیں۔ غلامی ذہنی ہو، یا سیاسی و عسکری، دونوں قوم کے تشخص کو ختم کر دیتے ہیں۔ اور دونوں سے آزادی حاصل کرنا قیادت کے

لئے ضروری ہے۔
خلافت عثمانیہ کے زوال کے بعد عالم اسلام پر سامراج نے جب قبضہ کرنے کی کوشش کی، تو سب سے بڑی تحریک ہندوستان سے شروع ہوئی جو دراصل سارے عالم کی آزادی کی تحریک بنی۔ خود ہندوستان ہی کی تحریک آزادی کو بھی اس تحریک خلافت سے روح ملی۔
ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں علماء کی اکثریت شریک ہوئی اور وہ دارالعلوم دیوبند اور اس کے علماء و مدرسین جن کو آج کل موردالزام ٹھہرایا جاتا ہے، اس تحریک میں دوسرے طبقوں سے زیادہ نمایاں تھے۔ اس شرکت اور قربانی کا آزادی کے بعد انہوں نے کوئی صلہ قبول نہیں کیا۔ ان میں کے متعدد کو حکومت کی طرف سے اعزازات کی پیش کش ہوئی۔ تو انہوں نے اسے قبول کرنے سے معذرت کی۔ جس میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی اور مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہما اللہ کے نام مثال کے طور پر پیش کئے جاسکتے ہیں۔
انگریزوں سے نفرت اور سامراج سے عداوت، علماء کی نفسیات میں شامل ہے۔ مسلمانوں کے اس عظیم اور روشن تاریخی کردار کو مؤرخین نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ان لوگوں کا نام لینے سے بھی گریز کرتے ہیں جو علماء کے طبقہ سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ مگر مسلمان ہونے کے ناطے وطن اور انسان کی آزادی کے لئے تحریک میں شریک ہوئے اور جانیں دیں۔
اس موضوع پر خود مسلم مؤرخین نے بھی کم توجہ دی، اس کا مواد منتشر طور پر ملتا ہے۔ ضرورت تھی کہ اس خاص گوشہ پر تفصیلی اور دستاویزی روشنی ڈالی جائے، اور یہ ثابت کیا جائے کہ مسلمان اس کو اپنا مذہبی اور وطنی فریضہ سمجھتا ہے، اور یہ بتایا جائے کہ مسلمانوں کو قومی دھارے سے اور خاص طور پر تاریخ سے الگ کرنے کی کیا کیا کوششیں کی گئیں۔
عزیزی مولوی فیصل احمد بھٹکلی ندوی سلمہ اللہ کی یہ تصنیف جو مجلس تحقیقات ونشریات اسلام (لکھنؤ) سے شائع ہورہی ہے، اس کی اہم کڑی ہے۔ مولانا محمد الیاس بھٹکلی ندوی کی تصنیف سلطان ٹیپو شہید کے بعد جس کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، یہ اہم موضوع بھی بھٹکل ہی کے ندوی فاضل کے حصہ میں آیا۔ اس کی تعریف میں محترمی جناب سید حامد صاحب (سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء و صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ) اور مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی (جنہیں علم و تحقیق میں شہرت اور مرجعیت حاصل ہے) کے مقدمات سند کا درجہ رکھتے ہیں۔
مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کو خوشی ہے کہ یہ اہم اور اچھوتی تصنیف شائع کرنے کی اس کو سعادت حاصل ہورہی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مصنف کو جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کی اس خدمت کو قبولیت بخشے۔

محمد واضح رشید حسنی ندوی
سکریٹری مجلس تحقیقات ونشریات اسلام (لکھنؤ)

منگل، ۲۴ ربیع الاول ۱۴۲۴ھ
مطابق ۲۷ مئی ۲۰۰۳ء

تشکر و اعتراف

الحمد لله رب العالمین و الصلاۃ و السلام علی سیدنا محمد و آلہ و صحبہ أجمعین.

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر و احسان کہ اس نے محض اپنے فضل و کرم سے کتاب مکمل کرنے کی توفیق عطا فرمائی، دراصل کتاب ڈیڑھ دو سال قبل ہی تیار ہو چکی تھی مگر بعض ضروری باتوں اور مزید تحقیق کے انتظار میں اب تک رُکنا پڑا۔ کتاب کے پریس جانے تک برابر حذف و اضافہ اور تنقیح و تہذیب ہوتی رہی۔ یہ اللہ ہی کا کرم ہے لیکن حدیث میں آتا ہے "من لا یشکر الناس لا یشکر اللہ" (ترمذی، ابواب البر والصلۃ) یعنی جو لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا بھی شکریہ ادا نہیں کرتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کروں جن سے اس کتاب کی تصنیف میں مدد ملی۔ مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی اور محمد راشد شیخ (جن کا تذکرہ آچکا ہے) کے علاوہ جن حضرات سے علمی تعاون حاصل ہوا، وہ یہ ہیں :

۱- ڈاکٹر نبی بخش بلوچ (حیدر آباد، سندھ)
۲- شیخ محمد علی موسلیار (منجیری، کیرالا)
۳- مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی (کلکتہ)
۴- حکیم محمد حسین شفاء (رضا لائبریری، رامپور)
۵- پروفیسر نثار احمد فاروقی (دہلی)
۶- مولانا عتیق الرحمٰن صاحب (خدا بخش لائبریری، پٹنہ)
۷- مولانا ظہیر الدین باقوی معروف بہ ڈاکٹر راہی فدائی (کڈپہ، آندھرا پردیش)

میں ان سب کا ممنون ہوں۔

حضرت مولانا سیّد محمد رابع حسنی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء و صدر مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ) کا انتہائی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود قیمتی "مقدمہ" تحریر فرمایا۔ جناب سیّد حامد صاحب (چانسلر جامعہ ہمدرد) کا

بھی مشکور ہوں جنہوں نے کتاب کے مسودہ پر نظر ڈالی اور وقیع ''پیش لفظ'' سے ہمت افزائی فرمائی۔ مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی کا دوبارہ شکریہ ادا کرنا ضروری ہے جن کے تعارفی کلمات نے کتاب کی اہمیت میں اضافہ کیا۔

اسی طرح دل میں خلش رہ جائے گی اگر میں اس وقت استاد مکرم جناب مولانا شہباز صاحب اصلاحی مرحوم کو یاد کر کے ان کا شکر ادا نہ کروں جنہوں نے (شروع کے دو ایک ابواب اور بعد کے اضافہ جات کے علاوہ) کتاب کو حرفاً حرفاً دیکھ کر ضروری اصلاح فرمائی اور تحسین و آفرین کہا اور بیماری میں بھی بار بار کتاب کے بارے میں دریافت کرتے رہے اور چھپنے کا اشتیاق ظاہر کرتے رہے۔ افسوس کہ مولانا چھپی ہوئی کتاب نہ دیکھ سکے اور ۳ ررمضان ۱۴۲۳ھ مطابق ۹ رنومبر ۲۰۰۲ء کو مالک حقیقی سے جا ملے۔

میں مولانا واضح رشید حسنی ندوی سکریٹری مجلس تحقیقات اور مولانا نذر الحفیظ ندوی جوائنٹ سکریٹری مجلس کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جن کی تشویق اور ہمت افزائی نے میرے لئے مہمیز کا کام کیا اور اشاعت کے مراحل آسان کئے۔

اسی طرح مولانا محمد غفران ندوی انچارج مجلس اور برادر معظم مولانا انیس احمد ندوی معاون انچارج کا بھی مشکور ہوں جنہوں نے طباعت و اشاعت کی ذمہ داریوں سے مجھے سبکدوش کیا۔ ناسپاسی ہوگی اگر میں برادر محترم مولانا نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی معاون علمی مجلس تحقیقات کا شکریہ ادا نہ کروں جن کا مجھے اس کتاب کے سلسلہ میں وقتاً فوقتاً تعاون حاصل ہوتا رہا۔ برادرم مولوی طارق اشرف ندوی بھی شکریہ کے مستحق ہیں جن کی دلچسپیوں نے بحسن وخوبی کمپوزنگ کے مراحل طے کئے۔

اخیر میں اپنے دو عزیز رفیقوں کا بھی شکریہ ادا کرتا چلوں جن سے پروف دیکھنے میں بیش قیمت مدد ملی، ایک مولوی عبد العلیم خطیب بھٹکلی ندوی اور دوسرے مولوی فیاض احمد دامدا فقیہ بھٹکلی ندوی۔ ان کے علاوہ جن کا تعاون حاصل رہا میں ان سب کے لئے سراپائے سپاس اور بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہوں۔

فیصل احمد بھٹکلی ندوی

ندوۃ العلماء، لکھنؤ

۷ رربیع الاول ۱۴۲۴ھ مطابق ۲۰ رمئی ۲۰۰۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

حضرت مولانا سیّد محمد رابع حسنی ندوی

ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

امت اسلامیہ اپنی چودہ سو سالہ تاریخ میں عروج و زوال کے مختلف مراحل سے گزرتی رہی، اس میں ان کے عروج کا دور بڑا تابناک رہا۔ ایک طرف دنیاوی ترقی میں بام عروج تک پہونچی اور دوسری طرف اعلیٰ انسانی کردار اور اعلیٰ اخلاقی معیار کی مثال قائم کی۔ یہ ان کا وہ دور تھا جب انہوں نے زندگی کا ثبوت دیا اور علمی لحاظ سے کوتاہی نہیں کی اور اپنے دین کی اعلیٰ قدروں کو اختیار کیا اور عملی طور پر اپنے دین سے مخلصانہ وابستگی رکھی چنانچہ ان کو طویل مدت تک عروج و کمال حاصل ہوا لیکن جب سے انہوں نے کارگاہِ حیات میں تساہلی اور بے توجہی اور اپنے دین سے برگشتگی اختیار کی اور ذمہ دارانہ اور فعال کردار سے غفلت برتی تو ان کی زندگی میں پس ماندگی اور زوال کی شکلیں سامنے آئیں، لیکن یہ دین اللہ تعالیٰ کا طے کردہ آخری اور دائمی دین ہے اور دنیا کے مختلف حصوں میں اور قوموں پر محیط ہے، اس سے وابستہ ایک علاقہ کے لوگ کوتاہی کرتے ہیں تو دوسرے علاقہ میں اللہ تعالیٰ کچھ کارگزار اور ذمہ دار افراد کو کھڑا کر دیتا ہے لہٰذا اس کے ماننے والوں کو بحیثیت مجموعی ناقابل تلافی زوال سے گزرنا نہیں پڑا اور امت مسلمہ کے ساتھ یہ بات قیامت تک جاری رہے گی۔ اسی امت کی سابقہ تاریخ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس امت کو زوال جب ہوا عارضی ہوا۔ اگرچہ یہ عارضی زوال خدا کی نافرمانی کا طرز حیات اختیار کرنے پر صرف زوال ہی نہیں ہوا بلکہ ذلت اور رسوائی

بھی ملی جو دراصل اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور اس کے نتیجہ میں اس کی پکڑ اور سزا کی حیثیت رکھتی تھی لیکن پھر جب جب انہوں نے رجوع الی اللہ کیا تو پھر عزت وقوت کے مقام تک پہنچے۔ دین کی طرف ان کا یہ رجوع علی العموم دین کے اعلیٰ کردار رکھنے والے علمبرداروں کے ذریعہ ہوا اور تاریخ میں یہ بار بار پیش آیا اور اس کا ذریعہ امت کے برگزیدہ علماء دین بنتے رہے۔

اسلام کی تاریخ کی تقریباً ہر صدی ایسے برگزیدہ علماء دین سے فیض یاب ہوئی جنہوں نے وقت کی شدید گمراہیوں کا بڑی عزیمت سے مقابلہ کیا اور ان کی مخلصانہ اور پرعزیمت مساعی سے حالات کا رُخ پلٹا۔ اس طرح عزیمت وجدوجہد کی ایک شاندار تاریخ بنی جس میں کام مختلف النوع طریقہ سے انجام پاتا رہا اور یہ امت اپنے دین سے تغافل اور اپنے مقام بلند سے گر کر تنزل سے گزرتی اور علماء اسلام کی کوششوں کے ذریعہ اس سے نکلتی رہی۔

عالم اسلام کے مختلف منطقوں اور علاقوں کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو اس امت کے عالمی اور دائمی امت ہونے کی حقیقت سامنے آئے گی۔ یہ امت اپنے اصحاب عزیمت افراد کی کوششوں کے نتیجہ میں دنیا کے تقریباً تمام منطقوں میں پھیلتی چلی گئی اور علاقائی لحاظ سے اس کے متعدد وطن بن گئے جو بڑی حد تک آپس میں مربوط بھی رہے اور زوال جب بھی پیش آیا عموماً پوری امت پر بیک وقت ہر جگہ پیش نہیں آیا۔ عروج کے علاقے بھی بدلتے رہے اور زوال کے علاقے بھی بدلتے رہے چنانچہ جس جگہ بھی زوال آیا وہ پوری امت کا زوال نہیں بنا۔

ہندوستان جنوبی ایشیا کے ایک وسیع رقبہ کا ملک ہے، یہاں مسلمانوں نے کئی سو سال شاندار طریقے سے حکومت کی اور نظام حیات چلایا اور یہاں عروج وزوال کے لحاظ سے ان کو نشیب وفراز سے گزرنا ہوا جس میں زیادہ سنگین اور وسیع حالت زوال برطانوی استعمار کے زمانہ میں پیش آئی لیکن برگزیدہ علماء دین نے اس کا مقابلہ کرنے اور بدلنے کے لئے ضروری توجہ اختیار کرنے میں کمی نہیں کی اس طرح ان کی مساعی کی ایک عظیم تاریخ بنی۔

ہندوستان جو تقسیم ہند سے قبل پورے تحتی براعظم کا نام رہا ہے، مختلف نسلوں، متعدد مذہبوں اور متنوع زبانوں اور مختلف النوع علاقوں کا ملک رہا ہے۔ یہ تنوع اس ملک کی خصوصیات میں داخل ہے۔ اس میں شروع سے متعدد و مختلف زبانیں، متعدد و مختلف کلچر، متعدد و مختلف مذاہب رہے جو اس ملک کی خاص شناخت بنے لیکن مسلمان علمائے دین ان مختلف عناصر کے سامنے بے بس نہیں رہے اور نہ ان کے برگزیدہ اور باعزیمت افراد نے زوال پذیر حالتوں کا ساتھ دیا بلکہ مقابلہ کیا اور رُخ موڑنے اور غلط رجحانات کا مقابلہ کرنے کی ہمت و حوصلہ کا ثبوت دیا۔ انہوں نے صرف دینی و علمی میدانوں کے ساتھ اپنی جدوجہد کو محدود نہیں رکھا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ قومی اور وطنی میدانوں میں بھی جدوجہد کا ثبوت دیا، انہوں نے اپنی امت تو اپنی امت اپنی ہم وطن دیگر امتوں میں بھی ہمت و احساس بیدار کیا۔ ہندوستان کی غیر ملکی سامراج سے آزادی کی کوششوں میں جن مسلمان و غیر مسلمان ہندوستانیوں نے حصہ لیا ان میں علماء اسلام کا حصہ بہت زیادہ نمایاں رہا جو غیر قوموں کے رہنماؤں کے حصہ سے بہت زیادہ ہے، اس کا جائزہ لینے اور معلوم ہونے پر اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں علماء اسلام نے کیسی عظیم قربانیاں دیں اور کام انجام دیا۔ مذہبی دائرہ تو ان کا خاص دائرہ رہا لیکن ملت کے اجتماعی و قومی معاملات میں اصلاح و بہتری کے پیدا کرنے کے دائروں میں بھی انہوں نے بڑی خدمات انجام دیں اور اس طریقہ سے انہوں نے مسلمانوں ہی کو نہیں بلکہ اپنے ہم وطن غیر مسلموں کو بھی فائدہ پہنچایا، ہندوستان کی اسلامی تاریخ کی متعدد صدیوں میں مسلمانوں کی بہت غیر معمولی قوت کارکردگی اور علم و عزیمت والی شخصیتیں پیدا ہوئیں جنہوں نے حالات کا رُخ موڑنے میں انقلابی کام کیا۔ مثال کے طور پر حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ہیں جنہوں نے ایک طرف مسلمانوں کی مذہبی حالت کو درست کرنے کے لئے فکر و محنت کی، دوسری طرف انہوں نے دینی و اسلامی نظام تعلیم کے اندر ترقی و اصلاح کے لئے انقلابی کوشش کی، تیسری طرف حکومت وقت کی کمزوری دور کرنے کیلئے بھی اہم تدابیر اختیار کیں چنانچہ ہندوستان کے نظام سیاست و نظام تعلیم پر ان کا مفید تر اثر پڑا۔

اسی طرح حضرت سید احمد شہید کو دیکھئے کہ ایک طرف تو ان کی کوششیں اصلاح اخلاق وتقویت ایمان وعمل صالح کے لئے غیر معمولی اثرات کے ساتھ سامنے آئیں جن سے لاکھوں لوگوں کی اصلاح کی راہ بنی، دوسری طرف برطانی سامراج کے اثر ورسوخ کو ختم کرنے کے لئے اپنے ہم وطن غیر مسلم اصحاب اثر ونفوذ کے ساتھ اس سلسلہ میں تعاون لینے اور تعاون دینے کا سلسلہ بھی رکھا اور اس طرح اصلاح کے انفرادی وقومی کام کی ایک نئی راہ بنائی۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی غیر معمولی شخصیتیں زندگی کا دھارا موڑنے کے کام میں نمایاں نظر آتی ہیں۔

مسلمانوں کے ان برگزیدہ علماء نے اپنے اخلاق وسیرت نیز اپنی علیمت اور اپنی ذہانت سے اپنے زمانہ کے حکمرانوں کو غلط راہ اختیار کرنے سے روکا اور بچانے کی کوشش کی اور اپنی ہمت وعزیمت سے ان کو صحیح راہ اختیار کرنے پر مجبور کیا، اس کی متعدد مثالیں متعدد عظیم علماء کی تاریخ میں ملتی ہیں۔ یہ کام کبھی تو انہوں نے نصیحت خیر خواہی اور حکمت کے ساتھ انجام دیا۔ اس سلسلہ میں ان کو کبھی کبھی حاکم وقت کے شدید ردّعمل کا سامنا کرنا پڑا اور قید ومصیبت سے بھی ان کو گزرنا پڑا لیکن انہوں نے حق کے لئے اس کو ہمت کے ساتھ جھیلا۔ ان سب باتوں کی داستان طویل اور موثر مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔

ضرورت اس بات کی تھی اور ہے کہ کم از کم مسلمانوں کی نسلیں اپنے اسلاف کے ان برگزیدہ اور عظیم کارگزار شخصیتوں سے واقف ہوں تاکہ اپنی زندگیوں کے لئے ان کی زندگیوں سے روشنی حاصل کریں اور جادہ عزت وکمال پر چلنے کے لئے ان سے رہنمائی حاصل کرسکیں۔ اس سلسلہ میں ملکی وملی عزت وآزادی کا موضوع ایک خاص اہمیت کا مالک ہے، اس دائرہ میں کارہائے نمایاں انجام دینے والے علماء اسلام کے تذکرے بھی تاریخ کی مختلف کتابوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔

ملت اسلامیہ کے ماضی کی تاریخ بتاتی ہے کہ دنیا کے مختلف ملکوں میں ملت اسلامیہ کو جب بھی مذہبی راہ سے یا سماجی یا سیاسی راہ سے چیلنج پیش آئے اور ان چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کی ضرورت ہوئی تو اس میں علماء کا بنیادی بلکہ اصل حصہ رہا۔

ہندوستان جیسے بڑے ملک میں بھی یہ بات پورے طور پر ظہور میں آئی، یہاں

اندرونی طور پر جو خرابیاں نمایاں ہوتی رہیں، ان کا مقابلہ علماء نے کیا، چنانچہ بیرونی اثرات اور سامراجی ظلم وزیادتی کے حالات جب پیش آئے تو علماء ان سے بہت اچھے ڈھنگ کے ساتھ نبرد آزما ہوئے، اس سلسلہ کی اصل جدوجہد ۱۸۵۷ء سے قبل ہی شروع ہوگئی تھی اور اسی کے نتیجہ میں ۱۸۵۷ء کی انقلابی کوشش ہوئی جو کامیابی کی منزل تک پہنچتے پہنچتے رہ گئی، جس کی سزا پھر انگریزی اقتدار نے علماء کو چن چن کر مارنے پھانسی دینے اور دیگر سزاؤں کے ذریعہ دی لیکن اس سے علماء بے ہمت نہیں ہوئے اور ۱۸۵۷ء کے بعد بھی انہوں نے ایسی جدوجہد جاری رکھی حتی کہ یہ ملک آزاد ہوا، اگرچہ اس کو ئی حصوں میں تقسیم کر کے آزادی دی گئی۔

اس جدوجہد آزادی میں صرف دارالسلطنت دہلی کے اطراف کے علماء ہی نہیں شریک ہوئے بلکہ ملک کے مختلف حصوں کے علماء شریک ہوئے اور جدوجہد کی اور قربانیاں دیں، اس میں جنوبی ہندوستان کے علماء بھی ہیں اور دیگر اطراف ملک کے علماء بھی ہیں، خواہ وہ اطراف اب پاکستان میں ہوں یا بنگلہ دیش میں ہوں۔ یہ ایک طویل داستان ہے جو تلخ بھی ہے لیکن عظیم ہمتوں کی اور ہمت بڑھانے والی داستان ہے۔

علماء کی جدوجہد کی یہ عظیم تاریخ نئی نسلوں کے جاننے کی ہے کہ حق کے لئے کس طرح کوشش کی جاتی ہے۔ علماء اسلام کے اس سلسلہ کے کارنامے ہندوستان کے وسیع اور مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے ہونے کی وجہ سے سب کے لئے ان کا مطالعہ اور واقفیت آسان نہ تھی، اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے ندوۃ العلماء کے عزیز فرزند اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نوجوان استاد مولوی فیصل احمد بھٹکلی ندوی کو کہ انہوں نے کئی برسوں کی محنت وجستجوئے علمی سے ان عظیم شخصیتوں کے حالات کئی ضخیم جلدوں میں اکٹھا کر دیئے ہیں۔ میں نے کتاب کو مختلف جگہوں سے دیکھا اور خاص طور پر بعض مشکل اور پیچیدہ معاملات کے پیش کئے جانے پر نظر ڈالی، ان کے سلسلہ میں عزیز مصنف نے جو تحقیقی اسلوب اختیار کیا ہے اس سے مصنف کے سنجیدہ علمی انداز وکوشش کا پتہ چلا۔ بعض وہ مسائل جو اخلاقی ہیں ان کو بھی واضح انداز میں کتاب میں بیان کیا گیا ہے۔

عزیز موصوف نے اس کتاب میں جو موضوع اختیار کیا ہے وہ خاصا تفصیلی

موضوع ہے۔ ایسے موضوع کا حق صحیح طور پر ادا کرنے میں موصوف کو بڑا وقت اور خصوصی محنت کی ضرورت پڑی، انہوں نے اس کے لئے ہندوستان کے مختلف بڑے کتب خانوں میں جا جا کر مواد جمع کیا اور کئی سال کا وقت اس موضوع کی تیاری میں صرف کیا۔ یہ ایک نوجوان مصنف کے لئے بڑی بات ہے۔ میں نے کتاب کے جن مقامات کا مطالعہ کیا ان سے مجھے اندازہ ہوا کہ مصنف نے علمی دیانت و امانت کا پورا خیال رکھا ہے جو واقعات پیش کئے ہیں ان کو تحقیق کی کسوٹی پر کس بھی لیا ہے، ان کی یہ کتاب کئی جلدوں میں تیار ہوئی ہے جن میں سے پہلی جلد زیور طبع سے آراستہ ہونے جا رہی ہے، اس کام کو سراہنا اور اس کی قدر دانی کا اظہار کرنا خود فی نفسہ اچھا کام ہے انہوں نے مجھے اس کی مسرت حاصل کرائی۔ میں ان کی کوشش کا مختصر تعارف اپنے مذکورہ بالا الفاظ کے ذریعہ کراتے ہوئے عزیز موصوف کے اس کام کو سراہتا ہوں اور اس لائق قدر کام پر ان کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

محمد رابع حسنی ندوی

۳ر محرم ۱۴۲۴ھ مطابق ۷ر مارچ ۲۰۰۳ء

دائرہ شاہ علم اللہ

تکیہ کلاں، رائے بریلی

پیش لفظ

جناب سیّد حامد صاحب چانسلر جامعہ ہمدرد دہلی
سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

فیصل احمد صاحب بھٹکلی ندوی کے صاحب عزم و امکانات ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ ان کے حساس ضمیر نے یہ محسوس کیا کہ ہمارے ملک میں علماء کی گرانقدر خدمات کا اعتراف ان کے شایانِ شان نہیں ہوا۔ ایسے لوگوں کی بھی کوئی کمی نہیں جو برصغیر کی آزادی میں علماء کے کردار سے سرتاسر ناواقف ہیں۔ فیصل احمد صاحب نے اس لاعلمی اور ناقدری کو ختم کرنے کا تہیہ کرلیا۔ اگرچہ اس کتاب کا منصوبہ کوئی گیارہ سال پہلے بن گیا تھا لیکن سلسلہ کی پہلی کتاب اشاعت کے لئے تیار ایسے وقت میں ہوئی جب کہ اس کی ضرورت بہت شدت سے محسوس کی جارہی تھی۔ مدارس پر ہر طرف سے یورش ہورہی تھی اور اب بھی ہورہی ہے، گویا یہ باور کیا جارہا ہے اور دکھایا جارہا ہے کہ مدارس ملک دشمن ہیں اور حبِّ وطن سے انہیں کوئی واسطہ ہی نہیں اور وہ دہشت گردوں کو پناہ دیتے ہیں آزادی سے انہیں کیا سروکار۔ ہرچند کہ یہ الزامات بالکل بے بنیاد ہیں لیکن جیسی فضا ملک کی اس وقت ہے اس میں زبانی تردید پر کون دھیان دے گا؟ اور تجربہ نے یہ بھی بتایا کہ تردید یا نفی سے ہر حال میں بہتر، مثبت باتوں کا تذکرہ ہوتا ہے۔ مدارس کے دفاع میں یہ تو کہا گیا ہے، حالانکہ اس تواتر سے نہیں جو درکار تھا، کہ مدارس کا مقابلہ جہاں تک نظم وضبط اور امن وامان کا تعلق ہے، عصری تعلیم کے ادارے ہرگز نہیں کرسکتے۔ لیکن یہ بات نہ صرف کہنے کی تھی بلکہ ثابت کرنے کے لائق کہ ہمارے علماء باوجود اپنی دینی اور علمی مصروفیات اور سیاست سے برکناری کے وطنِ عزیز کو آزاد کرنے کی مساعی میں پیش پیش رہے اور یہ زریں سلسلہ لامتناہی ثابت ہوا۔

ارادہ کرنا تھا کہ فاضل مصنف اس مہم لگ گئے۔ پہلا اور شاید صبر آزما قدم یہ تھا کہ

متعلقہ معلومات، جہاں سے بھی دستیاب ہوں، فراہم کر لی جائیں۔ انہوں نے دس سال اسی طلب اور اسی جستجو میں گزارے۔ اس مہتم بالشان تصنیف کا سب سے قابل ستائش پہلو یہی ہے، حقیقت کی انتھک تلاش۔ فیصل احمد صاحب کے لئے جہاں تک غیر دینی امور کا تعلق ہے، جستجو اور تحقیق کی راہ اجنبی تھی۔ لیکن انہوں نے اپنے ارادہ کی تکمیل میں خود کو تحقیق کے سانچہ میں ڈھال دیا، اور کسی ایسے واقعہ کو جس کی صحت پر انہیں پورا یقین نہ تھا اپنی کتاب میں شامل نہیں کیا۔ خود مصنف کی زبان میں ''یہ کام بھاگا بھاگ اور رواروی کا نہیں، بلکہ کسی بھی علمی و تحقیقی کام کے لئے صبر و انتظار شرطِ اولین ہے'' مصنف کے شامل حال ہمیشہ یہ احساس رہا۔ اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے صبر کی توفیق دی۔ یہیں سے میرے اندر یہ خیال پیدا ہوا اور روز بروز اس یقین میں اضافہ ہوتا گیا کہ یہ کام ایک کتاب کا نہیں۔ چنانچہ ''برصغیر کی آزادی میں علماء کا کردار'' کے عنوان سے چار جلدوں میں ایک کتاب کا منصوبہ بنایا گیا۔ مصنف نے اپنے پیرایۂ تحقیق کو بھی واضح کر دیا۔

''محقق کے لئے ضروری ہے کہ پہلے سے کوئی بات اس نے طے نہ کی ہو۔ بلکہ تحقیق کی روشنی میں جو نتائج سامنے آئیں انہیں بے کم و کاست بیان کرے''۔

''سخنہائے گفتنی'' میں فاضل مصنف نے انگریزوں کی مسلم بیزاری اور آر ایس ایس کے ارتقا اور آزادی کی تحریک سے اس کی علاحدگی کا تذکرہ دستاویزی ثبوت کے ساتھ کیا ہے۔ ہر چند کہ یہ باتیں کتاب کے موضوع سے براہ راست تعلق نہیں رکھتیں تاہم ان کا شمول پس منظر کے طور پر جائز ہے۔ اسی نوع کا جواز ان سطور کے لئے بھی فراہم کیا جا سکتا ہے جس میں فاضل مصنف نے عام مسلمانوں کے دیس کے تئیں وفاداری کی بات کی ہے اور برادران وطن کے گھپلوں میں ملوث ہونے کا ذکر چھیڑا ہے اور علماء اور مدرسوں اور عام طور پر مسلمانوں کے خلاف سنگھ پریوار کی سازشوں اور یورشوں کا تذکرہ کیا ہے۔ مصنف اپنی افتادِ طبع کے مطابق یہاں بھی تحقیق کو بروئے کار لایا ہے۔ اور اس نے جا بجا انکشافات کئے ہیں۔ مسلمانوں کے خلاف الزامات سے بحث کرتے ہوئے مصنف کے لہجہ میں مظلوم کی فریاد مترشح ہونے لگی ہے، کہیں کہیں چند

مثالوں سے تعمیم کا عمل کارفرما نظر آتا ہے، کہیں کہیں زورِ بیان اپنے جوہر دکھاتا ہے، کبھی کبھی جذبہ وضع استدلال سے دست و گریباں نظر آتا ہے۔ ان مظالم پر جن کے ہدف اس کے اہل مذہب متواتر بنائے گئے مصنف کی برہمی برحق ہے۔ جو اس کے لب ولہجہ کو بھی کبھی کبھی متاثر کر جاتی ہے، نہ کرتی تو بہتر ہوتا۔

مثنوی مولانا روم کا یہ شعر یاد آتا ہے :

موسیا! آداب دا ناں دیگر اند

سوختہ جان و روا ناں دیگر اند

(باری تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے موسیٰ سوختہ جانی الگ شے ہے آداب دانی بالکل الگ)

''سوختہ جانی'' کے شواہد جابجا ملتے ہیں۔ ''آداب دانی'' مصنف کی نگہِ التفات کے لئے چشم براہ ہے۔ جذبات کا تموج مصنف کی حرارت ایمانی اور غیرت ملی کی شہادت دیتا ہے۔ اس کا اسلوب تحریر جذبات سے ہم آہنگ ہے۔ زبان پر جو قدرت اسے حاصل ہے وہ اس پیرایۂ بیان کو اور دلکش بنا دیتی ہے، اور چمکا دیتی ہے۔ ہر چند کہ اس کتاب کی تصنیف اور مواد کی تحقیق پر سالہا سال صرف ہوئے تاہم اس کی روانی اور تسلسل میں کہیں رکاوٹ نہیں آئی۔ ہر چند کہ بطور پس منظر کہیں کہیں ایسا مواد بھی کتاب میں شامل کیا گیا ہے جس کی حیثیت حاشیائی ہے اور جس کا موضوع سے براہِ راست تعلق بھی نہیں، تاہم موضوع پر جو ابواب ہیں انہیں اس پس منظری مواد سے وزن بھی ملتا ہے اور بیانیہ کو حرکت بھی، اور قارئین کی معلومات میں گرانقدر اضافہ رونما ہوتا ہے۔

کتاب مندرجہ ذیل ابواب پر مشتمل ہے :

۱- جنگ آزادی اسلامی نقطۂ نظر سے۔

۲- یورو پین قومیں ہندوستان میں۔

۳- علماء کا پرتگالیوں سے جہاد۔

۴- انگریزوں کے خلاف اولین محاذ آرائی۔

۵- فتاویٰ دار الحرب اور ان کے مفتیان کرام کے مجاہدانہ کارنامے۔

۶- حضرت سید احمد شہید کا تحریک آزادی میں کردار۔

۷- تحریک مجاہدین کا انگریزوں سے تصادم۔

۸- روہیلکھنڈ میں علماء کا جہاد آزادی۔

۹- بنگال میں علماء کے زیر قیادت آزادی کی تحریکیں۔

۱۰- حیدر آباد دکن میں علماء کی جنگ آزادی۔

۱۱- کیرالا کی تحریک آزادی اور علماء۔

۱۲- مختلف مقامات پر علماء کی متفرق سرگرمیاں۔

ابواب کی سرخیوں سے کتاب کے پھیلاؤ کا اندازہ ہوتا ہے۔ علماء نے جنگ آزادی میں جو حصہ لیا، اس کو مصنفین نے مختلف تصانیف میں بیان کیا ہے۔ زیر نظر کتاب میں یہ ساری کوششیں اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ ہم ان کے جہد و جہاد کو بڑے افتخار و امتنان کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ عام قاری کو اچانک یہ احساس ہوتا ہے کہ۔

ایسی چنگاری بھی یا رب اپنی خاکستر میں تھی

ایک چنگاری نہیں، بیشمار چنگاریاں جنہوں نے اس ملک کے گوشے گوشے کو منور کر دیا تھا۔ مصنف نے کہا ہے اور اسے ثابت کر دکھایا ہے کہ آزادی کی جنگ ۱۸۵۷ء کی لڑائی سے بہت پہلے شروع ہوئی تھی اور اس جنگ کے سربراہ علماء تھے۔ وہ یوروپین طاقتوں کے خلاف بڑی بے جگری سے لڑے اور جریدۂ عالم پر نقش دوام ثبت کر گئے۔

کتاب کے پہلے باب ''جنگ آزادی اسلامی نقطۂ نظر سے'' میں مصنف نے بڑی جامعیت کے ساتھ یہ بات ثابت کی ہے کہ اسلام بہر حال آزادی کا عادی اور طالب ہے۔ بعد کے ابواب آزادی کی حفاظت یا حصول کے لئے علماء کی کوششوں پر مشتمل ہیں۔ دار الحرب کے تصور اور اس کی تاریخ پر مصنف نے سیر حاصل بحث کی ہے۔

فیصل احمد بھٹکلی کی زیر نظر کتاب مختلف زاویوں سے اہم اور قابل قدر ہے:

اول- تو اس نے علماء کی جو شبیہ ہمارے سامنے رکھی ہے اور جس کے خد و خال اس نے واقعات کے موقلم سے بنائے اور جس میں رنگ اس نے جذبہ، تجزیہ اور استدلال سے بھرا ہے، وہ ہمارے لئے فخر آفریں اور حوصلہ افزا ہے۔

دوئم۔ مصنف کو عربی اور فارسی تک دسترس اور اردو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے۔

سوئم۔ اس نے جنگ آزادی کو ۱۸۵۷ء سے شروع کرنے کی رسم کو جرأت کے ساتھ ترک کیا ہے اور جنگ آزادی کے تصور کو زمانی اور اقوامی حیثیتوں سے وسیع کیا ہے۔ اقوامی حیثیت سے اس طرح کہ یہ جنگ صرف انگریزوں کے خلاف نہیں تھی بلکہ افرنگ کی دوسری قوموں مثلاً پرتگیزیوں اور ولندیزیوں کے خلاف بھی۔

چہارم۔ ہندوستان کے گوشے گوشے میں علماء نے اور ان کے زیر اثر عام مسلمانوں نے اپنے دین اور اپنی آزادی کے لئے جسے وہ دین سے جدا نہیں سمجھتے تھے، کتنی صعوبتیں اٹھائیں، کیسی کیسی قربانیاں دیں، اس کا احساس ہم ستائش اور تشکر کے ساتھ کرتے ہیں۔ زیرنظر کتاب کا یہ ایک تحفہ ہے۔

پنجم۔ یہ بات حیرت خیز ہے کہ اس زمانہ کی عام روش کے خلاف مدرسہ کے ایک طالبعلم نے مروجہ نصاب کی اطمینان بخش اور پر آسائش چہار دیواری سے نکل کر تحقیق کے ہفتخواں کو طے کرنے کا تہیہ کرلیا، اس کے لئے ایک طویل و عریض منصوبہ بنایا اور غیر معمولی استقامت اور محنت اور مداومت کو بروئے کار لا کر اس کو تعمیل اور نفاذ سے سرفراز کیا۔

یہ سب کچھ مصنف کے جوہر طبعی کے علاوہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی نور اللہ برہانہٗ کا فیضان ہدایت ہے۔ ملت کو ندوۃ العلماء سے اس نوع کی بہت سی توقعات ہیں۔ نہ جانے کتنے اہم موضوعات ہیں جو ندوۃ العلماء کے طلبہ کی توجہ کے منتظر ہیں۔ ابھی چند ماہ ہوئے راقم سطور نے ایک کوشش کی تھی کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور جامعہ ہمدرد ان موضوعات پر جو مسلمانان ہند کے لئے اہمیت رکھتے ہیں اشتراک عمل کے ساتھ تحقیق کا آغاز کریں، ہرچند کہ یہ کوشش ابھی تک بارآور نہیں ہوئی ہے، پھر بھی اور بہتر ہو کہ مذکورہ یونیورسٹیوں کی اس اجتماعی تحقیقی کوشش میں ندوۃ العلماء بھی شریک ہو جائے۔ یہ تو خیر ایک جملۂ معترضہ تھا۔ ایک اشارہ جو اس گفتگو سے نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ ندوۃ العلماء کے ارباب اہتمام ندوہ کے فضیلت کے نصاب

میں یا اس کے بعد آداب تحقیق کا ایک مضمون شامل کر دیں۔ کیا عجب کہ اس کے مہتمم اعلا حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی جو فیصل احمد ندوی صاحب کی گرانقدر تحقیقی کوششوں سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ ان کے مؤید بھی ہیں، ندوۃ العلما میں تحقیق کے فروغ کی طرف مزید توجہ فرمائیں۔ دوسری یونیورسٹیوں کے ساتھ تحقیق میں اشتراک کا سجھاؤ بھی التفات کا طالب ہوگا۔

فاضل مصنف نے زیرِ نظر کتاب کی تقریب میں لکھا ہے :

> ''برصغیر میں یوروپین قوموں کی آمد سے لے کر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے پہلے علماء کے زیرِ قیادت اٹھنے والی آزادی کی تحریکوں اور انفرادی سرگرمیوں کا مفصل بیان اور ہمت افزا داستان۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کتاب داستان کی طرح دلکش ہے، ہمارے لئے سرمایۂ افتخار ہے اور ہماری ہمت بڑھاتی ہے۔ لیکن اس کے لائق اور ہونہار مصنف کی ہمت بڑھانے کی ضرورت سے ہم صرف نظر کرتے ہوئے آگے چلے جائیں۔ کیا یہ مناسب ہوگا؟

سیّد حامد

۲۲/مارچ ۲۰۰۳ء

تقریظ

مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی

اللہ رے عندلیب کی آواز دل خراش
جی ہی نکل گیا جو کہا ان نے ہائے گل
گل چیں سمجھ کے چنیو کہ گلشن میں میر کے
لخت جگر پڑے ہیں نہیں برگ ہائے گل

(میر تقی میر)

قوموں کی زندگی میں بعض واقعات، حادثے اور عزم وعمل کے نشان ایسے ہوتے ہیں جو قومی زندگی کی پیشانی پر عظمت و جرأت کی علامت یا سیاہ داغ بن کر ہمیشہ باقی اور یادگار رہ جاتے ہیں۔ انگریزی حکومت واقتدار کے خلاف اجتماعی کوشش اور معرکہ تیغ و تفنگ کی روداد بھی برصغیر ہند کی تاریخ کے ایسے ہی چند ممتاز ترین اور ناقابل فراموش واقعات و حوادث میں سے ہے جو قوموں اور ملکوں کی جرأت سطوت اور صلابت و استقامت کا نشان بن کر ان کی زندگی کی علامت اور ہمیشہ کے لئے یادگار بن جاتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کے حادثات وانقلاب نے برصغیر کی تمام قوموں کی تاریخ وسیاست اور بعد کے پورے دور اور عہد کو اس قدر متاثر کیا ہے کہ جس بڑے واقعے کو دیکھیں اس کا سلسلہ ۱۸۵۷ء کے واقعات سے ملا ہوا ہے اور جس تحریک کو ملاحظہ کیجئے اس کا رشتہ ۱۸۵۷ء کی تحریکات وواقعات سے جڑا ہوا نظر آتا ہے۔ برصغیر کا کوئی سیاست داں، کوئی قائد، دینی، علمی، تہذیبی مرکز اور سیاسی جماعت ایسی نہیں ہے جس کے فکر اور نظریات کی تشکیل میں ۱۸۵۷ء کے حادثات وانقلابات کا اثر نہ جھلکتا ہو، اور برصغیر میں قائم دینی

علمی اور مغربی علوم کا کوئی قدیم ادارہ ایسا نہیں جس کی تشکیل و تاسیس میں ۱۸۵۷ء کے نقصانات کا غم اور اس کی تباہی کی تلافی کا احساس صاف صاف نہ جھلکتا ہو۔ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸۵۷ء سے تقریباً ۱۹۲۰ء تک کی اکثر تحریکات اور ادارے ۱۸۵۷ء کی تحریک کا ردعمل اور اس نقصان کی تلافی کی کوشش ہیں۔ ہمارے تمام قائدین و زعماء کی فکر نے بھی اسی پس منظر میں تشکیل پائی تھی۔ نیز برصغیر کے مسلمانوں کے دینی اسلامی تشخص و تعلیم کا مرحلہ ہو یا معاشیات و سیاست کا مسئلہ، یا تہذیب و ثقافت کی بربادی کی بحث، ہر ایک کا ۱۸۵۷ء کے حادثات سے گویا براہ راست تعلق ہے۔

اس حادثے کی الم ناکی اور اس کے نقصانات کا دائرہ ایسا وسیع ہے کہ اس کو بلکہ اس کے کسی ایک پہلو کو بھی کسی ایک کتاب بلکہ کئی کتابوں میں بھی پوری طرح واضح اور منقح نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی داستان کا ایک ایک حرف بڑی بڑی کتابوں کا موضوع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو پاکستان کی تاریخ کے کسی ایک عنوان یا موضوع پر اس قدر کتابیں نہیں لکھی گئیں جس قدر کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی، اس کے محرکات و اثرات، اس کے فوائد و نقصانات اور اس کے متعلقات پر لکھی گئیں ہیں۔ ڈیڑھ سو سال کا عرصہ گذر جانے کے بعد بھی برصغیر (ہندو پاکستان و بنگلہ دیش) سے یورپ تک اس پر تحقیق و تصنیف اور مزید مطالعہ کا سلسلہ جاری ہے۔

مگر کیا ہندوستان میں آزادی کے لئے صرف یہی ایک اقدام ہوا تھا جس کو تحریک ۱۸۵۷ء کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور کیا برصغیر کے مسلمانوں کا اس میں صرف اسی قدر حصہ ہے جس کا عموماً ذکر کیا جاتا ہے۔ غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ہماری تاریخ کے یہ دونوں اہم باب اس پہلو سے ناقص اور نا تمام ہیں۔ وہ نہ آزادی کی تمام تحریکات کا احاطہ کرتے ہیں اور نہ ان تحریکات میں علماء اور مسلمانوں کی بھرپور شرکت و شمولیت بلکہ اولیت و رہنمائی کا تذکرہ کرتے ہیں۔ انگریزوں کے شمالی ہندوستان میں قدم رکھنے کے بعد سے ۱۸۰۳ء تک اور ۱۸۰۳ء میں دہلی پر جنرل لیک (Lake) کا قبضہ ہو جانے کے بعد سے ۱۸۵۷ء تک انگریز کے خلاف مسلمانوں کا کیا ردعمل رہا، مسلمانوں نے انگریزوں کی غلامی سے اور ان کے تسلط سے نجات کے لئے کیا کیا سوچا اور کیا کیا۔

نیز ۱۸۵۷ء سے پہلے آزادی کے لئے مسلم علماء اور عوام نے کن محاذوں پر کام کیا، کن کن جگہوں پر جنگیں لڑیں، اور ان کے کیا نتیجے ظاہر ہوئے اور ۱۸۵۷ء کی معرکہ آرائی، اس کے لئے تیاری، جنگجوئی، مزاحمت اور قربانی تفصیلات کے علاوہ تحریک کے ناکام ہو جانے کے بعد اس کے نتیجے میں پورے ملک کے مسلمانوں کو جو سزائیں دی گئیں، انہوں نے جو مصیبتیں اٹھائیں اور غیر معمولی تکلیفیں برداشت کیں، جس غیر معمولی نقصان کا سامنا کیا اور اپنی صدیوں کی محنت اور کارناموں کو جس طرح بے نام ونشان ہوتے دیکھا اس کی بھی مکمل روداد یک جا نہیں کی گئی۔ اس کی متفرق اطلاعات تو ملتی ہیں، جامع تفصیلی اور مرتب حالات دستیاب نہیں۔

ہماری تاریخوں میں عموماً جو لکھا گیا ہے اس کا آغاز عموماً اس فتوے سے کیا جاتا ہے جو حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے جاری کیا تھا اور اس کے بعد تحریک سید احمد شہیدؒ کے اثرات اور ۱۸۵۷ء کی جدوجہد میں اس تحریک کے نام لیواؤں کا (جس کو انگریز اور بعض ہندوستانی مؤرخین نے بھی ''وہابی مومنٹ'' کے نام سے یاد اور ذکر کیا ہے) پھر ضمناً ان تحریکات کے چند کارکنوں یا ان چند مجاہد کمانڈروں کا تذکرہ آتا ہے جنہوں نے ملک کے چند مرکزی حصوں میں اپنا اپنا انتظام اور کنٹرول قائم کر لیا تھا اور اپنی جنگی مہارت، بہادری اور حوصلہ مندی کی وجہ سے انگریزوں کو نقصانات پہنچاتے رہے۔ اور آخری سانس تک پوری قوت سے انگریزوں کا مقابلہ کرتے رہے اور جب تک ان کے دم میں دم رہا اس وقت تک اپنے علاقوں پر انگریزوں کا قبضہ نہیں ہونے دیا۔

یہ سب اپنی جگہ درست، لیکن اس سے واقعے کی تصویر مکمل نہیں ہوتی، اگر تحریک آزادی کی تاریخ اور جزئیات کا باریکی کے ساتھ اور وسیع پس منظر میں مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت اس تحریک کے کئی دور اور دو بڑے سرچشمے تھے۔ پہلا دور حضرت شاہ ولی اللہ کے عہد بارہویں صدی ہجری تقریباً ۱۱۵۰ھ (۳۸-۱۷۳۷ء) سے نئی صدی عیسوی کے آغاز تک۔ اور دوسرا دہلی پر انگریزوں کے قبضے سے ۱۸۵۷ء تک۔ تیسرا مرحلہ یا تحریک کا اہم پڑاؤ ۱۸۵۷ء کی جدوجہد ہے۔ نیز یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ اس موضوع پر پہلا بنیادی فتویٰ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے جاری کیا تھا۔ اس فکر کی پہلی

اینٹ حضرت شاہ ولی اللہ نے اس وقت رکھ دی تھی جب انہوں نے ہندوستان کو دارالکفر قرار دیا۔ اور یہاں سرگرم بعض قوتوں سے جہاد و اقدام کا ارادہ کیا اور اس مقصد کے لئے ہندوستان کی اندرونی مقامی سیاست میں سرگرم افراد سے حتیٰ کہ احمد شاہ ابدالی تک سے رابطے قائم کئے اور ایسے افراد تیار کئے جو اس فکر کے ترجمان اور اسی راہ کے مسافر و شہسوار ثابت ہوئے۔

نیز اس میں بھی کچھ شبہ نہیں کہ اس فکر کے سرخیل اور قافلہ سالار، حریت کے تاجدار شاہ ولی اللہ اور ان کے صاحبزادے رحمہما اللہ تھے۔ یہ انہی کا رسوخ اور ذاتی اثر تھا جس نے اس فکر، جذبہ اور تحریک کو پرواز بخشی اور غیر ملکی حکمرانوں اور مذہب و انسانیت دشمن افراد سے نجات پانے اور ان کے خلاف جدوجہد کرنے کی امنگ دلوں میں اس طرح موجزن کی کہ وہ ایک مقصد حیات بن گئی تھی۔

لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ جس فکر کو حضرت شاہ صاحب نے پروان چڑھایا وہ اس کے قائد و امام تو تھے، لیکن اس فکر میں منفرد نہیں تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت شاہ عبدالعزیز دونوں کے ہم زمانہ علماء میں اور بھی کئی بڑے عالم اور جلیل القدر مشائخ کی بھی یہی سوچ تھی وہ بھی (خصوصاً) شمالی ہندوستان میں اسلام دشمن قوتوں کے منظم اور طاقت ور ہونے اور نئے حکمرانوں کے تسلط کے اسی طرح خلاف تھے۔ جس طرح حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادے کے افراد۔ یہ الگ بات ہے کہ ان حضرات کے صدق و اخلاص اور مقام و مرتبہ کے باوجود ان کے فتاویٰ اور جہاد آزادی کے لئے ان کے نظریے اور ہدایات کو ویسی مقبولیت اور عوامی پذیرائی نہیں ملی جس کا حضرت شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز وغیرہ کے یہاں مشاہدہ ہوا تھا۔

حضرت شاہ ولی اللہ کے نامور معاصرین میں سے حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ ان خیالات و نظریات میں حضرت شاہ صاحب کے قریب نظر آتے ہیں، اگرچہ حضرت مرزا صاحب کی رائے کا بہت کھل کر اظہار نہیں ہوا، لیکن مرزا صاحب کے کلام میں اس کے اثرات جھلکتے ہیں۔ اور جس طرح حضرت شاہ ولی اللہ شیعوں اور مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی سیاسی قوت اور ان کے اقتدار کو اس ملک کے عمومی معاشرتی نظام اور خصوصاً اسلام

اور مسلمانوں کے لئے خطرہ سمجھتے تھے، یہی رائے حضرت مرزا صاحب کی معلوم ہوتی ہے۔ اور جس طرح حضرت شاہ ولی اللہ کو اپنے خیالات وفکر کا پرتو نجیب الدولہ میں نظر آتا تھا اور وہ ان کو ایک بڑا مدبر اور دور اندیش مانتے تھے، یہی کیفیت حضرت مرزا صاحب کی معلوم ہوتی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کے روابط و مراسم میں روہیلوں کا ایک مقام تھا، بالکل اسی طرح حضرت مرزا صاحب کے معتمد اور خانقاہ مظہریہ کے بنیادی کارکن روہیلہ رہتے تھے۔ اور جس طرح حضرت شاہ ولی اللہ کی نیابت حضرت شاہ عبدالعزیز نے فرمائی، اسی طرح مرزا صاحب کے علمی و عملی جانشین حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی تھے۔

حضرت قاضی صاحب نے بھی اسی راہ میں قدم اٹھایا جس پر شاہ عبدالعزیز گامزن ہوئے تھے۔ اور جس طرح شاہ عبدالعزیز نے دہلی پر انگریزوں کے قبضے کے بعد ہندوستان کو دارالحرب قرار دینے میں کچھ تامل نہیں کیا، اسی طرح حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب نے بھی اس ملک کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ صادر فرمادیا۔ اور اگرچہ حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت مرزا صاحب کی طرح حضرت شاہ عبدالعزیز اور حضرت قاضی صاحب کو نہایت سخت حالات سے مقابلہ کرنا پڑا۔ جس طرح شاہ عبدالعزیز کو طرح طرح کی سازشوں اور منصوبوں کا شکار بنانے کی کوشش کی گئی، اسی طرح حضرت قاضی صاحب بھی غیر متوقع سخت حالات نیز سکھوں، شیعوں اور جاٹوں کے نشانہ پر رہے۔ لیکن جس طرح ان حوادث کی وجہ سے حضرت شاہ ولی اللہ اور مرزا صاحب کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آئی تھی، اسی طرح حضرت شاہ عبدالعزیز اور حضرت قاضی صاحب کے قدموں میں بھی جنبش نہیں ہوئی۔ جس طرح وہ اپنی بات پر راسخ تھے، یہ بھی اپنے نظریات پر ثابت رہے ؎

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں
گو ہاتھ اس میں ہمارے قلم ہوئے

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شمالی ہند کے دارالحرب ہونے کا برملا فتویٰ دینے میں

حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب کو اولیت حاصل ہے۔ ہر چند کہ شہرۂ عام حضرت شاہ صاحب کے فتویٰ کو حاصل رہا اور ان دونوں اکابر علماء کے علاوہ بھی متعدد بڑے علماء نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کی وضاحت وصراحت فرمائی اور اس کو پوری قوت کے ساتھ اس طرح آشکارا کیا کہ کسی کو مجال گفتگو نہیں رہی۔

حضرت قاضی صاحب نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے اور اس کے متعلق مسائل پر متعدد فتاویٰ جاری کیے۔ قاضی صاحب کا اس موضوع پر ایک مختصر مگر جامع فتویٰ جس میں اس خطہ کے دارالحرب ہونے کے حکم کے علاوہ یہاں کے چند مالی مسائل پر بھی حکم صادر کیا ہے۔ ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہے۔ (۱)

نیز قاضی صاحب نے اس مبحث پر اور بھی کئی فتوے جاری کیے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی صاحب ملک کے سیاسی حالات سے نہایت پریشان اور غیر مطمئن ہیں اور اپنے دور کے سیاسی مذہبی منظر نامہ کو ملک اور مسلمانوں دونوں کے لئے خطرناک سمجھتے ہیں۔ (۲)

بہرحال حضرت شاہ عبدالعزیز اور حضرت قاضی صاحب جیسے مایۂ فخر روزگار علماء کے فتاویٰ نے پورے ملک کو متاثر کیا تھا اور اسی وجہ سے اور بھی بہت سے علماء نے اس سمت میں پیش قدمی کی اور ہندوستان کی مذہبی، سیاسی اور معاشی صورت حال کا جائزہ لیا اور پس منظر میں کئی کئی تحریریں مرتب کیں، اپنی فقہی رائے اور فتاوے جاری کیے۔

اس تحریک اور فضا کی آبیاری اور اس نظریہ کی ترویج واشاعت میں اور علماء کے علاوہ حضرت شاہ ولی اللہ کے خاندان کے دوسرے بڑے علماء کا بھی خاص حصہ ہے۔ حضرت شاہ رفیع الدین (وفات ۱۲۳۳ھ/ اگست ۱۸۱۸ء) بھی ہندوستان کو دارالحرب

---

(۱) یہ فتویٰ غالباً مفتی الٰہی بخش صاحب کے سوال کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ یہ اصل فتویٰ جو قاضی صاحب کے قلم سے ہے اور اس پر قاضی صاحب کی مہر بھی ثبت ہے۔ ہمارے ذاتی ذخیرے میں موجود ہے۔

(۲) یہ فتویٰ اور اس کے علاوہ متعدد اہم فتاویٰ جس میں ہندوستان کی آراضی کے مسائل پر بھی بحث ہے، قاضی صاحب کے اس مجموعہ فتاویٰ میں شامل ہے، جو قاضی صاحب کے پرپوتے عبدالسلام پانی پتی نے قاضی صاحب کی اصل تحریروں کی مدد سے مرتب کیا تھا۔ اس مجموعہ فتاویٰ کا مکمل فوٹو اسٹیٹ ہمارے ذخیرے میں موجود ہے۔

سمجھتے تھے۔ شاہ صاحب کا اس موضوع پر ایک مختصر مگر جامع فتویٰ موجود ہے۔ مفسر قرآن حضرت شاہ عبدالقادر (وفات رجب ۱۲۳۰ھ / جون ۱۸۱۵ء) کی بھی یہی رائے تھی۔ نیز خانوادہ کے علماء میں جن لوگوں کی تحریرات اور مصنفات موجود ہیں ان میں سے حضرت شاہ اسماعیل شہید بھی ہندوستان کو دارالحرب کہتے اور لکھتے تھے۔ (۱)

حضرت شاہ شہید کی تو پوری زندگی اس فتویٰ کے متعلقات کی تبلیغ و اشاعت کرتے گذری اور اسی مقصد کی جدوجہد میں بالاکوٹ کے میدان میں شہید ہوئے۔ عیاں راچہ بیان ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

حضرت شاہ عبدالعزیز کے علمی، عملی اور معنوی جانشین حضرت شاہ محمد اسحاق کی بھی یہی رائے تھی کہ ہندوستان دارالحرب ہے۔ شاہ صاحب کے ایک خط سے یہی رائے معلوم ہوتی ہے۔ چوں کہ شاہ صاحب ہندوستان کو دارالحرب سمجھتے تھے اسلئے ہندوستان سے مکہ معظّمہ ہجرت کر گئے تھے۔ شاہ محمد اسحاق صاحب کا سفر ہجرت اسی وجہ سے ہوا تھا، اس کا شاہ صاحب کے قریبی احباب کو خوب علم تھا۔ شاہ صاحب کے قریبی واقف اور مشہور شاعر مومن خاں مومن نے شاہ صاحب کے سفر ہجرت پر اپنے قطعہ تاریخ میں اس کا یوں اظہار کیا ہے ؎

بگذاشتہ دار حرب امسال
جا کردہ بمکہ معظم

---

(۱) شاہ صاحب نے صراط مستقیم میں اس کی صراحت فرمائی ہے کہ:
.... حال ہندوستان را کہ دریں جزو زمان کہ سنہ یک ہزار و دو صد و سی و سوم است کہ اکثرش دریں ایام دارالحرب گردیدہ...... الخ۔ (صراط مستقیم صفحہ ۹۵ مجتبائی دہلی: ۱۳۲۲ھ)
صراط مستقیم کا ایک ایسا اہم قلمی نسخہ جس کی صراط مستقیم کی تالیف کے صرف مہینہ بعد نقل مکمل ہوئی ہے۔ راقم کی نظر سے گذرا ہے اور اس کا مکمل عکس ہمارے ذخیرے میں موجود ہے۔ اس میں بھی یہ الفاظ اسی طرح درج ہیں۔ چونکہ معاندین نے صراط مستقیم کی اصلیت اور شاہ اسماعیل کے قلم سے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کی صراحت پر اعتراضات کئے ہیں۔ اس لئے یہاں یہ وضاحت ضروری تھی۔

یعنی شاہ صاحب اس سال دار الحرب چھوڑ کر مکہ معظّمہ چلے گئے اور وہیں رہائش اختیار کر لی۔

شاہ صاحب نے اپنی رائے کی وجہ سے حضرت شاہ عبد العزیز کی وفات (۷رشوال ۱۲۳۹ھ مطابق ۶رجون ۱۸۲۴ء) کے بعد سید احمد شہید اور ان کی تحریک کی یہی نہیں کہ مکمل سرپرستی و رہنمائی کی بلکہ دامے درمے قدمے سخنے ہر طرح سے اس کی مدد کی اور اپنے پورے علمی سلسلے اور شاگردوں کی بڑی تعداد کو اسی سے عملاً وابستہ کیا اور اس کا ہر پہلو سے تعاون فرماتے رہے۔ اور یہ حضرت شاہ محمد اسحاق اور خانوادہ ولی اللّٰہی کے رسوخ کا ایک اثر اور ان کی توجہات وعنایات کی برکت تھی کہ سید صاحب کی تحریک اصلاح و جہاد دونوں انگریز کے ماتحت علاقے سے افغانستان کی حدود تک آزادی سے اور بے روک ٹوک کام کرتی رہی۔ اور انگریزوں کو کم از کم ۱۸۵۷ء تک تحریک کے رہنما اور قائدین کے خلاف کوئی بڑی اجتماعی کارروائی کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔

یہ فکر خاندان ولی اللہ کے متاخر علماء میں بھی اسی طرح کارفرما رہی اور ان کی توجہ اور عمل کا محور رہی۔ مولانا عبدالحی بڈھانوی کے فرزند اور حضرت شاہ محمد اسحاق کے داماد مولانا مفتی عبدالقیوم نے اس موضوع پر "هادي إلى سبيل الرشاد في سبيل الهجرة والجهاد" (۱) کے نام سے اردو میں ایک کتاب تالیف کی تھی۔ اور غالباً یہی وجہ تھی کہ حضرت شاہ محمد اسحاق کے ہجرت کے بعد خانوادہ ولی اللّٰہی کے ممتاز افراد دہلی اور اسکے نواح سے رخصت ہو کر مسلم ریاستوں میں چلے گئے تھے اور آخر تک وہیں رہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز اور قاضی ثناء اللہ اور خاندان ولی اللّٰہی کے مذکورہ علماء کی یہ فکر اور عمل ایسا نہیں تھا کہ اس کا اور علماء پر اثر نہ ہوتا، چنانچہ ان فتاوی اور علماء کے اثر سے پورے ملک میں یہ نظریہ اور فکر عام ہوئی۔ بیسیوں علماء نے اس موضوع کے فتاویٰ جاری کئے اور ان فتاویٰ کی روشنی میں تدبیریں کیں اور اس طرح سے وہ بہت سے علماء جو صاحب عزم و عمل تھے میدان میں آئے۔ اور یوں کڑی سے کڑی اور زنجیر سے زنجیر جڑتی چلی گئی اور پورے ملک میں انگریز کے خلاف اجتماعی قدم اٹھانے اور اس پر

(۱) اس تالیف کا ایک نسخہ معلوم ہے جس کا فوٹو اسٹیٹ ہمارے ذخیرہ موجود ہے۔

فیصلہ کن وار کرنے کی بات بہت قوت اور تیزی سے آگے بڑھی۔

یہاں یہ عرض کر دینا چاہئے کہ حضرت شاہ عبد العزیز کے نقطۂ نظر کی جن علماء نے بطور خاص ترویج واشاعت کی، اس پیغام اور مشن کو آگے بڑھایا اور اس کی تبلیغ و تلقین میں بھر پور حصہ لیا ان میں ایک اہم نام مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کا بھی ہے۔(۱)

مفتی صاحب نے ہندوستان کی شرعی حیثیت کے مسئلے پر ملک کے متعدد بڑے علماء سے خط و کتابت، ان کی رائے، فتاویٰ طلب کئے۔ ہندوستان کی شرعی حیثیت اور اس وقت جہاد کی ضرورت پر علماء کے افادات اور تحریریں فراہم کیں۔ اور خود بھی اس موضوع پر کئی تحریریں لکھیں اور یادداشتیں مرتب کیں۔ اور جب حضرت سید احمد شہیدؒ تحریک اصلاح و جہاد لے کر اٹھے تو حضرت شاہ عبد العزیز کے ہم خیال لوگوں اور اس خطے کے ممتاز ترین علماء اور اصحاب ارشاد و معرفت میں جن لوگوں نے سب سے پہلے حضرت سید صاحب کی بھر پور پذیرائی کی، ان کا ہاتھ پکڑا اور ان کی دعوت پر پورے جذبے اور قوت کے ساتھ لبیک کہی ان میں حضرت مفتی صاحب کا نام بہت نمایاں ہے۔ اور یہ غالباً مفتی صاحب کے ذاتی اثر کی بات تھی کہ کاندھلہ، کیرانہ اور جھنجھانہ وغیرہ سے حضرت سید صاحب اور ان کی تحریک کو مخلص واہم رفقاء کی ایک قابل ذکر تعداد حاصل ہوئی جو اصلاح عقائد و اعمال اور بدعات و رسوم کی تردید سے میدان شہادت تک ہر گام اور ہر قدم پر حضرت سید صاحب کے رفیق اور ہر ایک قربانی اور ذمہ داری کے ادا کرنے میں پیش پیش رہے۔ ان میں سے کئی ایک سید صاحب کے معرکوں میں شہید ہوئے اور چند خوش نصیب بالاکوٹ کے لالہ زار سے سرخ پوش ہو کر "فاطر السماوات والأرض" کی بارگاہ میں پہنچے۔ اور جو ان میں سے باقی رہے وہ سید صاحب اور تحریک کی قائدین کی شہادت کے بعد وطن واپس آگئے تھے، لیکن وہ زندگی بھر اپنی اسی دعوت پر قائم، اس مشن کے خادم اور اسی مقصد کے سفیر رہے اور اسی کی آواز

(۱) حضرت مفتی صاحب (ولادت ۱۱۶۲ھ وفات ۱۲۴۵ھ/ ۱۸۲۹ء) حضرت شاہ عبد العزیز کے سب سے پہلے شاگردوں میں شامل نیز شاہ رفیع الدین اور شاہ عبد القادر کے ہم سبق تھے۔ مفتی صاحب کی ایک غیر معمولی لیاقت و صلاحیت اور اپنے سب سے بڑے اور سب سے صاحب لیاقت تین شاگردوں میں شامل ہونے کا خود شاہ عبد العزیز صاحب تذکرہ اور اعتراف فرمایا کرتے تھے۔

اور صدا لگاتے لگاتے اس دنیا کو خیر باد کہہ گئے۔

حضرت مفتی الٰہی بخش کے صاحبزادے مولانا ابوالحسن بھی اسی فکر کے پروردہ تھے۔ وہ بھی سید احمد شہید کے متوسل اور ہمیشہ اسی مقصد کے داعی اور مسافر رہے۔ مولانا ابوالحسن بھی سید صاحب کے دل دادہ اور غالباً دست گرفتہ بھی تھے اور اپنے والد ماجد کی طرح تحریک کے مقاصد کے لئے پوری کوشش اور جدو جہد کرتے رہے۔ اس سلسلے کے سرگرم افراد سے ہمیشہ ان کے روابط رہے۔ اس وقت کے متعدد علماء سے ان موضوعات پر خط و کتابت کی اور تحریک سید احمد شہید سے بھی بھرپور تعلق رکھا۔ مولانا کی بیاضوں اور تحریرات سے جھلکتا ہے کہ اس فکر کے متعدد اصحاب ایسے تھے جن سے مولانا کی قریبی رابطے اور خط و کتابت رہتی تھی۔

اسوقت کے حالات نے جو زخم شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کو پہنچائے تھے وہی کیفیت اور درد و سوزش ملک کے اور حصوں میں بھی اسی طرح محسوس کی جارہی تھی۔ اور ان حالات سے نکلنے کی جو تدبیریں اور نقشے خاندان ولی اللہی کے اکابر علماء اور اس خطے کے علماء کے تصورات میں کروٹ لے رہے تھے، اسی کا ملک کے اور علماء کے ذہن و خیالات پر بھی غلبہ تھا، اور حالات کی گرفت سے نکلنے کی جو تدبیریں اور راستے دہلی اور نواح کے علماء نے تجویز کئے تھے، اسی پر دوسرے خطے کے اہل نظر و قائدین کی بھی نگاہ گئی تھی۔ فکر و خیالات کا یہی اجتماع، نظریات و مقاصد کا یہی توارد اور اس موضوع پر مرتب تحریرات و فتاویٰ کا یہی معنوی اتفاق تھا جس نے اس نظریہ کو پورے ملک میں تقریباً ایک وقت میں متعارف کرادیا اور اس پر عمل پیرا ہونے کا نیز ایک جیسے ردعمل کے اظہار اور مشترک کارروائی کرسکنے کی توفیق اور اہلیت بخشی۔ اس کتاب میں ان میں سے کئی فتاویٰ کا اپنے اپنے موقعوں پر تذکرہ و تعارف آئے گا۔

اس خطے کی شرعی حیثیت کی تعیین اور یہاں کے بعض شرعی مالی مسائل کے بارے میں اس وقت تک معلوم تحریرات و فتاویٰ میں سے سب سے پہلی تحریرات وہ ہیں جو فقیہ سندھ عالم جلیل علامہ مخدوم محمد ہاشم سندھی کے پوتے شیخ ابراہیم (بن شیخ عبداللطیف) نے مرتب فرمائی تھیں۔ اٹھارھویں صدی عیسوی کے آخری بیس پچیس سال میں

راجستھان کی ریاست جودھپور نیز بعض اور علاقوں میں بھی مسلمانوں پر نہایت سختی اور ظلم وزیادتی شروع ہوئی تھی جو بڑھتے بڑھتے تمام مسلمانوں اوران کے دینی آثار وعبادات کے خلاف گویا ایک تحریک کی صورت اختیار کرگئی تھی۔ جس میں مسلمانوں کو اس علاقے سے نکالنے کی اوران پر ہر طرح کے ظلم ڈھانے کی پوری چھوٹ تھی۔ ان کو نماز روزہ اور شرعی عبادات وفرائض کے ادا کرنے سے مسلسل روکا جاتا تھا، ذبیحہ پر پابندی لگ گئی تھی، مسجدیں شہید کی جارہی تھیں۔ اس ظلم وستم کی خبریں دور دور تک پہنچ رہی تھیں اس وقت مخدوم شیخ ابراہیم سے بھی اس کے متعلق غالباً سوال کیا گیا۔ اس کے جواب میں شیخ ابراہیم نے ایک مختصر مگر بہت جامع رسالہ ان ریاستوں کی شرعی حیثیت کی تحقیق میں لکھا۔ اس موضوع کو آگے بڑھاتے ہوئے ایسے مقامات پر مالی معاملات کے حکم پر بھی ایک رسالہ اور تحریر کیا ان دونوں رسائل پر سندھ ہی کے ایک عالم (شیخ عثمان اوران کے شاگرد محمد صادق سندھی) نے اعتراضات کیئے ان رسائل کا جواب لکھا۔ مخدوم شیخ ابراہیم نے اس کے جواب الجواب میں ایک اہم کتاب "نشر حلاوی المعارف و العلوم فی الرد علیٰ من نصر الکفار و اھل الرسوم" کے نام سے تالیف فرمائی تھی۔ یہ کتاب برصغیر میں اس موضوع کی تمام تالیفات میں منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں شیخ سندھی نے احکام اہل ذمہ، دارالاسلام دارالحرب کا فرق اوران سے متعلق عنوانات ومسائل پر بہت وسیع بیش قیمت معلومات اور ایسے علمی افادات جمع فرمادئے ہیں کہ یہ تصنیف اس موضوع کا دائرۃ المعارف بن گئی ہے۔

یہ تینوں رسائل ۱۲۰۹ھ (یعنی ۹۵-۹۴ ۱۷ء) میں لکھے گئے تھے (۱)

علامہ شیخ مخدوم ہاشم سندھی کا اس نواح میں جو مقام ومرتبہ تھا اوران کے جو اثرات تھے اس کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ راجستھان اور سندھ وغیرہ میں ظالمانہ قوتوں کے خلاف مقابلہ کی قوت بڑھانے اور عام جذبہ پیدا کرنے میں مخدوم ابراہیم کی ان تالیفات کا بھی خاص حصہ رہا ہوگا۔

---

(۱) ان تینوں رسائل کا مولانا عبدالرشید نعمانی نے مفصل تعارف کرایا ہے۔ سہ ماہی الزبیر بہاولپور کتب خانہ نمبر اوران تینوں کے مذکورہ بالانسخوں کا فوٹو اسٹیٹ ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے۔

درج بالا سطور میں ہندوستان کی شرعی حیثیت کے متعلق حضرت شاہ ولی اللہ کی جس رائے اور علمائے سندھ کے جن رسائل کا ذکر آیا ہے ان سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ ان کا نشانہ صرف ایک انگریز ہی نہیں وہ قوتیں اور جبر و قہر کا وہ نظام بھی تھا جس میں محبت و رواداری اور تحمل کی گنجائش نہیں تھی۔ ایک ہی راستہ اور بنیاد مقرر تھی اور ہر ایک سے اسی پر چلنے کی امید کی جاتی تھی اور جو اس سے الگ ہٹ کر قدم بڑھانے یا اپنے معاملات و معاشرت اور عقائد و مذہب کے ساتھ جینا چاہتے تھے ان کے لئے کوئی موقع نہیں تھا۔

ایسے حالات سے جس کسی کو گذرنا پڑے اور جو اس مصیبت و افتاد کا شکار ہو اس کے لئے ان فتاویٰ میں عزم و حوصلہ اور ثبات استقامت کا ایسا پیام ہے جس کو کبھی بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے۔

دو چار دس بیس علماء کی بات نہیں بلکہ نشہ غیرت میں سرشار نہ جانے کتنے علماء اہل نظر اور ارباب منزلت تھے جو اسی طرح سوچ رہے تھے، اسی کی باتیں کرتے تھے، اسی کے لئے تدبیریں کرتے تھے، اور اسی مقصد کے لئے جانیں قربان کرنے کی نیت رکھتے تھے۔ ان میں بہت سے خدا کے بندے ایسے بھی تھے کہ انہوں نے جو ارادہ کیا، کر دکھایا اور جس مقصد کو لے کر اٹھے تھے اس کے لئے ہر طرح کی مصیبتیں اٹھائیں اور جانیں قربان کیں، پھانسیوں کے پھندے چومے، ان کو طرح طرح کی اذیتیں دے کر ہلاک کیا گیا، لیکن ان بلاکشانِ محبت اور رہروانِ راہ حریت کے نہ ارادے تبدیل ہوئے، نہ ان کے حوصلوں میں کمی آئی، نہ ان کے قدموں نے جنبش کی۔ جہاں تک ان کے بس میں تھا انہوں نے اپنی کسی کوشش میں کمی نہیں کی۔ لیکن غیب کے کئی فیصلے انسانی تدبیروں اور کوششوں کے خلاف اور ایسے تلخ گھونٹ ہوتے ہیں کہ ان کا انگیز کر لینا آسان نہیں ہوتا۔ لیکن جب یوں بساط پلٹتی ہے اس وقت ناکامی کی قیمت کامیابی سے زیادہ ہوتی ہے۔ نامساعد حالات میں اپنے سے ہزار گنا طاقتور اور منظم دشمن سے لوہا لینا ہر ایک کا کام نہیں۔ یہ انہیں کا منصب ہے جن کو اپنا مقصد زندگی ہزار گنا عزیز ہو۔

مگر ہمارا المیہ یہ ہے کہ اس تحریک کے عام کارکنوں، مجاہدین اور شہداء کو تو عموماً

کوئی جانتا ہی نہیں۔ سیکڑوں بلکہ ہزاروں ممتاز علماء اور قائدین ایسے تھے کہ ہم صرف سرسری طور پر ان کے نام جانتے ہیں، ان کی خدمات، کارناموں علم و دانش اور قیادت و قربانی کی تفصیلات ہماری دسترس میں نہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ انہوں نے یہ جذبہ اور شعلہ اور آگ کہاں سے حاصل کی اور کس طرح ان چنگاریوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے گھر گھر بستی بستی تقسیم کیا۔ اور کیوں کر سارے علاقے کو ایک لڑی میں پرو دیا اور کس طرح ان کو جہاد و پیکار کے لئے تیار کیا اور کیوں کر ان کی رہنمائی کی اور کن تدبیروں سے دشمن کے حملے اور نرغے سے بچے اور کس کیفیت میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ اور ایسے دو چار نہیں ہزاروں لاکھوں افراد ہوں گے جن کے لہو سے یہ مٹی سیراب ہوئی اور جن کی قربانیوں کے اثر سے ہمیں تازہ ہوا میں سانس لینا نصیب ہوا۔ کاش ہم انہیں جانتے۔ زیر نظر کتاب میں ان ہی بندگان خدا کو اور ملک و ملت کے بڑے محسنین کو دریافت کرنے، ان کی فراموش خدمات و قربانیوں کو یاد کرنے، ان کو خراج تحسین پیش کرنے اور انکے معلوم احوال کا ایک مرقع پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ایک عرصہ سے ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ آزادی کی جدو جہد میں علماء کرام، ان کے فتاویٰ، ان کے حلقہ اثر اور ان کے متوسلین سے عام مسلمانوں تک جو ایک بہت بڑی عالی مرتبہ اور شاخ در شاخ تحریک چلی جہاں تک ممکن ہو اس کے تمام پہلوؤں کو نمایاں کیا جائے اور جو بہت سی حقیقتیں اور سچائیاں ناواقفیت کے انبار میں دب کر آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں ہیں ان کو علم و استدلال کی روشنی میں سامنے لایا جائے اور جو متعدد پہلو چھپے ہوئے پڑے ہیں ان کو ظاہر کیا جائے۔ یہ آسان اور معمولی کام نہیں تھا اس کے لئے ایک بڑے علمی ادارے اور اکیڈمی کی ضرورت تھی۔ لیکن اکثر دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ جو اہم اور تاریخی حیثیت کے نمائندہ کام بڑی بڑی اکیڈمیوں اور علمی اداروں سے نہیں ہوئے اس کا کسی ایک عام شخص نے ارادہ کر لیا اور کر دکھایا۔ میرا خیال ہے کہ زیر نظر کتاب اور اس کے منصوبہ کو بھی ایسی فہرست میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

عظیم الشان ہے یہ کام نکلے گا فقیروں سے۔

ضرورت تھی کہ اس کو بساط بھر جامعیت اور تمام پہلوؤں کے احاطہ کے ساتھ اس

طرح مرتب کیا جائے کہ پچھلے ڈیڑھ سو سال کی تاریخ آئینہ ہو جائے اور اس میں کسی فقہی مسلکی اختلاف، علاقائی سیاسی وابستگی اور رجحان کی بطور خاص وکالت اور نمائندگی نہ کی جائے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت مولانا فیصل صاحب بھٹکلی ندوی کے لئے مقدر کی تھی کہ وہ اس مشکل سفر کو طے کریں اور اس قرض کو ادا کرنے کی کوشش کریں جو ہم سب پر عائد ہوتا ہے۔

مولانا فیصل صاحب نے آزادی کی اس مکمل داستان کو پانچ جلدوں میں مرتب اور پیش کرنے کا ارادہ کیا ہے، جس کی پہلی جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے جو ۱۸۵۷ء تک کے واقعات پر مشتمل ہے، امید ہے کہ یہ منصوبہ پانچ جلدوں میں مرتب ہوگا جس میں سے دوسری جلد ۱۸۵۷ء کی تحریک کے لئے مختص ہوگی اور آخری دو یا تین جلدیں ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کے واقعات کا احاطہ کریں گی۔ یہ کام اگر موجودہ ترتیب اور منصوبہ کے مطابق مکمل ہوگیا تو امید ہے کہ اس سے ہمارا ایک ملی فرض ادا ہو جائے گا اور ایک بڑی علمی ضرورت پوری ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے کہ فاضل مؤلف اپنے اس کام کو اسی لگن اور جوش و جذبہ کے ساتھ پورا کرسکیں اور اس پہلی جلد کے مطالعہ سے آئندہ متوقع جلدوں کے متعلق جو ایک امید پیدا ہوگئی ہے اور اشتیاق ہوگیا ہے وہ اسی نہج بلکہ اس سے بہتر طریقہ پر پورا ہو۔ آمین!

مؤلف اپنی اس کوشش میں کامیاب ہیں۔ مؤلف نے جس بڑے پس منظر میں اس کام کو شروع کیا اور جس جامعیت اور حسن ترتیب کے ساتھ اس سے عہدہ برآ ہوئے، وہ لائق تحسین اور قابل مبارکباد ہے۔

اس بڑی کتاب سے جس کی پہلی جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے، بہت سی تاریخی حقیقتیں پہلی بار مرتب طور پر منظر عام پر آرہی ہیں اور اس میں کئی ایسے اہم اور تاریخی فتاویٰ کا پہلی بار تفصیل سے تعارف کرایا گیا ہے جنہوں نے ہندوستان کے سیاسی حالات پر گہرا اثر ڈالا اور اب ان کی حیثیت ایک مینارۂ نور اور نشان راہ کی ہے اور ایسی متعدد شخصیتوں کا پہلی بار واضح تعارف کرایا ہے جن کی آزادی کی جدوجہد بلکہ قیادت

میں بھر پور حصہ تھا۔ نیز اس کتاب میں ایسی کئی جزئیات کا بھی احاطہ کیا گیا ہے جن سے تاریخ کے اس باب کی عظمت و سربلندی میں اضافہ ہوتا ہے مگر ان کا اس حیثیت سے تذکرہ آنا باقی تھا اور تمام واقعات کو صحیح ترتیب اور تحقیق و دیانت کے ساتھ پیش کرنے کی (جہاں تک میں نے پڑھا اور سمجھا) پوری پاسداری کی گئی ہے۔ بہرحال یہ ایک قابل قدر اور لائق تحسین خدمت انجام پائی ہے۔ فاضل مصنف کو اس بڑی خدمت کے ارادہ اور زیر نظر پہلی جلد کی تکمیل پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ انشاء اللہ یہ کتاب مقبول ہوگی اور اس موضوع پر بعض پہلوؤں سے ایک اضافہ اور چند نئے عنوانات کی کلید ثابت ہوگی اور یہ بھی امید کرتا ہوں کہ اس کتاب کی بھرپور پذیرائی ہوگی۔

لیکن اس سے یہ خیال یقیناً صحیح نہیں ہوگا کہ اس موضوع پر کام مکمل ہوگیا۔ ابھی بہت کچھ کرنا اور سفر کی کئی منزلیں طے کرنی ہیں۔ اور کئی مباحث تحقیق کے منتظر ہیں ؎

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کار مغاں
ہزار بادہ ناخوردہ در رگ تاک است

نور الحسن راشد کاندھلوی

مولویان

کاندھلہ، ضلع مظفر نگر، یوپی

۵ ربیع الاول ۱۴۲۴ھ ۸ مئی ۲۰۰۳ء

کچھ کتاب کے بارے میں

۱۹۹۲ء کی بات ہے میرا سبزۂ آغاز تھا اور میں جامعہ اسلامیہ بھٹکل کے درجہ عربی ششم میں زیر تعلیم، کہ ہمارے مدرسہ کی بزم ثقافت کی طرف سے متعدد عنوانات نکلے جن میں ایک دلکش عنوان تھا ''ہندوستان کی آزادی میں علماء کا کردار''۔ اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر مجھے خیال ہوا کہ میں اس کو اپنے لئے منتخب کروں، اب میں نے کتابوں کی تلاش شروع کی۔ کچھ کتابیں ہاتھ آئیں اور میں نے ان کی مدد سے لکھنا شروع کیا، اور برابر لکھتا رہا۔ وقت پر وقت گذرتا گیا منتظمین بزم تقاضا کرتے رہے تا آں کہ تعلیمی سال اختتام پذیر ہوا اور پروگراموں کا سلسلہ منقطع۔ ادھر میرا یہ حال تھا کہ جو آٹھ دس صفحے کا مختصر مضمون لکھنے بیٹھا تھا وہ فل اسکیپ کے ۸۰ صفحات سے تجاوز کر گیا اور ایک مختصر کتاب تیار ہوگئی۔ دوسرے سال ایک تہائی حصہ میں اس کا خلاصہ کیا جو ۲۸ صفحات میں آیا مگر اس بزم میں اس کو پیش کرنا بھی ممکن نہیں تھا اس لئے اس کے بھی اہم حصوں کو نشان زد کر کے کسی ابتدائی بزم میں اس کا خلاصۃ الخلاصہ پیش کیا گیا۔

چونکہ سال گذشتہ کے آخری تین چار مہینے اس موضوع سے اشتغال رہا تھا اس لئے اس سے ایک دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ اور میں نے اسی وقت طے کیا تھا کہ انشاء اللہ اس موضوع پر پوری تحقیق کرنا ہے۔

۱۹۹۵ء میں تعلیم کے لئے دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ آنا ہوا۔ ریزیڈنسی، شہید اسمارک پارک اور لکھنؤ کے گلی کوچوں (جنگ آزادی کی تاریخ کے کچھ مطالعہ کی وجہ سے جن میں سے بہت نام میرے لئے نامانوس نہیں تھے) کی زیارت کی وجہ سے اس کام کا پھر شدید داعیہ پیدا ہوا۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی مجلسوں اور تقریروں نے اس کو اور مہمیز کیا۔ اس کے بعد میرا جہاں بھی جانا ہوا میں نے اس موضوع سے متعلق

معلومات جمع کرنے کی کوشش کی۔ اخبارات کے تراشے رکھنا، رسائل کے مضامین کا فوٹو لینا، کتابوں کے نام اور پتے نوٹ کرنا اور انکے حصول کی فکر کرنا میرا مستقل مشغلہ بن گیا۔

جیسے ہی ۱۹۹۷ء کا سال شروع ہوا میرا اسمند شوق تیز گامی سے آگے بڑھنے لگا اور یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ اگست تک کتاب منظر عام پر آجائے اور آزادی کی گولڈن جبلی کا بہترین تحفہ ثابت ہو۔ بعض بہی خواہ جن کو میرے اس کام کا علم تھا موقع کی مناسبت دکھا کر جلدی مچانے لگے مگر مجھے بہت جلد اندازہ ہوا کہ یہ کام بھاگا بھاگ اور رواروی کا نہیں۔ بلکہ کسی بھی علمی و تحقیقی کام کے لئے صبر و انتظار شرط اولین ہے۔ پھر ۹۷ء اور ۹۸ء کے دو سال فضیلت کے مقالہ کی تیاری میں گزرے۔ اس مشغولیت کی وجہ سے بھی میں اس کام کے لئے فارغ نہ ہو سکا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ۹۹ء بھی گزر گیا۔ اور ۲۰۰۰ء پوری تابانی کے ساتھ سایہ فگن ہوا۔ اور ہر طرف نئی صدی کے زعم میں ایک گہما گہمی نظر آنے لگی، اسی اثناء میں تعطیلات گرما کا زمانہ آیا۔ پہلے سے ارادہ تھا کہ گرمی کی چھٹی اپنے تحقیقی کام کے سلسلہ میں وسطی اور شمالی ہند کی اہم لائبریریوں سے استفادہ میں گزارنا ہے۔ بالخصوص خدا بخش لائبریری پٹنہ، رضا لائبریری رامپور، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ اور نیشنل آرکائیوز سمیت دہلی کی دیگر لائبریریاں نیز دالعلوم دیوبند کا کتب خانہ اور مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی کا کتب خانہ اس فہرست میں شامل تھا۔ خیال تھا کہ اکثر کتابیں میں نے دیکھ ہی لی ہیں اور خود لکھنؤ میں اس موضوع پر کافی ذخیرہ موجود ہے۔ (ندوہ کے کتب خانہ کے علاوہ لکھنؤ کی اہم لائبریریوں میں جا کر میں نے اس موضوع سے متعلق کتابوں کی ایک فہرست تیار کر لی تھی تاکہ لکھنؤ سے باہر انہی کتابوں کی ورق گردانی میں وقت ضائع نہ ہو) لہذا جہاں کوئی نئی کتاب ملے گی اس سے نئی معلومات جمع کرتے ہوئے گزر جاؤں گا مگر میرا یہ خیال غلط ہی نہیں بلکہ ایک فریب تھا۔ یہ میری خوش فہمی تھی اور شاید مجھ جیسے میدان تحقیق و تصنیف کے نو وارد اپنی ذرا سی محنت کی وجہ سے خوش فہمی میں مبتلا ہوتے ہوں۔ پٹنہ ہی میں جہاں سب سے پہلے جانا ہوا تھا مجھے اس موضوع پر اتنا نیا مواد ہاتھ آیا کہ پورا مہینہ صرف پٹنہ کے لئے بھی ناکافی ثابت ہوا۔ اور میں نے پوری بصیرت کے ساتھ تہیہ کر لیا کہ اب بالکل جلدی نہیں کرنا ہے۔ اور اللہ کا

شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے صبر کی توفیق دی، یہیں سے میرے اندر یہ خیال پیدا ہوا۔ اور روز بروز اس یقین میں اضافہ ہوتا گیا کہ یہ کام ایک کتاب کا نہیں، بلکہ اس کے لئے کئی کتابوں کی ضرورت ہے پھر میں نے اس کی اس طرح تقسیم کی، یہ ایک سلسلہ ہے جس کا مرکزی عنوان ہے:

''برصغیر کی آزادی میں علماء کا کردار''

اسکی چار جلدیں ہوں گی یا اس سلسلہ کے تحت چار مستقل کتابیں ہوں گی:

پہلی جلد: جنگ آزادی اٹھارہ سوستاون سے پہلے علماء نے حصول آزادی کے لئے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں ان کی تفصیلات پر مشتمل ہوگی۔

دوسری جلد: اٹھارہ سوستاون کی جنگ میں علماء کے کردار کے ساتھ مخصوص ہوگی۔

تیسری جلد: اٹھارہ سوستاون کے بعد سے لے کر تحریک شیخ الہند تک محیط ہوگی اسمیں تحریک مجاہدین کے بقیہ حالات، مجاہدین ''حر'' (۱) کے کارناموں اور اس دوران ہونے والی تمام سرگرمیوں کا جائزہ لینے کے ساتھ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی اور ان کی تحریک کا تحریک آزادی میں جو زبردست کردار ہے اس کا ذکر ہوگا۔

چوتھی جلد: بیسویں صدی عیسوی میں جب تحریک آزادی نے نئے دور کا آغاز کیا اور ہر طرف سے جو علماء اس میدان میں کود پڑے اسمیں ان کا مفصل تذکرہ ہوگا، مکانی وسعت کے پیش نظر شاید یہ جلد پھر دو حصوں پر مشتمل ہوگی اور اس طرح یہ کام کل پانچ جلدوں میں انشاءاللہ مکمل ہوگا۔

زیرنظر کتاب اسی سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ محقق کے لئے ضروری ہے کہ پہلے سے کوئی بات اس نے طے نہ کی ہو بلکہ تحقیق کی روشنی میں جو نتائج سامنے آئیں ان کو بے کم وکاست بیان کرے، ماضی کی صحیح تصویر پیش کرنا مورخ کا فرض ہوتا ہے اس لئے اس کو

(۱) سلسلہ راشدیہ کے مشہور بزرگ حضرت سید صبغۃ اللہ شاہ اول نے سندھ میں سکھوں کی دست درازیوں سے مقابلہ کے لئے ''حر'' کے نام سے ایک تحریک کی بنیاد رکھی تھی جس نے حضرت سید احمد شہید کے ساتھ پورا تعاون کیا، بعد میں حروں نے تحریک آزادی میں ناقابل فراموش کارنامے انجام دیئے

نقد و تبصرہ سے بھی کام لینا پڑتا ہے میں نے اپنی عمر اور سطح کا لحاظ کئے بغیر اس ذمہ داری سے بھی عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی ہے، نیز علمی امانت سمجھتے ہوئے بعض مشہور مورخین کے تسامحات کی نشاندہی سے بھی دریغ نہیں کیا۔

تحدیث نعمت کے طور پر عرض کرنے میں کوئی حرج نہیں کہ موضوع سے متعلق مجھے اردو، فارسی، عربی اور انگریزی میں کسی نئی بات کا پتہ چلا خواہ وہ مطبوعہ ہو یا مخطوطہ کتب خانوں میں محفوظ ہو یا مخصوص افراد کے پاس موجود ہو یا کہیں سے بھی معلومات حاصل ہونے کی امید ہو میں نے وہاں تک رسائی کی پوری کوشش کی، بہت سی جگہوں پر خود پہنچا اور جہاں پہنچنا سردست مشکل تھا خطوط لکھ کر معلومات حاصل کئے۔ بسا اوقات ایک ایک واقعہ کی تحقیق اور ایک ایک جزئیہ کی تصحیح میں مہینوں انتظار کرنا پڑا مگر ہمت نے ساتھ نہیں چھوڑا اور نہ طلب وجستجو کی آنچ مدھم ہونے پائی۔ ”و أن ليس للإنسان إلا ما سعى و أن سعيه سوف يرى “(۱) کا بارہا عملی تجربہ ہوا اور میرا رُواں رُواں بارگاہ ایزدی میں سربسجود۔

اس کتاب کی تصنیف میں بہت سے لوگوں سے مدد ملی بالخصوص جناب مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی (جن کی علمی تحقیقات نے برصغیر میں اپنا ایک وزن اور مقام بنا لیا ہے) ان سے بعض قیمتی اشارات ملے اور نادر معلومات ہاتھ آئیں، مولانا نے بڑی فراخ دلی کے ساتھ اپنے ذخیرہ سے استفادہ کا موقع دیا، جناب محمد راشد شیخ صاحب کراچی (مصنف تذکرۂ خطاطین) سے بھی بیش قیمت مدد ملی، جن کتابوں کی فراہمی ہندوستان میں دشوار ہو رہی تھی انہوں نے پاکستان سے فراہم کر کے روانہ کیں نیز بعض سندھی اقتباسات کا ترجمہ کر کے بھیجا۔ اسی طرح جناب سید خورشید مصطفیٰ رضوی (۲) (جو اپنی تحقیقی کتابوں کی وجہ سے ہندو پاک میں کافی شہرت رکھتے ہیں) سے بھی برابر

---

(۱) سورہ نجم (۳۹-۴۰)، یعنی انسان کے لئے وہی کچھ ہے جس کی وہ کوشش کرے اور اس کی کوشش عنقریب دیکھی جائے گی۔

(۲) افسوس صد افسوس ان سطور کے لکھنے کے بعد ۳۱ر جولائی ۲۰۰۲ء کو رضوی صاحب اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ مرحوم اس کتاب پر مقدمہ لکھنے کے بجا طور پر مستحق تھے اور انہوں نے آمادگی بھی ظاہر کی تھی۔ اللہ ان کو غریق رحمت کرے۔

رابطہ رہا، مولانا کاندھلوی اور رضوی صاحب کی تشویق اور ہمت افزائی سے سمند تحقیق کو تازیانہ لگتا رہا اور اس کو غذا ملتی رہی۔

کتب خانوں میں میں نے ندوۃ العلماء لکھنؤ کے کتب خانہ علامہ شبلی سے سب سے زیادہ استفادہ کیا، دیگر اہم کتب خانوں میں خدا بخش لائبریری پٹنہ، گورنمنٹ اردو لائبریری پٹنہ، رضا لائبریری رامپور، مولانا آزادی لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ اور مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی کی ذاتی لائبریری کی کچھ قلمی اور کچھ نادر مطبوعات سے استفادہ کیا۔ نیز لکھنؤ کی بعض اہم لائبریریوں سے بھی فائدہ اٹھایا گیا۔ مثلاً ٹیگور لائبریری لکھنؤ یونیورسٹی، امیر الدولہ پبلک لائبریری لکھنؤ، گنگا پرساد میموریل لائبریری لکھنؤ، دار الکتب جمعیۃ الاصلاح دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ میں ان تمام لائبریریوں کے ذمہ داروں کا انتہائی مشکور ہوں جنہوں نے میرا بھرپور تعاون کیا اور سہولتیں بہم پہنچائیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کتاب کو شرف قبولیت سے نوازے اور اس سلسلہ کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے اور جن مقاصد کے تحت یہ کتاب لکھی گئی ہے وہ مقاصد حاصل ہوں۔

میں ظلمت شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس میرا شعلہ بار ہوگا

ان شاء اللہ. وما توفیقی إلا باللہ علیه توکلت وإلیه انیب.

فیصل احمد بھٹکلی ندوی
ندوۃ العلماء لکھنؤ

۲۸ر جمادی الاولیٰ ۱۴۲۲ھ
مطابق ۱۵ر اگست ۲۰۰۱ء

سخن ہائے گفتنی

اسلام انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اسلام کے نظام زندگی میں دینی معاملات اور دنیوی معاملات میں کوئی تفریق نہیں، اسمیں عقائد، عبادات معاملات، اخلاقیات، اقتصادیات اور سیاسیات سب ایک دوسرے سے اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ کسی کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔

معاشرہ میں علماء کا مقام

اسلامی تعلیمات کے ماہرین علماء کرام معاشرہ کے جسم میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کے بغیر اسلامی معاشرہ کی چول صحیح نہیں بیٹھ سکتی، وہ زندگی کے ہر شعبہ میں رہنمائی کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں ان کو کسی شعبہ سے جدا نہیں کیا جا سکتا، ان کی شرکت حقیقی کامیابی کی ضمانت ہے۔

ہندوستانی معاشرہ پر مسلمانوں کے اثرات

اسلام کی آمد سے پہلے ہندوستان کفر وشرک کے ساتھ بہت سی اجتماعی خرابیوں کا شکار تھا، اسلام کے عقیدۂ توحید اور نظریۂ مساوات نے یہاں کے معاشرہ پر گہرا اثر ڈالا۔ ہندوستانی معاشرہ میں احترام انسانیت اور انسانی مساوات کا تصور اسلام ہی کی دین ہے۔

آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے اس حقیقت کا ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے :

> ''شمال مغرب سے آنے والے حملہ آوروں اور اسلام کی آمد ہندوستان کی تاریخ میں کافی اہمیت رکھتی ہے۔ اس نے ان خرابیوں کو جو ہندو

سماج میں پیدا ہوگئی تھیں۔ یعنی ذاتوں کی تفریق چھوت چھات اور انتہا درجہ کی خلوت پسندی کو بالکل آشکارا کر دیا۔ اسلام کے اخوت کے نظریے اور مسلمانوں کی عملی مساوات نے ہندوؤں کے ذہن پر بہت گہرا اثر ڈالا، خصوصاً وہ لوگ جو ہندو سماج میں برابری کے حقوق سے محروم تھے اس سے بہت متاثر ہوئے۔" (۱)

ملک کی تعمیر و ترقی میں مسلمانوں کا کردار

مسلمان اس ملک کے عقیدہ اور سماج ہی پر اثر انداز نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے اس کی تہذیب کو بھی متاثر کیا اور طرز زندگی میں ایک انقلاب برپا کیا، اور اس سے بھی بڑھ کر متمدن دنیا سے اس کو جوڑ دیا۔ نیز اس کی زبان و ادب پر بھی دیرپا اثر ڈالا۔ سابق صدر کانگریس ڈاکٹر پٹابی سیتا رمیہ نے اس کا صاف لفظوں میں اعتراف کیا ہے انہوں نے کانگریس کے اجلاس جے پور میں اپنے خطبہ صدارت میں کہا تھا :

"مسلمانوں نے ہمارے کلچر کو مالا مال کیا ہے اور ہمارے نظم و نسق کو مستحکم اور مضبوط بنایا، نیز وہ ملک کے دور دراز حصوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے میں کامیاب ہوئے، اس ملک کے ادب اور اجتماعی زندگی میں ان کی چھاپ بہت گہری دکھائی دیتی ہے۔" (۲)

غرض مسلمانوں نے اس ملک کی ترقی و خوشحالی کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ اور اپنی پوری طاقت صرف کی، اس مالی کی طرح جو شبانہ روز چمن بندی میں لگا رہتا ہے۔ اور اس کے لئے رات دن ایک کرتا ہے اس امید میں کہ اس کی کوشش عنقریب رنگ لائے گی۔ اور پھر جب اس کی محنت بارآور ہوتی ہے تو وہ ٹھنڈی سانس لیتا ہے۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے الفاظ میں "مسلمان جس حیثیت سے بھی اس ملک میں آئے انہوں نے اسے اپنا وطن سمجھا، ان کا عقیدہ تھا کہ زمین خدا کی ہے وہی جس کو چاہتا ہے اپنی زمین کا وارث و نگہبان بنا دیتا ہے، وہ اپنے کو خدا کی طرف سے اس زمین کا

(۱) تلاش ہند۔ حصہ اول ۵۲۵-۵۲۶

(۲) دیکھئے ہندوستانی مسلمان - ایک تاریخی جائزہ ص ۴۴

منتظم اور اس کی مخلوق کا خادم سمجھتے تھے اور اس پر عقیدہ رکھتے تھے کہ

ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

اس لئے مسلمانوں نے ہمیشہ اس ملک کو اپنا وطن اپنا گھر اور اپنی ابدی قیام گاہ سمجھا، جس سے وہ کبھی اپنی نظریں پھیر نہ سکتے تھے، چنانچہ اس ملک کی خدمت کے لئے انہوں نے اپنی بہترین صلاحیتیں اور خداداد قابلیت و ذہانت صرف کر دی، ان کا خیال تھا کہ وہ اس ملک کی دولت میں جو بھی اضافہ کریں گے وہ گویا خود ان کی اپنی ثروت میں اضافہ ہوگا کیونکہ ان کا مستقبل اسی سرزمین سے وابستہ ہے۔ اس تصور کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ مسلمانان ہند اس ملک کو جس نظر سے دیکھتے تھے وہ انگریزوں اور دوسری استعماری طاقتوں سے بالکل مختلف تھی، یورپ کی استعماری طاقتوں کا مقصد صرف یہاں کی دولت کھینچنا تھا، ان کے نزدیک دراصل اس ملک کی حیثیت ایک مستعار دودھاری گائے کی سی تھی جو ان کے پاس چند دن رہ کر واپس جانے والی تھی اس لئے وہ اس کو اچھی طرح دوہ لینا چاہتے تھے، اس ملک کی ترقی و خوشحالی میں مسلمانوں نے جس دلچسپی سے کام لیا اس کا حقیقی راز یہی ہے"۔ (۱)

تحریک آزادی میں علماء کی قیادت

چونکہ مسلمانوں نے اپنے خون جگر سے اس کی سینچائی کی تھی اس لئے قدرتی طور پر انہوں نے اس کی حفاظت کے لئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ جب فرنگی ہندوستان آئے اور ملک پر قبضہ کرنا شروع کیا تو مسلمان ہی یہاں کے حاکم تھے۔ اور فرنگیوں نے ملک انہیں سے چھینا تھا اس لئے بھی فطری طور پر ان کے مقابلہ میں مسلمانوں کو آگے ہونا چاہئے تھا اور پھر اسلام کسی بھی طرح غلام رہنے کی اجازت نہیں دیتا اس لئے علماء سامراجیوں سے مقابلہ ضروری سمجھتے تھے۔ اس بناء پر تحریک آزادی کے ہر دور میں انہوں نے مسلم عوام کی پوری قیادت کی اور ایک مخلص اور سمجھدار رہنما کا پارٹ ادا کیا۔

---

(۱) ہندوستانی مسلمان ایک تاریخی جائزہ صفحہ ۲۰-۲۱ ہندوستان کی تہذیب و تمدن پر مسلمانوں نے جو اثر ڈالا اور اس کی تعمیر و ترقی میں انہوں نے جو حصہ لیا اس کے سرسری جائزہ کے لئے ملاحظہ ہو کتاب مذکور۔ صفحہ ۱۹ تا ۳۹۔

علماء کے استعمار مخالف موقف اور اس کے خلاف ان کی مسلسل جدو جہد نے فرنگیوں کو کبھی چین سے حکومت کرنے نہیں دیا۔ مسٹر ہمفرے جو برطانوی جاسوس تھا اور نو آبادیاتی علاقوں کی وزارت میں ملازم تھا اپنی بے اطمینانی کے اسباب بتاتے ہوئے لکھتا ہے کہ

''مسلمان علماء بھی ہماری تشویش کا باعث تھے...... یہ لوگ اس قدر متعصب تھے کہ اپنے موقف سے ایک انچ پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھے۔ بادشاہ اور امراء سمیت تمام افراد ان کے آگے چھوٹے تھے۔'' (۱)

برادران وطن کی انگریزوں کے ساتھ وفاداری

اس کے برخلاف انگریزوں کو ہندوؤں سے کبھی خطرہ محسوس نہیں ہوا بلکہ وہ ان کو اپنا حامی اور خیر خواہ سمجھتے رہے اور ان کے ساتھ مراعات کا سلوک کرتے رہے جب کہ مسلمانوں کو انگریزوں نے ہمیشہ اپنا مخالف سمجھا اور ایک دور میں تو مسلمان ہونا انگریزوں کا غدار ہونے کے مرادف سمجھا جاتا تھا، اس بناء پر انگریزوں کی آویزش مسلمانوں کے ساتھ مخصوص تھی۔ لارڈ ایلن برو گورنر جنرل ۱۸۴۲ء میں اس پالیسی کا آغاز کر چکا تھا کہ مسلمانوں کو ہرگز ابھرنے نہ دیا جائے کمپنی کے اس حاکم اعلیٰ نے کابل وغزنی کے معرکہ کے بعد ڈیوک آف ولنگٹن کو لکھا تھا:

''مجھے اچھی طرح ثابت ہو گیا کہ وہ خاص لوگ جن کی گزر ہمارے ہی ٹکڑوں پر ہے وہ دل سے ہمارے بدخواہ تھے، بخلاف اس کے ہندو ہماری فتح پر اظہار مسرت کر رہے ہیں، جب ہمیں ان مسلمانوں کی دشمنی کا یقین کام ہے جن کی تعداد ۱۰/۱ ہے تو پھر کیوں نہ ہم اس قوم کا

(۱) ہمفرے کے اعترافات صفحہ ۱۲۔ یہ کتاب انجمن نوجوانان پاکستان، گارڈن ٹاون، لاہور سے شائع ہوئی، اس پر انگریزی میں اس طرح لکھا ہے۔ Colonization Idea Mr. Humphry's Memories, The English Spy in Islamic Contries اور مسٹر ہمفرے کے بارے میں ناشر نے ذکر کیا ہے کہ وہ برطانوی جاسوس تھا اور نو آبادیاتی علاقوں کی وزارت میں ملازم تھا، ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانچ پڑتال کے سلسلہ میں اچھی کارکردگی نے اسے وزارت خزانہ میں ایک اچھے عہدہ پر فائز کیا۔

ساتھ دیں جن کی تعداد ۱۰/۹ ہے جو ہماری وفادار ہے۔'' (۱)

پھر ۱۸۴۳ء میں لکھتا ہے :

''میں اس عقیدہ کے خلاف کیسے آنکھیں بند کرلوں کہ مسلمانوں کی یہ نسل دیوانہ وار ہماری دشمن ہے اور اس لئے ہماری صحیح پالیسی یہ ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ مہربانی کی جائے۔'' (۲)

ہر دور میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے سلسلہ میں انگریزوں کا یہی خیال رہا۔ سر ہنری ہملٹن ٹامس (Henry Hemilton Thoms) ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے اس سے ہندو قوم کی فطرت کا بھی پتہ چلتا ہے :

''میں نے پہلے بیان کیا ہے کہ غدر ۱۸۵۷ء کے بانی اور اصل محرک ہندو نہ تھے اور اب میں یہ دکھانے کی کوشش کروں گا کہ یہ غدر مسلمانوں کی سازش کا نتیجہ تھا، ہندو اگر اپنی مرضی اور خواہشات تک محدود ہوں تو وہ کسی ایسی سازش میں شرکت نہ کر سکتے تھے نہ کرنا چاہتے تھے۔'' (۳)

اس کے بعد بھی یہی صورتحال رہی، سر ولیم ہنٹر نے کلکتہ کے ایک فارسی اخبار دوربین مورخہ ۱۶ر جولائی ۱۸۶۹ء کے حوالہ سے لکھا ہے :

''وقت ایسا آگیا ہے کہ حکومت اپنے گزٹ میں اس بات کا خاص طور پر اعلان کرتی ہے کہ مسلمانوں کو سرکاری نوکری نہیں دی جائے گی۔ ابھی ابھی سندربن کے کمشنر کے دفتر میں چند اسامیاں خالی ہوئی تھیں اس افسر نے سرکاری گزٹ میں اشتہار دیتے ہوئے صاف صاف لکھ

---

(۱) دیکھئے سیاست ملیہ ص ۲۹، از محمد امین زبیری

(۲) ایضاً

(۳) دیکھئے ہندوستانی مسلمان ایک تاریخی جائزہ صفحہ ۱۴۷-۱۴۸

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہندو من حیث القوم (تحریک آزادی کے آخری دور کو مستثنیٰ کر کے) ہمیشہ انگریزوں کے وفادار اور مددگار رہے مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ جھانسی کی رانی، نانا صاحب تانتیا ٹوپی امر سنگھ کنور سنگھ اور ان جیسے بعض افراد نے جنگ آزادی میں ناقابل فراموش کارنامے انجام دیئے، جیسے مسلمانوں میں میر جعفر اور میر صادق جیسے غدار ہوتے رہے، مگر مسلمان من حیث القوم ہمیشہ انگریزوں سے سخت بیزار اور ان سے برسرپیکار رہے۔

دیا تھا کہ یہ ملازمتیں سوائے ہندوؤں کے اور کسی کو نہیں ملیں گی۔"(۱)

غرض ہندوؤں کی وفاداری کے نتیجہ میں انگریزوں کی ان کی ساتھ ہمدردیاں برابر جاری رہیں۔

جنگ آزادی میں آر ایس ایس کا منفی کردار

بیسویں صدی عیسوی میں برادران وطن بھی میدان میں آئے اور مسلمانوں کے شانہ بشانہ جنگ آزادی میں حصہ لیا وہ کب تک الگ رہتے انگریز کو ایک دن بوریا سمیٹ کر جانا ہی تھا اور مسلمانوں کا دور ختم ہو چکا تھا اس لئے سیاسی مصلحت اور آئندہ کی متحدہ قومی جمہوری حکومت کے پیش نظر وہ ضروری سمجھتے تھے کہ جنگ آزادی تمام ہندوستانی قوموں کے اتحاد و اشتراک اور بالخصوص ہندوؤں کو ساتھ لے کر لڑی جائے، چنانچہ اس طرح کارواں آگے بڑھتا رہا۔ اس عرصہ میں اکا دکا واقعات کو چھوڑ کر کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا جس سے فرقہ پرستی کی بو آئے۔ تیسری دہائی میں اس کے آثار ظاہر ہونے شروع ہوئے یہاں تک کہ ۲۷ ستمبر ۱۹۲۵ء میں آر ایس ایس کا قیام عمل میں آیا(۲) اور اس نے بہت تیزی سے متحدہ ہندوستان کی صاف فضا کو فرقہ پرستی کی زہریلی گیس سے آلودہ کیا۔ اس کے بانی ڈاکٹر ہیڈ گیوار تھے، ڈاکٹر دامودر ساورکر اور ڈاکٹر مونجے کے خیالات پر اس کی بنیاد رکھی گئی تھی۔

آر ایس ایس کے قیام کے ساتھ اسکے تین مقاصد ظاہر ہوئے :۱- مسلمانوں سے نفرت اور ان کی تحقیر۔ ۲- انگریز حکومت سے تعاون۔ ۳- ہندوستان میں اپنی ڈکٹیٹر شپ یعنی مذہبی بنیادوں پر اپنی مطلق العنان حکومت قائم کرنا۔(۳)

آر ایس ایس کے دوسرے سرسنگھ چالک یعنی قائد مطلق اور ڈاکٹر ہیڈ گیوار کے جانشین گرو گولوالکر تھے وہ اپنی کتاب "Bunch of Thought" میں لکھتے ہیں کہ علاقائی (ہندوستانی) قومیت کے تصور نے تحریک آزادی کو صرف برطانیہ دشمن تحریک بنا

(۱) ہمارے ہندوستانی مسلمان۔ ص ۲۴۲-۲۴۳
(۲) آر ایس ایس کے قیام کے پس منظر اور اس کی تدریجی ترقی کے لئے ملاحظہ ہو حارث بشیر، آر ایس ایس : ایک مطالعہ ص ۱۱ تا ۲۴۔
(۳) آر۔ ایس۔ ایس۔ تعلیمات و مقاصد۔ ص ۸۹، از صلاح الدین عثمان

دیا تھا، برطانیہ کی مخالفت کو حب وطن اور وطن پرستی سمجھ لیا گیا تھا، یہ رجعت پسند نظریہ تھا اس نے تحریک آزادی پر تباہ کن اثرات ڈالے لیڈروں پر بھی اور عوام پر بھی۔(۱)

۱۹۳۰ء میں گاندھی جی نے مختلف طرح کے سرکاری قوانین کو توڑنے کے لئے عوامی ستیہ گرہ کا اعلان کیا جس کو بڑی عوامی تائید حاصل ہوئی۔ مگر آر ایس ایس کے بانی ڈاکٹر ہیڈ گیوار نے ہر جگہ اطلاع بھجوائی کہ سنگھ اس ستیہ گرہ میں حصہ نہیں لے گا لیکن جس کو اس میں حصہ لینا ہو، وہ انفرادی حیثیت سے ایسا کر سکتا ہے۔(۲)

یہ سنگھی، تحریک عدم تعاون میں شامل ہو کر جیل بھی گئے تو اس لئے کہ قوم کو منہ دکھانے کے قابل رہیں نہ کہ اس لئے کہ وہ تحریک کے حامی تھے بلکہ وہ اس کے سخت مخالف تھے۔ ڈاکٹر ہیڈ گیوار کے سوانح نگار سی پی بھیشکر نے صاف لکھا ہے:

> ”ڈاکٹر ہیڈ گیوار کو یہ پسند نہ تھا کہ آئندہ زمانے میں اگر کوئی ان سے دریافت کرے کہ جب پوری قوم انگریزوں کی مخالفت میں جیل خانوں میں مظالم برداشت کر رہی تھی تو آپ کہاں پوشیدہ تھے تو تسلی بخش جواب نہ دینے کی وجہ سے انہیں سر جھکانا پڑے۔“(۳)

مختار انیس نے اپنی کتاب میں جنگ آزادی میں سنگھ کا کردار کے عنوان کے تحت آر ایس ایس کے کردار کا تحقیقی جائزہ لیا ہے۔ انہوں نے نیشنل آرکائیوز کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جنگ آزادی کے پورے دور میں سنگھ غیر جانب دار بھی نہیں تھے۔ انگریزوں کے ہراول دستے کے روپ میں کام کرتے تھے۔ ہندو مسلم فساد بھڑکانا اور کانگریس کے خلاف اپنے کارکنوں کو لام بند کرنا ہی ان کا کردار تھا۔ پورا ملک جیلوں میں بند تھا لیکن یہ لوگ انگریزوں کی دلالی کے لئے آزاد گھوم رہے تھے۔ سنگھ کے بڑھاوے کے لئے انگریزی سرکاران کی بھرپور مالی امداد کر رہی تھی۔(۴)

جنگ آزادی کے ایک رہنما راج نرائن جی، گول والکر کو انگریزوں کا خفیہ ایجنٹ اور

---

(۱) آر۔ ایس۔ ایس۔ تعلیمات و مقاصد۔ ص ۹۷

(۲) آر ایس ایس ایک مطالعہ ص ۱۰۶۔

(۳) دیکھئے آر ایس ایس۔ تعلیمات و مقاصد ص ۱۱۰، صلاح الدین عثمان نے اپنی اس کتاب میں تحریک آزادی میں آر ایس ایس کے منفی کردار کا حقائق کی روشنی میں تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ ص ۱۰۵ تا ۱۲۸، نیز دیکھئے ص ۹۱ تا ۹۴۔

(۴) راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ۔ ایک مطالعہ، ص ۲۰۔ نیز دیکھئے ص ۲۹-۳۳

ان کی مخبری کرنے والا اوران سے اعزازی رقم پانے والا بتاتے تھے۔(۱)

ڈاکٹر دامودر (ویر) ساور کر جو ہندتو کے بانی تھے اور آر ایس ایس انہی کے خیالات کی تنظیمی شکل ہے وہ انگریزوں کے بہت بڑے حامی اور وفادار تھے۔ ۴ رمئی ۲۰۰۲ء کو وزیر داخلہ لال کرشن اڈوانی جزائر انڈومان ونکوبار کے دورے پر گئے تھے وہاں انہیں ایک سیاسی تقریب میں حصہ لینا تھا جس کی نوعیت یہ تھی کہ پورٹ بلیئر کے ہوائی اڈہ کا نام تبدیل کر کے ساور کر کے نام پر رکھنا تھا، اس تقریب میں مسٹر اڈوانی نے بڑا زور دے کر ویر ساور کر کو عظیم مجاہد آزادی اور معمار وطن کی حیثیت سے پیش کیا اس پر انگریزی اخبارات میں خوب لے دے ہوئی، عجیب اتفاق کہ ایک طرف جب وزیر داخلہ (اور موجودہ نائب وزیر اعظم بھی) ایل کے اڈوانی ساور کر کو جنگ آزادی کا ایک عظیم ہیرو تسلیم کرنے پر زور دے رہے تھے اور یہ ثابت کررہے تھے کہ ان کا شمار عظیم معماران وطن میں ہوتا ہے وہ انہیں نئی نسل کے لئے ایک قابل تقلید نمونہ بتارہے تھے اور دوسری طرف ٹائمز آف انڈیا میں ٹھیک اسی روز جب وہ جزائر انڈومان کے دورے پر پورٹ بلیئر پہنچے تھے ایک رپورٹ شائع ہوئی تھی جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ ساور کر نے انگریزوں سے رحم کی بھیک مانگی تھی اخبار مذکور کے خصوصی نامہ نگار اکھنے مکل نے اپنی اس رپورٹ میں یہ بتایا ہے کہ بھگت سنگھ، سکھ دیو اور اشفاق اللہ خاں نے جان دینا تو گوارہ کرلیا مگر انگریز حاکم سے رحم کی بھیک نہیں مانگی لیکن ہندتو کے بانی نے انگریز حاکم سے رحم کی اپیل کی تھی۔ جب انہیں سیلولر جیل میں قید کیا گیا تو انہوں نے انگریز حاکم کو ایک تحریری مراسلہ بھیجا تھا جس میں انہیں معاف کردینے کی درخواست کی گئی تھی انہوں نے یہ مراسلہ ۱۴ رنومبر ۱۹۱۳ء کو لکھا تھا نامہ نگار کے بقول ان کا یہ خط Penal Settlement in Andamans نام کی ایک کتاب میں چھپا ہے گویا یہ ایک سرکاری دستاویز ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ویر ساور کر نے اس سے پہلے ۱۹۱۱ میں بھی اسی طرح کی رحم کی ایک اپیل کی تھی، ساور کر نے انگریز حاکم کو یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ وہ سرکار انگلشیہ کے وفاداروں میں سے ہیں، ان کو قید میں رکھنا سرکار کے لئے نقصان دہ ہے۔ اسی طرح انہوں نے اس بات کا یقین بھی دلایا کہ اگر انہیں رہا کردیا گیا

---

(۱) راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ- ایک مطالعہ، ص ۲۱

تو وہ سرکار انگلشیہ کی ہر طرح کی خدمت بجالانے کے لئے تیار ہیں، انہوں نے اس اپیل میں اپنے بارے میں کہا کہ وہ سرکار انگلشیہ کے Prodigal Son ہیں، نامہ نگار نے مذکورہ کتاب سے ساورکر کی Mercy appeal (رحم کی درخواست) کی جو عبارت نقل کی ہے اس کا مفہوم اس طرح ہے :

"............اگر حکومت از راہ عنایت مجھے رہا کر دیتی ہے تو میں اسے یقین دلاتا ہوں کہ میں سرکار انگلشیہ کے ساتھ وفاداری نبھاؤں گا اور اس نے جس دستوری عمل کا آغاز کیا ہے اس کی پرزور وکالت کروں گا اور اگر میں جیل میں رہا تو ان ہزاروں گھروں میں صف ماتم بچھی رہے گی جو سرکار انگلشیہ کے وفادار ہیں، میرا جیل کے اندر رہنا ان میں مایوسی پیدا کرے گا اور اگر مجھے رہا کر دیا گیا تو ان گھروں میں خوشیاں لوٹ آئیں گی، وہ سرکار کے ممنون کرم ہوں گے، میں یہ بھی باور کرا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میری رہائی ان ہزاروں نوجوانوں کے لئے بھی باعث مسرت ہوگی جو مجھ سے عقیدت رکھتے ہیں اور مجھے اپنا لیڈر اور رہنما خیال کرتے ہیں، میری طرف دیکھتے ہیں، میں یقین دلاتا ہوں کہ میری رہائی ان ہزاروں گم کردہ راہ نوجوانوں کو راہ راست پر لانے میں بھی مفید و معاون ثابت ہوگی، میں سرکار کی ہر وہ خدمت بجالانے کے لئے تیار ہوں جس کا وہ مجھے حکم دے گی، وہ جیسا چاہے گی میں ویسا ہی کروں گا، مجھے جیل میں رکھ کر کچھ بھی حاصل نہیں کیا جا سکتا، میں یقین دلاتا ہوں کہ اس کے بعد میرا طرز عمل ویسا ہی ہوگا جیسا سرکار چاہے گی، اس لئے سرکار کو مجھ پر ترس کھانا چاہئے، آخر ہم جیسے بے دریغ حمایت کرنے والے بیٹے کہاں جائیں گے، وہ سرکار انگلشیہ ہی سے تو لو لگائیں گے کیونکہ وہ انکے لئے سرپرست و نگہبان ہے۔" (۱)

اسی طرح ہندوستان ٹائمز نے بھی ۷ رمئی کے شمارہ میں ساورکر کے بارے میں حقائق سامنے لا کر دنیا کو آگاہ کیا تھا۔

ساورکر نے بعد میں پورے فرمانبردار اور وفادار بیٹے کا ثبوت دیا جیسا کہ انہوں

(۱) بشکریہ سہ روزہ "دعوت" نئی دہلی، شمارہ : ۱۰ رمئی ۲۰۰۲ء

نے یقین دلایا تھا چنانچہ ہندوستان چھوڑ وتحریک (۱۹۴۲ء) کے دوران انہوں نے انگریزوں کی طرف داری کی جس وقت پورا ملک انگریزوں کے خلاف جنگ میں مصروف تھا ساورکر نے انگریزوں کے ساتھ تعاون کیا۔ ''ہندوراشٹر درشن'' میں انہوں نے اپنے اس اقدام کو درست قرار دیا ہے۔ انڈین نیشنل کانگریس پر پابندی لگائے جانے پر انہوں نے برطانوی حکومت کا شکریہ ادا کیا تھا، ساورکر کا جمہوریت میں نہیں ڈکٹیٹر شپ میں اعتقاد تھا وہ ایڈولف ہٹلر کے مداح تھے۔ ۱۹۴۰ء میں مدوارئی میں ساورکر نے کہا تھا چونکہ ایک نازی کی حیثیت سے ہٹلر دنیا سے گیا تھا اس لئے اس کو ننگ بشر ماننے کی کوئی وجہ نہیں۔ (۱)

آزادی تک آر ایس ایس کا یہی کردار رہا اور آزادی کے بعد بھی اس نے ملک کی تعمیر و ترقی میں کوئی حصہ نہیں لیا بلکہ الٹے ہر طرح سے ملک کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی جس کا آغاز جنوری ۱۹۴۸ء میں بابائے ہندوستان مہاتما گاندھی کے قتل سے ہوا جو آخری دور میں ہندوستان کی جنگ آزادی کے سب سے بڑے قائد اور رہنما سمجھے جاتے تھے۔ دنیا جانتی ہے کہ گاندھی جی کا قاتل ناتھورام گوڈسے آر ایس ایس سے تعلق

(۱) یہ معلومات ٹائمز آف انڈیا (دہلی ایڈیشن) مورخہ ۲۳ رمئی ۲۰۰۲ء میں شائع شدہ ایک مراسلہ سے ماخوذ ہیں جو یکتا (EKTA) نامی ایک شخص نے نیویارک سے ساورکر سے متعلق ۷ رمئی والے مضمون کی تائید و شکریہ میں بھیجا تھا آخیر میں مراسلہ نگار نے لکھا ہے لہذا ساورکر کو ایک قومی ہیرو کی حیثیت میں پیش کر کے وزیر داخلہ لال کرشن ایڈوانی نے جمہوریت کے خلاف زبردست جارحیت کا ارتکاب کیا ہے۔

مگر اس سب کے باوجود حکومت آج بھی ساورکر کو قومی ہیرو ثابت کرنے پر بضد ہے۔ کتاب پریس جانے ہی والی تھی کہ ۲۶ رفروری ۲۰۰۳ء کو اخباروں میں یہ خبر چھپی کہ کل پارلیمنٹ کے سنٹرل ہال میں ساورکر کی تصویر آویزاں کی جائے گی اور صدر جمہوریہ اے پی جے عبدالکلام (ابوالکلام) اس کی نقاب کشائی کریں گے۔ ممتاز تاریخ دانوں، مجاہدین آزادی سپریم کورٹ کے ایڈوکیٹ انل نوریاں اور تمام اپوزیشن پارٹیوں نے اس کی سخت مخالفت کی۔ سینئر تاریخ داں وپن چندر نے تاریخی حقائق کی بنیاد پر ساورکر پر ملک سے غداری، فرقہ پرستی کی وکالت اور بابائے قوم کے قتل کی سازش میں شامل ہونے کا الزام لگایا، انہوں نے کہا کہ ''حکومت کی جانب سے ایسے شخص کی عزت افزائی ہندوستان کی جنگ آزادی میں جان قربان کرنے والے شہیدوں کی توہین ہے''۔ اس پر بھی دوسرے دن تصویر کی نقاب کشائی ہوئی، اپوزیشن پارٹیوں نے احتجاج کیا اور اس تقریب سے غیر حاضر رہیں اور لوک سبھا میں زبردست ہنگامہ کیا مگر آج کی نام نہاد جمہوری حکومت کو ان جمہوری قدروں کی کوئی پروا نہیں۔ اللہ ہی حافظ ہے۔

رکھتا تھا۔ یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ ناتھورام گوڈسے آر ایس ایس کا ایک عام رکن ہی نہیں بلکہ اسکے بانی ڈاکٹر ہڈگیوار کا نہایت معتمد سمجھا جاتا تھا اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہڈگیوار نے آر ایس ایس کی توسیع کیلئے ۱۹۳۰ء میں مغربی مہاراشٹر کا دورہ کرکے نئی شاکھائیں قائم کی تھیں اس دورہ میں ناتھورام گوڈسے انکے ساتھ تھا۔(۱)

برادران وطن کی دیس مخالف سرگرمیاں

عمارت کی تعمیر میں جس کا سرمایہ لگا ہو، اس کا کوئی پتھر گر جائے تو اس کو تکلیف ہوگی، باغ کی سینچائی میں جس کا پسینہ بہا ہو وہ اگر اجڑ جائے یا اس کا کوئی درخت خشک ہو جائے تو اس کو دکھ ہوگا، چونکہ ملک کی تعمیر میں مسلمانوں کا خون لگا ہے اس لئے اسکا اجڑنا انہیں کسی طرح برداشت نہیں ہوسکتا، اسی بناء پر آج ہندوستان میں جتنی وطن مخالف سرگرمیاں جاری ہیں جن سے ملک کی دنیا بھر میں رسوائی ہوتی ہے(۲)۔امن و امان میں خلل پڑتا ہے اور معیشت تباہ ہوتی ہے خواہ فرقہ وارانہ فسادات کی شکل میں ہو جعلی نوٹوں کا مسئلہ ہو یا غیر قانونی اسلحہ کا معاملہ، ان سب معاملات میں برادران وطن کا ہاتھ واضح طور پر زیادہ نظر آتا ہے جس کا اظہار وقتاً فوقتاً خود غیر مسلم انصاف پسند دانشور اور ذمہ دار افراد کرتے رہتے ہیں گزشتہ سال اتر پردیش کے ڈائریکٹر جنرل آف پولس آر کے پنڈت نے راشٹریہ سہارا سے اپنی ایک ملاقات میں صاف کہا تھا کہ جعلی نوٹوں کے معاملہ میں اکثریتی فرقہ سے تعلق رکھنے والے کہیں زیادہ ملوث ہیں اس لئے آئی ایس آئی کے نام پر اقلیتی فرقہ کو بدنام کرنا بے ایمانی ہوگی۔(۳)

جہاں تک غیر قانونی اسلحہ کا تعلق ہے تو آئے دن اخبارات میں اس طرح کی خبریں شائع ہوتی ہیں کہ پولس نے فلاں جگہ چھاپہ مار کر ناجائز اسلحہ کا کارخانہ پکڑ لیا یا غیر قانونی اسلحہ کا ذخیرہ برآمد کیا، ان کے مالکان اور ملزمان میں اکثریتی فرقہ سے تعلق

---

(۱) دیکھئے آر ایس ایس: تعلیمات و مقاصد صفحہ ۱۴۰۔ اسی گاندھی جی کے قاتل کو وزیر اعظم اٹل بہاری باجپئی نے انڈین نیشنل آرمی کے لیڈروں کے ہم پلہ قرار دینے کی کوشش کی تھی۔

(۲) برلن میں واقع ایک بین الاقوامی غیر سرکاری ایجنسی "ٹرانسپرنسی انٹرنیشنل" کے حالیہ سروے کے مطابق ہندوستان دنیا کے سب سے زیادہ کرپٹ ملکوں میں سے ایک ہے (اس کی تفصیل کے لئے دیکھئے سہ روزہ دعوت نئی دہلی شمارہ ۱۳ ستمبر ۲۰۰۲ صفحہ ۱)

(۳) روزنامہ راشٹریہ سہارا، ۹ راگست ۲۰۰۱۔

رکھنے والوں کے نام نظر آتے ہیں۔(۱)

یہاں تک کہ پاکستان (جس کے نام پر ہندوستان میں مسلمانوں کا جینا دوبھر کر دیا گیا ہے) کے لئے جاسوسی کے الزام میں جن کو گرفتار کیا جاتا ہے ان میں بھی اسی فرقہ کے لوگ نکلتے ہیں۔(۲)

نہ رکنے والے فسادات جن سے کروڑوں کی املاک تباہ و برباد ہوتی ہیں، ملکی معیشت پر کتنے اثر انداز ہوتے ہیں اس کا اندازہ ہر شخص کر سکتا ہے۔ ۱۹۶۰ء میں احمد آباد میں بہت بڑا فساد ہوا تھا۔ ریاستی حکومت کے قائم کردہ جسٹس جگ موہن ریڈی کمیشن کی رپورٹ کے مطابق اس میں برباد شدہ املاک کی مالیت ۴،۲۳،۲۴،۰۶۵ روپئے تھی ساتھ ساتھ اسی کمیشن نے یہ انکشاف کیا تھا کہ اس ہولناک فساد کا ذمہ دار سنگھ سے متعلق ایک دہشت گرد تھا۔(۳)

بیچ کے تمام فسادات کو چھوڑ کر قریب آیئے ۵ر مارچ ۲۰۰۱ء کو دہلی میں اقوام متحدہ کے دفتر کے سامنے دو ہزار شیوسینکوں نے قرآن شریف کا نسخہ جلایا اس کے ردعمل میں ۱۴ر مارچ ۲۰۰۱ء کو جمعہ کے دن کانپور میں جو فساد ہوا اس میں پانچ سو کروڑ کی املاک تباہ ہوئیں۔(۴)

پھر گجرات کے حالیہ انسانیت سوز فسادات نے ملکی معیشت کی جو کمر توڑ کر رکھ دی ہے اس کا اعتراف خود وزیر خزانہ یشونت سنہا نے بھی کیا ہے، غیر ملکی سرمایہ کاروں نے یہاں بڑے پیمانہ پر سرمایہ کاری کی تھی اس وجہ سے عالمی برادری نے بھی گجرات کے فسادات پر اپنی گہری تشویش کا اظہار کیا تھا۔(۵)

---

(۱) مثلاً ۱۴ر اگست ۲۰۰۲ء کو مئوناتھ بھنجن میں ایک غیر قانونی اسلحہ کا کارخانہ پکڑا گیا جا کا سرغنہ رام پرکاش تھا۔ اور اسی طرح ۲۷ر اگست ۲۰۰۲ کی خبر کے مطابق بلریا گنج میں ناجائز اسلحہ کا بڑا ذخیرہ اور اسلحہ بنانے والے آلات برآمد کئے گئے۔ جس کا مالک دیونرائن تھا۔

(۲) میرے پاس ان سارے معاملات کے متعلق بڑی تعداد میں اخبار کے تراشے ہیں، اختصار کے پیش نظر صرف اشارہ پر اکتفا کیا ہے۔

(۳) اسی طرح وائے تھیاتھل کمیشن اور وینو گوپال کمیشن نے بھی فرقہ وارانہ فسادات میں واضح طور پر آر ایس ایس کی شمولیت ثابت کی ہے۔ (دیکھئے آر ایس ایس ایک مطالعہ ص ۱۰۶)

(۴) روزنامہ راشٹریہ سہارا، ۱۰ر ستمبر ۲۰۰۱ء۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بابری مسجد کی شہادت کے بعد ملک بھر میں ہوئے فسادات نے ملک کو کتنا پیچھے چھوڑا ہوگا۔

(۵) دیکھئے سہ روزہ دعوت نئی دہلی، ۴ر مئی ۲۰۰۲ء

==

فسادکنندگان کا مقصد مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا مگر اس کا لازمی نتیجہ ملک کی اقتصادی تباہی ہے جس کو روکا نہیں جا سکتا۔

دوسری طرف حکمراں طبقہ گھپلے اور اسکینڈل کر کے ملک کی معیشت پر جو منفی اثر ڈال رہا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ایک اسکینڈل کا شور ختم نہیں ہونے پاتا کہ دوسرے اسکینڈل کی سرخیاں اخباروں میں نظر آنے لگتی ہیں، یہ روزمرہ کا معمول بن گیا ہے کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا جاتا یہاں تک کہ کارگل جنگ کے بعد تابوت کے سلسلہ میں بھی گھپلہ کیا گیا۔ پھر یہ طبقہ (۱) اپنے تعیش اور تن آسانی کے لئے حد درجہ اسراف سے کام لے کر ملک کو جس طرح بھینٹ چڑھا رہا ہے اس کی تفصیل کہاں تک بیان کی جائے اخباروں میں اس کی تفصیلات شائع ہوتی رہتی ہیں۔

مسلمانوں کے خلاف الزامات اور ان کے مذہبی تقدس کی پامالی

ان کالے کرتوتوں پر پردہ ڈالنے کے لئے مسلمانوں کو نشانہ بنایا جارہا ہے اور انہیں ملک کا غدار اور آئی ایس آئی کا ایجنٹ بتا کر، ہر طرح سے بدنام کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، فرقہ پرست لیڈر ہر فساد اور بگاڑ کا ذمہ دار مسلمانوں کو ٹھہراتے ہیں اور ان کے خلاف زہر افشانی کرتے ہوئے نہیں تھکتے (۲) اور ان کے مقابلہ کے لئے اپنی تیاریاں مکمل کرنے کا بانگ دہل اعلان کرتے ہیں۔ (۳)

بابری مسجد کو گرانے کے بعد ان کے حوصلے اتنے بلند ہو گئے ہیں کہ شعائر کی بے

== مشہور صحافی کلدیپ نیر نے لکھا ہے کہ ایک اندازے کے مطابق فسادات کے بعد ریاست کو کاروبار میں دس ہزار کروڑ روپے سے زائد کا نقصان ہو چکا ہے اور سیل ٹیکس اور محصول چنگی میں ہر روز اسّی فیصد نقصان ہو رہا ہے (روزنامہ راشٹریہ سہارا، ۲۱ ر اکتوبر ۲۰۰۱ء۔

(۱) یہی بے غیرت لوگ ہیں جو ملک کی ترقی اور استحکام کا ڈھنڈورا پیٹتے ہوئے بڑھتی ہوئی آبادی پر کنٹرول کرنے والی تدبیریں سوچتے ہیں اور اپنی گہری تشویش کا اظہار کرتے ہیں۔

(۲) انکے لیڈروں کے بیانات پر مشتمل اخبار کے تراشوں کا میرے سامنے انبار ہے مگر طوالت کے خوف سے سب کو قلمزد کیا جارہا ہے۔

(۳) گزشتہ سال ۲۰۰۱ء جون جولائی میں مسلسل یہ خبر اخبارات میں شائع ہو رہی تھی کہ بجرنگ دل نے ۳۰ ر لاکھ رضاکار بھرتی کر کے ٹریننگ دینے کا کام شروع کر دیا ہے، ان کی پستول چلاتی اور تلوار لہراتی تصویریں چھپیں مگر ان کے خلاف کچھ نہیں ہوا جب کہ مسلمان کے پاس سے ناخن تراش یا پھل کاٹنے کا چاقو بھی برآمد ہوتا ہے تو دہشت گردی کے زمرہ میں آجاتا ہے۔ بجرنگ دل ==

حرمتی کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتی، قرآن کے نسخوں کو جلانا اور مسجدوں کو گرانا بائیں ہاتھ کا کھیل سمجھ لیا ہے۔(۱)

یہی نہیں مساجد کے ائمہ کو ہراساں کیا جاتا ہے جیسا کہ چند مہینوں پہلے ہماچل پردیش سے آئی ایک رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے۔

اور تو اور تبلیغی جماعت جیسی بے ضرر تحریک جس کو سیاست سے کوئی مطلب نہیں جو خالص دینی دعوتی اور اصلاحی تحریک ہے، اس تحریک تک کو بدنام کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں جو حد درجہ تعجب انگیز بلکہ انتہائی مضحکہ خیز ہے۔(۲)

علماء اور مدارس اسلامیہ کے خلاف محاذ

علماء اور مدارس کے خلاف تو ایک محاذ ہی قائم کیا گیا ہے۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب فرقہ پرستوں کی طرف سے مدارس کے بارے میں کوئی بیان اخبارات میں شائع نہ ہو، دار العلوم دیو بند اور دار العلوم ندوۃ العلماء جیسے مرکزی مدارس پر بغیر کسی ثبوت کے دہشت گردانہ انداز میں چھاپے مارے گئے، ان پر پورے ہندوستان میں جو شدید رد عمل ہوا اس کے پیش نظر سمجھا جا رہا تھا کہ شاید یہ سیلاب بلا یہیں رک جائے مگر دن بدن یہ بڑھتا ہی گیا اور مختلف سیاسی لیڈروں نے وہ بیان بازیاں، دروغ بافیاں، الزام تراشیاں اور افترا پردازیاں کیں کہ زمین و آسمان ہل گئے اور امن پسندوں کے دل دہل

== یوپی کے ریاستی کنوینر رمیش منی دکشت نے اپنے مسلم مخالف منصوبوں کا اعلان کرتے ہوئے ۲۷ر جولائی ۲۰۰۰ء کو کہا تھا کہ بجرنگ دل ضلعی مراکز کے علاوہ ۳۶ر بلاکوں پر گاؤں سطح کی سلامتی کمیٹیاں قائم کرے گی، ہر کمیٹی میں ۵ تا ۱۱ ممبران رکھے جائیں گے کمیٹیوں کے سات نکاتی مقاصد کے سلسلہ میں دکشت نے بتایا کہ سلامتی کارکن مسلم آبادیوں کے قریب ہوٹلوں، خلیجی ممالک کو ٹیلی فون کرنے والے پی سی او اور ٹیلی فون مراکز، مدارس کو امداد پہنچانے والے اداروں، پاکستان سمیت مسلم ممالک میں سفر کرنے والوں اور اسلامی مدرسوں پر نظر رکھیں گے۔ (روزنامہ راشٹریہ سہارا)

(۱) مثلاً ۱۲ر اگست ۲۰۰۱ء کو راجستھان کے بھیلواڑہ ضلع کی ایک مسجد میں گھس کر قرآن کو جلایا اور مسجد کو شدید نقصان پہنچایا "ہندو" کے مطابق ان جنونی نوجوانوں نے منبر کو توڑ ڈالا، جس الماری میں قرآن پاک اور احادیث کی کتابیں تھیں اس کو نذر آتش کیا جب کہ مسجد کی زمین یا تعمیر پر کوئی تنازعہ بھی نہیں تھا۔ (روزنامہ جدید عمل لکھنؤ ۱۵ر اگست ۲۰۰۱ء)

اس سے قبل ۲۷ر جولائی کو سولہویں صدی کی ایک تاریخی مسجد (قلندری مسجد) کو گرایا گیا تھا۔

(۲) مئو اور لکھنؤ کے واقعات شہادت کے لئے کافی ہیں جہاں تبلیغی جماعت کے افراد کو گرفتار کر کے پوچھ گچھ کی گئی تھی پھر وہاں سے واپس بھیج دیا گیا تھا۔

گئے، مدارس کی تعداد میں اضافہ سے تشویش کا اظہار روزانہ کے ضروری کاموں میں داخل ہوچکا ہے۔ وزارتی گروپ (۱) کی رپورٹ کس کو بھولی ہوگی جسمیں مدارس کو ملک کی فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور سالمیت کے لئے زبردست خطرہ قرار دیا گیا تھا۔

اس کے چند دنوں کے بعد آر ایس ایس کے لیڈر وی ایچ شیشادری نے مدارس کو ملک کے لئے خطرہ قرار دیا تھا۔ وشو ہندو پریشد کے سابق صدر اشوک سنگھل الزام لگاتے ہیں کہ مدارس میں ملک دشمنی کی تعلیم دی جاتی ہے (راشٹریہ سہارا، ۱۲؍نومبر ۲۰۰۰ء)

وشو ہندو پریشد کے بین الاقوامی جنرل سکریٹری پروین توگڑیا دینی مدارس کو طالبان (بزعم خودم دہشت گرد) پیدا کرنے والی فیکٹریاں قرار دیتے ہیں اور ہندوؤں کو ہتھیار اٹھانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ (سہارا، ۲۳؍اگست ۲۰۰۱)۔

راجستھان میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ دارالعلوم دیوبند دہشت گردی کا ہیڈ کوارٹر ہے اور ملک میں ایک لاکھ مدرسوں کے ذریعہ جہادی پیدا کر کے کافروں کو قتل کرنے کی تعلیم دی جارہی ہے۔ (سہارا، ۱۸؍اپریل ۲۰۰۲ء)

آج حکومت کو فرقہ پرستی کو ہوا دینے اور ہندوؤں کو علانیہ اسلحہ کی ٹریننگ دینے میں ملک کی سالمیت اور بقا نظر آتی ہے مگر اخلاقی تعلیم دے کر جانور نما انسانوں کو حقیقی انسان بنانے والے وطن دوستی اور وفاداری کا درس دینے والے اسلامی مدارس میں ملک کی سالمیت کو خطرہ نظر آتا ہے۔

تفو اے چرخ گرداں تفو

تاریخ کا چہرہ مسخ کرنے کی کوشش

اسی کے ساتھ آج ہندوستان کی پوری اسلامی تاریخ کو جس طرح مسخ کرنے کی شرمناک کوشش بلکہ سازش کی جارہی ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ Rewrite History کے نام سے ایک تحقیقاتی ادارہ کام کررہا ہے جو تاریخ کے غیر مستند ذخائر سے ایسی ایسی

(۱) کارگل حادثہ کے بعد ۱۷؍اپریل ۲۰۰۰ء کو ملک کے داخلی حفاظتی نظام کا جائزہ لینے کے لئے ایک وزارتی گروپ (Group of Ministers) تشکیل دیا گیا تھا جس میں چار مرکزی وزراء وزیر داخلہ لال کرشن اڈوانی، وزیر خارجہ جسونت سنگھ، وزیر خزانہ یشونت سنہا اور وزیر دفاع جارج فرنانڈیز شامل تھے۔ ۱۹؍فروری ۲۰۰۱ء کو اس نے ۱۳۵ صفحات پر مشتمل اپنی رپورٹ مکمل کی اور ۲۳؍مئی ۲۰۰۱ء کو اڈوانی نے ایک پریس کانفرنس میں اس کا اجراء کیا۔

باتیں نکال کر لا رہا ہے جن سے عقل سلیم شرما جائے اور مسلمان بادشاہوں اور ملک کی تعمیر کرنے والوں کو ایسی بھیانک شکل میں پیش کیا جاتا ہے کہ سنجیدہ ذہن رکھنے والے ہندو بھی متوحش ہو جائیں۔ حکومت اس جرم میں برابر کی شریک ہے اسی کے اشارہ پر یہ سب کام ہو رہا ہے۔ کبھی اس سلسلہ میں ایسی لچر باتیں سامنے آتی ہیں جنکو سنکر بیساختہ ہنسی آجاتی ہے بچہ بچہ جانتا ہے کہ تاج محل شاہجہاں نے بنایا مگر دو سال قبل (۱) ہندوستانی تاریخ از سرنو تحریر کرنے والے ادارہ کے بانی صدر پی کے اوک نے دعویٰ کیا تھا کہ اس کی تعمیر شاہ جہاں نہیں بلکہ ہندو راجہ پرمار دیو نے ۱۱۵۵ء میں کرائی تھی اور انہوں نے باقاعدہ سپریم کورٹ میں اس دعویٰ پر مشتمل پٹیشن داخل کی تھی جسے سپریم کورٹ نے بالکل غلط خیالات پر مبنی کہہ کر رد کر دیا تھا اور ہدایت کی تھی کہ ایسی پٹیشن داخل نہ کی جائے۔

یہ سلسلہ جاری ہے ابھی چند دنوں پہلے یہ خبر آئی تھی کہ گورکھپور یونیورسٹی انتظامیہ نے جدوجہد آزادی کی تاریخ کو نہ پڑھانے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ مسلمانوں کی قربانیاں طلبہ کے سامنے نہ آنے پائیں ساتھ ہی ساتھ نصاب سے ان تمام شخصیتوں کے تذکرہ کو نکال دیا گیا ہے جن سے مشترکہ تہذیب اور اتحا اور بھائی چارگی کا پیغام لوگوں تک پہنچتا ہے، اس کے برخلاف راشٹر گورو کا مضمون نصاب میں لازمی کیا گیا ہے تاکہ فرقہ واریت کو پھیلایا جاسکے۔ (۲)

معماران وطن کے کارناموں کو اجاگر کرنے کی اہمیت وضرورت

آج پورے ہندوستان کی فضا مسموم ہو چکی ہے ہمارا رشتہ خود اپنی تاریخ اور اپنے شاندار ماضی سے کٹ چکا ہے، وقت کی ستم ظریفی کہیے یا ہماری لاپروائی کہ ہم اپنے کو دوسری کی نگاہوں سے دیکھنے اور دوسروں کے بتائے ہوئے معیارات سے جانچنے لگے ہیں۔ ستم ظریفوں نے مسلمانوں کو انکے ماضی سے کاٹنے کی شاطرانہ چالیں چل رکھی

(۱) ۱۴ر جولائی ۲۰۰۰ء کے بعض اخبارات میں خبر رساں ایجنسی یو این آئی کے حوالہ سے یہ خبر شائع ہوئی تھی۔

(۲) روزنامہ راشٹریہ سہارا شارہ ۷ر ستمبر ۲۰۰۲ء۔ اس میں تعجب کی بات نہیں اس لئے کہ NCERT کا سربراہ سنگھی ہے یہ ادارہ پورے ملک کے لئے سلیبس اور نصاب تعلیم تیار کرنے کا ذمہ دار ہے اسی طرح نیشنل کاؤنسل آف ہسٹاریکل ریسرچ (NCHR) کا سربراہ بھی سنگھ سے تعلق رکھتا ہے۔

ہیں۔ حقائق پر سیاہی کے دبیز پردے ڈال دیئے ہیں، اس لئے نئی نسل اپنے اسلاف کے کارناموں سے بالکل واقف نہیں۔ ضرورت ہے کہ ہم تاریخ کے حقائق کو ان کے سامنے لائیں تاکہ وہ ان کے نقش قدم پر چل کر ملک وملت کے لئے مفید سے مفید تر ثابت ہوں۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے ہندوستان میں مسلمانوں کے شاندار ماضی کا جائزہ لیتے ہوئے دینی تعلیمی کانفرنس منعقدہ بستی کے خطبہ صدارت میں بڑے درد کے ساتھ عرض کیا تھا:

"..........ہم کس جرم میں اپنی انسانی عظمت، روحانی بلندی اور علمی پیشوائی کے اس درخشاں ورق کو ہندوستان کی قومی تاریخ سے خارج کرتے ہیں، اور کس قصور میں اپنے نوجوانوں کو ان کے کارناموں کی واقفیت سے محروم کرتے ہیں، آج ہندوستان میں اس دور کو نظر انداز کرنے یا اس کو حقیر دکھانے کا عمومی رجحان پایا جاتا ہے، آج کہیں ہماری جدید تاریخوں میں اور ہمارے نصاب تعلیم کی کتابوں میں اس کا شایان شان تذکرہ اور اس کی بلند ومنفرد شخصیتوں کا تعارف نہیں ملتا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری حب الوطنی اور ہمارے نیشنلزم میں ابھی بہت کمی اور خامی ہے، ہم سچے محب وطن اور ملک دوست اس وقت تک نہیں ہوسکتے جب تک کہ اس ملک کی ساری اچھی حسین اور مفید چیزوں پر فخر کرنا ان کی حفاظت کرنا اور ان کو زندہ رکھنا اپنا فرض نہ سمجھیں، ہندوستانی کنبہ کی ان شخصیتوں کو کیوں خارج کیا جائے، جن کا خمیر اسی سرزمین سے اٹھا، اور جنھوں نے اپنی ساری صلاحیتیں اس ملک کو زرخیز بنانے میں صرف کیں اور پھر اسی سرزمین میں آسودۂ خاک ہیں اور جن کی ہمت وبصیرت سے ہم اپنی زندگی کا چراغ جلا سکتے اور اس کی لو بڑھا سکتے ہیں اور دنیا کی بزم کمال میں اونچی جگہ پا سکتے ہیں، کسی محب وطن شاعر نے کہا تھا ؎

خار وطن از سنبل و ریحاں خوشتر
حب وطن از ملک سلیماں خوشتر

لیکن یہاں تو پھولوں کے ساتھ کانٹوں کا معاملہ کیا جارہا ہے، اپنے ہاتھوں سے اپنی تاریخ کے اوراق کو چاک کیا جارہا ہے، یا ان پر سیاہی پھیری جارہی ہے، اور اس طرح ہندوستان کی تاریخ میں ایک ایسا خلا پیدا کیا جارہا ہے جو صدیوں کو محیط ہے، ہمارا فرض ہے کہ ہم ہندوستان کے اس دور کو نمایاں اور ان کارناموں کو اجاگر کریں، ہم ہندوستان کی تاریخ کی ترتیب وتدوین میں حصہ لیں، ہم مطالبہ کریں کہ جدید تعلیم و نصاب میں عہد قدیم کی تاریخی شخصیتوں کے ساتھ ازمنۂ وسطیٰ کی ان تاریخی شخصیتوں کو بھی جگہ دی جائے جو ہندوستان کے لئے قابل فخر اور نوجوانوں کے لئے قابل تقلید ہیں اور جن سے ناواقفیت ایک بڑا نقص اور محرومی کی بات ہے۔" (۱)

ان حالات میں ہمارا خاص طور پر یہ فرض بنتا ہے کہ ملک کی آزادی میں مسلمانوں کے کردار کو نمایاں کریں۔ آج جب مسلمانوں کے کارناموں پر سازش کے تحت پردہ ڈالا جارہا ہے یہاں تک کہ ہر مسلمان کو شکایت ہے کہ

ورق ورق الٹ چکا تلاش میں کمی نہ کی
مگر کتاب حریت میں میری داستاں نہیں

اسی پر بس نہیں بلکہ ہر طرف سے انہیں ہدف ملامت بنایا جارہا ہے اور ان کو ہر طرح سے غدار اور ان کے مدارس کو ملک کی سالمیت کے لئے خطرہ قرار دیا جارہا ہے تو اس کام کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ ہم کسی کے ممنون کرم نہیں، ملک کا چپہ چپہ ہمارے لہو سے لالہ زار ہے۔ اس کا بچہ بچہ ہمارے احسانات سے گراں بار ہے۔ اس چمن کا ہر بوٹا شہادت دیتا ہے کہ اس کی سینچائی میں ہمارا خون شامل ہے۔

بہاریں ہم کو بھولیں یاد ہے اتنا کہ گلشن میں
گریباں چاک کرنے کا بھی اک ہنگام آیا تھا

---

(۱) خطبہ صدارت صوبائی دینی تعلیمی کانفرنس بستی منعقدہ ۳۰/۳۱ دسمبر ۱۹۵۹ء و ۱/ جنوری ۱۹۶۰ء صفحہ ۱۳-۱۴

فرقہ پرستوں (۱) کی بے اطمینانی کا کوئی علاج نہیں وہ جان بوجھ کر ایسا کرتے ہیں ان کا مفاد اسی سے وابستہ ہے ان کی حقیقت تو وہی ہے جس کو قرآن نے بیان کیا ہے۔ ولن ترضی عنک الیھود و لا النصاریٰ حتی تتبع ملتھم (بقرہ / ۱۲۰) (یہود و نصاریٰ آپ سے ہرگز خوش نہیں ہوں گے جب تک کہ آپ ان کے مذہب کی پیروی نہ کریں)۔ مسلمانوں کا بحیثیت مسلم وجود ہی سب سے بڑا جرم ہے شاعر کی زبان میں ۔

وجودک ذنب لا یقاس بہ ذنب

(یعنی تمہارا وجود ہی ایسا گناہ ہے جس کے برابر کوئی گناہ نہیں)

انہیں اس حقیقت پر یقین کرنا چاہئے کہ ہمارا وجود اسی سرزمین سے وابستہ ہے اللہ نے یہ بات مقدر کی ہے مسلمان قیامت تک ہندوستان میں رہیں گے، ان کی توحید و عبادت اور دعاء و مناجات سے فتنے دبیں گے۔ آسمانی و زمینی آفتیں ٹلیں گی، رازق حقیقی تو اللہ ہے کسی پر ان کی روزی روٹی کا بار نہیں ہوگا۔ آج سے ڈھائی سو برس پہلے جب مرہٹوں نے طرح طرح کے ظلم و بیداد پر کمر باندھ رکھی تھی اور پرانے وارثین کو بے دخل کر کے اپنی حکومت و اقتدار قائم کر رہے تھے اور چاہتے تھے کہ پورے ہندوستان کے مالک بن جائیں اس وقت مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے عجیب و غریب بات لکھی تھی۔ حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح ان کی فراست نے برادران وطن کی ذہنیت کو بھانپ لیا تھا

(۱) ان کی تعداد زیادہ نہیں مگر غلبہ ان کا ہے۔ ملک کی سیاست پر انہی کا قبضہ ہے۔ ہندو عوام اب بھی امن پسند ہیں اور طبعاً نیک ہیں مگر رو میں بہہ جاتے ہیں، لیکن کالجوں اور یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم نوجوان طبقہ کی ذہنیت پلاننگ کے تحت پوری طرح مسموم کی جا چکی ہے جن کے ہاتھ میں ملک کی قیادت آنے والی ہے۔ اس کے باوجود پڑھے لکھے لوگوں میں بھی ایسے افراد کی کمی نہیں جو تاریخ پر انصاف کی نظر ڈالتے ہیں اور حقیقت کے آئینہ میں اس کا جائزہ لیتے ہیں اور مسلمانوں کی تاریخ کے سلسلہ میں جو غلطیاں پھیلائی گئی ہیں ان کو دور کر کے فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں مشہور مورخ بشمبھر ناتھ پانڈے نے تو اسی کو اپنا موضوع بنایا تھا، مشہور مورخین تاراچند اور سندر لال کی کتابوں میں بھی ایسا مواد ملتا ہے۔ نیز ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد (شعبہ تاریخ پٹنہ یونیورسٹی) نے ایک کتاب لکھی ہے ''اورنگ زیب ایک نیا نقطہ نظر'' اور اکھیلیش جاکسوال کی کتاب ہے ''اورنگ زیب اور ہندوؤں کے ساتھ تعلقات'' ان کے علاوہ اور بھی بہت سے مورخین اور صحافی ہیں جو فرقہ واریت کے خلاف لکھتے رہتے ہیں۔

اوران کی دوررس نگاہ نے کس حد تک ہندوستان کی موجودہ کیفیت کا ڈھائی سو سال پہلے اندازہ لگالیا تھا، لکھتے ہیں :

رزاق مطلق تعالیٰ شانہ کہ روزی رسانندہ مسلمانان و ہندوست برات اصناف خلائق برہمیں زمیں نوشتہ، تمام ایں ممالک بیک قوم چہ طور مسلم تواند شد(۱)

رزاق مطلق اللہ تعالیٰ ہے جو مسلمان اور ہندو دونوں کا روزی پہنچانے والا ہے، اس نے ہر ایک کی روزی کا حصہ اسی سرزمین (ہند) میں مقرر فرمایا ہے، یہ سارا ملک کسی ایک قوم کے لئے کس طرح تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

اس لئے سب کا فائدہ اور ملک کی سالمیت اسی میں ہے کہ ملک کے تمام باشندے میل ملاپ اور آپسی تعاون کے ساتھ رہیں۔ مگر فرقہ پرست کچھ اور ہی چاہتے ہیں اور درحقیقت وہ اپنی حقیقی تاریخ پر پردہ ڈالنے کی کوشش کررہے ہیں۔

انکو خوب پتہ ہے کہ ان کے پاس پیش کرنے کے لئے کوئی تاریخ نہیں اس لئے وہ مسلمانوں پر دانت پیستے ہیں اور جز بز ہو کر ہوش وحواس کھو بیٹھتے ہیں اور بالآخر مجبور ہو کر "ہندتو" کا کارڈ استعمال کرتے ہیں اور مذہبی غیرت دلا کر عوام کو اپنے دام میں پھانسنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ وہ اسی میں پھنسے رہیں اور تاریخ پر سنجیدگی سے غور کرنے کا انہیں موقع ہی نہ ملے اگر وہ حقیقت سے واقف ہوگئے تو انکی قلعی کھل جائے گی۔

انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ اس ملک میں جو کچھ قابل فخر چیزیں ہیں اکثر مسلمانوں کی طرف منسوب ہیں، پھر آزادی کی تحریک کی انہوں نے قیادت کی اور انگریزوں سے ٹکر لینے اور ملک کے تئیں وفاداری برتنے میں انہوں نے سب سے زیادہ سرگرمی دکھائی۔ وہ جانتے ہیں کہ ہم نے اس خارزار میں اس وقت قدم رکھا جب وہ گل وگلزار میں مست ومگن تھے، ہم جاگ رہے تھے اور وہ خواب خرگوش میں مدہوش تھے، ہم کانٹوں سے کھیل رہے تھے، اور وہ پھولوں کی سیج سے لطف لے رہے تھے، ہم ٹاٹ پر مشکل سے سو پارہے تھے اور وہ حریر وکمخواب کے بستروں پر محو خواب تھے ہم بھنور میں

(۱) خزانہ عامرہ صفحہ ۴۷، مطبع نول کشور، کانپور، ۱۸۷۱ء

پھنسے تھے اور وہ ساحل کے تماشائی بنے تھے اس لئے وہ ہماری قربانیوں کا اندازہ نہیں لگا سکتے حافظ شیرازی کے بقول ؎

شب تاریک وبیم موج وگردابے چنیں حائل
کجا دانند حال ما سبکساراں ساحل را

ان کے جہاد آزادی کا حال یہ ہے کہ تماشہ بیں کی حیثیت سے سڑک پر کھڑے تھے پولس آئی اور پکڑ لے گئی بس مجاہد آزادی قرار پائے۔(۱)

ان حالات میں مسلمان اپنی وفاداری کا ثبوت پیش کرنے لگیں تو نادانی ہے۔ وفاداری کا ثبوت وہ پیش کرے جس کے پاس کچھ کارنامے ہوں جن کو اس نے پیش کرنے کے لئے اٹھا رکھا ہو۔ مگر جن کی تاریخ کا صفحہ صفحہ تعمیر وطن کے ناقابل تردید کارناموں سے پر ہو اور جو خود اس پوزیشن میں ہوں کہ دوسری قومیں ان کے سامنے کاسۂ گدائی لے کر حاضر ہوں اور کارناموں کی بھیک مانگیں، وہ کیوں کر دوسروں کے سامنے دریوزہ گری کریں اور اپنی وفاداری کے ثبوت پیش کرنے لگیں

بأی لسان للوشاة ألام
وقد علموا أنی سهرت و ناموا

(۱) مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہفت روزہ راشٹریہ سہارا میں ۱۹۹۷ء کے (غالباً اگست کے) کسی شمارہ میں ایک معروف شخصیت کا انٹرویو شائع ہوا تھا (اخبار میرے پاس محفوظ نہیں رہ سکا ورنہ تفصیل سے عرض کیا جاتا) ان سے ایک سوال کیا گیا تھا کہ جنگ آزادی میں آپ کے کارنامے کیا ہیں جن کی وجہ سے آپ کو پنشن مل رہی ہے انہوں نے صاف جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ ۱۹۴۲ء میں ہندوستان چھوڑو تحریک کے موقع پر میں ایک دن کالج سے لوٹ رہا تھا راستہ میں ایک جگہ کچھ لوگ جمع تھے مجھے بھی شوق ہوا کہ قریب جا کر دیکھوں کیا ہو رہا ہے اتنے میں پولس آئی اور گرفتار کرنا شروع کیا میں بھی ہاتھ لگا، بس جناب اس وقت سے مجاہد آزادی کہلائے اور آزادی کے بعد پنشن کے حقدار بھی قرار پائے۔

علاوہ ازیں پنشن خوار فرضی مجاہدین آزادی کی بڑی تعداد ہے، ملک کے موجودہ اقتصادی حالات کے پیش نظر کہیں کہیں اس پر بھی غور ہو رہا ہے۔ ۲۵ راگست ۲۰۰۰ء (یا ۲۰۰۱ء) کو یو این آئی نے خبر دی تھی کہ ۲۷,۰۰۰ فرضی مجاہدین آزادی کو دستیاب سہولتیں ختم کرنے کا مہاراشٹر کے مجاہدین آزادی اعلیٰ اختیاری کمیٹی نے حکم دیا ہے۔ یہ ابتدائی چھان بین کا نتیجہ ہے (بحوالہ روزنامہ راشٹریہ سہارا)۔

(یعنی میرے دشمن چغل خور کس طرح مجھ پر زبان طعن دراز کر سکتے ہیں جب کہ انہیں معلوم ہے کہ میں اس وقت جاگ رہا تھا جب وہ سو رہے تھے۔)

یہ انتہا درجہ کی احساس کہتری ہے اور ذہنی مرعوبیت اور اپنی تاریخ سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔

آج پڑھے لکھے مسلمان بھی عموماً یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے برادران وطن کے شانہ بشانہ جنگ آزادی میں حصہ لیا ہے اور یہ کہہ کر وہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے مسلمانوں کی طرف سے دفاع کا حق ادا کر دیا، ہم اس سطحی سوچ اور مرعوب ذہنیت کو ماننے کے لئے ہرگز تیار نہیں، ہم پوری بصیرت کے ساتھ خم ٹھونک کر کہتے ہیں ہمارے علماء آزادی کی راہ میں اس وقت سرگرم سفر ہوئے جب فضا پر فرنگی استبداد کے ابتدائی آثار ہی ظاہر ہوئے تھے جب کہ دوسری قوموں نے اس وقت قدم بڑھائے جب تاریکیاں بڑھتے بڑھتے اس حد کو پہنچ گئی تھیں جہاں سے صبح امید ہویدا ہوتی ہے اور ہم چیلنج کرتے ہیں کہ ہمارے کارناموں کے مقابلہ میں دوسری قوموں کے کارنامے سمندر میں چلو سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، اس لئے ہمیں احساس کمتری میں مبتلا ہونے کی ہرگز ضرورت نہیں ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ تاریخ کے چہرہ پر جو کیچڑ مل دیا گیا ہے اس کو دھو کر صاف شفاف بنا دیا جائے تاکہ حقیقی روشن اور چمکدار چہرہ سامنے آئے اور اس کی روشنی میں کم ہمت مرعوب اور ناواقف مسلمان اپنے تابناک ماضی کو دیکھ کر نئے عزم و حوصلہ کے ساتھ شاہراہ زندگی پر گامزن ہوں اور دوسروں سے پوری قوت کے ساتھ کہہ سکیں

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں

اور ہمارے برادران وطن حقیقت حال سے واقفیت کے بعد فرقہ وارانہ ذہنیت سے بلند ہو کر سوچنے اور تاریخ کی سچائیاں ڈھونڈنے کے عادی ہوں، اور پھر سب مل کر محبوب وطن کی گرتی دیوار کو تھامیں اور اس کی ڈوبتی نیا کو ساحل مراد تک پہنچانے میں کامیاب ہوں، اسی وجہ سے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔

ومن أحسن قولاً ممن دعا إلى الله و عمل صالحاً وقال إنني من المسلمين ولا تستوى الحسنة ولا السيئة

إدفع بالتي هي أحسن، فإذا الذي بينك وبينه عداوة كأنه ولي حميم، وما يلقاها إلا الذين صبروا و ما يلقاها إلا ذو حظ عظيم، وإما ينزغنك من الشيطان نزغ فاستعذ بالله، إنه هو السميع العليم۔

(حم السجدہ، آیت ۳۳-۳۶)

اور اس سے بہتر بات کس کی ہوسکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں اور نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں آپ برائی کو اس چیز سے دفع کیجئے جو زیادہ بہتر ہے (نیک برتاؤ سے ٹال دیا کیجئے) تو آپ کے اور جس شخص کے درمیان عداوت ہوگی وہ یکا یک سرگرم دوست ہوجائے گا، یہ بات انہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے مستقل مزاج ہوتے ہیں اور یہ حکمت اسی کو عطا ہوتی ہے جو بڑا نصیبہ ور ہوتا ہے، اگر شیطان آپ کے دل میں کوئی اکساہٹ پیدا کرہی دے تو اللہ کی پناہ ڈھونڈ لیجئے، بلاشبہ وہ خوب سننے والا جاننے والا ہے۔

اسی حکم الٰہی کی تعمیل میں پورے اعتماد اور تاریخی امانت کے احساس کے ساتھ علماء کے کارناموں کو واشگاف کر کے ملک کے بگڑتے ہوئے حالات میں احسن طریقے سے شر وفساد کے دفعیہ کی کوشش کی گئی ہے تاکہ مسلمان احساس کہتری سے بلند ہو کر زندگی گزاریں اور اپنے اسلاف کے قابل فخر کارناموں کی روشنی میں ملک کی تعمیر و ترقی میں پوری سرگرمی دکھائیں، اور دوسری طرف برادران وطن ٹھنڈے دل سے سوچیں حقائق پر غور کریں اور منافرانہ جذبات کو بالائے طاق رکھ کر تعمیری میدان میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں اور مسلمانوں کو ان کا حق سمجھ کر فراخ دلی کے ساتھ ان کے حقوق دیں تاکہ ہمارا ملک ہندوستان پھر سے گلستان جنت نشان بن جائے۔

تحریک آزادی میں مسلمانوں کے کردار سے متعلق سابقہ کام پر سرسری نظر

تحریک آزادی پر اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں بہت لکھا گیا ہے اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ اس موضوع پر اتنا کام ہوا ہے کہ اگر کوئی ان ساری کتابوں کا جائزہ لینا چاہے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہوسکتی ہے۔ انگریزوں نے بھی لکھا، ہندوؤں نے

بھی قلم اٹھایا اور مسلمانوں نے بھی ہزاروں صفحات سیاہ کیئے، انگریزوں اور ہندوؤں کی کتابوں میں بھی مسلمانوں کا ذکر آتا ہے اور ان کی قربانیوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ اور مسلمانوں نے جو لکھا ہے تو عموماً اس کا خیال رکھا ہے کہ مسلمانوں کا کردار واضح اور ان کی قربانیاں نمایاں ہوں۔ طبقات کے اعتبار سے بھی لکھا گیا، ادوار کے اعتبار سے بھی کام ہوا، تحریکات کے اعتبار سے بھی روشنی ڈالی گئی اور مخصوص صوبوں اور شہروں کے لحاظ سے بھی تحقیق کی گئی اور مخصوص افراد سے متعلق بھی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، ان میں کتابیں بھی ہیں اور رسائل و جرائد کے خاص شمارے بھی۔

مگر ان سب سے قطع نظر ہمیں یہاں صرف ان کتابوں کا سرسری تذکرہ کرنا ہے جو جنگ آزادی میں مسلمانوں کے کردار سے متعلق لکھی گئی ہیں اور کسی طبقہ، زمانہ، تحریک، شہر، صوبہ اور فرد کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر دور اور ہر جگہ کے مسلمانوں کی قربانیوں کا عمومی تذکرہ ہے یا کم سے کم کتاب کے نام سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ پھر ان کتابوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جو مخصوص صوبوں اور شہروں سے متعلق ہیں اور اخیر میں ان کتابوں کا جائزہ لیا گیا ہے جو علماء کے کارناموں اور ان کی خدمات سے تعلق رکھتی ہیں۔

ان میں مندرجہ ذیل کتابیں ہمارے علم میں ہیں اور ان میں سے زیادہ تر ہم دیکھ چکے ہیں مگر ہمارے مآخذ میں شامل نہیں اس لئے کہ ہم نے اپنی اس کتاب میں جس دور سے بحث کی ہے اس پر عموماً توجہ نہیں دی گئی تو نئی معلومات کہاں سے ملتیں پھر یہ کہ ان میں سے اکثر کتابیں تحقیق سے نہیں لکھی گئیں بلکہ ان کی حیثیت عام تاریخ اور تذکروں کی ہے، جس سے ایک عام قاری کچھ معلومات حاصل کرسکتا ہے۔ ہر کتاب پر مفصل تبصرہ کا یہ موقع نہیں، اس لئے صرف ضروری اشارے کئے گئے ہیں۔

(الف)

(۱) جنگ آزادی کے مسلم مجاہدین۔	از ضامن علی خاں (دہلی)
(۲) جنگ آزادی کے مسلمان مجاہدین	از میورام گپت ستوریا (بمبئی)
(۳) مسلم دیش بھگت	از رتن لال بنسی فیروز آبادی (الہ آباد)

یہ تینوں کتابیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں، غیر محقق روایات کو بڑی کشادہ دلی

سے جگہ دی گئی ہے۔

(۴) جنگ آزادی اور مسلمان   از غفران احمد (دہلی)

چند شخصیات کا سرسری تعارف ہے بالخصوص آخری دور کے مجاہدین آزادی

(۵) جنگ آزادی کے مسلم مجاہدین   از عزیز الرحمٰن جامعی لدھیانوی (دہلی)

اس میں بھی شخصیات کا تعارف ہے مگر نسبتہً بہتر، معلومات افزا اور وسیع رقبہ اور زمانہ پر محیط ہے۔ تین چار چھوٹے چھوٹے رسائل پر مشتمل ہے۔

(۶) ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کا کردار۔   (دہلی)

ندوۃ المصنّفین کی ایک پرانی فہرست مطبوعات میں یہ نام نظر سے گذرا مزید کچھ پتہ نہیں۔

(۷) ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کا حصہ   از سید ابراہیم فکری (علی گڑھ)

غیر مرتب معلومات جمع کی گئی ہیں۔

(۸) تحریک آزادی ہند اور مسلمان (۱)   از محمد احمد صدیقی (گورکھپور)

مختصر کتاب ہے معلومات کو خاص انداز میں سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۹) تحریک آزادی اور مسلمان   از اسیر ادروی (دیوبند)

یہ کتاب کافی مقبول اور اس موضوع پر غالباً سب سے مشہور ہے۔ زبان و ادب کے لحاظ سے معیاری اور اسلوب بیان دلچسپ ہے مگر گہری کم اور تحقیقی لحاظ سے بہت ناقص ہے تاہم ایک عام قاری اس سے خاصی معلومات حاصل کر سکتا ہے۔

(۱۰) جنگ آزادی میں مسلمانوں کی قربانیاں   از حیدر علی نعمانی (ٹانڈہ)

یہ اردو ترجمہ ہے جو محمد دلیر آزاد کے قلم سے ہے اصل کتاب غالباً ہندی میں ہے۔ کتاب محنت سے لکھی گئی ہے مگر تاریخی فروگذاشتوں سے خالی نہیں۔

(۱۱) جنگ آزادی میں مسلمانوں کا حصہ   از ساحل احمد (الہ آباد)

مختصر کتاب ہے، اس کے باوجود کہیں تکرار بھی معلوم ہوتی ہے۔ تحقیق سے قطع نظر

---

(۱) اسی نام سے دو حصوں میں مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی بھی کتاب ہے۔ بترتیب خورشید احمد، مگر یہ تاریخ نہیں بلکہ تحریک آزادی اور مسئلہ قومیت پر اسلامی نقطۂ نظر سے مفصل نقد و تبصرہ ہے اور مسلمانوں کی کیا پوزیشن اور کیا رویہ ہونا چاہئے اس کی توضیح و تشریح کی گئی ہے۔ دراصل یہ کتاب مولانا کی مشہور کتابوں ''مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش'' اور ''مسئلہ قومیت'' کا مجموعہ ہے۔

کچھ معلومات جمع کی گئی ہیں۔ تاریخی فروگزاشتیں بھی ہیں اور اشخاص کے ناموں میں غلطیاں بھی ہیں۔

(۱۲) مسلمان اور آزادی کی جنگ — از عبدالوحید خاں بی اے ایل ایل بی (لکھنؤ)

یہ کتاب ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی تھی غالباً اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب ہے۔

(۱۳) رول آف انڈین مسلمس ان دی فریڈم مومنٹ (Role of Indian Muslims in the Freedom Movement) — از سانتے رائے (Roy Sentemoy) صدر شعبۂ قانون سٹی کالج کلکتہ

(ب)

ان کے علاوہ مخصوص صوبوں اور شہروں میں مسلمانوں نے تحریک آزادی میں جو حصہ لیا ان کے کارناموں پر مشتمل حسب ذیل کتابیں ہمارے علم میں ہیں۔

(۱) مسلم اسٹرگل فار فریڈم ان بنگال (Muslim Struggle for freedom in Bengal) — از ڈاکٹر معین الدین احمد خاں (ڈھاکہ)

(۲) بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہد آزادی (۱۷۵۷ء-۱۸۵۷ء) — از عبداللہ ملک (لاہور)

ضخیم کتاب ہے۔ اور اپنے موضوع پر جامع اور معلومات افزا۔

(۳) سرحد اور جدو جہد آزادی (۱) — از مولانا اللہ بخش یوسفی (کراچی)

یہ کتاب بھی کافی ضخیم ہے، مصنف مشہور صحافی تھے اس لئے آخری دور کے حالات تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ ابتدائی دور کے لحاظ سے کتاب بہت ناقص معلوم

(۱) پنجاب پر بھی دو کتابیں ہیں (۱) جدوجہد آزادی میں پنجاب کا کردار از پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار (لاہور) (۲) پنجاب کی سیاسی تحریکیں از عبداللہ ملک (لاہور) پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت کے پیش نظر ان کتابوں کو بھی اس فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے نیز بلوچستان کی تحریک آزادی پر بھی پاکستان کی مطبوعہ ایک ضخیم کتاب دہلی کے کسی ناشر کے پاس دیکھی تھی، تفصیلات ذہن میں نہیں۔

ہوتی ہے۔

(۴) تحریک آزادی میں بہار کے مسلمانوں کا حصہ — از تقی رحیم (پٹنہ)

کافی ضخیم کتاب ہے مگر علماء کے سلسلہ میں معلومات اس کی بہ نسبت کم ہیں۔

(۵) تحریک آزادی ہند میں مسلم مجاہدین چمپارن (بہار) کا مقام — از اشرف قادری (بنیا)

(۶) بہار کے مسلم مجاہدین آزادی خدمات اور کارنامے — مرتب مفتی نسیم احمد قاسمی (پھلواری شریف، پٹنہ)

متعدد مجاہدین پر مختلف حضرات کے مضامین کا مجموعہ ہے۔

(۷) دی فریڈم اسٹرگل ان حیدر آباد (۱۸۰۰ء-۱۸۵۷ء) — حیدر آباد اسٹیٹ کمیونٹی نے شائع کی ہے۔

(The Freedom Struggle in Hydarabad)

(۸) ریاست حیدر آباد میں جدو جہد آزادی (۱۸۰۰ء تا ۱۹۰۰ء) — از سید محمد جواد رضوی (دہلی)

اپنے موضوع پر کامیاب اور معلومات افزا ہے۔

(۹) تحریک آزادی اور مملکت حیدر آباد — از ڈاکٹر معین الدین عقیل (کراچی)

مختصر کتاب ہے مصنف کے شایان شان معلومات سے خالی ہے۔

(۱۰) شہیدان وطن ضلع مراد آباد — از امداد صابری (مراد آباد)

(۱۱) مراد آباد تاریخ جدو جہد آزادی۔ — از سید محبوب حسین سبزواری (مراد آباد)

اس کتاب میں مصنف نے بعض نادر غیر مطبوعہ معلومات فراہم کیے ہیں۔

(۱۲) سنبھل کے علماء اور مجاہدین آزادی — از ڈاکٹر سعادت علی صدیقی (لکھنؤ)

سنبھل کے چند مجاہدین کا تعارف ہے۔ مزید تحقیق کی بڑی گنجائش ہے۔

(۱۳) ہندوستان کی جدو جہد آزادی اور ضلع ایٹہ میں مسلمانوں کا کردار — از محمد قمر عالم (دہلی)

(۱۴) شمع آزادی کے پروانے (غازی پور کے مسلم مجاہدین آزادی کا تذکرہ) از مولانا عزیز الحسن صدیقی۔ (غازی پور)
موضوع پر خاصی معلومات افزا کتاب ہے۔

اس طرح ہر صوبہ اور ہر ضلع کے اہل علم فکر کریں اور تلاش و جستجو سے اپنے علاقہ کے مجاہدین آزادی کو زندہ کرنے کی کوشش کریں تو تحریک آزادی میں مسلمانوں کے کردار پر نئے گوشے سامنے آسکتے ہیں اور یہ چیز ہندوستان کی فضا میں بہت مفید اور موثر ثابت ہوسکتی ہے۔

(ج)

جہاں تک تحریک آزادی میں خاص علماء کرام کے کردار سے متعلق کتابوں کا تعلق ہے اس کا آغاز غالباً مولانا سید محمد میاں صاحب نے اپنی مشہور کتاب

(۱) علماء ہند کا شاندار ماضی لکھ کر کیا۔ کتاب چار جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد (جو حضرت مجدد الف ثانی کے حالات و کارناموں کے ساتھ مخصوص ہے) کو چھوڑ کر بقیہ تین جلدیں جنگ آزادی میں علماء کے کارناموں پر مشتمل ہے۔ مولانا خود مجاہد آزادی اور قید و بند کی مصیبتیں جھیلے ہوئے تھے، اس لئے بڑے جذبہ سے انہوں نے یہ کتاب لکھی ہے اور محنت بھی کافی کی ہے مگر انہوں نے بیشتر موقعوں پر مولانا عبید اللہ سندھی (۱) کے خیالات پر عمارت کھڑی کی ہے اس لئے حقیقت سے بہت دور نکل گئے ہیں (۲) اس لئے خالص تحقیقی نظر سے دیکھا جائے تو یہ کتاب نظر ثانی کی مستحق معلوم ہوتی ہے تاہم چونکہ موضوع پر پہلی کتاب ہے اس لئے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور ایک عرصہ تک اس کو مرجع کی حیثیت حاصل رہی اور اب بھی جنگ آزادی میں علماء کے کارناموں کا ذکر آتا ہے تو سب سے پہلے عموماً نظر اسی کتاب پر جاتی ہے۔

---

(۱) مولانا عبید اللہ سندھی کی مشہور کتاب شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک اس عرصہ میں آچکی تھی جس سے دوسرے ایڈیشن میں مولانا محمد میاں نے استفادہ کیا ہے۔ اور جاننے والے جانتے ہیں کہ مولانا سندھی کی یہ کتاب تاریخ نہیں بلکہ ان کے افکار و خیالات کا مجموعہ ہے

(۲) ہم نے مناسب موقعوں پر اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

(۲) علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے (دو حصے)
مولانا محمد میاں صاحب ہی کی کتاب ہے۔اوراس کی حیثیت شاندار ماضی کے تتمہ کی ہے۔(دہلی)

(۳) علماء میدان سیاست میں
از ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی (کراچی)

۱۵۵۶ء سے ۱۹۴۷ء تک برصغیر میں علماء کی سیاسی سرگرمیوں کا تحقیقی جائزہ ہے۔ اصل کتاب انگریزی میں Ulama in Politics کے نام سے ہے، اردو ترجمہ ہلال احمد زبیری نے کیا ہے۔مصنف مشہور مؤرخ، محقق اور ناقد و مبصر تھے۔(۱۹۸۱ء میں ان کا انتقال ہوا) اس کتاب میں بھی مصنف کی یہ ساری صلاحیتیں پوری طرح نمایاں ہیں۔ ان کے جمع کردہ معلومات تو تحریک آزادی پر لکھی ہوئی دوسری کتابوں میں بھی عموماً ملتے ہیں مگر ان کے تجزیئے اور جو نتائج جگہ جگہ انہوں نے نکالے ہیں وہ بہت قیمتی ہیں۔

(۴) برصغیر پاک و ہند کی سیاست میں علماء کا کردار (بیسویں صدی میں ۱۹۴۰ء تک)
از ڈاکٹر ایچ بی خاں (اسلام آباد)

کتاب پر حصہ اول لکھا ہے دوسرے حصہ کا علم نہیں، کافی ضخیم کتاب ہے مصنف نے بڑی محنت سے تیار کی ہے۔

(۵) جنگ آزادی میں علماء کرام کا حصہ
از سلمان علی خاں (لکھنؤ)

بیس صفحات پر مشتمل ایک کتابچہ ہے مگر غیر محقق روایات اور تاریخی فروگزاشتوں سے پر ہے۔ میں نے کتاب میں مناسب موقعوں پر ان کی بیان کردہ روایات کی تردید کی ہے۔

(۶) علماء دیوبند کون ہیں اور کیا ہیں۔
از مولانا ضیاء الرحمٰن فاروقی (پاکستان)

یہ ان کی ایک تقریر ہے جسمیں انہوں نے انگریزوں کی آمد سے لے کر آزادی تک علماء کی قربانیوں کا تذکرہ کیا ہے مگر تاریخی اغلاط کا پلندا ہے۔

(۷) تحریک آزادی ہند میں مسلم علماء اور عوام کا کردار
از مفتی محمد سلمان منصور پوری

تعارف شخصیات: از معز الدین احمد قاسمی۔

کتاب سوال و جواب کے انداز میں ہے موضوع سے متعلق کچھ عام بنیادی معلومات فراہم کرتی ہے۔ تعارف شخصیات محنت سے تیار کیا گیا ہے۔ یہ تقریباً نصف حصہ کتاب پر مشتمل ہے۔

(۸) تحریک آزادی ہند اور علماء کرام لجنۃ العلماء کرناٹک (بنگلور)

چند معروف مجاہدین کا سرسری تذکرہ ہے۔

ان کے علاوہ مفتی انتظام اللہ شہابی کی مشہور کتابیں، ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء، غدر کے چند علماء۔ ان کتابوں کا تعلق ۱۸۵۷ء سے ہے۔ دوسری جلد میں انشاء اللہ سن ستاون پر لکھی ہوئی کتابوں کا جائزہ لیا جائے گا۔

جدید تحقیق کی ضرورت

اس سرسری جائزہ سے اندازہ ہوا ہوگا کہ ان میں سے کوئی کتاب جامع نہیں کہی جاسکتی نہ وہ کتابیں جو تمام مسلمانوں کے کردار سے متعلق لکھی گئی ہیں اور نہ وہ جن میں خاص علماء کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ پرتگالیوں سے علماء کی محاذ آرائی کو تحریک آزادی پر قلم اٹھانے والے ہر مصنف نے یکسر نظر انداز کر دیا ہے گویا وہ تحریک آزادی کا حصہ ہی نہیں حالانکہ اس کی حیثیت بالکل اساس کی ہے اس کے ذکر کے بغیر ہماری تحریک آزادی کی تاریخ کیسے مکمل ہوسکتی ہے۔ اور پھر اٹھارہ سو ستاون ہی کو عام طور پر مورخین نے جنگ آزادی کا نقطۂ آغاز قرار دیا ہے، اس سے انکار نہیں کہ یہ پہلی عوامی جنگ ہے جو اتنے بڑے پیمانہ پر لڑی گئی، مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ اس سے پہلے ہماری تاریخ جنگ آزادی کے کارناموں سے پوری طرح خالی ہے، البتہ مؤرخین نے سراج الدولہ اور سلطان ٹیپو کو اسی زاویہ سے دیکھا جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے، اور خاص علماء کے کردار پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی تو انہیں صرف شاہ عبدالعزیز کا فتویٰ نظر آیا اور اسی پس منظر میں کچھ مؤرخین نے سید احمد شہید کی تحریک کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے اور بس، اس کے علاوہ ہندوستان کے طول و عرض میں سن ستاون سے پہلے علماء نے تحریک آزادی کے سلسلہ میں جو نا قابل فراموش کارنامے انجام دیئے اور جو انمٹ نقوش رقم کئے ہیں وہ کس طرح نظر انداز ہوئے ان کو کیوں درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا؟ اسی ملی اور قومی وملکی

ضرورت کے پیش نظر اس ہیچمداں نے اپنی ناتوانی کے باوجود یہ بیڑا اٹھایا ہے کہ کم سے کم مسلمانوں کے صرف ایک طبقہ کا جو سب سے اہم ہے اور ہندوستانی معاشرہ میں آج سب سے زیادہ ترچھی نظروں سے جس کو دیکھا جارہا ہے کردار تفصیل و تحقیق کے ساتھ پوری طرح آشکارا ہو جائے۔ ضرورت ہے کہ کوئی صاحب علم اور صاحب قلم اٹھے اور پوری تحقیق کے ساتھ تحریک آزادی میں مسلمانوں کے ہر ہر طبقہ کے کردار کو واضح کرے۔ شاید علماء کو اس سے اختلاف نہ ہو کہ موجودہ حالات میں اس کی حیثیت فرض کفایہ کی ہوگئی ہے۔ اسی طرح ضرورت ہے کہ مسلم مجاہدین آزادی پر مشتمل ایک جامع ڈائرکٹری تیار کی جائے جسمیں نام بنام تحریک آزادی میں کسی بھی طرح حصہ لینے والے مسلمانوں کا ریکارڈ درج ہو۔ (۱)

خیال تھا کہ ابواب کتاب پر ایک نظر ڈالوں تا کہ چند صفحات میں اس کا خلاصہ بلکہ امتیاز سامنے آجائے مگر خوف طوالت قدم قدم پر عناں گیر ہورہا ہے۔

فیصل احمد بھٹکلی ندوی

ندوۃ العلماء لکھنؤ

۲۰؍رجب ۱۴۲۳ھ مطابق ۲۸؍ستمبر ۲۰۰۲ء

(۱) چند سال پہلے جب میں نے اس کام کا آغاز کیا ایک دن ایک کتاب شہیدان آزادی پر نظر پڑی معاً خیال ہوا کہ اسمیں ان مسلمان مجاہدین آزادی کا تذکرہ ہوگا جو جنگ آزادی میں کام آئے۔ کتاب کھولی تو بڑی مایوسی ہوئی کہ مسلمانوں کو بادل نخواستہ جگہ دی گئی تھی کئی کئی صفحات کے بعد کہیں کہیں مسلمانوں کا نام نظر آتا ہے۔

اگر ہندو کی کوشش کا وطن کے رُخ پہ غازہ ہے
مسلماں کے لہو سے بھی وطن کا باغ تازہ ہے

فطرتؔ بھٹکلی

باب اول

جنگ آزادی اسلامی نقطۂ نظر سے

پہلی فصل : انسان کا مقام اور آزادی کی انسانی اہمیت

دوسری فصل : اسلام میں آزادی کی اہمیت

تیسری فصل : اجتماعی آزادی اور اسلام
اور حب الوطنی کی شرعی حیثیت

چوتھی فصل : علماء اسلام اور فرنگی استعمار

متی استعبدتم النــاس وقــد
ولدتـهم أمـهاتـهم احراراً

○———— عمر بن الخطابؓ

تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنا رکھا ہے جب کہ
وہ اپنی ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوئے ہیں۔

پہلی فصل

انسان کا مقام اور آزادی کی انسانی اہمیت

انسان کی فطری آزادی اور دیگر مخلوقات میں اس کا مقام

انسان اپنی فطرت سے ایک آزاد مخلوق ہے، اللہ نے اس کو آزاد پیدا کیا ہے اور اس کا منشا یہی ہے کہ وہ آزاد رہے، دیگر مخلوقات میں اسے امتیاز بخشا ہے اور سب سے معزز و مکرم قرار دیا ہے۔

ولقد كرمنا بني آدم و حملنا هم في البر والبحر ورزقنا هم من الطيبات و فضلنا هم على كثير ممن خلقنا تفضيلاً (بني اسرائيل، ٧٠)

ہم نے اولاد آدم کو عزت دی، اور خشکی وتری میں ان کی سواری کا انتظام کیا اوران کو نفیس اور پاکیزہ چیزیں عطا فرمائیں اور اپنی بہت سی مخلوقات میں ان کو نمایاں فوقیت دی۔

سورج اور چاند اس کے لئے بنائے، رات اور دن اس کے لئے نکالے، ہوائیں اس کے لئے چلائیں پانی کے چشمے اور نہریں اس کے لئے نکالیں۔

وسخر لكم الفلك لتجرى فى البحر بأمره وسخر لكم الأنهار، وسخر لكم الشمس والقمر دائبين وسخر لكم الليل والنهار (ابراهيم ٣٢، ٣٣)

اور اللہ نے کشتی کو تمہارے لئے مسخر کیا تاکہ وہ اسکے حکم سے سمندر میں چلے، اور دریاؤں کو تمہارے لئے مسخر کر دیا، اور تمہارے لئے سورج اور چاند کو مسخر

کر دیا جو برابر چلتے رہتے ہیں۔ اور رات اور دن کو تمہارے لئے مسخر کر دیا۔
بلکہ پوری کائنات کو ان کے لئے مسخر کیا اور ان کے کام میں لگا دیا ہے۔

وسخر لكم ما في السموات و مافي الأرض جميعاً منه (الجاثيه، ۱۳)

آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب کو اس نے اپنی طرف سے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔

ألم تروا أن الله سخر لكم ما في السمٰوٰت و ما في الأرض وأسبغ عليكم نعمه ظاهرة و باطنة (لقمان، ۲۰)

کیا تمہیں نہیں معلوم کہ اللہ نے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں تمل کر دی ہیں۔

یہ سب اس لئے کیا تا کہ انسان سب کی غلامی سے آزاد ہو کر خدائے واحد کی بندگی میں لگ جائے۔

بنی اسرائیل کی غلامی اور موسیٰ علیہ السلام کی بعثت

جب اس کی آزادی میں کوئی چیز رکاوٹ بن جاتی ہے۔ جب انسان نوع انسان کا شکاری ہو جاتا ہے اور اپنے ہم جنس انسانوں کو اپنا غلام سمجھنے لگتا ہے تو خدا کی غیرت جوش میں آتی ہے اور وہ ان کی نجات دہی کے لئے کسی اپنے محبوب بندے کو بھیجتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا ایک اہم مقصد بنی اسرائیل کو غلامی سے بچانا اور فرعون کے پنجۂ خونیں سے نجات دلانا تھا۔ بعثت موسیٰ کی غرض و غایت کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ خود فرماتا ہے:

إن فرعون علا في الأرض، و جعل أهلها شيعاً يستضعف طائفة منهم يذبح أبنائهم ويستحي نسائهم إنه كان من المفسدين۔ و نريد أن نمن على الذين

استضعفوا فی الأرض و نجعلهم أئمة و نجعلهم الوارثین، و نمکن لهم فی الأرض و نری فرعون وهامان وجنودهما منهم ماکانوا یحذرون

(القصص، ٤-٦)

فرعون ملک (مصر) میں بہت چڑھ گیا تھا اور اس نے وہاں کے باشندوں کو کئی گروہوں میں بانٹ رکھا تھا ان میں سے ایک گروہ کو وہ کمزور سمجھ کر ان کے لڑکوں کو ذبح کرتا تھا اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دیتا تھا، وہ بڑا مفسد تھا، اور ہم چاہتے تھے کہ ان لوگوں پر جو ملک میں کمزور سمجھے جارہے تھے احسان کریں اور انہیں پیشوا بنائیں اور انہیں وہاں کا وارث بنادیں، اور اس سرزمین میں انہیں حکومت دیں، اور فرعون ہامان اور ان کے لشکروں کو ان کے ہاتھ سے وہ دکھادیں جن کا ان کو خطرہ تھا۔

موسیٰ علیہ السلام جلیل القدر نبی تھے انہوں نے آتے ہی فرعون سے سب سے پہلا جو مطالبہ کیا وہ یہ کہ بنی اسرائیل کو رہائی دے کر میرے ساتھ جانے دے(۱)۔

فأرسل معی بنی إسرائیل (الاعراف / ۱۰۵) دوسری جگہ ہے۔ فأرسل معنا بنی إسرائیل (طه/۴۷) اور ایک جگہ ہے۔ أن أرسل معنا بنی إسرائیل (الشعراء / ۱۷) اور سورہ دخان میں ہے۔ أن أدوا الیّ عباد الله، یعنی اللہ کے بندوں کو جو تم نے اپنا غلام بنا رکھا ہے میرے حوالے کردو۔

غور طلب بات ہے کہ فرعون جو خبیث ترین مشرک بلکہ خود مدعی الوہیت تھا گناہوں میں سرتاپا ملوث اور بدباطنی کا سب سے اعلیٰ مظہر تھا، مگر موسیٰ علیہ السلام نے پہلے اس سے کفر و شرک سے توبہ کرنے اور معاصی سے دور رہنے کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ

---

(۱) قرآن کی بیشتر آیات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰؑ نے سب سے پہلا مطالبہ بنی اسرائیل کی حوالگی کا کیا تھا اس کا مطلب یہ نہیں کہ صرف اسی لئے وہ بھیجے گئے تھے بلکہ فرعون کو راہ راست پر لانا بھی ان کا بنیادی مقصد تھا" إذهب إلی فرعون إنه طغی فقل هل لک إلی أن تزکی و أهدیک إلی ربک فتخشی (النازعات/۱۹-۲۰) اور إذهبا إلی فرعون أنه طغی. فقولا له قولاً لیناً لعله یتذکر أو یخشی (طه/ ۴۳-۴۴) جیسی آیتوں سے معلوم ہوتا ہے۔

سب سے پہلا مطالبہ بنی اسرائیل کی حوالگی کا تھا جن کو اس نے غلام بنا رکھا تھا۔ بنی اسرائیل بے بس تھے۔ اس نے ان کے پاؤں میں محکومی و غلامی کی زنجیریں ڈال دی تھیں موسیٰ علیہ السلام نے سب سے پہلے آزادی کا مطالبہ کیا اور فرعون کی صفت استبداد کا شکوہ کیا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دین الٰہی میں آزادی کی اہمیت کیا ہے۔

آخری آیت میں ''عباداللہ'' کا لفظ خاص معنیٰ رکھتا ہے کہ یہ صرف اللہ کے بندے اور اسی کے غلام ہیں تیرے غلام نہیں بن سکتے میرے حوالہ کر، میں انہیں خدا کی غلامی کی تعلیم دوں گا۔

موسیٰ علیہ السلام کے دل میں یہ بات اس طرح بیٹھی ہوئی تھی کہ جب فرعون موسیٰؑ پر کئے اپنے احسانات جتانے لگا تو موسیٰؑ نے فوراً کہہ دیا۔ وتلك نعمة تمنها علي أن عبدت بني إسرائيل (الشعراء / ۲۲) یعنی جس پوری قوم کو تو نے غلام بنا رکھا ہے اس کے ایک فرد کی پرورش کر کے تو نے کونسا احسان کیا؟ میری پوری قوم تیرے ظلم کی چکی میں پس رہی ہے۔

قوم کی اسی حالت زار کی وجہ سے موسیٰ نے اسرائیلی اور قبطی کے جھگڑے میں تحقیق کی ضرورت محسوس کئے بغیر قبطی پر ہاتھ صاف کیا تھا۔

نبی آخرالزماں کی بعثت کے وقت بنی نوع انسان کی غلامی

جس طرح موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو غلامی سے چھڑانے آئے تھے اسی طرح حضور اکرم ﷺ پوری نوع انسانی کا نجات دہندہ بن کر آئے تھے، آپ کی بعثت کے وقت بازنطینی اور ساسانی سلطنتوں نے عوام کو بری طرح جکڑ رکھا تھا، ان سے بھاری بھاری ٹیکس لئے جاتے، رشوتیں اور نذرانے وصول کئے جاتے۔ پھر اوپر سے بیگار لی جاتی تھی۔ انسانیت کے گلے میں انسانوں کی غلامی کا جوا تھا جس کے بوجھ سے وہ دبی جا رہی تھی، اس کی آہ و کراہ سے فلک میں شگاف پڑ رہے تھے، انسان تشدد و غلامی کی خوفناک فضا میں سانس لے رہا تھا اور بقول دیگرے وہ ایک ایسے آہنی قفس میں بند تھا جس میں کوئی روزن کسی طرف نہیں کھلتا تھا۔ ایسے مہیب حالات میں آپ تشریف لائے اور

دنیا کو انسانوں کی غلامی سے نکل کر خدائے واحد کی غلامی اختیار کرنے کی دعوت دی۔ آپ نے انسانیت کی گردن سے ظلم وستم کا جوا اتار پھینکا اور طوق وسلاسل کو توڑ دیا۔ انسانوں کو ان کی چھنی ہوئی آزادی واپس دلائی۔

دوسری فصل

اسلام میں آزادی کی اہمیت

آپ جو دین لے کر آئے یعنی ''اسلام'' وہ ایک آزاد مذہب ہے، اس کے خمیر میں آزادی پسندی داخل ہے، اس نے صدیوں سے جاری غلامی پر قدغن لگائے قرآن نے کتنی آیتوں میں غلاموں پر خرچ کرنے اور ان کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کی تاکید کی ہے، مندرجہ ذیل آیات پر ایک نظر ڈالی جائے :

(۱) و آتی المال علی حبه ذوی القربیٰ و الیتامیٰ و المساکین و ابن السبیل، و السائلین وفی الرقاب .... أولٰئک الذین صدقوا و أولٰئک هم المتقون (البقرة / ۱۷۷)

(۲) إنما الصدقات للفقراء و المساکین .... وفی الرقاب (التوبه/ ۶۰)

(۳) و اعبدوا الله و لاتشرکوا به شیئاً و بالوالدین إحساناً و بذی القربیٰ و الیتامیٰ و المساکین .... و ما ملکت أیمانکم. (النساء / ۳۶)

(۴) و أنکحوا الأیامیٰ منکم و الصالحین من عبادکم و إمائکم (النور / ۳۱)

(۵) و الذین یبتغون الکتاب مما ملکت أیمانکم فکاتبوهم إن علمتم فیهم خیراً و آتوهم من مال الله الذی أتاکم. (النور / ۳۳)

(۶) فلا اقتحم العقبة. و ما أدراک ما العقبة. فک رقبة (البلد/ ۱۱ — ۱۳)

اتنا ہی نہیں بلکہ اس نے کتنے گناہوں کا کفارہ غلام کی آزادی کو قرار دیا ہے اور کتنے موقعوں پر تحریر رقبہ (غلام کو آزاد کرنا) کو مصیبتوں کا حل بتایا ہے۔ قتل مومن (عمداً تو قطعی حرام، غلطی سے اگر ہو جائے تو اس) کا کفارہ اس کو قرار دیا ہے:

وما كان لمومن أن يقتل مومناً إلا خطأ و من قتل موماً خطأ فتحرير رقبة مومنة و دية مسلمة إلى أهله.......... الآية (النساء / ۹۲)

قسم پوری نہ کرنے پر اس کو متبادل بتایا ہے:

لايؤاخذ كم الله باللغو في أيمانكم و لكن يؤاخذ كم بما عقدتم الأيمان فكفارته إطعام عشرة مساكين من أوسط ماتطعمون أهليكم أو كسوتهم أو تحرير رقبة.

(المائدة / ۸۹)

ظہار (۱) میں بھی یہی حکم دیا گیا ہے۔

والذين يظاهرون من نسائهم ثم يعودون لما قالوا فتحرير رقبة من قبل أن يتماسا (۲). (المجادلة / ۳)

غلاموں کے لئے آزادی رائے کا اختیار

اسلام نے لوگوں میں آزادی کی جو روح پھونکی تھی اس کی تفصیل بیان کرنے لگوں تو کئی صفحات سیاہ ہو جائیں، حدیث و سیرت کی کتابوں میں سینکڑوں واقعات ملتے ہیں۔ آزاد تو آزاد شرعی حیثیت سے جو غلام تھے ان تک کو حضور ﷺ نے آزادی رائے کا پورا اختیار دے رکھا تھا، اور مرد ہی نہیں غلام عورتیں تک بڑی جرأت کے ساتھ آپ سے ہم کلام ہوتیں اور مباحثہ کرتی تھیں۔ نمونہ کے لئے حضرت بریرہؓ کا واقعہ کافی ہے جو صحیح بخاری (۳) میں موجود ہے۔ آپ نے شوہر سے مراجعت کے سلسلہ میں ان سے

(۱) ظہار کی تعریف اور احکام کے لئے کتب فقہ سے رجوع کیا جائے۔

(۲) میں نے اختصار کے پیش نظر صرف آیات کی جانب اشارہ کیا ہے، ترجمہ و تشریح کے لئے تفسیر کی کتابیں دیکھی جائیں۔

(۳) دیکھئے صحیح بخاری کتاب الطلاق باب شفاعة النبی ﷺ فی زوج بریرة حدیث نمبر ۵۲۸۳۔

فرمایا "لو راجعته ؟ قالت یا رسول اللہ تأمرنی؟ قال إنما انا أشفع، قالت فلا حاجة لی فیه، یعنی رجوع کرلوانہوں نے کہا اے اللہ کے رسول یہ آپ کا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں، میں تو سفارش کر رہا ہوں انہوں نے کہا تب تو مجھے ان کی کوئی ضرورت نہیں۔

غرض شخصی آزادی کے سلسلہ میں اسلام نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں ان کی تفصیل کا یہ موقع نہیں حدیث کی اکثر کتابوں میں کتاب العتق کے نام سے مستقل ابواب ہیں۔

آزادی کی بقاوحفاظت کے لئے حضرت عمرؓ کے کارنامے

اسی وجہ سے حضرت عمر نے جو سب سے زیادہ اسلام کا منشا سمجھنے والے تھے جب انہیں اسلامی احکام کے نفاذ کا پورا موقع ملا تو انہوں نے غلامی کا رواج کم سے کم کرنے کی پوری کوشش کی۔ کتنے واقعات ہیں کہ جن کو غلام بنایا گیا تھا حضرت عمر نے جا بجا سے ان کو جمع کر کے ان کے ملکوں میں واپس بھیج دیا۔(۱)

وہ مکاتبت کو ضروری قرار دیتے تھے۔ مکاتبت یہ ہے کہ غلام اپنے آقا سے زر معینہ پر معاہدہ کرے کہ اتنی مدت میں ادا کردوں گا۔ جب وہ ادا کرتا ہے تو پورا آزاد ہوجاتا ہے۔ حضرت انس کے غلام سیرین نے مکاتبت کی درخواست کی حضرت انسؓ نے انکار کر دیا، حضرت عمرؓ کو علم ہوا تو انسؓ کو درے لگوائے۔(۲)

غلاموں کی عیادت کو نہ جانے پر حضرت عمر اپنے عمال کو معزول وموقوف تک کر دیتے تھے یہاں تک سرداران فوج کو لکھ بھیجا کہ تمہارا کوئی غلام کسی قوم کو امان دے تو وہ امان تمام مسلمانوں کی طرف سے سمجھی جائے گی اور فوج کو اسکا پابند ہونا پڑے گا۔(۳)

فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص کے ایک لڑکے نے ایک موقع پر ایک مصری کو ناحق مارا، حضرت عمر سے اس نے شکایت کی، حضرت عمر نے حضرت عمرو بن العاص کو خط لکھا کہ فوراً اپنے لڑکے کے ساتھ حاضر ہو جائیں۔ وہ آئے، حضرت عمر نے اس مصری

(۱) دیکھئے الفاروق صفحہ ۲۱۵ تا ۲۱۷ کتب خانہ حمیدیہ دہلی، ۱۹۶۸ء۔
(۲) صحیح بخاری، کتاب المکاتبہ، باب المکاتبہ ونجومہ۔
(۳) دیکھئے الفاروق صفحہ ۲۱۹۔۲۲۰۔

کے ہاتھ میں درہ دیا اور کہا مارو اس شریف زادے کو صاحبزادگی جتاتے ہیں، اس نے مارا، کاری زخم آئے، حضرت عمر نے پھر اس سے کہا کہ عمرو بن العاص کو بھی مارو کہ لڑکے نے باپ کے اثر و رسوخ کی وجہ سے ہی یہ جرأت کی ہے، مگر اس نے انکار کیا، اس کے بعد حضرت عمر نے عمرو بن العاص سے مخاطب ہو کر کہا "متی استعبدتم الناس وقد ولدتهم أمهاتهم أحراراً" یعنی کب سے تم نے لوگوں کو غلام بنا رکھا ہے حالانکہ ان کی ماؤں نے انہیں آزاد جنا ہے۔(۱)

تیسری فصل

اجتماعی آزادی اور اسلام اور حب وطن کی شرعی حیثیت

اس سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ اسلام نے نفس آزادی پر کتنا زور دیا ہے، اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس مذہب نے افراد کی غلامی کو اتنا شنیع سمجھا ہو پوری پوری قوموں کی غلامی کو وہ کیسے برداشت کر سکتا ہے بلکہ انسان کی گردن پر جتنے طوق انسان نے ڈالے تھے ان کو کاٹ دینا تو بعثت نبوی کے مقاصد میں سے تھا جیسا کہ "ویضع عنهم إصرهم و الأغلال التي كانت عليهم (الاعراف/۱۵۷) سے معلوم ہوتا ہے یعنی نبی ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جس سے وہ دبے ہوئے تھے اور ان بیڑیوں کو توڑتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔

اسلام نے انسانوں کی بندگی سے آزادی دلانے کے ساتھ اپنے پیروکاروں کو یہ منصب بھی دیا کہ تم لوگوں کو آزادی بخشنے والے اور ملکوں کو بند استبداد سے نجات دلانے والے ہو، جس کے دین کی حقیقت "احتساب کائنات" ہو وہ غلام کیوں کر رہ سکتا ہے اللہ فرماتا ہے:

وكذلك جعلناكم أمة وسطاً لتكونوا شهداء على الناس و يكون الرسول عليكم شهيداً

(البقرة / ۱۴۳)

---

(۱) سیرۃ عمر بن الخطاب لابن الجوزی صفحہ ۸۶۔

ہم نے تم کو ایک معتدل امت بنایا تا کہ تم لوگوں پر گواہ رہو اور رسول تم پر گواہ رہیں۔

وہ اپنے کو ''شہادت علی الناس'' کے مقام بلند کا مستحق کیسے ثابت کر سکتا ہے جب وہ خود غلام ہو، یہ بوجھ کیسے سہار سکتا ہے جب وہ خود غلامی کی جگرد بندیوں میں الجھا ہوا ہو

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں :

''غلامی جوہر آدمیت کو اس طرح کھا جاتی ہے کہ وہ علانیہ اپنی ذلت اور پستی کا مجسم اشتہار بننے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور اس میں شرم محسوس کرنے کے بجائے فخر محسوس کرتے ہیں، اسلام جو انسان کو پستیوں سے اٹھا کر بلندی کی طرف لے جانے آیا ہے ایک لمحہ کے لئے بھی اس کو جائز نہیں رکھتا کہ کوئی انسانی گروہ ذلت نفس کے اس اسفل السافلین میں گر جائے جس کے نیچے پستی کا کوئی اور درجہ ہے ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عمرؓ کے زمانہ عجمی قومیں اسلامی حکومت کے زیر نگیں آئیں تو آپ نے ان کو سختی کے ساتھ اہل عرب کی نقالی سے روکا، اسلامی جہاد کا مقصد ہی باطل ہو جاتا اگر ان قوموں میں غلامانہ خصائل پیدا ہونے دیئے جائیں، رسول اللہ ﷺ نے عربوں کو اسلام کا پرچم اس لئے نہیں دیا تھا کہ وہ قوموں کے آقا بنیں اور قومیں ان کے ماتحت غلامی کی مشق بہم پہنچائیں''۔(۱)

مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک خطبہ میں کہا تھا کہ دنیا میں صداقت کے لئے جہاد اور انسانوں کو انسانی غلامی سے نجات دلانا تو اسلام کا خدائی مشن ہے۔(۲)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں :

''اسلام کسی ایسے اقتدار کو جائز تسلیم نہیں کرتا شخصی ہو یا چند تنخواہ دار حاکموں کی بیورو کریسی ہو وہ آزادی اور جمہوریت کا ایک مکمل نظام ہے جو نوع انسانی کو اس کی چھنی ہوئی آزادی واپس دلانے کے لئے

(۱) تحریک آزادی ہند اور مسلمان حصہ اول صفحہ ۳۷۵-۳۷۶۔

(۲) تحریک آزادی از مولانا آزاد۔ صفحہ ۱۴

آیا تھا، یہ آزادی بادشاہوں، اجنبی حکومتوں، خود غرض مذہبی پیشواؤں اور سوسائٹی کی طاقتور جماعتوں نے غصب کر رکھی تھی، وہ سمجھتے تھے کہ حق طاقت اور قبضہ ہے لیکن اسلام نے ظاہر ہوتے ہی اعلان کیا کہ حق طاقت نہیں بلکہ خود حق ہے اور خدا کے سوا کسی کو روا نہیں کہ بندگان خدا کو اپنا محکوم اور غلام بنائے۔" (۱)

اللہ نے مسلمانوں کو حکومت و خلافت اور دنیا کی امامت اس لئے نہیں دی تھی کہ وہ بزور قوت اپنی حاکمیت منوائیں اور قوموں کی گردنوں میں اپنی محکومیت اور غلامی کا قلادہ ڈال دیں بلکہ یہ منصب صرف اس لئے ملا تھا کہ وہ سسکتی، بلکتی، کراہتی اور اپنے ہم جنسوں کے ظلم وستم سے دم توڑتی انسانیت کو اللہ کے عادلانہ نظام کے راحت بخش سایہ میں پہنچا دیں۔ انسان کو بحیثیت انسان اس کے مقام سے آشنا کرائیں اور انسانوں کی غلامی سے نجات دے کر اللہ کی بندگی و غلامی کی حقیقت سمجھائیں۔

حضرت ربعی بن عامرؓ نے اس حقیقت کو خوب واضح کیا ہے، ایران کے سپہ سالار اعظم رستم کے سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا تھا:

الله ابتعثنا لنخرج من شاء من عبادة العباد إلى عبادة الله وحده و من ضيق الدنيا إلى سعتها و من جور الأديان إلى عدل الإسلام (۲)

اللہ نے ہمیں اس لئے بھیجا ہے تاکہ ہم جسے وہ چاہے بندوں کی بندگی سے نکال کر خدائے واحد کی بندگی میں لے آئیں اور دنیا کی تنگی سے نکال کر اس کی وسعتوں اور ادیان و مذاہب کے جور وستم سے نکال کر اسلام کے عدل وانصاف کے سایہ میں جگہ دیں۔

اسی لئے اسلام اس عدل کی یافت اور بندوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لئے جنگ کی ترغیب دیتا ہے۔ جب ایک انسانی طبقہ پر ظلم ہو رہا ہو، اور وہ آزادی کے لئے دہائی دے رہے ہوں تو اسلام مسلمانوں کو خاموش بیٹھنے کی اجازت نہیں دیتا۔

---

(۱) تحریک آزادی۔ صفحہ ۴۰

(۲) البداية و النهاية ۔ ۴۹/۷

بلکہ اس طرح جھنجھوڑتا ہے :

وما لكم لا تقاتلون فی سبيل الله والمستضعفين من الرجال والنساء والولدان الذين يقولون ربنا أخرجنا من هذه القرية الظالم أهلها۔ (النساء / ٧٥)

اورتم کو کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کے راستہ میں لڑتے نہیں اوران کمزور و مغلوب مردوں عورتوں اور بچوں کی خاطر جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو اس بستی سے نکال جہاں کے لوگ ظالم ہیں۔

اسی طرح جب وطن و دیار سے نکالا جارہا ہو اس پر دست درازی ہو رہی ہو اور خویش و تبار سے جدا کیا جارہا ہو تو اسلام لڑکر اپنا حق لینے پر آمادہ کرتا ہے۔

وما لنا أن لا نقاتل فی سبيل الله و قد أخرجنا من ديارنا و أبنائنا۔ (البقرة / ٢٤٦)

اور ہمیں کیا ہو گیا ہے کہ ہم اللہ کے راستہ میں جنگ نہ کریں جب کہ ہمیں نکالا جاچکا ہے اپنے گھروں سے اوراپنی اولاد سے۔

وطن سے لگاؤ ایک فطری چیز ہے اسلام اس پر قدغن نہیں لگاتا البتہ اس کا رخ متعین کرتا ہے، وہ وطن پرستی نہیں وطن دوستی کی تعلیم دیتا ہے یہاں تک کہ ایک روایت بیان کیجاتی ہے، "حب الوطن من الايمان"(۱) یعنی وطن کی محبت ایمان کا حصہ ہے۔ خود حضور ﷺ کو اپنے وطن مکہ معظمہ اور پھر مدینہ منورہ سے جو محبت تھی اس کا بھی ذکر صحیح احادیث میں ملتا ہے۔ حضرت ابن عباس کی روایت ہے کہ ایک دفعہ آپ نے مکہ کو مخاطب کر کے فرمایا :

ما أطيبك من بلدٍ و ما أحبَّكِ إلىَّ، ولو لاأن قومی أخرجونی منكِ ما سكنت غيرَك (۲)

---

(۱) اس روایت کے بارے میں سخاوی کہتے ہیں "لم أقف عليه و معناه صحيح (المقاصد الحسنة ص ۱۸۳ حدیث نمبر ۳۸۶۔) اس روایت کی اسنادی اور معنوی حیثیت کی تفصیل کے لئے دیکھئے البعث الاسلامی جلد نمبر ۴۷ شمارہ نمبر (۱) مضمون "حب الوطن من الايمان" بقلم الدکتور محمد بن سعد الشویعر ص ۲۸ تا ۳۶۔

(۲) جامع الترمذی، کتاب المناقب، باب فی فضل مکہ، حدیث نمبر ۳۹۲۶

تو کتنا پاکیزہ شہر ہے اور مجھے کتنا محبوب ہے، اگر میری قوم تیرے اندر سے مجھے نہ نکالتی تو میں دوسرے شہر میں کبھی نہ رہتا۔

پھر آپ نے مدینہ منورہ میں سکونت فرمائی تو مدینہ سے اسی طرح محبت کرنے لگے بلکہ خدا سے دعا کی اللّٰھم حَبّب إلینا المدینة کحبنا مکة أو أشد (۱)

یعنی اے اللہ جس طرح ہمیں مکہ سے محبت ہے ویسے ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ مدینہ کی محبت ہمارے دل میں ڈال دے۔

بلکہ جہاں آپ رہتے تھے وہاں کی ایک ایک چیز آپ کو محبوب تھی، احد پہاڑ کی نسبت آپ کا یہ فقرہ حدیث کی مختلف کتابوں میں موجود ہے ھذا جبل یحبنا و نحبه "یہ پہاڑ جو ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم جس سے محبت کرتے ہیں (۲)۔ جس نبی کے جذبات حب وطن یہ ہوں اس کے امتی ان جذبات سے کیسے عاری ہو سکتے ہیں۔

وطن کی محبت، ملک اور باشندگان ملک کی خیر خواہی، اس کے مفادات کا تحفظ، اس کے استحکام کی فکر اور حقوق کی حفاظت کے لئے کی جانے والی جدوجہد سے عبارت ہے۔

اسلام میں اجتماعی آزادی کی اہمیت کے پیش نظر ایک آزاد اسلامی اسٹیٹ کے قیام پر بہت زور دیا گیا ہے جہاں پوری آزادی اور بے خوفی کے ساتھ احکام اسلام پر عمل ہو سکے اور شعائر الہیہ کی تعظیم واحترام میں کوئی چیز رکاوٹ نہ بن سکے، اگر کوئی اسلامی سرحد پر دست درازی کرے تو اسلام کا حکم ہے کہ اس سے مقابلہ کرو اور سرحد اسلام کی پوری حفاظت کرو چنانچہ ارشاد ربانی ہے :

یا أیها الذین اٰمنوا اصبروا و صابروا و رابطوا (آل عمران / ۲۰۰)

اللہ مسلمانوں کو حکم دے رہا ہے کہ حدود اسلام کی حفاظت میں لگے رہو اور جہاں سے دشمن کے چڑھ آنے اور اسلامی ملک پر فوج کشی کا خطرہ ہو وہاں آہنی دیوار کی طرح سینہ سپر ہو کر ڈٹ جاؤ، بالکل کمزوری نہ دکھاؤ اور اسلامی سرحدوں پر آنچ نہ آنے دو۔

---

(۱) صحیح البخاری کتاب فضائل المدینہ حدیث نمبر ۱۸۹، پھر مدینہ کی چیزوں میں خیر وبرکت کے لئے آپ نے جو دعائیں کی ہیں وہ حدیث کی مختلف کتابوں میں موجود ہیں۔ ان سے بھی آپ کے جذبہ حب وطن پر روشنی پڑتی ہے۔

(۲) مثلاً ملاحظہ ہو صحیح بخاری کتاب الجهاد، باب فضل الخدمة في الغزو.

دوسری طرف حدیث کی کتابیں سرحد کی حفاظت کے فضائل سے بھری پڑی ہیں ایک روایت میں ہے۔ رباط یوم فی سبیل اللہ خیر من الدنیا و مافیھا. (۱) (یعنی اللہ کے راستہ میں ایک دن سرحد کی حفاظت میں گزارنا دنیا اور اس کی ساری چیزوں سے بہتر ہے) کہیں اس کا اور مہینہ بھر روزہ رکھنے والے کا درجہ ایک بتایا گیا ہے۔ کہیں اس کو اور ایک ہزار راتیں اللہ کی عبادت میں مشغول رہنے والے کو ایک صف میں کھڑا کیا گیا ہے۔ کہیں اس پر عذاب قبر سے نجات کی بشارت دی گئی ہے۔ (۲)

اور پھر جان و مال کی حفاظت کی خاطر جنگ آزادی لڑی جاتی ہے اور جان و مال کی حفاظت میں مارا جانا عین شہادت ہے۔ صحاح ستہ کی ہر کتاب میں رسول اکرم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی موجود ہے "من قتل دون مالہ فھو شھید" یعنی جو اپنے مال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے اور ایک روایت میں ہے۔ من قتل دون دمہ فھو شھید (۳) جو اپنی جان کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے۔

یہی نہیں بلکہ مسلمان دراصل یہ جنگ اپنے دین و ایمان کی سلامتی کے لئے لڑتا ہے جس کے حق میں یہ مژدہ جانفزا سنایا گیا ہے۔ "من قتل دون دینہ فھو شھید" اور کون صاحب ایمان ہوگا جو ایسی جنگ سے علاحدگی پسند کرے گا جو متعدد بشارتوں کی حامل اور کئی کئی شہادتوں پر مشتمل ہو۔

غرض اسلام ہر حال میں دفع ظلم اور حصول آزادی کے لئے لڑنے پر ابھارتا ہے بقول مولانا ابوالکلام آزاد اسلام کی تعلیم اس کتاب میں موجود ہے جو کسی حال میں بھی جائز نہیں رکھتی کہ آزادی کھو کر مسلمان زندگی بسر کریں، مسلمانوں کو مٹ جانا چاہیئے یا

---

(۱) صحیح بخاری کتاب الجھاد باب فضل رباط یوم فی سبیل اللہ حدیث نمبر ۲۸۹۲۔

(۲) اس قسم کی متعدد روایتیں حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں ہم نے اختصار کے پیش نظر حدیث کے الفاظ نقل کئے بغیر ان کے مرکزی مضمون کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔

(۳) سنن نسائی کتاب المحاربۃ باب من قاتل دون دینہ حدیث نمبر ۴۱۰۶ پوری روایت اس طرح ہے عن سعید بن زید قال قال رسول اللہ ﷺ: من قتل دون مالہ فھو شھید و من قتل دون أھلہ فھو شھید و من قتل دون دینہ فھو شھید و من قتل دون دمہ فھو شھید. ابو داود میں بھی یہ روایت موجود ہے۔

آزاد رہنا چاہئے تیسری راہ اسلام میں کوئی نہیں۔(۱)

نحن أناس لا توسط بيننا
لنا الصدر دون العالمين أو القبر

چوتھی فصل

علماء اسلام اور فرنگی استعمار

اسلام کی اسی واضح تعلیم کی وجہ سے علماء نے فرنگیوں کو ہمیشہ بہت خطرناک سمجھا، حافظ ابن کثیر نے جس اضطراب اور بے چینی کے ساتھ فرنگیوں کی عالم اسلام پر یلغار اور ان سے عزم جہاد کا ذکر کیا ہے اس سے علماء اسلام کے استعمار مخالف خدمات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔(۲)

ہندوستانی علماء شروع دن سے فرنگیوں کو جس نظر سے دیکھتے تھے اس کا اندازہ کرنے کے لئے حضرت مجدد الف ثانی کے ایک خط کا یہ فقرہ کافی ہے:

''معرفت خدائے جل وعلا بر آنکس حرام است کہ خود را از کافر فرنگ بہتر داند'' (۳)

یعنی خدا کی معرفت اس شخص پر حرام ہے جو خود کو فرنگی کافر سے بہتر جانے۔

جب اسلامی سلطنت پر دست اندازی کی جارہی ہو، شعائر کی پامالی ہورہی ہو، ظلم

---

(۱) تحریک آزادی صفحہ نمبر ۴۹۔

(۲) دیکھئے البداية والنهاية ۱۴/ ۳۹۱-۳۹۳۔ جب فرنگیوں نے ۷۶۷ھ(۱۳۶۵ء) میں اسکندریہ پر یورش کی تو علماء وقت بہت بے چین ہو گئے امام ابن کثیر نے ''الاجتهاد في طلب الجهاد'' کے نام سے ایک کتاب لکھ کر دمشق کے نائب امیر منجک کی خدمت میں پیش کی تاکہ اس کو دوسرے علاقوں میں بھیج کر مسلمانوں کو جہاد کی تیاری پر آمادہ کریں۔ جمعية النشر والتاليف الازهريه (مصر) نے ۱۹۲۸ میں اس کو شائع کیا تھا۔

(۳) مکتوبات امام ربانی، حصہ چہارم دفتر اول، مکتوب نمبر ۲۶۱ صفحہ ۹۸، مطبع مجددی منشی نبی بخش، امرتسر، ۱۳۳۱ھ

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے جس وقت یہ بات لکھی اس وقت فرنگی عالم اسلام کو لقمہ تر بنانے کی کوشش میں تھے اور ہندوستان میں بھی ان کے منحوس قدم پڑ چکے تھے، ہمارے علماء نے ان کو سب سے بدترین مخلوق گردانا اور مختلف پیرایوں میں ان سے نفرت دلانے لگے۔

کو رواج دیا جا رہا ہو، عزتیں خاک میں مل رہی ہوں تو علماء کیسے نچلے بیٹھ سکتے ہیں، قرآن کی آیتیں انہیں للکار رہی ہوں، احادیث نبویہ انہیں جھنجھوڑ رہی ہوں، سلف کی مثالیں انہیں غیرت دلا رہی ہوں (۱) اس وقت وہ قلم و کتاب چھوڑ کر اور گدی سے منھ موڑ کر تلوار تھام لیتے ہیں اور کفن بردوش میدان جہاد میں کود پڑتے ہیں۔ اس کی سینکڑوں نہیں ہزاروں مثالیں تاریخ اسلام میں ملیں گی۔ (۲)

انیسویں صدی عیسوی میں فرنگیوں نے جب پورے عالم اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو علماء نے عالم اسلام کے طول و عرض میں سامراجیت کے مقابلہ میں جس سرفروشی کا ثبوت دیا وہ تاریخ عالم کا ایک ناقابل فراموش باب ہے، بالخصوص افریقی ممالک میں امیر عبدالقادر الجزائری، شیخ عبدالحمید بن بادیس اور شیخ المشائخ سید احمد سنوسی اور پھر علماء ہند نے اس سلسلہ میں جو نقوش چھوڑے ہیں وہ بھلائے نہیں بھول سکتے۔ انہوں نے ثابت کر دکھایا کہ اسلام سامراجیت کو کبھی قبول نہیں کر سکتا۔

(۱) ہر دور میں علماء کی ایک بڑی تعداد فوج میں رہی ہے۔ امام ابن کثیر بنو امیہ کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ وكان في عساكرهم وجيوشهم في الغزو الصالحون والأولياء والعلماء من كبار التابعين، في كل جيش منهم شرذمة عظيمة ينصر الله بهم دينه. (البداية والنهاية ۹ / ۱۱۷)

(۲) خود امام ابن تیمیہ جیسا زبان و قلم کا بادشاہ تاتاریوں کے مقابلہ میں سیف و سنان کے ساتھ میدان کارزار میں نظر آتا ہے۔

لا يجتمع الإسلام و الميل إلى الاستعمار الأوربي في قلب واحد

شکیب ارسلان

اسلام اور یورپی سامراج کی طرف رجحان ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔

باب دوم

یورپین قومیں ہندوستان میں

پہلی فصل : پرتگیز
دوسری فصل : ڈچ
تیسری فصل : فرانسیسی
چوتھی فصل : انگریز
پانچویں فصل : دیگر فرنگی اقوام

چشمِ عبرت برکشا قدرتِ حق را ببیں
شامتِ اعمالِ ما ایں صورتِ نادر گرفت

نویں صدی ہجری اور پندرہویں صدی عیسوی کا اختتام تھا اور مسلمانوں کا آفتاب اقبال لب بام، یورپ کی شب دیجور سحر ہوتی نظر آرہی تھی، وہ خواب غفلت سے آنکھیں ملتے اور انگڑائی لیتے بیدار ہورہا تھا، عیسائی دنیا نئے دم خم کے ساتھ اگلی صدی میں قدم رکھنے کے لئے بے چین تھی، اس کے بال و پر نکل رہے تھے اور وہ ایک اونچی اڑان کے لئے تڑپ رہی تھی۔

۸۹۸ھ (۱۴۹۲ء) تھا جب اندلس پر ان کا قبضہ مکمل ہوگیا اور مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ پرشکوہ سلطنت کی جڑیں اکھڑ گئیں اور عیسائیوں نے بڑی بے دردی کے ساتھ مسلمانوں کا قتل عام کیا، اندلس کی دولت انکے ہاتھ آئی، وہاں کے آثار ونشانات دیکھے تو ان کی آنکھیں کھل گئیں، ان میں اور لالچ پیدا ہوا، چنانچہ یہیں سے اسی سنہ میں چند مہینوں کے بعد ہسپانوی حکومت نے اطالوی باشندہ کولمبس (Colombus) کو مہم جوئی پر روانہ کیا جس نے نئی دنیا امریکہ کو ڈھونڈ نکالا، ہسپانیہ کی یہ کامیابی دیکھ کر پڑوسی ملک پرتگال کو بھی طمع ہوئی اور اس نے افریقہ کے مغربی سواحل پر قسمت آزمائی شروع کی۔

اندلس کی سلطنت ان کی راہ کا روڑا تھی، اب اس کی فتح کے بعد مطلع صاف ہوگیا تھا اور انہیں پوری دنیا پر عیسائی جھنڈا لہراتا نظر آرہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۴۹۳ء میں پوپ الگزینڈر ششم نے کرہ ارض پر ایک خط کھینچ کر دنیا کے دو حصے کردیئے، مغربی حصہ اسپین کو اور مشرقی حصہ پرتگال کو دے دیا تاکہ وہ غیر معلوم علاقوں کو دریافت کرکے قبضہ کرلیں اسی کا نتیجہ تھا کہ اسپین کی جدوجہد مغرب کی طرف منعطف ہوئی اور پرتگال مشرق کی طرف گامزن ہوا۔(۱)

(۱) تاریخ ہند (برائے انٹرمیڈیٹ) جلد سوم صفحہ ۲۵۷، نیز ہندی مملکت برطانیہ کا عروج اور وسعت صفحہ ۷

پہلی فصل

پرتگیز

دراصل پرتگالیوں نے پندرھویں صدی کی دوسری دہائی میں اپنی مہم جوئی کا آغاز کیا تھا مگر اس اعلان کے شائع ہوتے ہی ان کے جوش وخروش میں بے پناہ اضافہ ہوا اور اس کو باقاعدہ مذہبی حیثیت حاصل ہوگئی۔

۱۴۸۶ء میں پرتگالی جہاز ران برھا ئموڈلیس طوفان کے تھپیڑوں سے راس امید تک پہنچ گیا اور اس طریقے سے بحر ہند کا راستہ دریافت ہوگیا، چنانچہ اس کی بدولت دوسرے سال پیڈرو (Pedro) بحر ہند کے راستے سے ساحل مالابار پہنچ گیا اور اس سے یہ معلوم ہوگیا کہ جنوبی مشرقی راستہ سے ہندوستان پہنچنا آسان ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۴۹۸ء (۹۰۴ھ) میں واسکوڈی گاما (Vasco De Gama) نہایت اطمینان کے ساتھ راس امید کا چکر کاٹ کر بحر ہند میں داخل ہوا اور مئی کے مہینہ میں کالی کٹ کے ساحل پر لنگر انداز ہوا۔

پرتگیز جہاز رانوں کی حیثیت شخصی تاجروں کی نہ تھی بلکہ یہ جہاز راں شاہ پرتگال کے عہدہ دار تھے۔ اسی لئے واسکوڈی گاما کی بخیریت واپسی پر ملک میں سرکاری طور پر خوشی منائی گئی۔ اور اسی وقت اہل پرتگال ایشیاء میں اپنی سلطنت قائم کرنے کا خواب دیکھنے لگے کہ جس طرح امریکہ کے دریافت شدہ جزائر پر اسپین کا قبضہ ہوگیا تھا اسی طرح بحر ہند کے جزائر پر پرتگال کا تسلط ہو جائے، چنانچہ ڈیڑھ دو سال بعد ہی حکومت پرتگال نے تیرہ جہازوں کا بیڑا ہندوستان کی جانب روانہ کیا، جس میں بارہ سو سپاہی سوار تھے۔ یہ بیڑا ہوا کی ناموافقت کی وجہ سے جنوبی امریکہ کی جانب بہہ گیا، وہاں سے بہت دنوں کے بعد کالی کٹ پہنچا مگر پہنچتے ہی کالی کٹ کے راجہ سامری (زمورین) سے لڑائی ہوگئی جس میں پرتگیزوں کے صدہا آدمی مارے گئے اور وہ کالی کٹ میں ٹھہر نہ سکے بلکہ ان کو مجبوراً کوچین کے راجہ سے مدد لینی پڑی جس کی کالی کٹ کے راجہ سے رقابت

تھی۔(۱)

اس مہم کی ناکامی کے بعد واسکوڈی گاما پھر بیس جہازوں کا بیڑا لے کر ہندوستان آیا اور کوچین و کنانور کے راجاؤں کو ملا کر اس نے کالی کٹ پر باقاعدہ فوج کشی کی مگر اس مرتبہ بھی کامیابی نہیں ہوئی تو وہ اپنے کچھ سپاہی کوچین ہی میں چھوڑ کر پرتگال واپس چلے گئے۔اس زمانہ میں شاہ پرتگال نے اپنے مذہبی پیشوا پاپائے روما سے ایک ''فرمان'' حاصل کیا جس میں اس کو حبش،عرب،ایران اور ہندوستان کی تجارت فتوحات اور جہاز رانی کا مختار تسلیم کیا گیا۔اب اس کی اور ہمت بڑھی اور اس نے ۱۵۰۵ء (۹۱۱ھ) میں المیڈا (Francisco De Almeida) نامی ایک شخص کو ہندوستان میں اپنا نائب یعنی وائسرائے بھی مقرر کیا۔کئی سال جدو جہد کے باوجود پرتگیزوں کو ملک گیری کے منصوبوں میں کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں ہوئی سوائے اس کے کہ البوکرک

---

(۲) تحفۃ المجاہدین میں شیخ زین الدین نے اہل پرتگال کی دوسری آمد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اب کی بار وہ چھ کشتیوں میں آئے اور تاجروں کے بھیس میں کالی کٹ میں داخل ہوئے اور تجارت کرنے لگے اور سامری کے عہدہ داروں سے مسلمانوں کو تجارت سے بے دخل کرنے اور عربستان کی آمد و رفت سے روکنے کی خواہش ظاہر کی اور کہا کہ ان سے جو منفعت حاصل ہوتی ہے ہم سے کئی گنا منفعت زیادہ حاصل ہوگی،اسی دوران ان فرنگیوں نے مسلمانوں کے معاملات تجارت میں خلل ڈالنا اور ان پر ظلم و زیادتی کرنا شروع کیا تو سامری نے ان کے قتل کا حکم دیا۔تقریباً ساٹھ ستر فرنگی مارے گئے اور جو بچے انہوں نے راہ فرار اختیار کی اور کشتیوں پر سوار ہو کر جاتے جاتے خشکی والوں پر گولہ باری شروع کی۔سامری کے سپاہیوں نے بھی اس کا جواب دیا پھر وہ بندر کشی کی طرف روانہ ہوئے اور وہاں کے باشندوں سے صلح کی اور وہاں ایک قلعہ بھی بنایا،یہ سرزمین ہند میں انکا سب سے پہلا قلعہ ہے۔(اسکا نام انہوں نے اپنے بادشاہ کے نام پر قلعہ عمانوئیل (The fort Manuel) رکھا) اور اس کو اپنا مسکن و مرکز قرار دیا۔ساحل پر ایک مسجد تھی جس کو انہوں نے شہید کیا اور اس کی جگہ کلیسا کی بنیاد رکھی اور وہاں کے باشندوں سے خرید و فروخت کے تعلقات قائم کئے پھر کنانور والوں سے مصالحت کر کے وہاں بھی ایک قلعہ بنایا اور وہاں کے باشندوں سے بھی تجارتی وابط وابستہ کئے اور کالی مرچ اور ادرک لیکر پرتگال روانہ ہوئے یہی ان کا مقصود اعظم تھا۔(تحفۃ المجاہدین صفحہ ۳۶-۳۷ مع حاشیہ صفحہ ۷۶)

نوٹ۔ (عبارت میں دو موقعوں پر عالملوا اھلہا ہے جسکا ہم نے ظاہری ترجمہ کر دیا ہے مگر حکیم شمس اللہ قادری صاحب نے اپنے ترجمہ میں پہلی جگہ اس کیلئے خدام مقرر کئے اور دوسری جگہ اسکی حفاظت کیلئے فوج مقرر کی سے ترجمہ کیا ہے۔کشی سے مراد غالباً کوچین ہے۔)

Albuquerque نے ۱۵۱۰ء (۹۱۶ھ) میں گوا کو سلطنت بیجاپور سے چھین لیا اور وہاں اپنی حکومت قائم کی۔ اور گجرات کی بندرگاہ دیو یا دیپ کو بھی ۱۵۳۵ء (۹۴۱ھ) میں انہوں نے سلطان گجرات (۱) سے مصالحانہ طور پر حاصل کر لیا۔ (۲)

دوسری فصل

ڈچ

پرتگال کے بعد ڈچ (۳) یعنی ولندیز ہندوستان پہنچنے کا خواب دیکھنے لگے بادٹ مین ان کا پہلا شخص ہے جو ۱۵۹۵ء (۱۰۰۴ھ) میں ہندوستان پہنچنے میں کامیاب ہوا۔ یعنی واسکوڈی گاما سے ٹھیک ایک صدی بعد۔

اس کے بعد ولندیزوں کے اور تجارتی جہاز بھی ہندوستان آنے جانے لگے جس کے نتیجہ میں ان کی پرتگیزوں سے کشمکش شروع ہو گئی۔ مگر دونوں کی نوعیت اور مقاصد میں فرق تھا۔ سید ہاشمی صاحب لکھتے ہیں :

ولندیزیوں کی اصلی غرض ایشیاء سے تجارت تھی اور تجارت شروع کرنے کے دو تین سال بعد ہی ان کے سب تاجروں نے ملکر ایک مشترکہ کمپنی دی یونائیٹڈ ایسٹ انڈیا کمپنی آف دی نیدرلینڈ (The United East India Company of the Netherland) قائم کی جو ان کی ملکی حکومت کے زیر نگرانی تھی، تاہم پرتگیزوں کی طرح اس کمپنی کے جہاز یا ملازمین براہ راست حکومت کے ملازم نہ تھے اور نہ پرتگیزوں کی طرح انہیں اول سے ممالک ایشیاء کی فتح کا سودا تھا۔ (۴)

---

(۱) اس وقت گجرات کا فرمانروا سلطان بہادر شاہ (۹۳۲ھ-۹۴۳ھ) تھا۔

(۲) تاریخ ہند (برائے انٹرمیڈیٹ) از سید ہاشمی فرید آبادی، حصہ سوم صفحہ ۲۵۷ تا صفحہ ۲۶۱، طبع دوم ہندوستان کی دوسری تاریخوں میں بھی اس سلسلہ کی تفصیلات موجود ہیں مگر چونکہ ہاشمی صاحب کی یہ تاریخ اپنے اختصار اور جامعیت کی وجہ سے بہت مشہور اور نہایت مستند سمجھی جاتی ہے اس لئے ہم نے اسی کو پیش نظر رکھا ہے۔ نیز پرتگالیوں کی بار بار آمد و رفت کا ذکر تحفۃ المجاہدین (صفحہ ۳۶ تا صفحہ ۳۸ ہندوستانی ایڈیشن) میں بھی ہے۔

(۳) ہالینڈ (نیدرلینڈ) کے باشندوں کو ڈچ یا ولندیزی کہتے ہیں۔ (۴) تاریخ ہند سوم صفحہ ۲۶۱

مگر ظاہر ہے کہ چونکہ ڈچ، پرتگیزوں کے تجارتی رقیب کی حیثیت سے سامنے آئے تھے اس لئے بہت جلد دونوں میں جنگ چھڑ گئی۔ اور ہر جگہ ڈچ پرتگیزوں پر غالب رہے یہاں تک کہ ۱۶۶۴ء (۱۰۷۴ھ) میں تین سال کی مسلسل جنگ کے بعد رفتہ رفتہ ساحل مالا بار کے تمام پرتگیزی مقبوضات ڈچوں نے چھین لئے۔ یہی زمانہ ہے جس میں ولندیزیوں کی تجارتی کوٹھیاں نہ صرف کارومنڈل اور بنگالے کے سواحل پر قائم ہوئیں بلکہ ڈھاکہ پٹنہ آگرہ اور احمد آباد میں بھی ان کے مستقل کارخانے بن گئے اور ان کی کمپنی یورپ و ایشیاء کے مابین تجارت کا سب سے بڑا ذریعہ ہوگئی۔(۱)

اسی دوران ولندیزوں پر خود ان کے ملک ہالینڈ میں مصیبت آئی جس سے انکی طاقت ٹوٹ گئی اور ہندوستان میں ان کے قدم جم نہ سکے، منتشر لوگ جزائر شرق الہند میں آ گئے۔

تیسری فصل

فرانسیسی

فرانسیسی ملاح سولہویں صدی عیسوی کے آغاز ہی میں ایشیائی سمندروں تک پہنچ گئے تھے اور فرانس میں یکے بعد دیگرے کئی کمپنیاں بھی بنی تھیں جن کا مقصد ایشیاء سے تجارت کرنا تھا مگر اہل فرانس ان دنوں تجارت سے زیادہ سپہ گری کے دلدادہ تھے، تجارت سے چنداں مناسبت نہیں تھی اس لئے کمپنیاں بند کرنی پڑیں۔ لیکن سترھویں صدی عیسوی کے وسط میں حکومت فرانس مشرقی ممالک سے تجارتی تعلقات بڑھانے میں کوشاں ہوئی اور شاہ لوئی چہار دہم کے عہد میں اور اسکے وزیر کول برٹ کی سرپرستی میں ۱۶۶۴ء (۱۰۷۴ھ) میں ایک فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی قائم ہوئی جسکا مقصد ہندوستان سے تجارت کرنا تھا۔ اسکا پہلا کارخانہ چار سال بعد سورت میں قائم ہوا اور اگلے سال مچھلی پٹم میں اس کی ایک شاخ کھل گئی لیکن اسی زمانہ میں فرانس اور ہالینڈ کی جنگ شروع ہوگئی۔ اور شاہ گولکنڈہ کی مدد سے ۱۶۷۴ء (۱۰۸۵ھ) میں ولندیزوں نے میلا پور (مدراس) کے کارخانہ کو دوبارہ حاصل کیا جن پر فرانسیسیوں نے قبضہ کرلیا تھا۔ اور ان

(۱) تاریخ ہند سوم صفحہ ۲۶۱ تا صفحہ ۲۶۲

فرانسیسیوں کو وہاں سے خارج کر دیا۔ یہاں سے نکل کر کوئی سو میل جنوب میں کارو منڈل کے اس مقام پر اترے جو انہوں نے چند دنوں قبل سلطنت بیجاپور کے ایک صوبہ دار شیر علی خاں سے خرید ا تھا۔ اور یہیں انہوں نے پانڈی چیری کے نام سے وہ بستی بسائی جو تاریخ میں بہت مشہور ہے۔ یہ بستی آہستہ آہستہ ایک بڑا تجارتی اور جنگی شہر بن گئی۔

۱۷۳۵ء (۱۱۴۸ھ) میں جب دیوما (Dumas) اس کا گورنر مقرر ہوا تو انہوں نے ملکی سیاست میں مداخلت شروع کی۔ پہلی مرتبہ ۱۷۳۹ء (۱۱۵۱ھ) میں ایک چھوٹی سی ہندو ریاست تنجور کی مسند نشینی کے جھگڑے میں حصہ لیا اور مدد کے عوض قصبہ کاری کال حاصل کیا جو کول رون ندی کے کنارے واقع ہے۔ بہت جلد اہم تجارتی بندرگاہ کی حیثیت سے اس کی شہرت ہوئی۔ پھر اسی زمانہ میں مرہٹہ حملہ آوروں کے مقابلہ میں انہوں نے رئیس کرناٹک دوست علی کے اہل و عیال کو پانڈی چیری میں پناہ دی جس سے ان کی جنگی قوت اور جرأت کا دکن میں ایسا شہرہ ہو گیا کہ خود نواب نظام الملک آصف جاہ اول (۱۷۲۴ء-۱۷۴۸ء) نے دیوما کو خلعت سے نوازا، کچھ روز بعد شاہ دہلی محمد شاہ کی طرف سے بھی منصب اور نوابی کا خطاب ملا۔ یہ واقعات ۱۷۴۰-۴۱ء (۱۱۵۲ھ) کے ہیں۔ اس کے بعد اس کے جانشین دوپلے نے بڑی شہرت حاصل کی۔ فرانسیسی مقبوضات میں بھی بتدریج اضافہ ہوتا گیا یہاں تک کہ ۱۷۴۶ء (۱۱۵۹ھ) میں انہوں نے مدراس پر بھی قبضہ کر لیا۔ جنوب کے حکمرانوں کو ایک دوسرے سے لڑانے اور ان کے آپس میں نا چاقی پیدا کرنے کے لئے انہوں نے اپنے مکر و فن سے خوب خوب کام کیا۔ مگر ان کی ہمیشہ انگریزوں سے آویزش رہی۔ سالوں دونوں لڑتے رہے۔ طویل طویل جنگیں ہوئیں، بالآخر فرانس کو ۱۷۶۱ء میں شکست تسلیم کرنی پڑی اور انہوں نے انگریزوں کی اطاعت قبول کی پھر انگریزوں کے مقابلہ میں وہ کہیں جم نہ سکے۔ (۱)

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے تاریخ ہند سوم صفحہ ۲۷۵ تا صفحہ ۲۸۵۔ دکن اور کرناٹک کی تاریخوں میں بھی اس کی تفصیلات ملتی ہیں۔

چوتھی فصل

انگریز

انگریز ملاح دسویں صدی ہجری (سولہویں صدی عیسوی) کے آغاز ہی میں ہندوستان پہنچنے کی فکر میں تھے۔ کئی مرتبہ بحری راستہ سے پہنچنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ ۸۴-۱۵۸۳ء میں انگلستان کے چار سوداگر ہندوستان پہنچے، مگر گوا کے پرتگیزوں نے انہیں پکڑ کر قید میں ڈال دیا۔ آخر کار رہائی مل گئی اور ایک شخص بہت سی مشکلات کے بعد وطن پہنچ گیا۔

لیکن انگریزوں کی ہندوستان سے تجارت کا اصلی آغاز ہسپانیہ کے بحری بیڑے ارمیڈا (۱) کی تباہی کے بعد ہوا، اور انہوں نے ملکہ الزبتھ سے درخواست کی کہ انہیں بھی ممالک ایشیا سے تجارت کی اجازت دی جائے۔ ان کی یہ درخواست منظور ہوئی اور ان سوداگروں نے تین جہاز ہندوستان روانہ کیے جن میں سے ایک راستہ میں ڈوب گیا، دو جنوبی ہند پہنچے، یہی انگریزوں کے پہلے جہاز تھے جو پرتگیزوں کے دریافت کردہ راستہ سے ہندوستان پہنچے۔ (۲)

یہ ۱۶۰۰ء کا واقعہ ہے جب تاجروں کی اس جماعت کو پندرہ سالہ ایک میعادی حکمنامہ سلطنت انگلستان کی طرف سے عطا کیا گیا۔ (۳)

مگر اس جماعت کی حیثیت تاجرانہ سے زیادہ رہزنانہ تھی۔ بروس نے لکھا ہے کہ اس کمپنی کی ایک قرارداد کی رو سے شریف انسانوں کا اس میں شامل ہونا ممنوع تھا چنانچہ اس کمپنی میں بحری ڈاکو اور تقدیر آزما شریک تھے۔ اور باسو کے بقول ''کمپنی کی حکومت

---

(۱) ملکہ الزبتھ نے ۱۵۷۸ء میں ہالینڈ کی آزادی کے اعلان کو تسلیم کر کے اسپین سے جنگ مول لی تھی۔ ۱۵۸۸ء میں انگلستان نے اسپین کے بحری بیڑے ارمیڈا پر زبردست فتح حاصل کی۔ (ہندی مملکت برطانیہ کا عروج اور وسعت صفحہ ۱۰)

(۲) تاریخ ہند سوم، ہاشمی، صفحہ ۲۶۶

(۳) ہندی مملکت برطانیہ کا عروج اور وسعت صفحہ ۱۱۔ یہی ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیاد ہے۔

کے آخری ایام تک اسمیں بہت کم شریف انسان دکھائی دیتے ہیں۔(۱)

غرض اس منشور کے بعد کپتان ہاکنس پہلا انگریز ہے جس نے ساحل ہندوستان پر قدم رکھا۔ ۱۶۰۸ء میں اس کا جہاز سورت کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ ہاکنس شاہ انگلستان جیمس اول کا خط اور بہت سے تحائف لے کر جہانگیر کے دربار میں حاضر ہوا لیکن بہت جلد اسے سورت واپس جانا پڑا۔ ۱۶۱۳ء میں سر تامس رو "سفیر" بنا کر بھیجا گیا یہ پہلا برطانوی سفیر تھا۔ اسی سنہ میں انگریزوں کو سورت میں ایک فیکٹری قائم کرنے کی بھی اجازت مل گئی۔(۲)

۱۶۱۶ء میں کمپنی نے مسولی ٹیم میں ایک کارخانہ قائم کیا۔ ۱۶۴۰ء میں کمپنی نے مدراس کے ایک راجہ سے کچھ زمین خرید کر فورٹ سینٹ جارج تعمیر کیا جو اب بھی مدراس میں موجود ہے۔(۳)

۱۶۴۴ء میں شاہ جہاں کی بیٹی جہاں آرا کسی شدید مرض کا شکار ہوئی، درباری اطباء علاج میں کامیاب نہ ہو سکے چنانچہ شاہ جہاں نے ایک انگریزی طبیب سورت سے بلایا۔ ۱۶۴۵ء کے اوائل میں ڈاکٹر باٹن آگرہ پہنچا، اس کے معالجہ سے شہزادی کی تکلیف رفع ہو گئی۔ اب انگریزوں پر انعام و اکرام کی بارش ہونے لگی۔ چنانچہ ۱۶۵۱ء میں کمپنی کو بنگال میں تجارتی کوٹھیاں کھولنے کی اجازت مل گئی۔(۴)

مغربی ساحل پر جزیرہ بمبئی تھا، یہاں فقط مچھیرے رہا کرتے تھے۔ پرتگال والوں نے لاوارث جان کر اپنا مال بنالیا تھا۔ ۱۶۶۱ء میں جب شاہ انگلستان چارلس دوم کی شادی پرتگالی شہزادی سے ہوئی تو چارلس کو یہ مقام بطور جہیز دیا گیا، اس نے دس پونڈ سالانہ لگان پر کمپنی کے ہاتھ اٹھایا اسی وقت سے بمبئی جیسا شہر ان کے قبضہ میں رہا۔ انہوں نے اس کے چند قطعے صاف کرا کے اپنے گودام اور مکان بنوائے، جہازوں کی

---

(۱) دیکھئے کمپنی کی حکومت صفحہ ۲۴، از باری۔ تفصیل کے لئے دیکھئے ڈاکٹر تاراچند، تاریخ تحریک آزادی ہند جلد اول صفحہ ۳۱۶ تا صفحہ ۳۱۹۔

(۲) کمپنی کی حکومت صفحہ ۲۴، نیز تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت جلد دوم صفحہ ۲۰۳، از ہاشمی

(۳) برطانوی حکومت ہند صفحہ ۶، از مسٹر انڈرسن ترجمہ محمد الیاس برنی

(۴) کمپنی کی حکومت صفحہ ۲۵-۲۶

آمد و رفت ہونے لگی تو آبادی میں اضافہ ہوا اور ۱۶۸۷ء میں سورت کا صدر کارخانہ یہیں منتقل کر لیا گیا۔

۱۶۵۸ء میں بنگال کے انگریزی تاجروں اور نواب شائستہ خان کے درمیان کش مکش ہوئی۔ انگریز تاجر اس زرخیز علاقہ پر تسلط کا خواب دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے تجارتی کوٹھیوں کی قلعہ بندی اور حکام سے سرکشی شروع کی۔ یہ دیکھ کر اورنگ زیب نے جملہ صوبہ داروں کے نام احکام جاری کئے کہ انگریزی تجارت خانے بند اور مال ضبط کر لیا جائے۔ کمپنی کے گماشتے فرار ہوئے یا گرفتار کر لئے گئے۔ شاہ جیمس ثانی کے حکم سے دو تین جنگی بیڑے لڑنے اور چاٹگام پر حملہ کرنے کے لئے بھیجے گئے تھے مگر انگریزوں کو ہر بار ناکامی ہوئی، اس کے انتقام میں انگریزوں نے حاجیوں کے جہاز لوٹنے شروع کئے، وہاں بھی عالمگیری انتظام نے ہاتھ پکڑ لیا اور کمپنی کو مالی نقصان اور ذلت کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ آخر بڑی خوشامد اور توبہ کے بعد ہگلی کے کنارے ۱۶۹۰ء میں فیکٹری قائم کرنے کی اجازت ملی جہاں بعد میں کلکتہ آباد ہوا۔ ۶۰ سال بعد فورٹ ولیم تعمیر ہوا۔ ۱۷۰۰ء کے قریب کمپنی نے گوبند پور اور کالی کٹ کے گاؤں خرید لئے اور آہستہ آہستہ سیاست ملکی میں دخل دینا شروع کیا۔ (۱)

برصغیر میں بمبئی پہلا شہر ہے جس کے وہ مالک بنے وہ بھی بطور انعام، یہ ان کے حق میں بڑا نیک شگون ثابت ہوا۔ اس کے بعد ان کی ہوس ملک گیری میں اضافہ ہوتا گیا، سر جان میلکم نے اس کی حقیقت واضح کرتے ہوئے پورے انصاف کے ساتھ لکھا ہے کہ:

> ”ابتداء میں اس جماعت کو بذریعہ منشور محض تجارت کرنے اور بزور شمشیر اپنے مال کی حفاظت کرنے کا اختیار اور حق عطا کیا گیا تھا لیکن چند ہی سال کی مدت میں وہ اپنے گماشتوں اور کارندوں کی جدو جہد اور اولوالعزمی، دیگر اقوام یورپ کی حریفانہ سرگرمی اور والیان ملک کی کمزوری اور ریاکاری کی بدولت بہت جلد شاہی اختیارات کی مالک بن بیٹھی اور ان والیان ملک کی نظر میں یہ جماعت اپنی غاصبانہ حرکتوں

(۱) تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت جلد دوم صفحہ ۲۰۴-۲۰۶ نیز کمپنی کی حکومت صفحہ ۲۶-۲۷

یا تمول کی وجہ سے رشک کرنے یا لوٹنے کے قابل ایک چیز ہوگئی۔"(۱)

آگے لکھتا ہے :

"سچ تو یہ ہے کہ جس دن کمپنی کی فوجیں اپنے کارخانوں سے ایک میل آگے بڑھیں اسی دن سے اپنے علاقوں میں توسیع اور اپنی فوجوں میں اضافہ کرنا ان کی حفاظت کا اصول بن گیا۔"(۲)

مگر اہلکاران کمپنی حدود سے بہت آگے نکل گئے اور اپنی حفاظت کے نام پر ہر طرح کا ظلم روا رکھا، یہاں تک کہ ان کے مظالم کی بازگشت لندن میں بھی سنی گئی۔ مسٹر انڈرسن لکھتا ہے :

انگریزوں کے ظلم وتشدد کے افسانے برابر ہندوستان سے انگلستان پہنچتے رہے بہت سے لوگوں کا خیال ہوگیا کہ حکومت برطانیہ کمپنی کے مقبوضات کے انتظام میں عملاً زیادہ مداخلت کرے اور کمپنی کے سیاسی اختیارات کی حتی الوسع صاف صاف تشریح کردی جائے، ان دقتوں کو رفع کرنے کے لئے ایک قانون پاس ہوا جس کا مشہور انگریزی نام ریگولے ٹنگ ایکٹ (Regulatting act) ہے جس نے کمپنی کی مشکلات کو بھی دور کیا اس قانون کی رو سے کمپنی کے اختیارات محدود ہوگئے اور دوہری حکومت ہوگئی۔ انتظام سلطنت میں کمپنی اور شاہ انگلستان دونوں شریک تھے۔(۳)

---

(۱) سیاسی تاریخ ہند اول صفحہ ا، ترجمہ مولوی ابن حسن صاحب ایم اے۔

(۲) ایضاً صفحہ ۳

(۳) برطانوی حکومت ہند صفحہ ۱۰-۱۱

پانچویں فصل
دیگر فرنگی اقوام

ان کے علاوہ دیگر قوموں کی بھی قسمت آزمائی کا حال مؤرخین نے لکھا ہے۔
پرتگال، ہالینڈ، فرانس اور برطانیہ کے علاوہ جن ملکوں نے ہندوستان سے تجارت کرنے کی کوشش کی ان میں ڈنمارک، جرمنی، اسٹریا، بلجیم، سویڈن اور پروشیہ کا نام آتا ہے۔

اہل ڈنمارک نے گیارہویں صدی ہجری (سترہویں صدی عیسوی) میں سیرامپور (بنگال) میں ایک بہت بڑی تجارتی کوٹھی قائم کی تھی۔

وسطی یورپ جرمنی اور اسٹریا وغیرہ اس زمانہ میں سیاسی طور پر اسٹریا کے بادشاہ کے ماتحت تھے۔ انہوں نے ''اوس ٹینڈ کمپنی'' کے نام سے ایک کمپنی قائم کی تھی۔ اس کمپنی کو بہت نفع ہوا۔ اس نے کورومنڈل اور ہگلی (بنگال) کے کنارے انگریزوں اور ولندیزیوں کی تجارتی کوٹھیوں کے قریب اپنے کارخانے کھولے تھے۔ انگریز اور ڈچ تاجروں نے ان کی سخت مخالفت کی اور مختلف حیلوں سے ہگلی کے حاکم کو جرمن تاجروں کا دشمن بنادیا اور اس نے تھوڑی سی جمعیت بھیج کر انہیں جبراً اپنے علاقے سے نکال دیا اور ان کی تجارتی کوٹھی جس کے گرد انہوں نے خندق اور جنگی برج تیار کئے تھے چھین کر منہدم کرادی۔ یہ ۱۱۴۵ھ مطابق ۱۷۳۱ء کا واقعہ ہے۔ (۱)

غرض ان میں سے کسی قوم کو کوئی خاص فروغ حاصل نہیں ہوا اور بہت جلد وہ انگریزوں، پرتگالیوں اور فرانسیسیوں کی رقابت کا شکار ہو گئے۔

(۱) سید ہاشمی، تاریخ ہند جلد سوم صفحہ ۲۶۳-۲۶۵

ہندوستان کے باشندوں کو کبھی ایسے ظلم کا سامنا نہیں
ہوا تھا جو پوری فنی مہارت اور پوری سوجھ بوجھ پر مبنی
اور اتنا زوردار ہو۔

——— لیکی

باب سوم

علماء کا پرتگالیوں سے جہاد

پہلی فصل : کیرالا کے علماء کا پرتگالیوں سے جہاد

دوسری فصل : گوا پر پُرتگالیوں کا قبضہ اور عادل شاہ کی مدافعت

تیسری فصل : سندھ پر پُرتگیزوں کا حملہ
اور علماء و صوفیہ کی ان سے لڑائی

بغاوت میں مسلمانوں نے پہل کی اور ہندو
بھیڑ بکریوں کے مانند ان کے پیچھے ہو لئے۔

○———— سیتارام

پہلی فصل

کیرالا کے علماء کا پرتگالیوں سے جہاد

ہندوستان کی آزادی کی تاریخ مرتب کرنے والوں نے کیرالا کے علماء کے ان کارناموں کو جو انہوں نے پرتگالیوں کے مقابلے میں انجام دیئے بالکل نظر انداز کیا ہے حالانکہ یہ خشت اولین ہے جس سے تحریک آزادی کی بنیاد پڑی پھر ملک کے طول وعرض میں ساڑھے چار سو سال یعنی ۱۹۴۷ء کی آزادی تک اس سلسلہ میں جو کوششیں ہوئیں، ان کا سہرا انہیں علماء کے سر بندھتا ہے جنہوں نے اس کا آغاز کیا۔

مگر پہلے اس صورتحال کا جائزہ لینا ہے جسمیں انہوں نے جہاد کو فرض عین قرار دیا تھا۔

عیسائیت کی تبلیغ اور پرتگالیوں کی چیرہ دستیاں

تمام مورخین نے باتفاق یہ بات لکھی ہے کہ مسیحیت کی تبلیغ وترویج ان کا بنیادی مقصد تھا، حتی کہ اس وقت کے شاہ پرتگال عمانوئیل (۱۴۹۵ء-۱۵۲۱ء) نے پہلے حملہ کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا تھا کہ ''سمندری راستہ دریافت کر کے ہندوستان پہنچنے کا مقصد مسیحیت کی ترویج اور مشرق کی دولت پر قبضہ کرنا ہے''۔(۱)

انہوں نے اس مقصد کے حصول کے لئے جو زیادتیاں کیں اسے پہلے شیخ زین الدین مخدوم کی زبان سے سنئے جنہوں نے ان حالات کا بچشم خود مشاہدہ کیا ہے ان کی یہ تصویر کشی حقیقت سے زیادہ قریب ہے، لکھتے ہیں :

ان فرنگیوں نے وہ فساد مچایا اور مسلمانوں پر وہ ظلم ڈھایا جس کی کوئی حدو انتہا نہیں وہ ان کو مارتے، مذاق اڑاتے، قریب سے گزرتے تو حقارت سے ان پر ہنستے، فقرے

(۱) تحفۃ المجاہدین صفحہ ۲۴۶ فٹ نوٹ۔ بیروت ایڈیشن۔

کستے ،ان کی کشتیوں کو کیچڑ میں پھنساتے اور وہاں لیجاتے جہاں پانی نہ ہو، ان کے بدن اور چہروں پر تھوکتے، ان کے سفروں اور بالخصوص سفرحج میں رکاوٹ ڈالتے، ان کا مال لوٹتے، شہروں اور مسجدوں کو جلاتے، کشتیوں کو چھینتے، مصاحف اور کتابوں کو روندتے اور ان میں آگ لگاتے، مساجد اور شعائر کی بے حرمتی کرتے، عیسائیت قبول کرنے اور صلیب کو سجدہ کرنے پر مجبور کرتے، اس کے لئے مال کا لالچ دیتے، مسلمان عورتوں کو برگشتہ کرنے کے لئے اپنی عورتوں کو زیورات اور نفیس کپڑوں سے آراستہ کرتے، حجاج اور دوسرے مسلمانوں کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچا کر مار ڈالتے۔ رسول اللہ ﷺ کو علانیہ گالی دیتے، مسلمانوں کو قید و بند میں رکھتے اور طوق و سلاسل میں جکڑتے، بولی لگانے کے لئے ان کو بازار لیجاتے جیسے غلاموں کو بیچا جاتا ہے۔ اور ان کو خطرات سے گھری بدبودار تنگ و تاریک کوٹھری میں جمع کرتے، پانی سے طہارت حاصل کرنے پر جوتوں سے مارتے، آگ سے تکلیف پہنچاتے، کسی کو بیچتے، کسی کو غلام بناتے اور کسی سے بیگار لیتے، کتنی شریف عورتوں کو انہوں نے قید کر کے باندی بنالیا یہاں تک کہ ان سے عیسائی بچے پیدا ہوئے جو دین کے دشمن ہیں اور خود مسلمانوں کو اذیتیں پہنچا رہے ہیں۔ کتنے سادات، علماء اور امراء کو انہوں نے قید کر کے تکلیفیں پہنچائیں یہاں تک کہ ان کی جان لے لی۔ کتنے مسلمان مردوں عورتوں کو انہوں نے عیسائی بنایا اور مسلمانوں کے ساتھ وہ وہ سلوک کیا کہ زبانیں ان کو بیان کرنے سے عاجز اور ان کی وضاحت سے کراہت محسوس کرتی ہیں۔ اللہ اپنی طاقت و قدرت سے ان کو مزا چکھائے کیونکہ اول و آخر ان کا مقصود اصلی اور غرض و غایت مسلمانوں کا مذہب بدلنا اور ان کو عیسائی بنانا ہے۔

ان کے اس جذبہ کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب پرتگال سے نئے فرنگی آئے اور کشی (کوچین) میں مسلمانوں کی صورت دیکھی تو انہوں نے کہا اب تک ان کی صورتیں نہیں بدلیں اور انہوں نے اپنے ذمہ دار کو اس بات پر بہت لعن طعن کیا کہ وہ اب تک ان کو اسلام سے پھیر نہ سکا، اسی وجہ سے ان کے ذمہ دار نے کشی کے راجہ سے کہا "مسلمانوں کو کشی سے نکال دیجئے ان سے جو فائدہ حاصل ہوتا ہے وہ بہت کم ہے ہم سے اس سے کہیں زیادہ فائدہ ہوگا۔ تو اس نے جواب دیا، وہ زمانہ دراز سے ہماری رعایا ہیں اور انہیں سے ہمارا شہر آباد ہے ان کو نکالنا ہمارے لئے ممکن نہیں"

ان کو صرف مسلمانوں اور ان کے مذہب سے دشمنی ہے نہ نائروں سے نہ دوسرے کفار سے۔(۱)

منشی ذکاء اللہ پرتگیزوں کے بارے میں رقمطراز ہیں :

اس کی ساری تاریخ ایسی لڑائی جھگڑوں سے بھری پڑی ہے جس میں ساحل بحر کی آبادیاں جلیں پھکیں، وہاں کے باشندے خستہ وتباہ ہوئے، رعایا پر جور و ظلم کرنے کا شیوہ ان پر ختم تھا، مسلمانوں کی تذلیل وتکلیف میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتے تھے اور ان کو گرفتار کر کے بھنگی، سقا، دھوبی سب ہی رذیل کام ذلیل کرنے کے لئے لیتے تھے۔ اور ان کے منہ پر تھوک دیتے تھے۔ ان کو سفر نہیں کرنے دیتے تھے، حج میں نہ جانے دینے کی تو انہوں نے قسم کھائی تھی، ان کا مال چھین لیتے تھے۔ مکانوں کو جلا دیتے تھے کبھی مسجدوں کو پھونک کر ان کے محراب اور مصلے اکھیڑ کر پامال کرتے، کبھی ان کو غلاظت گاہ بناتے تھے، یا اپنا کلیسا اس کی جگہ قائم کرتے تھے، ان کی کتابوں کو ایندھن کی جگہ جلاتے تھے، کبھی مسلمانوں کے ہاتھ پاؤں رسوں میں کس کر دریا میں ڈبو دیتے تھے، کبھی پتھروں اور مٹی میں چن دیتے تھے، کبھی کوڑے مار مار کر مار ڈالتے، کبھی تنگ وتاریک قید خانوں میں زیر زمیں درگور کرتے تھے، قیدی اس قید میں زندگی سے ایسے بیزار ہوتے تھے کہ دستار کا پھندہ گلے میں ڈال کر قید حیات سے آزاد ہوتے تھے ان سب پر یہ طرہ اور تھا کہ ان کو طرح طرح سے ترک اسلام پر اور عیسائی مذہب اختیار کرنے پر مجبور کرتے تھے، مولویوں اور مجتہدوں کی مٹی خراب کرتے تھے، کبھی دھمکاتے، کبھی روپیہ کی طمع دیتے، کبھی اپنی عورتوں کو خوب زیور اور لباس سے آراستہ کر کے ان پر فریفتہ کراتے، کبھی مسلمان عورتوں کو وہ دھمکیاں دیتے کہ بیچاریوں کے ہوش حواس باختہ ہوتے، غرض پادری صاحبوں کی زبان وعظ وپند میں بند تھی مگر توپوں نے اپنا منہ کھول کر دنادن بیکسوں کے کپ کپاتے بدن سے صلیب کے آگے گھٹنا ٹکوایا۔(۲)

---

(۱) تحفۃ المجاہدین صفحہ ۴۱-۴۲۔ حکیم شمس اللہ صاحب نے پتہ نہیں کیوں اپنے ترجمہ "پرتگیزان مالابار" میں اس فصل کو چھوڑ دیا ہے حالانکہ یہ بڑی اہم فصل ہے جس سے پرتگالیوں کی ذہنیت کا اندازہ ہوتا ہے اور ان کے مظالم کی تفصیل معلوم ہوتی ہے۔

(۲) تاریخ ہند حصہ سوم جلد اول (عہد سلطنت انگلشیہ) صفحہ ۳۹-۴۰۔ ==

علماء کا جہاد

یہ حالات تھے کہ علماء خم ٹھونک کر میدان میں اترے اور فرنگیوں سے جہاد فرض عین قرار دیا۔ دوسری طرف وہ علماء جو یمن سے ہجرت کر کے ہندوستان پہنچ رہے تھے۔ وہ پرتگالیوں سے جنگ کرتے ہوئے یہاں پہنچتے تھے۔ ان کی عداوت ونفرت ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی چنانچہ یہاں انہوں نے ان سے نفرت پھیلائی ان سے جہاد کی ترغیب دی اور عملاً جہاد میں خود بھی شریک رہے۔(۱)

کالی کٹ وغیرہ ساحلی علاقوں کے مسلمانوں کی تجارت بڑے عروج پر تھی۔ جزیرۃ العرب اور مصر سے ان کے مستحکم تجارتی روابط تھے۔ یہاں کی اشیاء بالخصوص گرم مسالوں

== ان فرنگیوں کی اسلام دشمنی کا اندازہ اسی سے لگا سکتے ہیں کہ وہ جہاں بھی گئے پہلے مسجدوں کو نشانہ بنایا ان کو مسمار کیا یا جلا دیا، پہلے پہل بندر کشی کی ایک مسجد کو شہید کیا۔ پھر ۹۵۱ھ (۱۵۱۰ء) جب کالی کٹ آئے تو وہاں کی مشہور جامع مسجد کو جو ناخدا مثقال کی طرف منسوب تھی مسمار کیا ۹۳۸ھ (۱۵۳۱ء) کو شالیات میں تین مسجدیں شہید کیں جن میں ایک وہ مسجد بھی تھی جن کو ابتدائے اسلام میں مشہور تابعی مالک بن دینار نے تعمیر کیا تھا، اس مسجد کی شہادت کا مسلمانوں پر بہت زیادہ اثر ہوا اور ان کی غیرت ملی اور بیدار ہوئی ۹۵۷ھ (۱۵۵۰ء) میں ترکوڈی کی جامع مسجد گرائی اور اسی سنہ میں فندرینہ کی چار مسجدوں کو بشمول جامع مسجد کے شہید کیا۔

(۱) دسویں صدی ہجری کے اوائل میں جب پرتگالی پے بہ پے ہندوستان کا رخ کر رہے تھے۔ وہ افریقہ اور یمن وعمان کے سواحل پر حملہ کرتے ہوئے ہندوستان پہنچتے تھے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب یمن سے ہندوستان ہجرت کا سلسلہ بھی شروع ہوا تھا۔ حضر موت کے عالی نسب خاندان سادات و شرفاء، علماء وفضلاء بڑی تعداد میں ہجرت کر کے ہندوستان پہنچ رہے تھے۔ یہ فرنگی ان کی ہجرت کی راہ میں رکاوٹ بنتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ دونوں کے درمیان جنگ چھڑ جاتی جب صورتحال نازک ہوتی تو ساحل پر اور سمندر میں پرتگالیوں سے جنگ کرنے والے اندرون ملک سے مدد طلب کرتے۔ اس وقت علماء وفقہاء شوق جہاد میں پرتگالیوں سے مقابلہ کے لئے بڑی سبقت کرتے تھے۔ راہ ہجرت میں رکاوٹ بننے کی وجہ سے دینی فریضہ سمجھ کر وہ ان سے مقابلہ کرتے تھے۔ تاریخ نے ان میں سے بہت سے لوگوں کے نام بھی محفوظ کر لئے ہیں۔ جو ان فرنگیوں کے ہاتھوں قید ہوئے یا جنہیں ان کے مقابلہ میں جام شہادت نوش کرنا پڑا۔ پرتگالیوں کی نفرت سے ان کا حال یہ ہو گیا تھا کہ اگر انہیں معلوم ہوتا کہ کوئی ان سے مقابلہ کر رہا ہے تو وہ اس کے ساتھ شامل ہو کر ان سے جہاد کرتے اور جہاں جاتے ان سے نفرت پیدا کرتے۔

(ملاحظہ ہو "حاضر العالم الاسلامی ۳/۱۷۰-۱۷۱)

اسمیں علامہ محقق سید محمد بن عبدالرحمٰن بن شہاب علوی حضرمی کا ایک مقالہ ہے جس میں ==

کی عرب ممالک میں بڑی مانگ تھی۔ ایک عرصہ سے بڑے اطمینان سے یہ تجارت ہورہی تھی۔ کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہیں تھی مگر فرنگیوں نے آکر ان کی آزادی ختم کرنی چاہی۔ ان کو بے اثر کرنے کے لئے تدبیریں کیں۔ کالی کٹ کے سامری کو بھی ان کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی یہاں تک کہ ان کو ملک بدر کرنے اور ملکی تجارت سے بے دخل کرنے کا مطالبہ کیا۔ مگر چونکہ سامری کی ماتحتی میں مسلمان سالہا سال سے رہ رہے تھے۔ اور اس کو ان سے فائدہ ہی تھا، وہ ان کو اپنا خیر خواہ سمجھتا تھا اس لئے اس نے اس مطالبہ پر فرنگیوں ہی کو اپنا دشمن سمجھا اور ان کے خلاف اعلان جنگ کردیا، ظاہر ہے کہ یہ جنگ مسلمانوں ہی کی وجہ سے اس نے شروع کی تھی اس لئے مسلمانوں کا اس کے ساتھ ہونا بالکل بدیہی بات ہے۔

دوسرے یہ کہ ان ساحلی علاقوں اور بندرگاہوں کے اکثر باشندے مسلمان ہی تھے جہاں زیادہ تر جنگیں لڑی گئیں اس لئے بھی مسلمان طبعاً لڑنے اور اپنا دفاع کرنے پر مجبور تھے۔ اور بات اسی پر ختم نہیں ہوتی بلکہ علماء ان کو اس پر آمادہ کررہے تھے اور اس کی ترغیب دے رہے تھے۔ قرآن کی آیتیں پڑھ پڑھ کر اور احادیث سنا سنا کر ان میں شوق جہاد اور ذوق شہادت پیدا کرتے تھے۔

تحفۃ المجاہدین میں جو تفصیل درج ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دراصل یہ جنگیں مسلمانوں اور فرنگیوں کے درمیان تھیں ہاں البتہ سامری کا تعاون اور اس کی ہمدردی حاصل تھی۔

فرنگیوں کی آمد کے وقت جو سامری (کالی کٹ کے راجہ کو سامری یا زمورین کہتے تھے) حکمراں تھا اس نے اول ہی سے ان کے خلاف اپنے موقف کا اظہار کیا تھا اور اس کے لئے زر کثیر صرف کیا مگر اس کے انتقال کے بعد جب اس کا بھائی جانشین ہوا تو اس نے ان سے صلح کرنے میں مصلحت سمجھی چنانچہ اس نے کالیکٹ میں انہیں قلعہ بنانے کی

== انھوں نے حضرمیوں کے بارے میں یہ تفصیلات بیان کی ہیں۔)
انہی میں سے بڑی تعداد میں سادات و شرفاء ہندوستان پہنچے جو علم و فضل میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں انہوں نے پرتگالیوں کے خلاف میدان جنگ ہموار کرنے میں نمایاں حصہ لیا۔

اجازت دی۔ اوران سے صلح کرلی مگر اس شرط پر کہ جدہ اور عدن جانے کے لئے ہر سال چار کشتیوں کا نظم کریں یہ ۹۲۱ھ (۱۵۱۴ء) کی بات ہے۔ سامری ان کے شر سے بچنے کے لئے بظاہر صبر کئے ہوئے صلح پر قائم تھا مگر پس پردہ علماء کی ترغیب سے مسلمان بادشاہوں سے مراسلت جاری رکھ کران کو فرنگیوں کے خلاف جنگ پر آمادہ کررہا تھا۔

۱۵۲۴ء (۹۳۱ھ) میں فندرینہ کے مسلمانوں اور فرنگیوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی جس سے صلح کا خاتمہ ہوگیا۔ اتفاقاً اسی سنہ میں گدنگلور کے مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان اختلافات رونما ہوئے، یہودیوں نے ایک مسلمان کو قتل کیا اس پر مسلمان بھڑک اٹھے اور گردونواح کے مسلمانوں سے امداد کا مطالبہ کیا چنانچہ کالیکوٹ، فندرینہ، کاپکاٹ، ترکوڈی، شالیات، پریورنگاڈی، ترورنگاڈی، تانور، پرونور، پونانی اور پلیکوٹ سے بڑی تعداد میں مسلمان حاضر ہوئے اور شالیات کی جامع مسجد میں جمع ہوکر یہودیوں سے بدلہ لینے اور فرنگیوں سے جنگ کرنے اور صلح نہ کرنے کا عہد کیا، اس پر عمل درآمد بھی ہوا۔ یہودیوں کو مزا چکھانے کے بعد عیسائیوں کے گھروں اور گرجوں میں آگ لگادی۔

اسی سال درمفتن، ادکاڈ، کھور، ترورنگاد، میلی اور چمپا وغیرہ کے باشندوں نے بھی فرنگیوں سے لڑنے پر اتفاق کرلیا۔

فرنگیوں کے ساتھ معرکہ آرائی میں یہ سال بڑی اہمیت رکھتا ہے اسی سال کشی (غالباً اس سے ہر جگہ کوچین مراد ہے) کے بعض سربرآوردہ لوگ بھی فرنگیوں سے جنگ پر آمادہ ہوئے جن میں دو بھائیوں فقیہ احمد مرکار اور کنج علی مرکار اور ان کے ماموں محمد علی مرکار کے نام سرفہرست ہیں۔ اس کیلئے وہ کشی سے نقل سکونت کر کے کالیکوٹ آگئے۔ (۱)

جب فرنگیوں کو مسلمانوں اور سامری کی مخالفت کا علم ہوا تو وہ کشی سے بڑی

---

(۱) تحفۃ المجاہدین کے ہندوستانی ایڈیشن کے محقق حمزہ جیلا کودان لکھتے ہیں : مرکار خاندان اپنی شجاعت و بہادری اور بحری جنگ کی مہارت کی وجہ سے تاریخ میں مشہور ہے۔ اس خاندان کی کوچین سے کالیکوٹ اور پونانی منتقلی پرتگالیوں کے خلاف مسلمانوں اور ان کے بادشاہ ساموتری (سامری) کی معرکہ آرائی کے سلسلہ میں نیا موڑ ثابت ہوئی، ساموتری نے یکے بعد دیگرے اس خاندان کے افراد کو بحری جنگ میں سپہ سالار مقرر کیا جنھوں نے سامراجیوں سے سخت ٹکر لی اور ان کے بڑھتے ہوئے قدم کو روکا۔ (تحفۃ المجاہدین، ہندوستانی ایڈیشن، حاشیہ نمبر ۱۸۵، صفحہ ۷۹)

تیاریوں کے ساتھ نکلے اور پونانی میں پڑاؤ ڈالا اور بڑی تباہی مچائی۔ مسلمانوں نے کھل کر مقابلہ کیا جس میں بہت سے مسلمان شہید ہوئے۔

اب ہم ان چند علماء کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے پرتگالیوں کے مقابلہ میں قائدانہ کردار ادا کیا۔

شیخ زین الدین مخدوم کبیر

شیخ زین الدین کا شمار مالابار کے علماء کبار میں ہوتا ہے۔ وہ ایک بہت بڑے عالم، فقیہ، محدث، مصلح، سیاسی رہنما اور مجاہد تھے، علوم ظاہری کے ساتھ علوم باطنی میں بھی ان کا پایہ بہت بلند تھا، دسویں صدی ہجری کے مشہور شافعی فقیہ قاضی القضاۃ شیخ الاسلام زکریا بن محمد انصاری متوفی ۹۲۵ھ (مدرس مسجد حرام) سے آپ کو تلمذ تھا۔ نیز آپ نے جامع ازہر جا کر وہاں کے متعدد مشائخ سے کسب فیض کیا۔ حدیث و تفسیر کی سند حاصل کرنے کے ساتھ فقہ کی بھی سند متصل حاصل کی جو رسول اللہ ﷺ تک پہنچتی ہے۔ تصوف وسلوک کی تعلیم آپ نے شیخ قطب الدین اجودھنی چشتی سے حاصل کی۔ عربی اور فارسی میں مہارت تامہ تھی۔ آپ طبیب حاذق بھی تھے۔

اس سب کے ساتھ آپ نے دعوت کو بھی جمع کر لیا تھا۔ آپ کی دعوت پر ہزاروں ہندو، یہودی اور عیسائی مسلمان ہوئے۔ (۱)

---

(۱) اے پی محمد علی موسلیار، تحفۃ الاخیار فی تاریخ علماء ملیبار (مخطوطہ مصنف)
صوبہ کیرالا میں ضلع ملاپورم کے مشہور شہر منجیری کے قریب نیلی کتھ (Nelli Kuth) کے نام سے ایک چھوٹا سا قصبہ ہے وہاں کے مشہور عالم دین اے، پی محمد علی موسلیار نے کیرالا کے علماء کے حالات میں "تحفۃ الأخیار فی تاریخ علماء ملیبار" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جو ابھی زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئی۔ اس میں انہوں نے کیرالا کے تقریباً ڈھائی ہزار علماء کا تذکرہ کیا ہے۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور جنگ میں حصہ لینے والے علماء کیرالا کے بارے میں جاننا چاہا اور جو نام ہمیں معلوم تھے ان کے بارے میں تفصیل دریافت کی۔ انہوں نے کہا ہم آپ کو جدید اور مزید معلومات فراہم کریں گے۔ ہم نے ان کی لکھی ہوئی کتاب دیکھی کتاب کیا متعدد فائلوں میں بے ترتیب اوراق ہیں۔ جن کی کوئی فہرست بھی نہیں، اور شیخ ستر سال کے بزرگ اور سال بھر سے مفلوج۔ (گھر ہی میں عصا کے سہارے چل لیتے ہیں) اس لئے اس وقت میں مزید معلومات حاصل نہ کرسکا۔ انہوں نے بھیجنے کا وعدہ کیا۔ ==

آپ کیرلا کے مشہور شہر پونانی کے رہنے والے تھے۔ان کی وجہ سے پونانی کو علمی و روحانی مرکز کی حیثیت سے بڑی شہرت حاصل ہوئی۔اور اس کی یہ مرکزیت آج تک باقی ہے۔

آپ نے کئی کتابیں تصنیف کیں۔(۱)

ان میں قصیدہ ''هداية الأذكياء إلى طريق الأولياء'' بہت مشہور اور متداول ہے۔اسی طرح ''مرشد الطلاب إلى الكريم الوهاب'' نے بھی کافی مقبولیت حاصل کی۔

ان کی پیدائش ۸۷۱ھ (۱۴۶۷ء) میں ہوئی۔پرتگالیوں کی آمد کے وقت وہ تیس بتیس سال کی ابھرتی جوانی میں تھے۔علوم دینیہ میں درجہ کمال کو پہنچ چکے تھے۔اس کے ساتھ بڑی فراست بھی پائی تھی۔پرتگالیوں (جو تاجروں کے روپ میں ہندوستان آئے تھے) کے حقیقی مقاصد کو انہوں نے پہلی ہی نظر میں بھانپ لیا۔طبیعت میں بڑا جوش تھا اس لئے میدان میں اتر کر سامراجیت سے سخت ٹکر لی اور پرتگالیوں کے خلاف میدان کارزار گرم کیا،اس پہلی جنگ آزادی کی قیادت کی اور لوگوں میں جہاد کی روح بیدار کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔چونکہ ایک مشہور اور معتمد عالم تھے۔معاشرہ میں جن کا وزن تھا اس لئے ان کی ترغیب کا عوام میں کافی اثر ہوا۔دوسری طرف ملک و بیرون کے مسلم فرمانرواؤں کو خطوط لکھے اور ان سے اس سلسلہ میں مالی اور عسکری مدد کا مطالبہ کیا۔انہوں نے جہاد آزادی پر آمادہ کرنے کے لئے ایک سو پینتیس اشعار پر مشتمل ایک پرزور قصیدہ کہا،اس قصیدہ جہادیہ کا عنوان ہے ''تحريض أهل الإيمان على جهاد عبدة الصلبان'' (یعنی صلیب پرستوں کے خلاف مسلمانوں کو جنگ و جہاد کی ترغیب) اس میں انہوں نے پرتگالیوں کے مظالم کا تذکرہ کرتے ہوئے ان سے جہاد کو فرض عین قرار دیا ہے،اور جہاد کی عام دعوت دی ہے۔جہاد و قتال کی ترغیب میں وارد آیات و احادیث

== یہ بھی بتایا کہ کالیکٹ یونیورسٹی نے کتاب کی طباعت کا بیڑا اٹھایا ہے۔اللہ ان کو صحت دے کہ وہ کتاب مکمل کر کے چھپوا سکیں۔ورنہ خطرہ ہے کہ کہیں یہ قیمتی اثاثہ ضائع نہ ہو جائے۔مصنف، ۱۹۲۱ء کی ماپلا بغاوت کے قائد شیخ محمد علی موسلیار کے پوتے ہیں اور انہیں کے ہم نام ہیں۔

(۲) المسلمون فی کیرالا کے مصنف نے ان کی بائیس کتابوں کا ذکر کیا ہے۔(صفحہ ۱۸۴-۱۸۵)

کو اشعار کے قالب میں ڈھالا ہے۔ اس قصیدہ کے متعدد نسخے مختلف اطراف میں بھیجے اور بڑے پیمانہ پر اس کی اشاعت کی جس سے پورے کیرلا میں ایک بھونچال آ گیا۔ اور ہندو مسلم سب پرتگالیوں سے لڑنے پر کمر بستہ ہو گئے (۱) ہم اس کے بعض اشعار (۲) کا ترجمہ کر رہے ہیں جن سے شیخ کے حقیقی جذبات کا اندازہ لگانے میں آسانی ہوگی۔

مسلمان سلاطین اور امت کے باشعور و باحمیت طبقہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں :

''تم پر سلام ہو اے امیدوں کے مرکز! مجبوروں اور مصیبت زدوں کی جائے امن اور امت کی پناہ گاہ! مصیبت سے نجات کے لئے ہم نے آپ کی طرف کمزوری محتاجی اور ذلت و تنگ حالی کا ہاتھ بڑھایا ہے۔ صلیب پرست اور تصویر کے پجاری فرنگیوں کی طرف سے ہم بڑی سخت مصیبتوں اور آزمائشوں سے دوچار ہیں خدا کی سرزمین پر ہر ممکن سرکشی کو انہوں نے روا رکھا ہے۔ ان کے فساد اور بگاڑ کی داستانیں زبان زد خلائق ہیں بالخصوص، ملیبار میں تو ہر طرح کے ظلم و زیادتی اور فتنہ سامانی پر انہوں نے کمر باندھ لی ہے۔''

پھر ان کے جور و ستم کا ذکر کیا ہے مگر یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ زبان اس کی تفصیل بیان کرنے سے عاجز ہے خدایا تو ان کو اپنی گرفت میں لے اور اپنی طاقت و سطوت سے ہلاک کر۔

پھر کہتے ہیں ''ان سے جہاد کرنا ہر مسلمان پر جو طاقت اور سامان حرب رکھتا ہو فرض ہے یہاں تک کہ غلام پر بھی، ان کو آقا سے اجازت کی ضرورت نہیں، بچوں کو والدین کی اجازت کی حاجت نہیں اور طاقت رکھنے والی بیوی پر بھی اس کو شوہر کی اجازت کی ضرورت نہیں۔ آگے کہتے ہیں ہم نے اپنی کمزوری اور سامان حرب و ضرب کی کمی کے باوجود ان سے سالوں جنگ کر کے اپنی پوری طاقت لگا دی ہے۔ اس سلسلہ میں ہمارے بعض حکمرانوں نے بھی ہمارا ساتھ دیا مگر پھر بھی پوری فتح نہیں حاصل ہو سکی تو اے سردارو! خدا کے فضل سے آپ ہی ہر مصیبت میں ہماری امیدوں کا مرکز ہیں۔ ہم

(۱) تحفۃ الاخیار

(۲) چونکہ یہ قصیدہ نادر ہے اور عام دسترس سے باہر، اس لئے اس کی اشاعت کے پیش نظر ہم اس کو پورا نقل کر رہے ہیں تاکہ تاریخ میں اس کو وہ مقام ملے جس کا مستحق ہے ملاحظہ ہو ضمیمہ (۱)

پیاسے ہیں اور آپ برستے بادل ہیں، کاش مجھے معلوم ہوتا کہ کیا ہماری پیاس بجھے گی۔ اگر اس مصیبت سے آپ نے ہمیں نجات دی تو آپ بے حدوحساب اجروثواب سے مالا مال ہوں گے۔

پھر جہاد کی فضیلت پر کئی اشعار لکھ کر آگے کہتے ہیں۔ اے اہل اسلام اور اے امت محمدیہ کے سپوتو پورے عزم وہمت اور حوصلہ کے ساتھ اس جہاد کی طرف لپکو، اسی میں خالق ومخلوق، انسان وجنات، پرندوں، جنگلی جانوروں اور چوپایوں کی رضامندی ہے۔

اے لوگو! فرنگیوں کو اپنا دوست نہ بنانا خواہ تمہیں جان کی تباہی اور تجارت کی بربادی کا خطرہ ہی کیوں نہ ہو۔ خدائے بے نیاز نے ان کی دوستی سے منع کیا ہے اور جو ان سے دوستی رکھے گا قیامت کے دن انہیں کے ساتھ اس کا حشر ہوگا۔ اگر تم نے اس جہاد سے غفلت برتی تو پہلے دنیا کے خسارہ میں رہو گے پھر آخرت میں حسرت وندامت ہوگی۔ اس غفلت سے بڑی آزمائش کا خطرہ ہے اور مہنگائی کا اندیشہ ہے اور گناہ کی وجہ سے ذلت ورسوائی ہلاکت اور آگ کا خوف ہے۔

اس کے بعد جہاد نہ کرنے پر جو وعیدیں آئی ہیں ان کا ذکر کیا ہے اور بنی اسرائیل وغیرہ کی مثالیں پیش کیں ہیں۔

اخیر میں بڑے جوش کے ساتھ کہتے ہیں :

''دین محمدی کے دشمنوں پر کود پڑو اور اپنے دین ودنیا کی حفاظت کا سامان کرو، اس سے زاد آخرت اور جنت کی امید رکھو، موت بہرحال آنی ہے، اور ہر وقت اس کا کھٹکا لگا رہتا ہے، اس حقیقت کو ہمہ پیش نظر رکھو۔ بزدلی نہ دکھاؤ، اللہ اپنے دین کی مدد کرنے والا صلیبوں کو توڑنے والا اور سنت کی اشاعت کرنے والا ہے، اگر تم نے مال صرف کر کے جہاد کیا تو تم بندگان خدا کے نجات دہندہ ثابت ہو گے۔

شیخ کی زندگی میں ان کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا وہ اسی کوشش میں تھے اور پورا زور لگائے ہوئے تھے کہ ۹۲۸ھ مطابق ۱۵۲۱ء میں ان کا وقت آخر آپہنچا اور انہوں نے پونانی میں انتقال کیا ان کی قبر وہاں جامع مسجد کے متصل ہے اور راقم نے زیارت کی ہے۔

فقیہ احمد مرکار

فقیہ احمد مرکار کیرالا کے مشہور مجاہد علماء میں سے تھے جنہوں نے فرنگیوں کا ناک

میں دم کر رکھا تھا۔۹۳۱ھ (۱۵۲۴ء) میں اپنے بھائی کنج علی مرکار اور ماموں محمد علی مرکار اور خاندان کے دیگر افراد کے ساتھ میدان میں اترے تھے۔

پرتگالیوں کے تسلط کا یہ عالم تھا کہ ہندوستانی تاجر بغیر پروانہ راہ داری کے سفر نہیں کر سکتے تھے۔ مرکار خاندان کے کچھ سر برآوردہ افراد ابراھیم مرکار وغیرہ نے ۹۴۴ھ (۱۵۳۷ء) میں اس کی جرأت کی اور ان کی کشتی بغیر پروانہ کے ادرک اور سیاہ مرچ لے کر تجارت کی غرض سے جدہ پہنچی جس کے نتیجہ میں پرتگالیوں نے ان کو قتل کیا۔(۱)

پھر علی ابراہیم سرکار (یہ ابراہیم مرکار کے چچا تھے) فقیہ احمد مرکار اور ان کے بھائی کنج علی مرکار ۴۰ کشتیاں لے کر کایل پٹنم (Kayal Pattanam)(۲) کی طرف نکلے پتالہ (Puttalam)(۳) پہنچ کر کشتیاں لنگر انداز کیں اور کئی روز وہاں قیام کیا۔ اسی اثناء میں فرنگی بھی اپنی کشتیوں میں سوار ہو کر آپہنچے، دونوں میں جنگ ہوئی اور فرنگیوں نے مسلمانوں کی کشتیوں پر قبضہ کر لیا اور بہت سے مسلمان شہید ہوئے۔ یہ واقعہ اخیر شعبان ۹۴۴ھ (۱۵۳۸ء) میں پیش آیا۔ بقیہ لوگوں نے وہاں سے نکلنے میں عافیت سمجھی۔ سرداروں میں علی ابراہیم مرکار کو کاری زخم آئے تھے۔ واپسی میں اثنائے راہ نلیبطی (۴) کی ایک مسجد میں ان کا انتقال ہوا۔(۵)

مگر اس سے فقیہ احمد مرکار کی ہمت پست نہیں ہوئی۔ علی ابراہیم مرکار کی وفات کے دوسرے سال ہی انہوں نے اور ان کے بھائی کنج علی مرکار نے گیارہ کشتیوں کے ساتھ جزیرۂ سیلان کا رخ کیا مگر فرنگی بھی وہاں پہنچ گئے اور ان کا راستہ روکنے کی کوشش کی اور جنگ کر کے کشتیاں چھین لیں۔ بہت سے مسلمان شہید ہوئے جو بچ رہے انہوں

---

(۱) تحفۃ المجاہدین میں ہے کہ فرنگیوں کو کسی بات پر اس قدر غصہ نہیں آتا تھا جس قدر ادرک اور سیاہ مرچ کی تجارت پر اور بالخصوص جب ان چیزوں کی تجارت جدہ میں کی جائے۔

(۲) کایل پٹنم دریائے تامراوارنی (Thamra Varni) کے ساحل پر واقع ہے مارکو پولو اسی راستے سے آیا تھا جس کی وجہ سے اس دریا کو بڑی شہرت حاصل ہوئی (تحفۃ المجاہدین صفحہ ۸۲ حاشیہ ۲۰۵)

(۳) پتالہ کایل پٹنم کے جنوب میں ہے۔

(۴) یہ مقام کوچین میں واقع ہے۔

(۵) تحفۃ المجاہدین صفحہ ۵۲ مع حاشیہ

نے دونوں سرداروں کے ساتھ حاکم سیلان کے یہاں پناہ لی مگر اس نے دونوں کو دھوکہ سے مار ڈالا (۱)۔ اس میں بھی فرنگیوں کی سازش معلوم ہوتی ہے وہ فقیہ احمد مرکار اور ان کے بھائی کو بہت خطرناک سمجھتے تھے، میدان جنگ میں ان کی جان نہ لے سکے تو دھوکہ کا راستہ اختیار کیا۔

شیخ شمس الدین محمد حمصی کالیکوٹی

عارف باللہ حضرت شیخ ابوالوفاء شمس الدین محمد بن شیخ علاء الدین حمصی ثم کالیکوٹی کیرالا کے مشہور اولیاء اللہ میں تھے۔

آپکے والد شیخ علاؤالدین حمصی شرفاء حمص میں سے تھے، وہ خود ایک بڑے عابد شخص تھے، تجارت کے لئے کالیکٹ آئے اور یہیں بس گئے، اور یہاں ایک نیک خاتون سے شادی کی، آپ کے فرزند شیخ شمس الدین محمد ۹۳۰ھ میں کالیکٹ میں پیدا ہوئے، علوم رسمیہ کی تحصیل قاضی احمد کالیکوٹی سے کی بچپن ہی سے لہو ولعب سے کلی اجتناب تھا، زیادہ تر وقت تیر اندازی اور نیزہ بازی اور تلوار چلانے کی مشق میں صرف کرتے۔ یہ پرتگالیوں سے جنگ کا زمانہ تھا۔ آپ جوان ہوئے تو ایک پختہ کار فوجی اور ماہر جنگ سپاہی تھے، فرنگیوں کے ساتھ بحری جنگوں میں انہوں نے بڑے کارنامے انجام دیئے۔ وہ مسلمانوں کو جنگ پر ابھارتے اور سامری کی بھرپور مدد کرتے تھے۔ ۹۸۰ھ (۱۵۷۲ء) میں وفات پائی۔ آپکا مزار کالیکٹ میں زیارت گاہ خاص و عام ہے (۲)۔

قاضی جزیرہ شیتلاکم

پرتگالیوں سے مقابلہ کر کے شہید ہونے والوں میں جزیرہ شیتلاکم (۳) کے قاضی صاحب کا نام بہت نمایاں ہے۔ یہ بڑے عالم فاضل اور صالح شخص تھے، عمر بھی زیادہ تھی

---

(۱) تحفۃ المجاہدین صفحہ ۵۳

(۲) تحفۃ الاخیار (مخطوطہ)، مصنف لکھتے ہیں کہ بہت سے علماء کیرالا نے آپ کے مناقب میں کتابیں لکھی ہیں۔

(۳) شیتلاکم جسکو آج کل شیتلات (Chetlat) کہتے ہیں لکشادیپ کے چھوٹے جزائر میں سے ہے۔

مگراس کے باوجود فرنگیوں سے مقابلہ کیا اور شہادت سے بہرہ مند ہوئے۔

اس کی تفصیل بتاتے ہوئے فقیہ زین الدین مخدوم لکھتے ہیں۔

۹۶۳ھ (۱۵۵۵ء) فرنگیوں نے جزائر ملیبار (۱) کا رخ کیا۔ یہ جزیرے ازراجا (۲) کے قبضہ میں تھے، اس چڑھائی سے ان کا مقصد ازراجا کو زک پہنچانا اور اس کی قوت توڑنا تھا۔ فرنگی جزیرہ امنی (Amini) میں اترے اور بڑی تعداد میں وہاں کے باشندوں کو تہ تیغ کیا اور چار سو سے زائد مردوں اور عورتوں کو گرفتار کیا، مال واسباب لوٹا اور بہت سے گھروں اور مسجدوں کو جلا دیا۔ امنی میں داخل ہونے سے پہلے شیتلا کم پہنچے اور وہاں کے بعض لوگوں کو قتل کیا اور بعض کو گرفتار، ان جزیروں کے باشندے اس حملہ سے بالکل غافل تھے، ان کو اس کی کوئی خبر نہیں تھی نہ ان کے پاس ہتھیار تھے اور نہ ان میں کوئی شخص فن حرب سے واقف تھا، اس کے باوجود لوگوں نے مدافعت کی، مٹی اور پتھر پھینکے اور لکڑی کے پٹروں سے کام لیا یہاں تک کہ لڑتے ہوئے جانیں دیں۔ ان شہید ہونے والوں میں یہاں کے قاضی صاحب اور انکی بیوی بھی تھیں، قاضی صاحب بڑے فاضل صالح اور عمر رسیدہ تھے انکی بیوی بھی بڑی نیک صالحہ خاتون تھیں۔ (۳)

شیخ عبدالعزیز مخدوم یونانی

شیخ مخدوم عبدالعزیز، شیخ زین الدین مخدوم (کبیر) کے صاحبزادہ تھے۔ تمام علوم

---

(۱) مولانا حکیم سید شمس اللہ قادری صاحب لکھتے ہیں کہ جزائر ملیبار سے لکادیپ (لکشادیپ) کے جزیرے مراد ہیں۔ ان کی تعداد سو سے زیادہ ہے۔ ان میں سب سے بڑا جزیرہ امنی ہے اور اسے یورپین قوموں میں سب سے پہلے ملیبار کی جانب آتے ہوئے واسکوڈی گاما نے ۱۴۹۹ء میں دریافت کیا تھا، لیکن اس سے پہلے عرب اور سواحل فارس کے مسلمان جہاز ران ان جزیروں سے خوب واقف تھے اور ان کے جو جہاز فارس یا عرب کے سواحل سے چین کی جانب روانہ ہوتے تو راستہ میں ان کا ضرور قیام ہوا کرتا تھا (پرتگیزان مالابار صفحہ ۲۹ فٹ نوٹ)

(۲) ازراجا یا آذی راجا، ارکل خاندان کے بادشاہ کا لقب ہے، یہ ایک قدیم مسلم خاندان تھا جو کنور میں حکومت کرتا تھا۔ مالک بن دینار اور انکے ساتھیوں کی ملیبار آمد کے وقت سے اس خاندان کے نقوش پائے جاتے ہیں اس زمانہ میں علی آذراجا وہاں کا حاکم تھا جس نے فرنگیوں کے مقابلہ میں بڑی جدوجہد کی تھی اور زر کثیر صرف کیا تھا۔ (تحفۃ المجاہدین صفحہ ۸۳ حاشیہ ۲۱۵ نیز صفحہ ۵۵)

(۳) تحفۃ المجاہدین ص ۵۵-۵۶

مروجہ تفسیر، حدیث، فقہ، عقائد وکلام اور ادب میں درک رکھتے تھے، ساتھ ساتھ جذبہ دعوت میں بھی والد کے نقش قدم پر تھے، اسی کا نتیجہ تھا کہ بڑی تعداد میں ہندو اور عیسائی ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔ اپنے والد کے علاوہ قاضی احمد کالیکوٹی (متوفی ۹۶۰ھ) سے علم کی تحصیل کی۔

آپ بڑے مجاہد بھی تھے، والد صاحب کی جلائی ہوئی آگ کو اور سلگایا اور بڑی سرگرمی کے ساتھ پرتگالیوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیا بلکہ بعض معرکوں میں مسلمانوں کے لشکر کی قیادت کی اور جنرل افواج کا کام کیا۔ اسی وجہ سے سامری کے ساتھ بھی گہرے روابط تھے۔

آپ نے کئی کتابیں لکھیں۔ اکثر کتابیں محفوظ نہیں رہ سکیں۔ جو محفوظ ہیں ان میں والد صاحب کی کتاب ''هداية الأذكياء'' کی شرح بنام ''مسلك الأتقياء'' ہے جو مطبعہ بولاق مصر سے شائع ہوئی ہے۔ آپ نے پچاسی سال کی عمر میں ۹۹۴ھ (۱۵۸۶ء) میں انتقال کیا۔ (۱)

شیخ فقیہ زین الدین مخدوم صغیر

شیخ زین الدین (صغیر) جنوبی ہندوستان کے مشہور ترین علماء میں سے ہیں۔ وہ شیخ زین الدین کبیر مصنف ''تحريض أهل الإيمان'' کے پوتے تھے۔ وہ ایک نکتہ رس فقیہ، بالغ نظر محدث، ماہر مؤرخ اور معرفت وسلوک کے رمز آشنا تھے۔ بعض محققین ان کو ہندوستان کا سب سے بڑا شافعی فقیہ گردانتے ہیں۔ انہوں نے دس سال ارض حرم میں گزار کر وہاں کے مشائخ سے استفادہ کیا تھا۔ فقہ کی تحصیل وتکمیل مشہور محقق فقیہ علامہ ابن حجر هیتمی مکی سے کی اور شیخ محمد صدیق البکری المکی سے طریقہ قادریہ حاصل کیا۔ شیخ زین الدین نے کئی کتابیں یادگار چھوڑیں جن میں فتح المعین (۲) اور تحفۃ

---

(۱) تحفة الأخيار في تاريخ علماء مليبار (مخطوطہ)۔

(۲) فتح المعین فقہ شافعی کے مشہور اور جامع مختصرات میں سے ہے اور ہندوستان کے شافعی حلقہ مدارس میں آج تک داخل نصاب ہے۔ مصر وشام اور یمن میں بھی ایک زمانہ میں اس کا بڑا رواج رہا تھا یمنی اور مصری علماء نے اس کے حواشی لکھے ہیں۔

المجاهدین (۱) نے عالمگیر شہرت حاصل کی۔ ان کی پیدائش ۹۲۸ھ (۱۵۲۲ء) کی ہے۔ یہ پرتگالیوں کے عروج کا زمانہ تھا۔ وہ کیرالا کے ہر گوشہ میں سر اٹھائے ہوئے تھے اور ان کی زیادتیاں حد سے گذر گئی تھیں، اس لئے شیخ نے بھی اپنے درس و تدریس اور علمی مشغولیتوں کے ساتھ سیاست کے خارزار میں قدم رکھا۔ وہ کیوں میدان میں نہ آتے جب کہ ان کے دادا ہی نے اس جہاد کا بگل بجایا تھا اور اس اولین جنگ آزادی میں قائدانہ کردار ادا کیا تھا۔ انہوں نے ایک ایسے گھرانہ میں پرورش پائی تھی جو شروع دن سے ہی پرتگالیوں کے خلاف صف آرا تھا۔ اس لئے شیخ بھی سیاسی قائد کی حیثیت سے

---

(۱) کتاب کا مکمل نام تحفة المجاهدين في بعض اخبار البرتغاليين یا تحفة المجاهدين في احوال البرتغاليين ہے یہ کتاب چار اقسام (ابواب) پر مشتمل ہے قسم اول میں جہاد کے احکام، فضیلت وثواب اور ترغیب کا بیان ہے۔
قسم ثانی میں مالابار میں اسلام کے آغاز اور مسلمانوں کی آمد کا ذکر ہے
قسم ثالث میں مالابار کے کفار کے رسوم وعادات کا بیان ہے۔
قسم رابع میں پرتگالیوں کے مالابار آنے اور یہاں اقتدار حاصل کرنے اور ان کے اور باشندگان مالابار کے درمیان ہونے والی جنگوں کی تفصیل ہے۔
یہ کسی بھی زبان میں ہندوستانی پرتگالیوں کے حالات میں لکھی جانے والی سب سے پہلی کتاب ہے۔ چونکہ اس میں بیان کردہ اکثر واقعات مصنف کے چشم دید ہیں اس لئے اس کو تاریخی طور پر بڑی اہمیت حاصل ہے اور بہت معتمد مآخذ میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ اسی وقت یہ کتاب مختلف ممالک میں پہنچ گئی تھی۔ اس نے مشرق سے زیادہ مغرب میں شہرت حاصل کی۔ مغربی زبانوں میں سے انگریزی، فرنچ، پرتگالی، جرمنی اسپینی اور چیکی میں اس کا ترجمہ ہوا ہے۔ نیز فارسی میں بھی اس کا ترجمہ کیا گیا۔ اور ہندوستان کی زبانوں میں اردو، کنڑ، ملیالم، گجراتی اور تامل زبانوں میں اسکے تراجم موجود ہیں۔ کے کے محمد عبدالکریم کندولی ملیباری نے تحفۃ المجاہدین کے مقدمہ میں اسکا ذکر کیا ہے۔ اردو ترجمہ پرتگیزان مالابار کے نام سے مولانا حکیم سید شمس اللہ قادری صاحب نے کیا ہے جو ۱۹۳۷ء میں حیدر آباد سے شائع ہوا۔ مگر یہ صرف کتاب کی ''القسم الرابع'' کا ترجمہ ہے اور اس میں بھی فصل ثانی (جو پرتگالیوں کے مظالم اور چیرہ دستیوں کے بیان میں ہے اور انکی ذہنیت اور اصل مقاصد کو سمجھنے کیلئے نہایت اہمیت رکھتی ہے) کا ترجمہ غائب ہے۔ نیز اس میں ترجمہ کی بہت سی غلطیاں ہیں ہاں البتہ بعض مفید حواشی اور تعلیقات ہیں جن سے ہم نے فائدہ اٹھایا ہے۔ حکیم شمس اللہ صاحب کے قلم سے ہی تحفۃ المجاہدین کے نام سے بھی اس کا اردو ترجمہ ملتا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۲ء میں علی گڑھ میں چھپی تھی۔ غالباً پہلے قسم رابع کا ترجمہ کیا ہوگا پھر پوری کتاب کا۔

سامنے آئے (۱) ان کی کتاب "تحفۃ المجاھدین" ایک تاریخی دستاویز ہی نہیں بلکہ پرتگالیوں سے مقابلہ کرنے اور آزادی کی جنگ میں شریک ہونے کی کھلی دعوت بھی ہے۔

آغاز کتاب ہی میں لکھتے ہیں: اس وقت ہمارے یہاں کی جو صورتحال ہے کہ کفار مسلمانوں کے ملک میں گھس آئے ہیں اس میں ہر طاقت رکھنے والے مکلّف مسلمان پر جہاد فرض عین ہے خواہ غلام ہو، عورت ہو یا قرضدار ہو۔ اصول وفروع سب پر، غلاموں کو آقاؤں سے اجازت کی بھی ضرورت نہیں اور بیوی پر بھی شوہر سے اجازت واجب نہیں۔ مسافت قصر میں جو رہتے ہوں ان سب پر جہاد فرض ہے اور اس سے کام نہ چلتا ہو اور ان سے کفایت نہ ہوتی ہو تو حد قصر سے باہر رہنے والوں پر بھی جہاد فرض ہے۔ (۲)

وہ فرنگیوں کے زیر تسلط علاقہ کو دار الحرب سمجھتے تھے۔ ۱۵۱۰ء میں گوا پر حملہ کے بعد عادل شاہ نے ان سے جنگ کی تھی۔ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس نے ان کو مصیبت سے نکالا اور گوا کو دوبارہ دار الاسلام میں تبدیل کیا۔ (۳)

مسلمان سلاطین اور امراء کو ان سے جہاد کی ترغیب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جو صاحب اختیار و اقتدار فرنگیوں سے جہاد میں مال صرف کرے گا اور ان سے جنگ کرنے اور مالابار کے علاقہ سے ان کو نکالنے کے لئے مناسب تیاری کرے گا اور جن بندرگاہوں پر انہوں نے قبضہ کرلیا ہے اور جن کے مالک بن بیٹھے ہیں ان سے ان کو آزاد کرنے کی کوشش کرے گا تو وہ توفیق یافتہ اور خوش نصیب ہوگا اور خدا کے حکم سے اپنے فرض و واجب کو پورا کرنے والا اور بقیہ لوگوں کی تنگی اور پریشانی کو دور کرنے والا قرار پائے گا، اور اتنا اجر وثواب اسے ملے گا جس کا شمار نہیں اور مشرق ومغرب والوں کی طرف سے نہ جانے کتنی تعریف وستائش کا مستحق ہوگا۔ اللہ، اس کے ملائکہ، انبیاء اور

(۱) پرتگالیوں کے خلاف جنگ کرنے والے قائدین کے ساتھ ان کے مضبوط تعلقات تھے، علی عادل شاہ والئی بیجاپور اور کالیکٹ کے راجا سامری کا انہیں بھرپور اعتماد حاصل تھا اور ایک روایت کے مطابق سامری نے اسلامی ریاستوں کے امراء کو انہی سے عربی میں خطوط لکھوائے تھے۔ (تحفۃ الاخیار، مخطوطہ)

(۲) تحفۃ المجاہدین۔ صفحہ ۱۷

(۳) ایضاً صفحہ ۴۰

اولیاء کا محبوب بنے گا، اور اللہ کے نیک بندوں، کمزوروں اور درماندوں اور فقراء و مساکین کی دعاؤں سے شاد کام ہوگا۔(۱)

کتاب کا اسلوب ان کے جذبات کی صحیح غمازی کرتا ہے وہ مجاہدین کو دعا دیتے اور فرنگیوں کے حق میں بدعا کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔

علی آذراجا جس نے فرنگیوں سے سخت مقابلہ کیا تھا (جس کا پہلے ذکر آچکا ہے) کا دوجگہ وفقہ اللہ للخیرات (خدا اس سے مزید کام لے اور خیر کی توفیق عطا فرمائے) سے ذکر کیا ہے۔(۲)

کتی پوکر نے ۹۷۸ھ (۱۵۷۰ء) میں فرنگیوں سے مقابلہ کرتے ہوئے جام شہادت نوش کیا تھا۔اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں : خدا اس کے ساتھ رحم وکرم کا معاملہ کرے یہ فرنگیوں کے مقابلہ میں بڑا ہی مخلص تھا۔(۳)

۹۸۵ھ (۱۵۷۷ء) میں پرتگالیوں نے بندرگاہ سورت سے جدہ جانے والے کئی جہاز پکڑ لئے تھے۔ان میں شہنشاہ ہند جلال الدین اکبر کے بھی جہاز تھے اس وجہ سے فرنگیوں اور اکبر میں نزاع ہوا چونکہ قیمتی شاہی مال واسباب تھا اور زیادہ تھا اس لئے صلح کی غرض سے فرنگیوں کے لئے اس کو واپس کرنا آسان نہ تھا۔اکبر نے ان سے مقابلہ کی ٹھانی اور رعادل آباد کی بندرگاہ کی طرف ان سے مقابلہ کے لئے کچھ آدمی بھیجے۔اس واقعہ کو بیان کر کے اکبر کو دعا دیتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے : اللہ سلطان جلال الدین اکبر کو ہدایت دے اور اس کی بھرپور مدد فرمائے اور فرنگیوں سے جنگ کرنے اور تمام بندرگاہوں سے جن پر وہ قابض ومسلط ہیں ان کو نکالنے کی توفیق عطا فرمائے۔(۴)

وہ فرنگیوں کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے پوری طرح واقف اور ان کی چالوں پر گہری نظر رکھتے تھے۔ایک جگہ لکھتے ہیں : وہ ملعون بڑے ہوشیار، مکار، حیلہ ساز اور چالباز ہیں۔دوسرے موقع پر تحریر کرتے ہیں : اپنے معاملات کی مصلحتوں اور تقاضوں

---

(۱) تحفۃ المجاہدین۔ صفحہ ۱۸
(۲) ایضاً صفحہ ۵۵ وصفحہ ۶۰
(۳) ایضاً صفحہ ۵۹-۶۰
(۴) ایضاً صفحہ ۶۴

سے خوب واقف ہیں۔ضرورت کے وقت اپنے دشمنوں سے انتہائی لجاجت اور عاجزی کرتے ہیں اور جب ان کا کام بن جاتا ہے تو پوری قوت سے پل پڑتے اور ہر ممکن طریقہ سے اس کی مخالفت کرتے ہیں۔(۱)

دوسرے موقع پر رقم طراز ہیں وہ مکاری، غداری، چالبازی اور حیلہ سازی میں انتہا کو پہنچے ہوئے ہیں۔(۲)

اس لئے وہ ان کو سخت سے سخت بددعا دیتے ہیں، جگہ جگہ ان کا ملاعین اور لعنهم الله سے ذکر کیا ہے۔کہیں قاتلهم الله (خدا ان کو غارت کرے) کہیں خذلهم الله (خدا ان کو بے یارومددگار چھوڑے اور ان پر ادبار لائے) اور کہیں أهلكم الله هلاک عاد و ثمود (خدا عاد و ثمود کی طرح ان کو تباہ و برباد کرے) جیسے سخت الفاظ لکھے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ وہ فرنگیوں کے خلاف سخت سے سخت اقدام کر کے ان کی جڑ اکھاڑنا چاہتے تھے۔اسی کوشش کے دوران جان جان آفریں کے سپرد کیں۔تاریخ وفات میں اختلاف ہے مگر یہ طے ہے کہ ۹۹۲ھ (۱۵۸۴ء) کے بعد ان کا انتقال ہوا اس لئے کہ تحفۃ المجاہدین میں ۹۹۲ھ تک کے واقعات موجود ہیں۔اس لئے عام طور پر محققین ۹۹۱ھ کے بعد ان کا انتقال ہونا بتاتے ہیں مگر حال میں کیرالا سے شائع ہونے والی ایک کتاب میں سنہ وفات ۱۰۲۸ھ درج ہے(۳)۔نیز شیخ محمد علی موسلیار نے بھی تحفۃ الاخیار میں یہی تاریخ لکھی ہے اور انہوں نے صراحت کی ہے کہ انتقال کے وقت اکیانوے برس کی عمر تھی۔

قاضی عبدالعزیز بن قاضی احمد کالیکوٹی

قاضی عبدالعزیز اپنے زمانے کے مشاہیر میں سے تھے، ان کی حیثیت قاضی القضاۃ کی تھی، کئی پشتوں سے ان کے خاندان میں سلسلۂ قضاءت جاری تھا، اپنے والد قاضی احمد بن قاضی فخرالدین سے تعلیم حاصل کی، پھر پونانی جا کر شیخ عبدالعزیز مخدوم

(۱) تحفۃ المجاہدین صفحہ ۴۳ (۲) ایضاً صفحہ ۴۸
(۳) المسلمون فی کیرالا صفحہ ۱۸۵

سے بھی پڑھا، تمام علوم میں دسترس حاصل تھی، ان کے مواعظ کا عوام پر کافی اثر تھا، شجاعت و بہادری میں بھی ممتاز تھے، پرتگالیوں کے خلاف جنگ میں پیش پیش رہے اور مسلمانوں کی قیادت کی۔ وہ ان کو جہاد کی ترغیب دیتے اور ظالم فرنگیوں کے خلاف جنگ پر ابھارتے تھے۔ سامری کو بھی انہوں نے اس سلسلہ میں پورا تعاون دیا۔ ۱۰۱۰ھ (۲-۱۶۰۱ء) میں انہوں نے وفات پائی۔ کالیکٹ میں مدفون ہیں۔ (۱)

قاضی محمد بن عبدالعزیز کالیکوٹی

قاضی جمال الدین محمد بن قاضی عبدالعزیز کالیکوٹی کیرالا کے مشہور علماء میں سے تھے، ۹۸۰ھ میں کالیکوٹ میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد سے اکثر کتابیں پڑھ کر مزید تعلیم کے لئے مشہور زمانہ عالم وفقیہ شیخ زین الدین مخدوم (صغیر) کے پاس تشریف لے گئے، ۱۰۱۰ھ میں حج کا سفر کیا اور کچھ عرصہ حرمین میں قیام کر کے وہاں کے علماء سے استفادہ کیا، اور وہیں بعض مشائخ سے سلسلہ قادریہ اور سلسلہ چشتیہ میں اجازت بھی حاصل کی۔ قضائت وراثت میں پائی تھی۔ آپکو تمام علوم میں دسترس تھی بالخصوص فنون ادبیہ نحو اور بلاغت وغیرہ میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ عربی شاعری میں ید طولی حاصل تھا، تجوید، تاریخ، حساب اور نجوم وفلکیات میں درک تھا، صرف پینتالیس سال کی عمر پاکر ۵ ربیع الاول ۱۰۲۵ھ (۳/اپریل ۱۶۱۶ء) میں انتقال کیا مگر اس کے باوجود مختلف موضوعات پر کئی کتابیں تصنیف کیں۔ (۲)

فرنگیوں کے سخت دشمن تھے۔ مجاہدین کے ہمنوا اور کالیکٹ کے حاکم سامری کے بڑے معتمد اور پشت پناہ تھے۔ انہوں نے اس کے لئے ایک قصیدہ لکھا جس میں انہوں نے پرتگالیوں اور ہندوستانیوں کے درمیان ۹۳۰ھ میں ہونے والے واقعہ کو تقریباً پانچ سو اشعار میں نظم کیا ہے۔ اس کا نام "الفتح المبین للسامری الذی یحب المسلمین" (۳) ہے اس کا ایک نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود ہے۔ (۴)

---

(۱) تحفۃ الاخیار فی تاریخ علماء ملیبار (مخطوطہ)

(۲) شیخ محمد علی موسلیار، تحفۃ الاخیار (مخطوطہ)، نیز کتابوں کی نا تمام فہرست کے لئے دیکھئے عبدالغفور عبداللہ القاسمی۔ المسلمون فی کیرالا۔ صفحہ ۱۸۶۔

(۳) شیخ محمد علی موسلیار نے کتاب کا نام الفتح المبین فی بیان أحوال البرتغالین لکھا ہے۔ نیز لکھتے ہیں کہ یہ ایک بڑا قصیدہ ہے جو مشہور ہے۔ ==

بعض دیگر مجاہدین

ان کے علاوہ بعض دیگر امتاز مجاہدین کے نام بھی ملتے ہیں مگر چونکہ ان کے طبقہ علماء میں سے ہونے کا قطعی علم نہ ہوسکا اسلئے ان کا مستقل عنوان کے تحت ذکر نہیں کیا گیا۔

انہی میں مرکار خاندان سے تعلق رکھنے والے دو چچازاد بھائی علی ابراہیم مرکار اور کتی ابراہیم مرکار ہیں جنہوں نے فرنگیوں کے مقابلہ میں بڑی ہمت و جرأت سے کام لیا تھا۔ انہیں میں سے کتی پوکر ہیں جنہوں نے سخت سمندری معرکہ میں شہادت پائی تھی جن کی طرف اشارہ گزر چکا ہے۔

انہی بہادر مجاہدوں مین حاکم کنعور علی آ ذ راجا کے والد کنج صوفی اوراس کے ماموں ابوبکر علی ہیں جن کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور جو بہت بڑے سردار تسلیم کئے جاتے تھے۔ دونوں کو ۹۵۲ھ (۱۵۴۵ء) میں فرنگیوں نے قتل کیا تھا۔ (۱)

ان کے علاوہ سینکڑوں مسلمان ہیں۔ جنہوں نے مختلف معرکوں میں جام شہادت نوش کیا اور ملک و وطن پر قربان ہو کر سرخرو ہوئے۔

== اس میں انہوں نے پرتگالیوں کی آمد، ان کے فتنہ وفساد، ظلم وزیادتی اور تمام اعمال بد کا تذکرہ کیا ہے۔ مگر عبدالغفور عبداللہ قاسمی صاحب نے بڑی تعداد میں ان کی کتابوں کے نام لکھنے کے باوجود اس کتاب کا ذکر نہیں کیا۔ ہاں البتہ تنبیہ الإخوان فی احوال الزمان کے نام سے ان کی ایک کتاب کا ذکر کیا ہے ممکن ہے یہ اسی قصیدہ کا دوسرا نام ہو۔ واللہ اعلم

(۴) ملاحظہ ہو جرجی زیدان، تاریخ آداب اللغة العربية ۲/۲۲۸. جرجی زیدان نے واقعہ کا سال ۹۰۳ھ لکھا ہے اور اسی سے نقل کر کے مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی نے نزهة الخواطر (الإعلام) ۴/۲۷۰ پر یہی لکھا ہے مگر صاف ظاہر ہے کہ اس میں تحریف ہوئی ہے۔ اس لئے کہ پرتگالی پہلی دفعہ ۹۰۴ھ میں ہندوستان میں داخل ہوئے اس لیے ہمارا خیال ہے کہ یہ ۹۳۰ھ ہوگا، زیدان نے عدد میں ۹۰۳ لکھا ہے اس لئے غلطی کا پورا احتمال ہے ان سے یا ان کے کاتب سے نقل کرنے میں قطعاً غلطی ہوئی ہے۔ اور مولانا عبدالحی نے اسی کو صحیح سمجھ کر ثلاث و تسعمائة لکھا ہے۔

جہاں تک ۹۳۰ھ کے واقعہ کا تعلق ہے اس کو شیخ زین الدین نے مختصراً یوں بیان کیا ہے کہ کالیکوٹ میں فندرینہ کے مسلمانوں کے درمیان جھگڑا ہوا جس سے صلح کا خاتمہ ہوا اور جنگ کی نوبت آئی جس کے نتیجہ میں فندرینہ، چمنیا، ترورنگاڈی اور پریورنگاڈی وغیرہ کے بعض باشندوں نے خفیہ طور پر کشتیوں میں سوار ہو کر فرنگیوں کی دس تجارتی کشتیوں پر قبضہ کیا۔ (تحفة المجاہدین صفحہ ۴۵)

(۱) تحفة المجاہدین صفحہ ۵۴

ضمیمہ

تحريض أهل الإيمان على جهاد عبدة الصلبان

للشيخ زين الدين بن على المليبارى

بسم الله الرحمن الرحيم

لَكَ الحَمْدُ يَا اللهُ فِي كُلِّ حَالَةٍ وَأَنْتَ عَلِيمٌ بِالْكُرُوبِ وَحَاجَةٍ
صَلَاةٌ وَتَسْلِيمٌ عَلَى خَيْرِ خَلْقِكَا مُحَمَّدٍ الدَّاعِي إِلَى خَيْرِ مِلَّةٍ
وَنَدْعُوكَ يَارَحْمٰنُ يَا خَيْرَ نَاصِرٍ لِدَفْعِ بَلِيَّاتٍ وَجَلْبِ لِبُغْيَةٍ
وَتَنْصُرُ مَنْ يَغْزُو لِإِنْقَاذِ أُمَّةٍ مِنَ الكَرْبِ وَالضَّرَّا وَكُفْرٍ وَذِلَّةٍ
سَلَامٌ عَلَيْكُمْ يَا مَآلَ لِآمِلٍ مَعَاذاً لِمُضْطَرٍّ مَلَاذاً لِأُمَّةٍ
مَدَدْنَا إِلَيْكُمْ كَفَّ ضَعْفٍ وَحَاجَةٍ وَذُلٍّ وَإِقْتَارٍ لِدَفْعِ مُلِمَّةٍ
فَإِنَّا كُرِبْنَا بِارْتِكَابِ شَدَائِدٍ بِإِفْرَنْجِ عُبَّادِ الصَّلِيبِ وَصُورَةٍ
طَغَوْا فِي بِلَادِ اللهِ مِنْ كُلِّ مُمْكِنٍ وَقَدْ أَكْثَرُوا فِيهَا الفَسَادَ بِشُهْرَةٍ
بَغَوْا فِي مَلْيَبَارٍ بِأَصْنَافِ بَغْيِهِمْ وَأَنْوَاعِ شِدَّاتٍ وَأَجْنَاسِ فِتْنَةٍ
مِنَ الأَسْرِ وَالنَّهِبِ وَإِحْرَاقِ مَسْجِدٍ وَخَرْقِ كِتَابٍ ثُمَّ هَتْكٍ لِحُرْمَةٍ
وَتَحْرِيقِ أَمْوَالٍ وَتَخْنِيقِ مُسْلِمٍ وَتَعْوِيقِ أَسْفَارٍ وَتَعْطِيلِ عِيشَةٍ
وَتَخْرِيبِ بُلْدَانٍ وَتَعْبِيدِ مُؤْمِنٍ وَتَزْيِينِ نِسْوَانٍ لِتَفْتِينِ نِسْوَةٍ
وَفَكِّ عُرَى البُلْدَانِ وَالثَّغْرِ كُلِّهَا وَدَكِّ ذُرَى الأَمْصَارِ مَعْ كُلِّ قَرْيَةٍ
وَمِلْكِ بِلَاداً وَاتِّخَاذِ لِبِيعَةٍ وَظُلْمِ عِبَاداً ثُمَّ قَطْعِ طَرِيقَةٍ
وَصَدِّ عَنِ الحَجِّ المُعَظَّمِ قَدْرُهُ بِتَعْطِيلِ أَسْفَارٍ إِلَى خَيْرِ بَلْدَةٍ
وَقَتْلٍ لِحُجَّاجٍ وَسَائِرِ مُؤْمِنٍ بِأَنْوَاعِ تَعْذِيبٍ وَأَصْنَافِ مُثْلَةٍ
وَجَلْدٍ وَقَطْعٍ مَنْ يَقُولُ مُحَمَّدٌ وَسَبِّ رَسُولِ اللهِ مِنْ غَيْرِ خُفْيَةٍ
وَتَقْيِيدِ أَسْرَى بِالقُيُودِ الثَّقِيلَةِ وَتَعْذِيبِهِمْ بِالنَّارِ مِنْ غَيْرِ رَأْفَةٍ

وَجَلْدٍ بِنَعْلٍ لِلْأُسَارىٰ بِفِيهِم خُصُوصاً لَوِاسْتَنْجَوا لَآذَوا بِجَلْدَةِ

وَقَوْدٍ وَسَوْقٍ لِلْأُسَارىٰ وَجَمْعِهِم بِضَيِّقِ بَيْتٍ مِثْلَ شَاءٍ حَقِيرَةِ

وَتَرْدِيدِهِمْ فِي السُّوقِ لِلْبَيْعِ قُيِّدُوا وَتَعْذِيبِهِمْ فِيهَا لِتَزْيِيدِ قِيمَةِ

وَتَكْلِيفِهِمْ مَالَا يُطِيقُونَ مِنْ عَمَلْ وَتَخْوِيفِهِمْ لَوْ خَالَفُوا بِأَذِيَّةِ

وَتَحْرِيضِهِمْ أَنْ يَسْجُدُوا لِصَلِيبِهِمْ وَتَحْضِيضِهِمْ أَنْ يَقْبَلُوا قَوْلَ رِدَّةِ

وَسُخْرٍ مِنَ الْإِسْلَامِ وَالْمُسْلِمِ الَّذِي يَمُرُّ طَرِيقاً ثُمَّ ضِحْكٍ بِجَهْرَةِ

يَكِلُّ لِسَانُ الْمَرْءِ عَنْ ذِكْرِ كُلِّهَا فَيَا رَبِّ خُذْهُمْ أَهْلِكَنْهُمْ بِسَطْوَةِ

جِهَادُهُمْ فَرْضٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ قَوِيٍّ بِنَفْسٍ ثُمَّ زَادٍ وَعُدَّةِ

حَتَّى عَلَى عَبْدٍ بِلَا إِذْنِ سَيِّدٍ وَوُلْدٍ بِلَا إِذْنٍ وَزَوْجٍ قَوِيَّةِ

وَلَوْ كَانَ فِيمَا فَوْقَ قَصْرِ صَلَاتِنَا إِذَا لَمْ يَكُنْ مَنْ دُونَهُ ذَا كِفَايَةِ

لِمَا دَخَلُوا دَاراً لِأُمَّةِ أَحْمَدٍ وَقَدْ قَيَّدُوا بِالْأَسْرِ أَهْلَ شَرِيعَةِ

وَإِنَّا عَلَى ضَعْفٍ وَقِلَّةِ عُدَّةٍ غَزَوْنَاهُمُ الْأَعْوَامَ قَدْرَ الْإِطَاقَةِ

وَوَافَقَهُمْ فِي ذَاكَ بَعْضُ رُعَاتِنَا فَلَمْ يَحْصُلِ الْفَتْحُ الْمُزِيلُ لِنَكْبَةِ

فَيَا أَيُّهَا السَّادَاتُ أَنْتُمْ رَجَاؤُنَا بِفَضْلِ إِلٰهِ الْعَرْشِ فِي كُلِّ شِدَّةِ

وَنَحْنُ عِطَاشٌ أَنْتُمُ السُّحْبُ تُمْطِرُ فَيَا لَيْتَ شِعْرِي هَلْ نَفُوزُ بِرِيَّةِ

فَإِنْ أَنْتُمْ أَنْقَذْتُمُونَا مِنَ الْكُرَبْ وَجَدْتُمْ ثَوَاباً لَيْسَ يُحْصَى لِكَثْرَةِ

فَقَدْ حَرَّضَ الْمَوْلَى عَلَى الْغَزْوِ لِلْعِدَى خُصُوصاً عَلَى غَزْوٍ لِتَفْرِيجِ كُرْبَةِ

فَإِنَّا لَمِنْ مُسْتَضْعَفِينَ اجْعَلَنْ لَنَا وَلِيّاً نَصِيراً مِنْ لَدُنْكَ بِرَحْمَةِ

وَقَدْ قَالَ خَيْرُ الْمُرْسَلِينَ مُحَمَّدٌ شَفِيعُ الْوَرىٰ بَحْرُ النَّدىٰ ذُو مَكَانَةِ

لِمَنْ نَفَّسَ الْكُرَبَ الَّذِي جَاءَ مُسْلِماً يُنَفَّسُ عَنْهُ كُرَبُ يَوْمِ الْقِيَامَةِ

وَهٰذَا أَتَى فِيمَنْ يُنَفِّسُ كُرْبَةً عَنِ الْمُسْلِمِ الْفَرْدِ الْمُصَابِ بِغُمَّةِ

فَمَا ظَنُّكُمْ فِيمَنْ يُنَفِّسُ جُمْلَةً مِنَ الْكَرْبِ عَنْ كُلِّ الْأَنَامِ بِغَزْوَةِ

وَقَدْ جَاءَ أَخْبَارٌ صِحَاحٌ كَثِيرَةٌ بِفَضْلِ جِهَادٍ فَاسْمَعَنَّ بِنُبْذَةِ

لَغَدْوَةُ شَخْصٍ فِي سَبِيلِ إِلٰهِهِ لَخَيْرٌ مِنَ الدُّنْيَا وَمَالٍ كَرَوْحَةِ

وَمَنْ قَاتَلَ الْأَعْدَا فُوَاقاً لِنَاقَةٍ ... فَقَدْ فَازَ مِنْ فَضْلِ الْكَرِيمِ بِجَنَّةٍ
رِبَاطٌ بِيَومٍ فِي سَبِيلِ إِلٰهِنَا ... لَأَفْضَلُ مِنْ دُنْيَا وَمَالٍ بِجُمْلَةٍ
وَعَيْنَانِ لا تَغْشَاهُمَا النَّارُ مِنْ لَظَى ... فَعَيْنٌ بَكَتْ مِنْ خَشْيَةِ اللهِ عَزَّتِ
وَعَيْنٌ تَبِيتُ اللَّيْلَ تَحْرِسُ لِلعِدَى ... رَجَاءَ ثَوَابِ اللهِ مِنْ خَيْرِ يَقْظَةٍ
وَ إِنّ جَمِيعَ الْبِرِّ فِى جَنْبِ غَزْوَةٍ ... كَنُقْطَةِ مَاءٍ فِى الْبِحَارِ الزَّخِيرَةِ
كَذٰلِكَ كُلُّ الْبِرِّ وَ الْغَزْوُ نُقْطَةٌ ... بِجَنْبِ عُلُومٍ لِازْدِيَادِ الْفَضِيلَةِ
وَمَنْ أَنْفَقَ الْأَمْوَالَ فِي الْبِرِّ يَحْصُلُ ... بِوَاحِدَةٍ عَشْرٌ أُدِيمَتْ وَجَلَّتِ
وَمَنْ فِي سَبِيلِ اللهِ أَنْفَقَ مَالَهُ ... فَسَبْعَمِآتٍ نَالَ عَنْ كُلِّ حَبَّةٍ
وَمَنْ يُنْفِقِ الْأَمْوَالَ فِي الْغَزْوِ خَارِجاً ... فَسَبْعَمِائَيْ أَلْفٍ لِتَفْسِيرِ آيَةٍ
وَمَنْ لَمْ يُجَاهِدْ أَوْ يُجَهِّزْ مُجَاهِداً ... وَلَمْ يَخْلُفِ الْغَازِي بِأَهْلٍ لِخِدْمَةٍ
يُصِبْهُ إِلٰهُ الْعَرْشِ وَالْخَلْقِ كُلِّهِمْ ... بِقَارِعَةٍ قَبْلَ الْقِيَامَةِ جَاءَتِ
وَمَنْ جَهَّزَ الْغَازِي فَقَدْ صَارَ غَازِياً ... كَذَا خَالِفٌ فِي أَهْلِهِ بِإِعَانَةٍ
وَجُرْحٌ لِمَكْلُومِ الْغَزَا حِينَ يُبْعَثُ ... بِلَوْنِ دَمٍ وَالرِّيحُ مِسْكٌ بِفَارَةٍ
وَمَنْ مَاتَ مِنْ غَيْرِ الْغَزَاءِ وَنِيَّةٍ ... فَقَدْ مَاتَ مِنْ دَاءِ النِّفَاقِ بِشُعْبَةٍ
وَمَنْ دَخَلَ الْجَنَّاتِ لَمْ يَرْجُ رَجْعَةً ... لِدُنْيَا وَلَو كَانَتْ لَهُ كُلُّ نِعْمَةٍ
وَلٰكِنْ شَهِيدٌ قَدْ تَمَنَّى رُجُوعَهُ ... لِقَتْلٍ مِرَاراً مِنْ ظُهُورِ كَرَامَةٍ
وَمَنْ مَاتَ فِي غَزْوٍ فَيُجْعَلُ رُوحُهُ ... حَوَاصِلَ طَيْرٍ كَانَ فِي لَوْنِ خُضْرَةٍ
فَيَشْرَبُ مِنْ مَاءٍ بِأَنْهَارِ جَنَّةٍ ... وَيَأْكُلُ مِنْ ثَمْرِ الْجِنَانِ اللَّذِيذَةِ
وَيَأْوِي إِلَى الْقِنْدِيلِ مِنْ خَيْرِ عَسْجَدٍ ... يُعَلَّقُ فِي ظِلِّ لِعَرْشٍ بِرَاحَةٍ
وَلَمَّا أَصَابُوا طِيبَ أَكْلٍ وَمَشْرَبٍ ... وَطِيبَ مَقِيلٍ يَوْمَ أُحُدٍ بِوَقْعَةٍ
تَنَادَوا وَقَالُوا مَنْ يُبَلِّغُ صِحَابَنَا ... بِأَنَّا كَذَا أَحْيَاءُ دَارِ الْمَسَرَّةِ
فَقَالَ إِلٰهُ الْخَلْقِ إِنِّي مُبَلِّغٌ ... رِسَالَتَكُمْ عَنْكُمْ فَقَالَ بِسُورَةٍ
وَلَا تَحْسَبَنَّ الصَّائِرِيْنَ بِغَزْوِهِمْ ... إِلَى الْقَتْلِ أَمْوَاتاً كَسَائِرِ مَوْتَةٍ
وَلٰكِنَّهُمْ أَحْيَاءُ عِنْدَ إِلٰهِهِمْ ... بِرِزْقٍ وَفَضْلٍ فَارْغَبُوا فِي الشَّهَادَةِ

وَلَمَّا أَصَابُوا مِثْلَ هٰذَا بِجَنَّةٍ　　فَقَالَ لَهُمْ رَبُّ الْعُلَا فِي اطِّلَاعَةٍ

أَهَلْ تَشْتَهُونَ الشَّيْئَ قَالُوا وَ أَيُّ شَيْ　　نُرِيدُ وَنَحْنُ الْفَائِزُونَ بِشَهْوَةٍ

فَقَالَ ثَلَاثاً ذَا الْمَقَالَ لَهُمْ فَقَدْ　　رَأَوْا أَنَّهُمْ لَنْ يُتْرَكُوا مِنْ مَقَالَةٍ

فَقَالُوا نُرِيدُ الرَّدَّ لِلرُّوحِ فِي الْجَسَدِ　　لِنُقْتَلَ فِي سُبُلِ الْإِلٰهِ بِمَرَّةٍ

فَلَمَّا رَأَى أَنْ مَا بَقِي حَاجَةٌ لَهُمْ　　حَمَاهُمْ مِنَ الْإِلْحَاحِ رَبُّ الْبَرِيَّةِ

شَهِيدٌ لَيُعْفَى غَيْرَ دَيْنٍ ذُنُوبُهُ　　بِأَوَّلِ ضَرْبٍ كَانَ مُزْهِقَ مُهْجَةٍ

يُرَى مَقْعَداً يَأْوِي إِلَيْهِ بِجَنَّةٍ　　إِذَا زَهَقَ الرُّوحُ الزَّكِيُّ بِضَرْبَةٍ

وَيُحْفَظُ مِنْ فَتَّانِ قَبْرٍ وَيَأْمَنُ　　مِنَ الْفَزَعِ الْأَعْلَى بِيَوْمِ الْمَخَافَةِ

وَيُوضَعُ تَاجٌ لِلْوَقَارِ بِرَأْسِهِ　　لِإِكْرَامِهِ رَبُّ الْبَرَايَا بِعِزَّةٍ

وَيَا قُوتَةٌ مِنْهَا لَخَيْرٌ مِنَ الَّتِي　　بِهَا النَّاسُ غَرُّوا جَاهِلِينَ بِآفَةٍ

يُزَوَّجُ مِنْ حُورٍ حِسَانٍ كَوَاعِبٍ　　بِثِنْتَيْنِ وَالسَّبْعِينَ مِنْ خَيْرِ زَوْجَةٍ

يُشَفَّعُ فِي سَبْعِينَ مِنْ أَقْرِبَائِهِ　　فَيَا لَكَ مِنْ عِزٍّ وَفَخْرٍ وَرُتْبَةٍ

كَذَا قَالَ خَيْرُ الْأَنْبِيَاءِ رَسُولُنَا　　مُحَمَّدٌ الْهَادِي إِلَى خَيْرِ شِرْعَةٍ

عَلَيْهِ صَلَاةُ اللهِ مَا لَاحَ بَارِقٌ　　وَمَا غَنَّتِ الْأَطْيَارُ فِي حُسْنِ نَغْمَةٍ

جَزَى اللهُ مَنْ يَغْزُو جَزَاءً مُوَفَّراً　　وَ أَنْقَذَهُمْ مِنْ كُلِّ شَرٍّ وَمِحْنَةٍ

فَيَا أَهْلَ إِسْلَامٍ وَأُمَّةَ أَحْمَدٍ　　هَلُمُّوا إِلَى هٰذَا الْجِهَادِ بِهِمَّةٍ

فَفِيهِ رِضَى الْخَلَّاقِ وَالْخَلْقِ إِنْسِهِمْ　　وَجِنٍّ وَوَحْشٍ وَالطُّيُورِ وَدَابَّةٍ

وَلَا تَجْعَلُوا إِفْرَنْجَ يَا قَوْمِ أَوْلِيَا　　وَإِنْ خِفْتُمُ هُلْكاً وَفَوْتَ تِجَارَةٍ

فَقَدْ مَنَعَ الْمُغْنِي مُوَالَاتَهُمْ وَمَنْ　　تَوَلَّاهُمُ يُحْشَرْ إِلَيْهِمْ بِعَرْصَةٍ

فَإِنْ تُهْمِلُوا هَذَا الْجِهَادَ خَسِرْتُمُ　　غِنَا دَارِ دُنْيَا ثُمَّ أُخْرَى بِحَسْرَةٍ

وَخِيفَ بَلَاءٌ وَالْغَلَاءُ بِدَارِكُمْ　　وَعَارٌ وَنَارٌ وَالْبَوَارُ بِحُوبَةٍ

فَقَدْ أَوْعَدَ الْبَارِي عَلَى تَرْكِنَا الْغَزَا　　بِتَرْكٍ لِإِنْفَاقٍ لِمَالٍ بِوَرْطَةٍ

فَقَالَ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى　　هَلَاكٍ إِذِ الْأَعْدَا تَصِيرُ بِقُوَّةٍ

وَلَا تَبْخَلُوا مَنْ كَانَ يَبْخَلْ فَإِنَّمَا　　مَضَرَّتُهُ تَأْتِي عَلَيْهِ بِضِنَّةٍ

وَقَدْ تَرَكَتْ قَوْمٌ لِمُوسَىٰ غُزَاءَهُمْ — جَبَابِرَةً كَانُوا عِظَاماً بِشَوْكَةِ
وَعَوْجُ بْنُ عُنُقٍ كَانَ مِنْهُمْ وَطُولُهُ — ثَلْثُمِائِينَ مَعَ أُلُوفٍ ثَلَاثَةِ
وَمَعْهَا ثَلَاثٌ وَالثَّلَاثُونَ مَعْ ثُلُثْ — ذِرَاعٍ وَهَابُوا مِنْ جُسُومٍ عَظِيمَةِ
فَسَارُوا حَيَارَىٰ أَرْبَعِينَ حَجِيجَةً — بِتِيْهٍ وَكَانُوا فِي فَرَاسِخَ سِتَّةِ
يَسِيرُونَ كُلَّ الْيَوْمِ جِدّاً إِلَى الْمَسَا — فَحِينَئِذٍ كَانُوا بِمَوْضِعِ رِحْلَةِ
فَجَاهَدَهُمْ مُوسَىٰ وَهَارُونُ بَعْدَهَا — وَأَهْلَكَ مُوسَىٰ عُوجَهُمْ بَعْدَ صُرْعَةِ
وَمَنْ فَرَّ يَوْمَ الزَّحْفِ مِنْ خَوْفِ سَطْوِهِمْ — فَقَدْ آلَ بِالْعَارِ الْفَظِيعِ وَلَعْنَةِ
وَقَدْ بَاءَ بِالسُّخْطِ الْعَظِيمِ لِرَبِّهِ — وَمَأْوَاهُ نَارٌ ذَاتُ حَرٍّ وَفَوْرَةِ
تَزِيدُ عَلَى نَارٍ بِدُنْيَا بِتِسْعَةِ — وَبِتِّينَ جُزْأً مِثْلُهَا بِالسَّوِيَّةِ
وَمَنْ كَانَ يَعْصِي اللهَ تَشْوِي فَيَكْلَحُ — فَتَبْلُغُ وَسْطَ الرَّأْسِ عُلْيَا شُفَيْهَةِ
وَسُفْلَىٰ شِفَاهٍ تَنْزَوِي بِكَلُوحَةٍ — إِلَي السُّفْلِ مِنْ جِسْمٍ إِلَي ضَرْبِ سُرَّةِ
يُصَبُّ حَمِيمٌ فَوْقَ رَأْسٍ فَيَنْفُذُ — خُلُوصاً إِلَى جَوْفٍ بِشِدَّهِ حُرْقَةِ
فَيَسْلُتُ مَا فِي جَوْفِهِ ثُمَّ يَمْرُقُ — مِنَ الرِّجْلِ ثُمَّ الْعَوْدُ يَأْتِي بِلَحْظَةِ
وَلَوْ مِنْ حَمِيمٍ قَطْرَةٌ صَاحِ تَسْقُطُ — عَلَى جَبَلِ الدُّنْيَا جَمِيعاً أَذَابَتِ
وَيُدْنَىٰ إِلَي فِيهِمْ صَدِيدٌ فَيُحْرِقُ — وُجُوهاً وَيُلْقِي مِنْ رُؤُسٍ لِفَرْوَةِ
إِذَا شَرِبُوا يَقْطَعُ مِعَاهُمْ فَيَخْرُجُ — مِنَ الدُّبُرِ ذَا الْمَاءُ الصَّدِيدُ لِسَاعَةِ
وَأَهْوَنُ أَهْلِ النَّارِ مَنْ كَانَ يَنْتَعِلُ — بِنَعْلَيْنِ مِنْ نَارِ الْجَحِيمِ الْأَجِيجَةِ
فَيَغْلِي دِمَاغٌ مِثْلَ غَلْيِ مَرَاجِلٍ — فَمَا ظَنُّكُمْ يَا سَادَتِي بِالشَّدِيدَةِ
أَعِذْنِي يَا اللهُ مِنْ حَرِّ نَارٍ كَا — وَمِنْ شَرِّ أَمْوَاجِ الزَّمَانِ الْمُبِيدَةِ
وَقَدْ فَرَّ قَوْمٌ خَوْفَ مَوْتٍ مِنَ الْبَلَدِ — وَكَانُوا أُلُوفاً قَالَ مُوتُوا بِنِقْمَتِي
فَمَاتُوا جَمِيعاً فِي الطَّرِيقِ فَمَا نَفَعْ — فِرَارُهُمْ شَيْئاً مِنَ الْمَوْتِ فَاثْبُتِ
وَقَدْ وَعَدَ الْبَارِي عَلَى الصَّبْرِ وَالتُّقَىٰ — مَعُونَتَهُ فَاصْبِرْ بِتَقْوَىٰ تُثَبَّتِ
وَكَيْفَ دُعَانَا يُسْتَجَابُ وَإِنَّنَا — لَنَدْعُو بِقَلْبٍ غَافِلٍ ذِي مَسَاءَةِ
وَقَدْ جَا حَدِيثٌ عَنْ رَسُولٍ مُمَجَّدٍ — رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ مِنْ غَيْرِ مِرْيَةِ

لَتُوشِكُ أُمَّاتٌ تَدَاعَى عَلَيْكُمْ ... كَمَا يَتَدَاعَى الْآكِلُونَ لِقَصْعَةِ
فَقِيلَ وَذَا مِنْ قِلَّةٍ نَحْنُ يَوْمَئِذٍ ... فَقَالَ كَثِيرٌ أَنْتُمْ فِيهِ أُمَّتِي
وَأَنْتُمْ غُثَاءٌ كَالْغُثَاءِ لِسَيْلِنَا ... وَيُذْهَبُ مِنْ صَدْرِ الْعِدَى بِالْمَهَابَةِ
وَيُقْذَفُ وَهْنٌ أُمَّتِي بِقُلُوبِكُمْ ... فَقِيلَ وَمَا الْوَهْنُ رَسُولَ الشَّفَاعَةِ
فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ذَاكَ مَحَبَّةٌ ... لِدُنْيَا وَكُرْهٌ لِلْمَنِيَّةِ حَقَّتِ
وَهٰذَا هُوَ الدَّاءُ الدَّفِينُ الَّذِي بِهِ ... يَصِيرُ عَدُوٌّ غَالِبًا ذَا مَتَانَةِ
فَدَاوُوا بِنَصٍّ مَعْ حَدِيثٍ مُحَرِّضٍ ... عَلَى الْغَزْوِ مَعْ ذِكْرٍ لِهَادِمِ لَذَّةِ
وَصُولُوا عَلَى أَعْدَاءِ دِيْنِ مُحَمَّدٍ ... وَصُونُوا بِهِ دِيناً وَدُنيا بِرَغْبَةِ
وَرُومُوا بِهِ زَادَ الْمَعَادِ وَجَنَّةً ... وَدُومُوا عَلَى خَوْفِ هُجُومِ الْمَنِيَّةِ
وَلَا تَجْبُنُوا فَاللهُ نَاصِرُ دِينِهِ ... وَكَاسِرُ صُلْبَانٍ وَنَاشِرُ سُنَّةِ
فَإِنْ تُنْفِقُوا مَالاً وَتَغْزُوا أَغَثْتُمْ ... جَمِيعَ عِبَادِ اللهِ مِنْ كُلِّ عَاهَةِ
وَصُنْتُمْ عِبَادَ اللهِ مِنْ شَرِّ مَاكِرٍ ... حَمَيْتُمْ صِغَاراً وَالنِّسَاءَ بِغَيْرَةِ
وَلَاحَ ثَنَاكُمْ خَافِقَيْنِ كِلَيْهِمَا ... وَفَاحَ سَمَاكُمْ كُلَّ يَوْمٍ وَلَيْلَةِ
وَحُزْتُمْ غِنَى الدَّارَيْنِ فُزْتُمْ رَأَيْتُمْ ... جَزَاهُ جَزِيلاً يَومَ فَقْرٍ وَفَاقَةِ
وَذٰلِكَ يَوْمٌ لَيْسَ يَنْفَعُ مَالُكُمْ ... وَلَا ابْنٌ وَلَا جَاهٌ بِمِثْقَالِ ذَرَّةِ
وَنِلْتُمْ بِهِ دَارَ السَّلَامِ وَحُورَهَا ... بِمُلْكٍ عَظِيمٍ دَائِمٍ وَغَنِيمَةِ
وَلَيْسَ بِهَا خَوْفٌ وَحُزْنٌ بِنَاؤُهَا ... لَمِنْ لَبِنٍ عِقْيَانٍ وَلَبِنَةِ فِضَّةِ
مِلَاطٌ لَهَا مِسْكٌ ذَفِيرٌ تُرَابُهَا ... عَبِيرٌ وَحَصْبَا لُؤْلُؤٌ بِيَوَاقِتِ
وَدَاخِلُهَا يَنْعَمُ وَيَخْلُدُ بِلَا بِلَى ... ثِيَابٌ وَلَا يَفْنَى شَبَابٌ بِشَيْبَةِ
بِهَا بَحْرُ مَاءٍ ثُمَّ بَحْرٌ لِشُهْدِنَا ... وَبَحْرٌ لِأَلْبَانٍ وَبَحْرٌ لِخَمْرَةِ
وَمِنْ هٰذِهِ الْأَنْهَارُ تَجْرِي إِلَى فِنَا ... مَنَازِلِ كُلِّ الدَّاخِلِينَ لِنُزْهَةِ

☆☆☆

دوسری فصل

گوا پر پرتگالیوں کا قبضہ اور عادل شاہ کی مدافعت

گوا بیجا پور کی عادل شاہی سلطنت کے ماتحت تھا، اور اس کی مضبوط بندرگاہوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ چونکہ بیجا پور کے والی یوسف عادل شاہ اور گجرات کے سلطان محمود شاہ اور کالیکٹ کے حاکم زامورین فرنگیوں کو بے دخل کرنے کیلئے باہم متحد تھے۔(۱) اسلئے پرتگالی ان سب کے ممالک پر قبضہ کے لئے موقعہ کی تلاش میں رہتے تھے اور اطمینان سے ہندوستان پر حکومت کرنے کے لئے اس کو ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ ۹۱۵ھ (۱۵۱۰ء) میں فرنگیوں نے گوا پر حملہ کیا اور بزور شمشیر اس پر قبضہ کر لیا، مگر عادل شاہ پانچویں دن دو تین ہزار سپاہیوں کے ساتھ گوا پہنچا اور قلعہ پر قابض ہو کر پرتگیزوں کو وہاں سے بے دخل کر دیا مگر چند ہی مہینوں کے بعد ۹۱۶ھ میں اس کا انتقال ہوا اور اسماعیل عادل شاہ اس کی مسند حکومت پر فائز ہوا، اس کو خانگی جھگڑوں سے واسطہ پڑا۔ اس موقع کو غنیمت سمجھ کر فرنگی بڑی تیاریوں کے ساتھ دوبارہ گوا پر حملہ آور ہوئے اور سخت جنگ کے بعد شہر پر قبضہ کر لیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں کے بعض سرداروں نے ان کا ساتھ دیا اور رشوت لے کر شہر پر قبضہ دلانے کے لئے راستہ ہموار کیا۔(۲)

اس وجہ سے پرتگالیوں نے بہت جلد اندازہ کر لیا کہ یہاں انہیں استقرار حاصل ہوگا، یہاں کی زمین بڑی سازگار ہے، چنانچہ قبضے کے ساتھ ہی انہوں نے متعدد مضبوط قلعے تعمیر کئے اور گوا کو ہندوستان میں اپنا دارالحکومت قرار دیا۔ انکا اندازہ صحیح ثابت ہوا چنانچہ روز بروز انکی قوت میں اضافہ ہوتا گیا اور سب سے آخر میں گوا انکے ہاتھوں سے نکلا۔

(۲) ان سب کا مصر کے خاندان غلامان کے آخری بادشاہ سلطان قانصوہ غوری (۱۵۰۱ء-۱۵۱۶ء) سے رابطہ تھا۔ اس نے امیر حسین کردی کی امارت میں اپنی فوج ہندستان بھیجی جس نے ہندوستانیوں کے ساتھ مل کر فرنگیوں سے جنگ کی۔ (تحفۃ المجاہدین۔ صفحہ ۳۹-۴۰) نیز تفصیل کے لئے تحفۃ المجاہدین (بیروت ایڈیشن) کی تعلیقات ملاحظہ ہو۔ صفحہ ۲۵۲ و صفحہ ۲۵۶ تا صفحہ ۲۶۰

(۳) تحفۃ المجاہدین صفحہ ۴۰ نیز پرتگیزان مالابار صفحہ ۱۳، ۱۴ (فٹ نوٹ)

تیسری فصل

سندھ پر پرتگیزوں کا حملہ اور علماء وصوفیہ کی ان سے لڑائی

سندھ پر ان کے حملہ کا پس منظر یہ ہے کہ حاکم سندھ مرزا شاہ حسن ارغون کی وفات (۱) ۹۶۲ھ کے بعد سندھ کی حکومت دو حصوں میں بٹ گئی۔ بالائی سندھ کی حکومت سلطان محمود کوملی اور زیریں سندھ پر مرزا عیسیٰ ترخان بادشاہ ہوا، سلطان محمود کا دارالحکومت بھکر اور مرزا عیسیٰ ترخان کا دارالسلطنت ٹھٹھ قرار پایا مگر چند ہی دنوں میں دونوں حکومتوں میں اختلافات پیدا ہوئے اور نوبت بایں جارسید کہ لڑائی چھڑ گئی۔ ۹۶۳ھ میں مرزا عیسیٰ ترخان اپنی فوجیں لے کر بھکر کی طرف بڑھا۔ اس نے اپنی امداد کے لئے گوا سے پرتگیزوں کو بلوایا وہ تو اسی کوشش اور انتظار میں رہتے تھے کہ کیسے مسلمانوں کے درمیان انتشار کا بیج بو کر اپنے استعماری مقاصد کو حاصل کریں، چنانچہ وہ فوراً آمادہ ہوئے۔ مگر ابھی وہ پہنچنے بھی نہ پائے تھے کہ مرزا عیسیٰ نے بھکر روانہ ہو کر سلطان محمود کا محاصرہ کیا۔ سلطان محمود قلعہ بند ہو گیا تھا۔ ابھی مرزا عیسیٰ بھکر ہی میں تھا کہ پرتگیزی فوجیں ٹھٹھ پہنچیں، ٹھٹھ کو انہوں نے خالی پایا کہ اس وقت یہاں کا حاکم موجود نہیں ہے تو ان کی نیت بگڑ گئی اور اس پر تسلط کا خواب دیکھنے لگے مگر مشکل یہ تھی کہ ان کا مرکز گوا یہاں سے دور اور بہت دور تھا، بیچ میں ان کی کوئی کالونی نہیں تھی، انہوں نے دیکھا کہ دونوں کو سنبھالے رکھنا دشوار ہوگا، نتیجۃً ہمیں گوا کی حکومت سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا اس لئے انہوں نے ٹھٹھ کی حکومت کا ارادہ ترک کر کے اس کو لوٹنے کی ٹھانی۔ چنانچہ بے دریغ لوٹنا شروع کیا، مسلمانوں کا قتل عام کر کے اپنی خون آشام طبیعت کا پورا مظاہرہ کیا، پھر شہر میں آگ لگا دی، جس سے شہر کی شاندار عمارتیں جل گئیں۔ پرتگیزوں نے اس قتل وغارت گری میں جن مساجد میں مسلمانوں کو شہید کیا وہ ان مساجد کے سامنے ہی دفن

---

(۱) یہ سندھ میں ارغون خاندان کا دوسرا بادشاہ تھا۔ وہ اپنے والد شاہ بیگ ارغون (۹۲۴ھ - ۹۲۸ھ) کی وفات کے بعد نصر پور میں تخت نشین ہوا اور ۹۶۲ھ میں موضع علی پوترہ میں وفات پائی (تذکرہ صوفیا سندھ صفحہ ۶۷۔

کئے گئے اس طرح ٹھٹھ میں پانچ گنج شہیداں موجود ہیں۔(۱)

سید شاہ مسکین

اس موقع پر بہت سے علماء اور اہل اللہ شہید ہوئے۔ان میں سید شاہ مسکین کا نام سب سے نمایاں ہے،آپ کا شمار ٹھٹھ کے اولیائے کبار میں ہوتا ہے آپ کا درجہ اتنا بلند ہے کہ ٹھٹھ کے مشہور صوفی و درویش میاں ابوالقاسم نقشبندی فرمایا کرتے تھے کہ ٹھٹھ کے قبرستان میں جتنے اولیاء اللہ آرام فرما ہیں ان میں جو شان سید شاہ مسکین کی ہے کوئی دوسرا ان کی ہمسری نہیں کرتا۔ درود شریف کا بڑا اہتمام تھا آپ سے بہت سے لوگوں نے تربیت روحانی حاصل کی۔آپ کا مزار محلہ غلہ بازار ٹھٹھ میں ہے۔(۲)

پرتگالیوں کا خاتمہ

مالابار کے حالات کچھ تفصیل سے آپ کی نظر سے گزرے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ پرتگالیوں سے کئی شدید جنگیں لڑی گئیں۔کئی دفعہ زامورین کو دب کر صلح کرنی پڑی پھر حالات نے پلٹا کھایا اور بار باران کے خلاف جنگ کا اعلان کرنا پڑا،مگر اس کے باوجود ان کا اثر و رسوخ بڑھتا گیا اور مختلف مقامات پر انہوں نے قلعے تعمیر کیے اور تقریباً پورے مالابار پران کا قبضہ ہوا۔اس کے ساتھ گجرات کی بعض بندرگاہیں بھی ان کے زیر نگیں رہیں۔

ان کا خاتمہ اس وقت ہوا جب انہوں نے مغربی بنگال میں ہگلی کو قلعہ بند کر کے خود مختار حکومت کی شان بنانی چاہی تو شاہ جہاں کے حکم سے وہ جبراً وہاں سے نکال دیئے گئے اور ان کے جو لوگ بچ کر بھاگنے میں کامیاب ہوئے انہوں نے بنگال کے دشوار گزار ساحلی مقامات میں رہ کر بحری قزاقی کا پیشہ اختیار کیا۔(۳)

اس کے علاوہ جہاں ان کا اثر و اقتدار تھا انگریزوں سے رسہ کشی میں اس سے دست بردار ہونا پڑا مگر پھر بھی گوا ان کے پاس رہا جہاں انہوں نے بے پناہ استحکام حاصل کیا تھا۔انگریزوں کے پورے ملک پر قبضہ کے باوجود گوا پرتگالیوں ہی کے زیر تسلط رہا،تا آں کہ ۱۹/دسمبر ۱۹۶۱ کو ہندوستانی فوج نے پوری قوت سے مداخلت کی اور پرتگالیوں کو گوا سے نکلنے پر مجبور کیا اور اس دن سے گوا جمہوریہ ہند کا ایک اسٹیٹ قرار پایا۔

(۱) تذکرہ صوفیائے سندھ صفحہ ۲۱۷،فٹ نوٹ (۲) ایضاً صفحہ ۲۱۶-۲۱۷

(۳) ملاحظہ ہو تاریخ ہند از ہاشمی۔حصہ سوم صفحہ ۲۶۰

باب چہارم

انگریزوں کے خلاف اولین محاذ آرائی

پہلی فصل : جنگ آزادی کا سرافیل
شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

دوسری فصل : جنگ آزادی کا فراموش کردہ ایک عظیم مجاہد
حافظ الملک حافظ رحمت خاں

تیسری فصل : فدائے وطن: سراج الدولہ

چوتھی فصل : شہید حریت: سلطان ٹیپو

آغشتہ ایم ہر سرِ خارِ بخونِ دل
قانونِ باغبانی صحرا نوشتہ ایم

پہلی فصل

جنگ آزادی کا سرافیل شاہ ولی اللہ دہلوی

عالمگیر کے بعد کی انارکی اور شاہ ولی اللہ کی بے قراری

اٹھارویں صدی کی ابتداء ہے اور اورنگ زیب عالمگیر کی سلطنت اپنے عروج پر، وہ بلا شرکت غیرے اس ہندوستان کا حاکم ہے جس کے حدود کنیا کماری سے کابل تک اور گجرات سے لے کر بنگال تک پھیلے ہوئے ہیں (اس سے پہلے تاریخ میں اتنی وسیع سلطنت کسی کی یہاں قائم نہیں ہوئی۔)(۱)

نہ نظام میں کوئی خرابی ہے نہ تدبیر میں کوئی کمی، بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس سلطنت کی شان و شوکت زمانہ دراز تک قائم رہے گی۔ لیکن تقدیر کا فیصلہ کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ پورے پچاس سال حکمرانی کے بعد عالمگیر عالم جاودانی کی طرف روانہ ہو جاتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے سلطنت کا اقبال رخصت ہو جاتا ہے اور اس کا شیرازہ بکھرنے لگتا ہے، جانشین ناخلف ثابت ہوتے ہیں اور شہزادے شباب کی رنگ رلیوں اور شراب و کباب کی بدمستیوں کا شکار ہو جاتے ہیں، زوال کا سائرن بجتا ہے مگر آہ کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی، آنکھوں پر غفلت کا پردہ پڑا ہے، سوچنے کی صلاحیت ختم ہو چکی ہے، دماغ شل اور قوی معطل ہو چکے ہیں، لاپروائی کا دور دورہ ہے اور قوت ادراک سلب ہو چکی ہے۔ اس عالم دیجور اور فضائے رنجور میں ایک ہی چراغ جلتا اور ایک ہی تارہ چمکتا نظر آتا ہے وہ ہے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی ذات بابرکات، جو بظاہر ایک معلم مدرس اور صوفی ہے مگر اس کا قلب حالات سے چھلنی ہو چکا ہے، آنکھیں ماحول سے اشکبار ہیں، دل میں احساسات کا ایک دریا موجزن ہے، دماغ میں افکار کا سمندر

---

(۱) اس کا رقبہ کم وبیش پندرہ لاکھ مربع میل اور آبادی بیس کروڑ کے قریب تھی۔

ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ اس کے کپڑوں میں شیر نہفتہ ہے جو باہر نکلنے کے لئے بے قرار ہے، اس کے ہاتھ میں قندیل ایمانی ہے جس کو جلانے کیلئے وہ بے چین ہے، جو غیرت و حمیت، خودداری و خودشناسی، قوت ادراک اور ذکاوت حس، فکر کی گہرائی اور نظر کی گیرائی دوررسی اور حکمت عملی میں بس اپنی مثال آپ ہے۔

شاہ صاحب کا دور ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا بدترین اور تاریک ترین دور ہے اس سے اوپر کا تصور بھی ذرا مشکل ہے۔ شاہ صاحب نے اپنی زندگی میں دس بادشاہوں کو تخت دہلی پر دیکھا (۱)، بہتر سے بہتر اور بد سے بدتر، اورنگ زیب تا شاہ عالم، اس دوران اخلاقی بگاڑ اپنی آخری حد کو پہنچ چکا تھا، وہ امراء کا دادعیش دینا، وہ شاہزادوں کا گل چھرے اڑانا، وہ تن آسانی و آرام طلبی، وہ تعیش کوشی و دولت پرستی، وہ خودغرضی اور بے ایمانی کہ شیطان بھی شرما جائے۔ دوسری طرف سیاسی داؤ پیچ اور مکروفریب، انتشار و اضطراب، انارکی اور بے نظمی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ سادات بارہہ کا تسلط اور آخری درجہ کا ظلم وستم، مرہٹوں کا زور، جاٹوں کا اثر، سکھوں کی بغاوت، نادر شاہ کا حملہ اور دہلی کا قتل عام، سیاست ملکی میں روہیلوں کی شرکت اور اقتدار میں عمل دخل، ایرانی امراء کی باغیانہ کوششیں اور حکومت کے خلاف سازشیں، اخیر میں انگریزوں کی للچائی ہوئی نظریں اور تخت سلطنت پر قبضہ کی تدبیریں (۲)۔ ان سب چیزوں نے شاہ صاحب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ شاہ صاحب کے قلب و دماغ پر ان کا جو اثر پڑا اس کا اندازہ ان کے ایک شعر سے ہوتا ہے فرماتے ہیں :

كأن نجوماً أومضت في الغياهب   عيون الأفاعي أو رؤوس العقارب

(تاریکیوں میں جو ستارے چمک رہے ہیں مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے وہ ناگوں کی آنکھیں یا بچھوں کے سر ہیں)

آخر جس نے یہ سب انقلابات بچشم خود دیکھے ہوں اور ساتھ ہی وہ دل دردمند اور

---

(۱) ملاحظہ ہو ضمیمہ نمبر ۱)

(۲) ان سب کی تفصیلات ہندوستان پر لکھی گئی متعدد تاریخوں میں موجود ہیں ان سے رجوع کیا جائے تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ مختصر اور جامع معلومات کے لئے علمائے ہند کا شاندار ماضی جلد دوم صفحہ ۴۸ تا صفحہ ۷۰، اور تاریخ دعوت وعزیمت حصہ پنجم صفحہ ۷۵ تا صفحہ ۹۱ کا مطالعہ بھی مفید ہوگا۔

فکر ارجمند کا بھی حامل ہو وہ کیوں نہ تڑپے اور حالات میں سدھار لانے کا پرگرام نہ بنائے۔ چنانچہ حکیم الہند حضرت شاہ ولی اللہ نے ملک کو اخلاقی معاشرتی اور سیاسی انتشار سے بچانے کے لئے ایک مستقل انقلابی تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔

شاہ ولی اللہ میدان عمل میں

شاہ ولی اللہ مضطرب اور بے چین تھے کہ اسی دوران ۲۱رذی قعدہ ۱۱۴۴ھ مطابق ۵رمئی ۱۷۳۱ء کو مکہ معظمہ کی مبارک سرزمین میں انہوں نے ایک خواب دیکھا جس میں انہیں بشارت دی گئی تھی کہ ان کے ذریعہ انقلاب عظیم برپا ہوگا اور باطل طاقتیں پاش پاش ہوجائیں گی۔(۱)

(۱) اس خواب کی روشنی میں مستقل بارہ سال کے غور فکر کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہندوستان میں صحیح نظام قائم کرنے کے لئے انہیں کیا طریقہ اختیار کرنا ہے اور کس طرح کام کرنا ہے۔ اصل خواب جسے شاہ صاحب نے فیوض الحرمین میں بیان کیا ہے، اس طرح ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں :
رأيتني في المنام قائم الزمان أعني بذلك أن الله إذا أراد شيئاً من نظام الخير جعلني كالجارحة لإتمام مراده، ورأيت أن ملك الكفار قد استولى على بلاد المسلمين ونهب أموالهم وسبىٰ ذرياتهم وأظهر في بلدة اجمير شعائر الكفر، وأبطل شعائر الإسلام والعياذ بالله، فغضب الله تعالىٰ على أهل الأرض غضباً شديداً، ورأيت صورة هذا الغضب متمثلة في الملأ الأعلى ثم ترشح الغضب إليَّ، فرأيتني غضباناً (غضبان) من جهة نفث من تلك الحضرة في نفسي لا من جهة ما يرجع إلى هذا العالم، و أنا ساعتئذ في جم غفير من الناس منهم الروم و منهم الأزا بكة و منهم العرب، بعضهم ركبان الإبل و بعضهم فرسان و بعضهم مشاة على أقدامهم، وأقرب مارأيت شبهاً بهولاء الحجاج يوم عرفة، ورأيتهم غضبوا بغضبي و سألوني ماذا حكم الله في هذه الساعة، قلت : "فك كل نظام" قالو إلى متى؟ قلت : إلى أن تروني قد سكت غضبي فجعلوا يتقاتلون بينهم و يضربون وجوه إبلهم فقتل منهم كثير، انكسرت رؤوس إبلهم و شفاهها، ثم إني تقدمت إلى بلدة أخَرّبها و أقتل أهلها، فتبعوني في ذلك، و كذلك خربنا بلدةً بعد بلدة حتى وصلنا الأجمير (اجمير) وقتلنا هنا لك الكفار و استخلصناها منهم وسبينا ملك الكفار ثم رأيت ملك الكفار يما شي مع ملك الإسلام في نفر من المسلمين فأمر ملك الإسلام ==

شاہ صاحب کا پروگرام

چنانچہ شاہ صاحب نے ایک منظّم پروگرام بنایا۔ سب سے پہلے عام بیداری کی

فی أثناء ذلک بذبحه، فبطش به القوم و صرعوه و ذبحوه بسکین، فلما رأیت الدم یخرج من أوداجه متدفقاً قلت الآن نزلت الرحمة و السکینة. رأیت الرحمة والسکینة شملت من باشر القتال من المسلمین و صاروا مرحومین فقام إلیّ رجل و سألنی عن المسلمین اقتتلوا فیما بینهم فتوقفت عن الجواب و لم أصرح . رأیت ذلک لیلة الجمعة الحادیة والعشرین من ذی القعدة سنة ۱۱٤٤ھ (فیوض الحرمین صفحہ ۸۹ — ۹۰)

اس کا ہو بہو ترجمہ کرنے کے بجائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھی کی زبانی اس کا خلاصہ پیش کیا جائے۔ لکھتے ہیں :

(شاہ ولی اللہ) فرماتے ہیں کہ شب جمعہ ۲۱ رذی قعدہ ۱۱۴۴ھ کو میں نے مکہ معظمہ میں خواب دیکھا کہ خدا تعالیٰ نے مجھے اس زمانہ کا نظام قائم رکھنے میں واسطہ بنایا ہے میں نے دیکھا کہ کفار کا سردار مسلمانوں کے شہروں پر غالب آگیا ہے۔ اس نے ان کے اموال لوٹ لئے اور انہیں قید کر لیا اجمیر جیسے شہر میں کفر کے خصوصی احکام جاری کر دیے اور اسلامی قانون کے خاص کام ممنوع قرار دیئے، اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے متاثر ہو کر میں غضب سے بھر گیا اور میرے غضب کا اثر اس ہجوم میں بھی پھیل گیا، جو میرے گرد جمع ہو رہا تھا، انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ اس وقت خدا تعالیٰ کی رضا کس طرح ہو سکتی ہے میں نے جواباً کہا "فک کل نظام" یعنی تمام بوسیدہ نظاموں کو توڑ دو۔ اس کے بعد وہ ہجوم آپس میں جنگ شروع کر دیتا ہے، پھر میں ایک شہر کے قریب پہنچا تا کہ اس کو برباد کروں، ادھر وہ لوگ بھی میرے پیچھے پیچھے چلے آئے اور لگا تار شہروں کو برباد کرتے ہوئے اجمیر پہنچ گئے، یہاں میں نے دیکھا کہ ان لوگوں نے کفار کے سردار کو ذبح کر ڈالا اور اس کی رگ ہائے گردن سے خون بڑے زور سے بہہ رہا ہے۔ (شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک صفحہ ۱۶۸)

یہ کتنا کھلا خواب ہے۔ مستقبل کے کتنے انقلابات اس میں صاف دکھائے گئے ہیں۔ اس میں ہر شخص جس کی تاریخ پر نظر ہو مستقبل کو پڑھ سکتا ہے اور اپنے ذہن و دماغ سے اس کے حدود متعین کر سکتا ہے۔ مستقبل قریب کے لحاظ سے دیکھیں تو یہ مرہٹوں پر پوری طرح صادق آتا ہے اور اگر مستقبل بعید تک اس کو وسعت دی جائے تو انگریزوں پر فٹ ہوتا ہے۔

اجمیر میں کفر کے احکام جاری ہونے سے اشارہ اس طرف ہے کہ اسلامی احکام کی پامالی ہوگی اور مسلمانوں کو بالخصوص مصیبتوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ انگریزی عہد اسکی بین مثال ہے۔ خصوصاً اجمیر کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ یہ ہندوستان کا روحانی مرکز سمجھا جاتا تھا، خواجہ معین الدین اجمیری یہیں فروکش ہوئے تھے اور یہیں سے اشاعت اسلام کا کام شروع کیا تھا۔ اس کی تباہی ہندوستان میں دین اسلام کی تباہی تھی۔

خواب کا حاصل یہ ہے کہ شاہ صاحب ہندوستانی مسلمانوں کے امام ہوں گے اور ان کے ذریعہ اجتماعی اور سیاسی انقلاب برپا ہوگا اور موجودہ زمانہ کی خرابیاں دور ہوں گی۔

کوشش کی، اس کے لئے قرآن پاک کا رائج الوقت فارسی میں ترجمہ کیا اور اس کا درس عام کیا اور پھر بادشاہ اور وزراء سے لے کر عوام تک ایک ایک طبقہ کو مخاطب کر کے اس کی خرابیوں اور مفاسد سے آگاہ کیا اور ان کا علاج بتایا۔ (۱)

دوسری طرف شاہ صاحب نے ایک مرکزی جماعت تیار کرنے کی طرف توجہ کی جس کے ذریعہ کام لیا جائے۔ مولانا عبید اللہ سندھی لکھتے ہیں :

حکیم الہند نے اپنے پروگرام کی تدوین کے ساتھ ساتھ رفقاء کی مرکزی جماعت بھی تیار کی جو تعلیم و ارشاد کے ذریعہ اس انقلابی تحریک کی اشاعت ایک طرف صوفیاء اور علماء میں اور دوسری طرف امراء و سرداران سلطنت میں کرتی رہی، ان میں سے مولانا محمد عاشق پھلتی (۲)، مولوی نور اللہ بڈھانوی (۳) اور مولانا محمد امین کشمیری (۴) خاص طور پر مشہور ہیں نیز آپ نے اطراف ملک میں اس مرکزی جمعیت کی شاخیں بھی قائم کرائیں۔ نجیب آباد کا مدرسہ (۵)، رائے بریلی میں دائرہ (تکیہ) شاہ علم اللہ (۶) حکیم الہند کی مرکزی تحریک کے مرکز تھے، سندھ میں ملا محمد

---

(۱) ملاحظہ ہو التفهيمات الالهيه. جلد اول، صفحہ ۲۰۹ تا صفحہ ۲۱۹۔

(۲) شاہ ولی اللہ کے ماموں زاد بھائی، ان کے سب سے محبوب اور انکے علوم کے سب سے بڑے حامل اور محرم اسرار تھے۔ شاہ صاحب نے ان کے بارے میں بہت بلند کلمات ارشاد فرمائے ہیں تقریباً ۱۱۸۷ھ میں وفات پائی (نزهة الخواطر (الإعلام) ٦ / ٣٨).

(۳) شاہ عبدالعزیز صاحب کے خسر اور مولانا عبدالحی بڈھانوی کے حقیقی دادا تھے۔ اپنے وقت کے علماء کبار میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ شاہ عبدالعزیز صاحب نے ان سے فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۱۸۷ھ کے قریب انتقال کیا (الإعلام ٦ / ٤٠٦)

(۴) شاہ صاحب کے اجلہ اصحاب میں سے تھے۔ اصلاً وطن کشمیر مگر سکونت دہلی میں تھی۔ ولی اللہی نسبت کرتے تھے، شاہ صاحب نے ان کے لئے بعض رسائل تصنیف فرمائے، شاہ عبدالعزیز نے ان سے علوم کی تکمیل کی۔ ۱۱۸۷ھ کے آس پاس انتقال ہوا۔ (الإعلام ٦ / ٢٩٣)

(۵) نجیب الدولہ نے ایک مدرسہ قائم کیا تھا تاکہ شاہ ولی اللہ کے طریقے کی تعلیم ہو (شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک صفحہ ۱۷۸)

(۶) حضرت شاہ علم اللہ حسنی رائے بریلوی، عہد عالمگیری کے مشہور عالم ربانی اور سب سے بڑے متبع سنت تھے، شیخ آدم بنوری (متوفی ۱۰۵۳ھ) کے کبار خلفاء میں سے تھے جو حضرت مجدد الف ثانی کے خلیفہ تھے۔ ۱۰۹۶ھ میں وفات پائی (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تذکرہ شاہ علم اللہ حسنی رائے بریلوی از مولانا محمد الحسنی، مکتبہ اسلام لکھنؤ)

==

معین (۱) کا مدرسہ ٹھٹھ بھی ان کا ایک مرکز تھا جس سے مشہور عارف شاہ عبد اللطیف بھٹائی (۲) خصوصی تعلق رکھتے ہیں۔ (۳)

سلطنت مغلیہ کو سنبھالا دینے کی کوشش

جب علمی اور فکری حیثیت سے ایک حد تک کام کر چکے تو عملی کام کا آغاز کیا۔ اس وقت ہندوستان کے سیاسی منظر نامے پر مرہٹے سب سے زیادہ طاقتور اور اہمیت کے حامل تھے، دکن سے اٹھے اور دیکھتے ہی دیکھتے شمال پر چھا گئے (۴)۔ مغلیہ سلطنت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ۱۷۵۷ء میں دہلی پر حملہ کر دیا یہاں تک کہ مجبور ہو کر نجیب الدولہ (جو سلطنت مغلیہ کا مختار کل تھا) کو صلح کرنی پڑی۔ پھر وہ پنجاب کی طرف سیلاب تند و تیز کی طرح بڑھتے چلے گئے۔ کوئی بند نہیں تھا جو ان کو روکے۔ چین و سکون غارت ہو گیا تھا۔ ان کی ہنگامہ آرائیوں سے ہندو مسلمان سبھی متاثر ہوتے تھے۔ (۵)

== اس وقت (شاہ ولی اللہ کے زمانہ میں) شاہ ابو سعید رائے بریلوی تکیہ رائے بریلی کے اس حسنی خانوادہ کے سب سے نمایاں شخص تھے۔ شاہ ولی اللہ کے چار مخصوص خلفاء میں سے تھے جن سے شاہ صاحب کے طریقہ کی اشاعت ہوئی۔ مولانا سندھی اپنی کتاب التمہید (حصہ اردو) میں لکھتے ہیں۔ شاہ صاحب کے مکمل نظریے کو سمجھنے والے تین چار رفقاء سے زیادہ نہیں ہیں (۱) ان کے ماموں زاد بھائی شاہ محمد عاشق (۲) جمال الدین شاہ محمد امین ولی اللہی کشمیری (۳) شاہ نور اللہ بڈھانوی (۴) شاہ ابو سعید رائے بریلوی (شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک صفحہ ۱۷۳-۱۷۴)
آپ حضرت سید احمد شہید کے حقیقی نانا تھے۔ ۱۱۹۳ھ میں وفات پائی۔ مولانا نسیم احمد فریدی نے آپ کے حالات پر مستقل کتاب لکھی ہے "شاہ ابو سعید حسنی اور سلسلہ ولی اللہی کا ایک گمنام درویش"۔ الفرقان بکڈپو، لکھنؤ)

(۱) مولانا محمد معین سندھی اپنے زمانہ کے مشہور ترین علماء میں سے تھے، علم حدیث، کلام اور عربی ادب میں آپ کا پایہ بہت بلند تھا، "دراسة اللبيب في الأسوة الحسنة بالحبيب" آپ کی بہت مشہور اور معرکۃ الآراء کتاب ہے۔ ۱۱۶۱ھ میں انتقال ہوا۔

(۲) سندھ کے مشہور عارفین اور اہل اللہ میں سے تھے۔ ۱۱۶۵ھ میں انتقال کیا۔

(۳) شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک صفحہ ۵۶۔

(۴) بنگال، بہار، اڑیسہ میں مرہٹوں کی کارستانیوں کے لئے دیکھئے۔ Fall of the Mughal Empire vol 1 P.34- 63

(۵) بنگال کے مشہور شاعر گنگا رام نے بنگال پر ان کے حملوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کے ==

شاہ صاحب نے اپنے سارے علمی مشاغل کے ساتھ اس طرف توجہ کی (۱) اور ان کا زور توڑنے کا بیڑا اٹھایا۔ اس کے لئے یا تو یہ ہوتا کہ خود شاہ صاحب میدان جہاد میں اترتے اور ظالم و جابر اور انصاف دشمن طاقتوں سے جنگ کر کے عملاً اصلاح کرتے جس کی شاہ صاحب پوری قابلیت رکھتے تھے مگر یہ حالات کا اقتضا نہ تھا خود لکھتے ہیں :

فلو فرض أن يكون هذا الرجل في زمان واقتضت الأسباب أن يكون إصلاح الناس بإقامة الحروب و نفث في قلبه إصلاحهم لقام هذا الرجل بأمر الحرب أتم قيام و كان إماماً في الحرب لا يقاس بالرستم والاسفنديار بل الرستم والاسفنديار وغيرهما طفيليون عليه مستمدون منه مقتدون به (۲)

یعنی اگر یہ شخص بالفرض کسی ایسے زمانہ میں ہوتا کہ اسباب کا اقتضا یہی ہوتا کہ جنگ کر کے لوگوں کو درست کیا جائے اور اس کے دل میں

== دیہاتوں کو بے دردی سے لوٹنے، گھروں کو آگ لگا دینے اور لوگوں کے ہاتھ ناک اور کان کاٹ لینے اور عورتوں کو اپنی ہوس کا شکار بنانے اور اس میں حدود سے تجاوز کر کے بہیمانہ اور وحشیانہ عمل کا مظاہرہ کرنے کا ذکر کیا ہے۔

اسی طرح بنگال کے ایک مشہور پنڈت وینشورودیا پتی نے ۱۷۴۴ء میں مرہٹوں کے ہنگاموں اور مظالم کا ذکر نہایت دردانگیز لہجے میں کیا ہے ملاحظہ ہو سر جدوناتھ سرکار کی کتاب Fall of the Mughal Empire vol 1 P. 87-88۔ پرتگالی مصنفوں نے بھی مرہٹوں کی ان اخلاق سوز حرکتوں پر استعجاب کا اظہار کیا ہے۔ Pissurlencar of Portuguesese Maralas II P.49. دیکھئے شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات صفحہ ۱۷۳-۱۷۴

اسی وجہ سے شاہ صاحب مرہٹوں کے ہنگاموں کو اس وقت ہندوستان کا سب سے بڑا فتنہ قرار دیتے تھے (سیاسی مکتوبات، مکتوب دوم صفحہ ۸)

(۱) جہاں حالات کے تقاضے سے شاہ صاحب نے یہ فیصلہ کیا وہیں موروثی جذبات بھی اس میں کار فرما نظر آتے ہیں۔ ان کے والد شاہ عبدالرحیم (متوفی ۱۱۳۱ھ/۱۷۱۹ء) کے مجاہدانہ جذبات کا پتہ انکے خطوط سے ملتا ہے۔ انکے مکاتیب کا ایک نسخہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کے کتب خانہ میں ہے اس میں ایک خط نظام الملک آصف خان اول کے نام ہے جسمیں انہوں نے نواب مرحوم کو مرہٹوں سے جہاد کی ترغیب دی ہے۔ (سیرت سید احمد شہید، مقدمہ از مولانا سید سلیمان ندوی صفحہ ۳۸) نیز ملاحظہ ہو رود کوثر صفحہ ۵۴۵، از شیخ محمد اکرام۔

(۲) التفہیمات الالٰہیۃ جلد اول صفحہ ۱۰۱

ڈالا جاتا کہ تلوار ہی سے نظام کو درست کرے تو پھر یہ شخص اس کو بڑی خوبی سے انجام دیتا اور جنگ میں امام تسلیم کیا جاتا (۱) اور دنیا کو ماننا پڑتا کہ رستم واسفندیار بھی اس کے مقابلہ میں ہیچ ہیں بلکہ اس کے طفیلی اور شاگردوں کے درجہ میں ہیں۔

مگر چونکہ موقع ومحل کا یہ اقتضا نہ تھا، نہ دوسرے ضروری کام اس کی اجازت دیتے تھے اس لئے دوسری صورت میں ضروری ہوا کہ ایسے حوصلہ مند سرداروں اور آزمودہ کار قائدین سے رابطہ کریں جن کے خاکستر میں دینی حمیت اور ملی غیرت کی کوئی چنگاری ہو جن کے ذریعہ پورے اطمینان اور اعتماد کے ساتھ یہ عظیم انقلابی کام لیا جا سکے۔

یہ شاہ صاحب کے کمال مردم شناسی کی بات تھی کہ ان کی نگاہ انتخاب نجیب الدولہ (۲) جیسے غیور قائد اور والی افغانستان احمد شاہ ابدالی (۳) جیسے باحمیت حاکم پر

(۱) شاہ صاحب کے دعویٰ میں مبالغہ نہیں معلوم ہوتا اس لئے کہ غیرت وشجاعت ان کو ورثہ میں ملی تھی۔ ان کے حقیقی دادا شیخ وجیہ الدین شہید اپنے باطنی کمالات کے ساتھ مغل فوج کے ایک سپاہی بھی تھے یہاں تک کہ لڑتے ہوئے انہوں نے جام شہادت نوش کیا تھا (تفصیل کے لئے دیکھئے تاریخ دعوت وعزیمت حصہ پنجم صفحہ ۷۱-۷۵) اور والد بزرگوار شیخ عبدالرحیم کی غیرت وجذبہ جہاد کا حال تو ابھی گزرا۔ اس لئے بہت ممکن ہے کہ شاہ ولی اللہ نے بھی جوانی میں جنگی مشقیں کی ہوں اور جسمانی لحاظ سے بھی جہاد کے لئے پوری طرح موزوں ہوں مگر حالات کے تقاضے سے انہوں نے عملاً جنگ میں شرکت نہیں کی بلکہ دوسرے علمی فکری اور دعوتی کاموں میں مشغول رہے۔ جن کی روشنی میں بعد میں کئی جہادی تحریکیں وجود میں آئیں۔

(۲) نجیب خاں ۱۷۵۳ء میں سلطنت دہلی سے وابستہ ہوا، نجیب الدولہ کا خطاب اور پنج ہزاری کا منصب عطا ہوا، بہت جلد اس نے ترقی کی اور دہلی کا ڈکٹیٹر ہوگیا۔ ۱۷۶۱ء سے ۱۷۷۰ء تک وہ دہلی کی سب سے بڑی شخصیت تھا، تمام سیاست اس کے گرد گھومتی تھی اور وہ سارا نظام حکومت اپنے کاندھوں پر سنبھالے ہوئے تھا۔ (سیاسی مکتوبات صفحہ ۲۳۱-۲۳۲)

منشی ذکاء اللہ لکھتے ہیں۔ ''نجیب الدولہ ایسا عاقل ہوشیار ودانشمند تھا کہ کمتر ہوتے ہیں، امانت داری ایمانداری تو اس وقت میں اس پر ختم تھی .... یہ جوانمرد اس ٹوٹی پھوٹی سلطنت کو نباہ رہا تھا۔ (تاریخ ہندوستان جلد نہم صفحہ ۳۱۵)

سر جدوناتھ سرکار نے لکھا ہے۔

''ایک مورخ کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اس کی کس خوبی کی سب سے زیادہ تعریف کرے میدان جنگ میں اس کی حیرت انگیز قیادت کی یا مشکلات میں اس کی تیز نگاہی اور صحیح رائے کی یا اس کی اس فطری صلاحیت کی جو اس کو انتشار اور ابتری میں ایسی راہ دکھا دیتی تھے جس سے نتیجہ اچھا نکلے ==

پڑی۔شاہ صاحب نے ایک طرف نجیب الدولہ کو کئی خطوط لکھے اور اسلامی نقطۂ نظر سے

== موافق نکل آتا تھا" (ملاحظہ ہو سیاسی مکتوبات صفحہ ۲۳۲) اس کی مذہبی دلچسپیوں کا یہ حال تھا کہ شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں۔

نزد نجیب الدولہ نہ صد عالم بود، ادنیٰ پنج روپیہ و اعلیٰ پانصد (ملفوظات شاہ عبدالعزیز صفحہ ۸۱) یعنی نجیب الدولہ کے یہاں نو سو عالم تھے سب سے نیچے درجہ والے کو پانچ روپے اور اعلیٰ کو پانچ سو روپے ملتے تھے۔

اسی وجہ سے علماء اس کی بڑی قدر کرتے تھے۔ روہیلکھنڈ کے ایک مشہور عالم حاجی محمد مہدی صاحبؒ نے اس کی شان میں متعدد قصیدے لکھے ہیں۔ ملاحظہ ہو انشاء مہدی، قلمی (سیاسی مکتوبات صفحہ ۲۳۳) مگر اپنی مذہبیت کے ساتھ انتہائی غیر متعصب انسان تھا۔

اس کی عدل گستری اور بالغ نظری کا یہ واقعہ ہمیشہ تاریخ میں یادگار رہے گا کہ وہ جس وقت بستر مرگ پر آخری سانس لے رہا تھا، اس نے اپنی فوجوں کو (جو اس کے ساتھ ہاپوڑ کے مقام پر تھیں اور گڈھ کا میلہ ہو رہا تھا) حکم دیا کہ گنگا کے میلے میں آنے جانے والے ہندو یاتریوں کے جان و مال کی پوری حفاظت کی جائے۔(Fall of the Mughal Empire Vol II P. 250)

۳۱ ر اکتوبر ۱۷۷۰ کو اس کا انتقال ہوا (تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو نجیب التواریخ از نصیر الدین (قلمی نسخہ حبیب گنج) مختصر حالات کے لئے شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات صفحہ ۲۳۱-۲۳۴ ملاحظہ ہو

(۳) احمد شاہ ابدالی، نادر شاہ کے ذاتی خدمت گار سے فوجی افسر بنا پھر ترقی کر کے مہتمم خزانہ اور آخر میں مُلک کارکن بھی ہو گیا تھا۔ ۲ رجون ۱۷۴۷ء کو نادر شاہ جب اپنے کیمپ میں مارا گیا اور اس کے مرتے ہی سلطنت میں انتشار اور بد نظمی پیدا ہو گئی تو احمد شاہ نے افغانوں کی طاقت اکٹھی کی اور اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔

احمد شاہ اپنے عہد کے نہایت ہی ممتاز حکمرانوں میں تھا، اس کی صلاحیت جہانبانی، تدبیر اور عسکری لیاقت کا اعتراف اس کے مخالفین تک نے کیا ہے۔ اسی کے ساتھ وہ مذہبی رجحانات کا آدمی تھا، علماء و مشائخ کا ہجوم اس کے گرد رہتا تھا، ہر جمعرات کی شب میں وہ علماء و مشائخ کو کھانے پر بلاتا اور مذہبی معاملات پر گفتگو کرتا تھا، وہ خود نہایت پابند شرع سنی تھا۔

ان تمام مذہبی دلچسپیوں کے باوجود وہ انتہائی غیر متعصب اور وسیع النظر تھا، اس کے ملک میں شیعہ، ہندو، عیسائی سب پوری آزادی کے ساتھ رہتے تھے، افغانستان کی تجارت ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی۔

فیریر (Ferrier) نے (History of the Afghans) میں لکھا ہے کہ مشرقی ممالک کی بہت سی خرابیوں سے احمد شاہ مبرا تھا، شراب نوشی افیون وغیرہ سے اجتناب کلی کرتا تھا، لالچ اور منافقانہ حرکتوں سے پاک تھا، مذہب کا سخت پابند تھا، اس کی سادہ لیکن باوقار عادتیں اس کو ہردلعزیز بنا دیتی تھیں، اس تک پہنچنا آسان تھا، وہ انصاف کا خاص خیال رکھتا تھا۔ کبھی کسی نے اس کے فیصلہ کی شکایت نہیں کی"

۲۰ رجب ۱۱۸۶ھ مطابق ۲۳ ر اکتوبر ۱۷۷۲ء کو ابدالی کا انتقال ہوا۔ (ملاحظہ ہو سیاسی مکتوبات۔ صفحہ ۲۲۳ تا ۲۲۶)

احمد شاہ کی اسلامی حمیت کا کچھ بیان سید صاحب کے تذکرے میں آ رہا ہے۔ دیکھئے صفحہ ۳۴۹

اس کی اہمیت جتائی اور مشورے دیئے، ایک خط میں انہیں امیر الغزاۃ اور رئیس المجاہدین کے لقب سے یاد کیا ہے۔(۱)

دوسری طرف احمد شاہ ابدالی سے رابطہ قائم کیا، نجیب الدولہ کے ذریعے کئی خطوط لکھوائے اور خود بھی ایک پرزور مفصل خط لکھا، جسمیں تفصیل سے ہندوستان کی صورتحال بیان کی بالخصوص مرہٹوں اور جاٹوں کا ذکر کر کے مسلمانوں کی مظلومیت کا دلدوز نقشہ کھینچا گیا ہے اور اس کو ہندوستان آ کر اس صورتحال کا مقابلہ کرنے اور مغلیہ سلطنت کو اپنی ذمہ داری سنبھالنے کا موقع دینے پر آمادہ کیا گیا ہے اور اس سے امید ظاہر کرتے ہوئے صاف لکھا گیا ہے کہ ''اس زمانے میں ایسا بادشاہ جو صاحب اقتدار و شوکت ہو اور لشکر مخالفین کو شکست دے سکتا ہو، دور اندیش اور جنگ آزما ہو سوائے آنجناب کے اور کوئی موجود نہیں ہے۔(۲)

یہ خطوط بے اثر نہیں رہے چنانچہ ۱۷۵۹ء (۱۱۷۳ھ) میں اس نے ہندوستان کا قصد کیا۔ اس سے پہلے وہ پانچ مرتبہ ہندوستان پر حملہ کر چکا تھا (۳)، اس وجہ سے یہاں کے جغرافیہ اور سیاسی حالات سے پورا واقف بھی تھا، یکم نومبر ۱۷۶۰ء کو پانی پت کے میدان میں پہنچا اور یہاں ڈھائی مہینے تک مرہٹوں اور افغانوں (بشمول ہندوستانی اسلامی متحدہ محاذ) کے درمیان مسلسل جنگ جاری رہی۔ ۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء کا دن وہ تاریخی فیصلہ کن دن تھا جب مرہٹوں کو شکست فاش ہوئی جس نے ہندوستان کی تاریخ کا رخ بدل دیا، بقول ایک مؤرخ کے ''مرہٹوں کی طاقت چشم زدن میں کافور کی طرح اڑ گئی۔(۴)

سر جادو ناتھ سرکار نے لکھا ہے کہ مہاراشٹر میں کوئی گھر ایسا نہ تھا جس میں صف ماتم نہ بچھ گئی ہو، لیڈروں کی پوری کی پوری نسل ایک ہی معرکہ میں ختم ہو گئی۔(۵)

---

(۱) شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات مکتوب پنجم صفحہ ۲۰

(۲) ایضاً مکتوب دوم صفحہ ۱۱-۱۲

(۳) دیکھیے ایضاً صفحہ ۲۲۷-۲۲۸

(۴) ملاحظہ ہو شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات صفحہ ۴۵

(۵) سرکار کے الفاظ یہ ہیں:

There was not a home in Maharashtara that had not to mourn the loss of a member and several houses their very heads. An ==

یہ مغلیہ سلطنت کو سنبھالا دینے کی ایک کوشش اور صحیح معنی میں ''آخری منظم کوشش'' تھی مگر چونکہ رگ رگ میں جراثیم سرایت کر چکے تھے اور سارا جسم تقریباً سڑ چکا تھا، اس لئے اسے کوئی فائدہ نہیں ہوا اور ابن خلدون کے اس حکیمانہ مقولہ نے ایک بار پھر اپنی معنویت ثابت کر دی'' إن الهرم إذا نزل بالدولة لا يرتفع '' (۱) یعنی سلطنت پر جب بڑھاپا آ جاتا ہے تو از سر نو جوان ہونا ممکن نہیں ہوتا۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے بالکل صحیح تجزیہ کیا ہے لکھتے ہیں :

> اگر سلطنت مغلیہ میں تھوڑی سی بھی جان ہوتی تو وہ جنگ پانی پت کے نتائج سے فائدہ اٹھا کر اپنے اقتدار کو ہندوستان میں پھر کچھ صدیوں کے لئے قائم کر سکتی تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغلیہ سلطنت اس وقت ایک بے روح جسم کی مانند تھی۔ جنگ پانی پت کا اصلی فائدہ فاتحین پلاسی نے اٹھایا۔(۲)

شاہ ولی اللہ مطلق العنان بادشاہت واپس لانا نہیں چاہتے تھے حقیقت یہ ہے جیسا کہ مولانا محمد سرور نے مولانا عبید اللہ سندھی کے خیالات کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے :

> شاہ صاحب نے خوب سمجھ لیا تھا کہ شاہنشاہیت کا دور ختم ہو چکا۔ اب اگر کوئی حکومت بنے گی تو اس کا اساس (۳) کوئی اور ہوگا، چنانچہ

= = entire generation was cut off at one stroke.

(Fall of the Mughal Empire. Vol II. P.212)

مرہٹہ فوج کی تعداد تین لاکھ تھی جن میں دو لاکھ جنگ میں کام آئے ان کے مقابلہ میں مسلمانوں کی تعداد صرف نوے ہزار تھی۔ مگر مرہٹوں نے پھر اپنی طاقت اکٹھی کی اور ۱۷۷۲ء میں دہلی پر قابض ہو گئے۔ یہاں تک کہ شاہ عالم نے جو انگریزوں کی پناہ میں تھا خود کو مرہٹوں کی حفاظت میں دے دیا اور دہلی آ گیا اور مرہٹہ سردار کو اپنا سپہ سالار مقرر کیا۔ مگر ۱۷۹۵ء کے بعد وہ خانہ جنگیوں میں مبتلا ہو گئے اور آخر کار انگریزوں کی اطاعت قبول کر لی۔

جنگ پانی پت کو سرکار نے بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ دیکھئے :

(Fall of the Mughal Empire. Vol II P. 181- 226)

(۱) ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں ایک فصل اس عنوان سے قائم کی ہے۔

(۲) شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات صفحہ ۴۵

(۳) اساس اردو میں عموماً مونث استعمال ہوتا ہے مگر مولانا نے مذکر استعمال کیا ہے۔

شاہ ولی اللہ نے جس تحریک کی داغ بیل ڈالی وہ ہمہ گیر تحریک تھی، ان کے پیش نظر پورا ہندوستان تھا، چونکہ مرکزی ہندوستان کی قیادت اس وقت مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی اس لئے لامحالہ شاہ صاحب نے عام مسلمانوں سے خطاب کیا لیکن شاہ صاحب کی دعوت کے اصول عام انسانیت کے اصول تھے، ان کا زور مذہب کی رسوم پر نہیں بلکہ مذہب کی روح پر تھا، قانون کی ظاہری شکل پر نہیں بلکہ قانون کی جان یعنی عدل و انصاف پر تھا۔ .... مرہٹوں، جاٹوں، سکھوں اور اس عہد کی دوسری چھوٹی چھوٹی تحریکیں اپنی اپنی جگہ پر ٹھیک ہوں گی لیکن ان میں سے کسی تحریک میں اتنی وسعت اور ہمہ گیری نہ تھی کہ وہ ہندوستان کی مرکزیت اور وحدت کو بحال کر سکنے کی تدبیر سوچتی۔ شاہ صاحب اپنے مجوزہ نظام میں اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب کے زمانے کی مرکزیت اور سلطنت ہند کے اقتدار اعلیٰ کو بحال دیکھنا چاہتے تھے، لیکن اس طرح سے کہ مطلق العنان بادشاہوں کے بجائے انصاف کی حکومت ہو .... حضرت شاہ ولی اللہ کی جماعت کا مرہٹوں اور سکھوں کے خلاف معرکہ آرا ہونا نتیجہ تھا ان خاص حالات کا جن سے اس وقت مسلمانوں کو پالا پڑا۔ (۱)

انگریزی خطرہ کا احساس

یہ سمجھ لینا غلط ہوگا کہ شاہ ولی اللہ صاحب یا احمد شاہ ابدالی انگریزوں کے خطرہ سے بے خبر تھے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انہیں ڈر تھا کہ کہیں مغل بادشاہ کے تساہل سے انگریزوں کو اپنا اقتدار قائم کرنے کا موقع نہ مل جائے۔ جنگ پانی پت کے وقت مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی بہار میں تھا (۲)، جنگ کے بعد احمد شاہ ابدالی نے شاہ عالم کو دہلی

---

(۱) شاہ ولی اللہ اور انکی سیاسی تحریک صفحہ ۲۶-۲۹

(۲) درباری فتنہ سے بچنے کے لئے جب وہ ولی عہد تھا اپنے باپ عالمگیر ثانی کے اشارہ سے باہر نکلا تھا اودھ میں شجاع الدولہ کے پاس آیا پھر بہار (جو اس وقت بنگال کے ماتحت تھا) گیا وہیں باپ کے مارے جانے کی خبر ملی اور اسی سفر میں رسم تخت نشینی ادا ہوئی۔

بلانے کی بے حد کوشش کی اور اپنا آدمی بھیجا، جب نہ آیا تو احمد شاہ ابدالی نے شاہ عالم کی والدہ نواب زینت محل سے خط لکھوایا۔ احمد شاہ ابدالی نے انگریزوں کو بھی لکھا کہ وہ شاہ عالم کو دہلی پہنچنے کے لئے ہر قسم کی سہولت دیں، احمد شاہ نے شاہ عالم کو وہاں سے بلانے کی کوشش اس لئے کی تھی کہ وہ انگریزوں کے اثر سے نکل آئے اور دہلی آکر احمد شاہ کی موجودگی میں اپنی طاقت کا استحکام کر لے۔ (۱)

شاہ ولی اللہ انگریزی خطرہ کو پوری طرح سمجھتے تھے۔ مگر حالات کے تقاضے سے انہوں نے اپنا نظام مرتب کیا تھا جس کے تحت اول مرہٹوں کی شکست پھر جاٹوں کا استیصال اس کے بعد سکھوں (۲) سے مقابلہ اور اخیر میں انگریزوں کو ختم کر کے ایک آزاد اور پر امن اسلامی اسٹیٹ کا قیام ان کے پیش نظر تھا جہاں انصاف کو بالا دستی حاصل ہو، ہر طرح کے ظلم کا خاتمہ ہو اور ہر شخص کو خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو اس کا مذہبی ملکی اور معاشرتی حق پورا پورا ملے، زندگی چین اور سکون سے گزرے اور امن و امان کا دور دورہ ہو۔ (۳)

---

(۱) شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات صفحہ ۴۵-۴۶

(۲) نجیب الدولہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ دینی و دنیاوی مصلحت اسی میں ہے کہ مرہٹوں سے جنگ جیتنے کے بعد فوراً قلعہ جات جٹ (جاٹ) کی جانب متوجہ ہو جائیں اور اس مہم کو بھی برکات غیبیہ کی مدد سے آسانی کے ساتھ سر کر لیں۔ اسکے بعد سکھوں کی باری ہے۔ اس جماعت کو بھی شکست دینی چاہئے اور رحمت الٰہی کا منتظر رہنا چاہئے۔ (سیاسی مکتوبات، مکتوب ششم)

(۳) شاہ ولی اللہ کو غیر مسلموں کے امن و امان کا کتنا خیال تھا اور اس کے لئے وہ کتنے متفکر تھے۔ اس کا اندازہ کرنے کے لئے ان کے ایک خط کا فقرہ نقل کرنا کافی ہے جو انہوں نے نجیب الدولہ کو لکھا تھا۔

ایں بار اگر می خواہند کہ کار دست بستہ میسر شود قدغن بلیغ باید نمود کہ کسے با مسلمانان و ذمیان دہلی کار نداشتہ باشند۔ (سیاسی مکتوبات، مکتوب ششم صفحہ ۲۱)

یعنی اگر اس بار آپ چاہتے ہیں کہ یہ مشکل آسان ہو جائے تو پوری پوری تاکید کرنی چاہئے کہ کوئی فوجی دہلی کے مسلمانوں اور غیر مسلموں سے جو ذمی کی حیثیت رکھتے ہیں ہرگز تعارض نہ کرے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

یہ فقرہ مولوی عبید اللہ مرحوم (مولانا عبید اللہ سندھی) کے نظریۂ ''قومیت'' کی تعمیر میں بنیاد کا کام دے سکتا ہے...... معاہدہ کے بعد دینی خصوصیات سے قطع نظر کر کے ''قومیت'' کا مفہوم اسلام نے جو قائم کیا ہے اور عصر حاضر میں ''سکولر'' طرز کی حکومت جس کا نام رکھا گیا ہے ==

ان کے بعد تحریک اسی ترتیب سے آگے بڑھی۔ مرہٹوں کی شکست کے بعد جاٹ خود ہمت ہار بیٹھے، رہی سہی طاقت نجیب الدولہ نے ختم کر دی۔ پھر سکھوں سے معرکوں کا طویل سلسلہ چلا۔ یہ سب طاقتیں جب ختم ہوگئیں تو تحریک کا رخ ہر طرف سے ہٹ کر انگریزوں کی طرف ہوا اور انگریزوں کا اخراج اور ملک کی آزادی اس کا مقصد اساسی قرار پایا۔

احمد شاہ ابدالی نے اس کے بعد ہندوستان پر جو حملے کیے اس کے تناظر میں بھی شاہ صاحب کے مجوزہ ہمہ گیر نظام کی ترتیب سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ شاہ صاحب کی دعوت پر مرہٹوں سے مقابلہ کرنے کے لئے احمد شاہ ابدالی کے ہندوستان آنے کے بعد اس کے درمیان اور شاہ صاحب کے درمیان کیا باتیں ہوئیں، ان تفصیلی ملاقاتوں کا ذکر تاریخ میں نہیں ملتا، مگر قرینہ ہے کہ شاہ صاحب نے اپنا پورا پروگرام اس کو سمجھا دیا ہو۔ اس لئے کہ اس کے معاً بعد ۱۷۶۲ء میں احمد شاہ ابدالی نے سکھوں کی ہنگامہ آرائی (۱) کو روکنے کے لئے ہندوستان پر ساتواں حملہ کیا۔ یہ شاہ صاحب کی زندگی ہی کی بات ہے۔ پھر ۱۷۶۷ء میں جب انگریز بنگال پر پوری طرح قابض ہو چکے تھے، اس نے آٹھواں حملہ کیا۔ اس کا مقصد بنگال سے انگریزوں کو نکالنا تھا، انگریزوں نے اس کے مقابلہ کے لئے فوج کا ایک دستہ الٰہ آباد بھیج دیا تاکہ اودھ میں اس کا مقابلہ کیا جائے۔ (۲)

شاہ ولی اللہ انگریزوں کی ڈپلومیسی سے خوب واقف تھے۔ اگر ان طاقتوں کو ختم کیے بغیر انگریزوں پر ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کرتے تو لامحالہ انگریز اپنی عیاری سے کام لے کر ان کو اپنے ساتھ ملاتے اور وطن دوستوں اور آزادی کے لئے لڑنے والوں کے مقابلہ میں ان کو لے آتے جیسا کہ بعد کی تاریخ نے ثابت کر دیا۔ تاہم شاہ صاحب

== سب کچھ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ان الفاظ میں درج ہوگیا ہے...... سکولر نظریہ کے سوا اسلامی حکومت کی کوئی بنیاد نہیں ہے، اس لئے ہر اس شخص کو جو باضابطہ اسلامی حکومت کی حفاظت میں آگیا، خواہ وہ کچھ ہی مذہب رکھتا ہو۔ شاہ صاحب نے دلی کے مسلمانوں کے ساتھ دلی کے غیر مسلم باشندوں کی حفاظت کی شدید تاکید اسی لئے کی ہے کہ اس کے سوا اسلامی سیاست میں کسی دوسرے تصور کی گنجائش ہی نہیں'' (مکتوب بنام خلیق احمد نظامی، دیکھئے سیاسی مکتوبات صفحہ ۷-۸)

(۱) احمد شاہ ابدالی کی سکھوں سے معرکہ آرائی کے لئے ملاحظہ ہو (بلوچستان تاریخ کی روشنی میں صفحہ ۵۱۲-۵۲۳)

(۲) ملاحظہ ہو شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات صفحہ ۲۳۰

نے پورے ملک میں آزادی کی روح پھونک دی تھی۔ اسرار احمد آزاد لکھتے ہیں :

پلاسی کی لڑائی سے بہت پہلے حضرت شاہ صاحب کی تحریک کے داعی ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل چکے تھے اور انہوں نے قریہ قریہ میں پہنچ کر لوگوں کے دلوں میں بدیسی اقتدار کی مخالفت اور ہندوستان کی مرکزی حکومت کی بقا و حفاظت کا جذبہ پیدا کر دیا تھا (۱)۔ اور خود انہوں نے اپنے وارثوں اور شاگردوں کو اسی نہج پر تیار کیا تھا۔ رتن لال بنسل نے اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے :

بدیشی قوموں کے بڑھتے ہوئے خوفناک پنجوں سے ہندوستان کو بچانے کے لئے وہ زندگی بھر لڑتے رہے اور اپنے وارثوں بیٹوں ناتیوں اور ہزاروں شاگردوں کے دل میں ایسی آگ چھوڑ گئے کہ انہوں نے مر جانا پسند کیا پر ہندوستان کی غلامی کو چپ چاپ برداشت نہیں کیا۔ (۲)

ذرا غور تو کیجئے مرہٹوں کا زور ٹوٹ چکا ہے، جاٹ ہمت ہار چکے ہیں، مگر شاہ صاحب کی آنکھیں ابھی ٹھنڈی نہیں ہوئیں، ان کو کسی کروٹ چین نہیں، وہ مسلسل کرب و اضطراب محسوس کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ اپنے وطن میں خود انہیں اجنبیت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ تاریخ پر نظر رکھنے والا سمجھ سکتا ہے کہ اس کی کوئی وجہ اگر ہو سکتی ہے تو وہ انگریزی سیاست کی شاطرانہ چالیں اور ان کے بڑھتے قدم ہیں جو شاہ صاحب پر تیشے چلا رہے تھے، انہیں ملک میں مسلمانوں کا مستقبل تاریک نظر آ رہا تھا۔ اس کی سب سے بڑی دلیل ان کا آخری وصیت نامہ ہے۔ مولانا گیلانی لکھتے ہیں :

آخر عمر میں جب وصیت نامہ ترتیب دینے لگے تو جہاں اور باتیں لکھیں ان میں سب سے زیادہ دردناک وہ وصیت نامہ ہے جسے پڑھ کر کلیجہ کانپ اٹھتا ہے، دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت کے عاصمہ (پائے تخت) میں بیٹھ کر اسی سلطنت کا ایک عالم لکھتا ہے اور حالات نے جو رخ پلٹا تھا ان کا صحیح اندازہ کرنے کے بعد لکھتا ہے :

---

(۱) ماہنامہ آج کل (دہلی) شمارہ اگست ۱۹۵۷، جنگ آزادی نمبر، صفحہ ۷

(۲) رتن لال بنسل، جدوجہد آزادی اور تحریک ولی اللہی، دریافت و تدوین، عابد حسن از ششماہی فکر و تحقیق، نئی دہلی، جلد نمبر ۱، شمارہ نمبر ۲، جولائی تا دسمبر ۱۹۹۷، صفحہ ۱۲۶۔

ما مردم غریبم کہ در دیار ہندوستان آبائے ما بغربت افتادہ اند

(وصیت نامہ صفحہ ۱۱)

ہم لوگ اجنبی مسافر لوگ ہیں ہمارے باپ دادے اس ملک میں بحالت مسافرت ہی یہاں داخل ہوئے۔ اور پھر وہی حالت واپس ہوگئی ہے۔

وہ دیکھ رہے تھے کہ اگر یہی لیل ونہار رہیں تو اس ملک میں اب دین اور اہل دین کا بس خدا ہی حافظ، اور اب اس میں شک کی گنجائش ہی کیا باقی تھی، جو کچھ ہونے والا تھا، اس کی صبح بلکہ صبح سے بھی زیادہ روشنی طلوع ہو چکی تھی، قوم کی تقدیر ان پر واضح ہو چکی تھی۔(۱)

لیکن ان کے زمانہ میں دہلی پر انگریزوں کا غلبہ نہیں ہوا تھا اور حالات اتنے سنگین نہیں ہوئے تھے کہ شاہ ولی اللہ انگریزوں کے خلاف عملی جدو جہد کا آغاز کرتے اور ان سے جہاد کا صریح فتویٰ دیتے، یہ شرف انہی کے صاحبزادہ اور وارث شاہ عبدالعزیز کے لئے مقدر تھا۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی رقم طراز ہیں:

> ''اگر چہ ہماری نظر سے کہیں نہیں گزرا کہ شاہ صاحب: (شاہ ولی اللہ) نے ملک کو دارالحرب کہا ہو لیکن وہ ملک کا جو نقشہ کھینچتے اور اس کے جو حالات بیان کرتے ہیں وہ ہرگز کسی دارالاسلام کے نہیں ہو سکتے اور اس بناء پر بے تکلف کہا جا سکتا ہے کہ ان کے نیم شعوری ذہن میں ہندوستان کے دارالحرب میں منتقل ہو جانے کا تصور موجود تھا۔(۲)''

جس کو ان کے بعد شاہ عبدالعزیز صاحب نے کھل کر ظاہر کیا مگر جیسا کہ کے ایم اشرف نے لکھا ہے:

شاہ ولی اللہ بلاشبہ انیسویں صدی کے احیائے اسلام کے ممتاز محرکوں میں ہیں جنہوں نے برطانوی حکومت کے خلاف پے درپے شورشوں کی تنظیم اور قیادت کی (۳)۔

بہر حال اس حقیقت کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شاہ ولی اللہ کی تحریک ہندوستان کی تحریک آزادی کی تاریخ ہی میں نہیں بلکہ عالمی تحریکات آزادی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے، اسی سے عام بیداری پیدا ہوئی، یہیں سے روح ملی، یہیں سے غذا فراہم

---

(۱) الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر صفحہ ۱۵۶، اشاعت دوم

(۲) نفثۃ المصدور اور ہندوستان کی شرعی حیثیت صفحہ ۳۷

(۳) انقلاب ۱۸۵۷ء، مرتبہ پی سی جوشی صفحہ ۸۸

ہوئی، اور اسی نے زمین ہموار کی۔

شاہ اہل اللہ کا جذبہ حریت

شاہ اہل اللہ، شاہ ولی اللہ کے برادر خورد تھے۔ یہاں ان کا بھی مختصر تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ علماء ربانیین میں ان کا شمار ہوتا تھا اور ساتھ ساتھ علوم ظاہر میں بھی ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ طب میں مہارت تامہ رکھتے تھے، مطب بھی کرتے تھے۔ ان کی کتابوں میں تلخیص ہدایہ سب سے مشہور ہے، عربی میں تفسیر بھی لکھی۔ ۱۱۱۹ھ مطابق ۱۷۰۸ء میں پیدائش ہوئی (۱) شاہ ولی اللہ ہی کے آغوش میں تعلیم وتربیت پائی۔ اس کے نتیجہ میں ان کے اندر اصلاح احوال کی جو تڑپ رہی ہوگی اس کے بیان کی چنداں حاجت نہیں۔

شاہ عبدالعزیز کے مشیر ودمساز اور ہم راز تھے اور انقلابی کاموں میں ان کے ہم خیال وشریک حال۔ شاہ عبدالعزیز ان کو صورتحال سے مطلع کرتے اور وہ شاہ عبدالعزیز کی ہمت افزائی کرتے جیسا کہ ان کی آپسی مراسلت سے ظاہر ہے۔ خط وکتابت عموماً عربی میں ہوتی تاکہ دشمن مطلع نہ ہو۔ انگریزوں سے متعلق شاہ عبدالعزیز کے اشعار جن کا بالتفصیل ذکر آرہا ہے دراصل شاہ اہل اللہ ہی نام خطوط میں لکھے گئے تھے۔ شاہ عبدالعزیز کے نام لکھے گئے شاہ اہل اللہ کے خطوط سے ان کے جذبات کا کسی قدر پتہ چلتا ہے۔ یہاں صرف ایک خط کا اقتباس نقل کیا جاتا ہے جس سے ان کے جذبہ حریت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ انگریزوں کے تسلط وتغلب سے وہ کس قدر بے چین تھے اور ان سے خلاصی کی ان کو کیسی فکر تھے اور کیسے دلدوز انداز میں وہ انگریزوں کا شکوہ کرتے ہوئے شاہ عبدالعزیز کے جذبات کو فروزاں کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ لکھتے ہیں:

والذی یسمع من أخبار جنود شجاع الدولة عن کفار فرنگ فإلی اللہ المشتکی: الأیام أیام الفتن و نحن فقراء المسلمین مثل حشرات الأرض، من أتی علیها

(۱) ان کے مفصل حالات اور تصنیفات کے لئے ملاحظہ ہو شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان صفحہ ۵۴ تا صفحہ ۶۷

يدسها بالأقدام، لا نستطيع الانتقال و الارتحال من بلد إلى بلد، و أين المفر؟ لا ملجأ ولا منجى من الله إلا اليه. كان ما كان۔ (۱)

کفار فرنگ کے مقابلہ میں شجاع الدولہ کے لشکر کی جو خبریں آرہی ہیں تو بس خدا ہی سے شکوہ ہے، وہی مدد کر سکتا ہے۔ زمانہ بڑے فتنوں کا ہے اور ہم فقراء مسلمین کی حالت کیڑے مکوڑوں کی طرح ہے کہ جو آتا ہے پاؤں سے روند ڈالتا ہے، ہم ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر بھی نہیں کر سکتے، اور جائیں بھی تو کہاں جائیں، اللہ کے علاوہ نہ کہیں پناہ ہے اور نہ نجات کا راستہ، جو ہونا تھا ہوا۔

اس مکتوب میں بظاہر بکسر کی شکست کی طرف اشارہ ہے جو اکتوبر ۱۷۶۴ء (۱۱۷۸ھ) میں پیش آئی تھی۔ آخری جملہ بڑی معنویت کا حامل ہے کہ جو ہونا تھا سو ہوا اب اگلی تدبیر سوچنی چاہئے اور کوئی منظم پروگرام بنانا چاہیے جس سے انگریزوں کو شکست دی جا سکے، ماضی پر افسوس سے کچھ ہونے والا نہیں۔

شاہ اہل اللہ کی وفات ۱۱۸۷ھ مطابق ۱۷۷۳ء میں ہوئی، پھلت میں مدفون ہیں۔

(۱) بیاض مولانا رشید الدین خاں دہلوی، ورق نمبر ۲۴، الف، (قلمی فوٹو) مملوکہ مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی

ضمیمہ (۱)

شاہ ولی اللہؒ کے ہم عصر مغلیہ سلاطین

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی ولادت ۱۱۱۴ھ/۱۷۰۳ء میں ہوئی اور وفات ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء میں ہوئی۔ اس دوران مندرجہ ذیل سلاطین مغلیہ تخت پر آئے:

۱-	اورنگ زیب عالمگیر	(۱۰۶۸ھ/۱۶۵۸ء تا ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۷ء)
۲-	بہادر شاہ اول	(۱۱۱۸ھ/۱۷۰۷ء تا ۱۱۲۳ھ/۱۷۱۱ء)
۳-	جہاں دار شاہ	(۱۱۲۳ھ/۱۷۱۱ء تا ۱۱۲۴ھ/۱۷۱۲ء)
۴-	فرخ سیر	(۱۱۲۴ھ/۱۷۱۲ء تا ۱۱۳۱ھ/۱۷۱۹ء)
۵-	رفیع الدرجات	(۱۱۳۱ھ/۱۷۱۹ء دو ماہ)
۶-	رفیع الدولہ شاہ جہاں ثانی	(۱۱۳۱ھ/۱۷۱۹ء چند ماہ)
۷-	محمد شاہ	(۱۱۳۱ھ/۱۷۱۹ء تا ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء)
۸-	احمد شاہ	(۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء تا ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۴ء)
۹-	عالمگیر ثانی	(۱۱۶۷ھ/۱۷۵۴ء تا ۱۱۷۴ھ/۱۷۶۰ء)
۱۰-	شاہ عالم ثانی	(۱۱۷۴ھ/۱۷۶۰ء تا ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء)

ضمیمہ (۲)

شاہ ولی اللہؒ سے متعلق بعض غلط روایات اور ان کی تردید

یہاں اس بات کا اظہار مناسب بلکہ ایک حد تک ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ کی تحریک کو بعض مصنفین نے اس طرح پیش کیا ہے جس سے عام قاری یہ تاثر لینے لگتا ہے کہ شاہ صاحب نے باقاعدہ انگریزوں کے خلاف اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا تھا اور اس کی خاطر مصیبتیں جھیلی تھیں۔ تاریخ سے زیادہ سے زیادہ جو باتیں ثابت ہوتی ہیں اور جو نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں وہی ہیں جن کا اوپر ذکر ہوا۔ مگر بہت سے مصنّفین اور مقالہ نگاروں نے اس تاریخ کو افسانہ بنا دیا ہے، آئے دن اخباروں میں اس طرح کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ حال ہی میں سلمان علی خاں صاحب (لکھنؤ) نے ''جنگ آزادی میں علماء کرام کا حصہ'' کے نام سے بیس صفحات کا ایک مختصر کتابچہ لکھا ہے جس میں بہت سی تاریخی فروگذاشتوں کے ساتھ اس افسانہ کو بھی ہوا دی گئی ہے۔ وہ شاہ صاحب کے متعلق لکھتے ہیں :

> سب سے پہلے انہوں نے انگریزوں کی بڑھتی ہوئی دست درازی پر ضرب لگانے کے لئے شہنشاہ شاہ عالم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی .... ان کی انقلابی سرگرمیوں پر روک لگانے کے لئے انگریزوں نے ان کے دونوں پہنچوں کو اتروا لینے کی روح فرسا سزا دی .... (صفحہ ۴)

پہنچے اتروانے کا قصہ خود ایک افسانہ ہے پھر اسے انگریزوں کی طرف منسوب کرنا افسانہ در افسانہ ہے۔ جہاں تک پہنچے اتروانے کی بات ہے اس کو سب سے پہلے امیر شاہ خانصاحب نے اپنی کتاب ''امیر الروایات'' میں بیان کیا ہے وہ کہتے ہیں :

> اس زمانہ میں ایک تو روافض کا نہایت غلبہ تھا، چنانچہ دہلی

میں نجف علی خاں کا تسلط تھا جس نے شاہ ولی اللہ کے پہنچے اتروا کر ہاتھ بیکار کر دیئے تھے تاکہ وہ کوئی کتاب یا مضمون نہ تحریر کر سکیں۔

(ارواح ثلثہ صفحہ ۳۳)

اس روایت کو بہت سے اکابر علماء و محققین نے نہ صرف نقل کیا ہے بلکہ بڑی اہمیت دی ہے جن میں مولانا مناظر احسن گیلانی اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی (پاکستان) جیسے محققین کا نام لینا کافی ہے۔ مگر یہ روایت تاریخی اعتبار سے سرے سے غلط ہے۔ نجف علی خاں ۱۷۷۲ء میں پہلی دفعہ دہلی آیا (پھر اس نے بہت جلد ترقی کی یہاں تک کہ امیر الامراء کا خطاب مل گیا) اس سے پورے دس سال قبل ۱۷۶۲ء میں شاہ ولی اللہ کا انتقال ہو جاتا ہے۔ اور عقلاً بھی یہ کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ شاہ ولی اللہ جیسے پایہ کا مشہور عالم (ایک جم غفیر جس کا معتقد تھا) اس مصیبت سے دوچار ہو اور کسی معاصر تاریخ میں اس کا اشارۃً تک ذکر نہ ہو۔ ان کے سارے شاگرد اور معتقد اس سے ناواقف ہوں یا اس کے خلاف آواز بلند نہ کریں۔ پھر اس کی جو علت بیان کی گئی ہے وہ کیا پہنچے اتروانے سے حاصل ہو جاتی۔ کیا شاہ صاحب املاء نہیں کروا سکتے تھے (تفصیل کے لئے دیکھئے ماہنامہ برہان دہلی، شمارہ نومبر ۱۹۶۴ء، مضمون جناب مولوی محمد عضد الدین خاں ایم اے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ بعنوان ''حضرت شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے متعلق چند غلط روایات'' صفحہ ۲۹۲ تا صفحہ ۲۹۶)

جب یہ بات پیش ہی نہیں آئی تو یہ بحث فضول ہے کہ یہ نجف علی خاں نے کیا یا انگریزوں کی سازش تھی۔ پھر بھی یہ معلوم ہونا چاہئے کہ نجف خاں اگرچہ انگریزوں کا بہی خواہ اور ان کا بڑا حامی اور مددگار تھا بلکہ اگر کہا جائے کہ ان کا پٹھو اور ایجنٹ تھا تو بھی غلط نہیں۔ تاہم نجف علی خاں سے متعلق اہل سنت کو پریشان کرنے کے جو واقعات بیان کئے جاتے ہیں تاریخ سے ثابت بھی ہوں تو ان سے کہیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ انگریز دوستی کی وجہ سے ایسا کرتا تھا بلکہ اپنے مذہبی تعصب اور سخت تشیع کی وجہ سے وہ سنیوں سے نفرت کرتا تھا اور ان کو تکلیف پہنچاتا تھا وہاں ''حب علی'' نہیں بلکہ ''بغض معاویہ'' کی کارفرمائی تھی۔

دوسری فصل

جنگ آزادی کا فراموش کردہ ایک عظیم مجاہد

حافظ الملک حافظ رحمت خاں

حافظ الملک حافظ رحمت خاں ان روہیلہ (۱) سرداروں میں سے تھے جن کا شاہ ولی اللہ سے تعلق تھا۔

۱۱۲۰ھ مطابق ۱۷۰۸ء میں علاقہ روہ افغانستان میں آپ کی پیدائش ہوئی۔ یتیمی (۲) میں پروان چڑھے۔ بارہ برس کی عمر میں حفظ قرآن وغیرہ سے فراغت پائی اور تھوڑے عرصہ میں کتب ضروریہ کی تعلیم حاصل کی اور فقہ پر عبور کلی حاصل کیا۔ اپنے وطن میں حافظ صاحب اپنے ذاتی علم وفضل اور دیگر عمدہ خصائل وعادات کے سبب بڑی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ (۳)

آپ نواب علی محمد خاں (۴) نواب کٹھیر (۵) کی دعوت پر ہندوستان آئے (۶)

---

(۱) روہ، مشرقی افغانستان میں ایک کوہستانی سلسلہ ہے۔ وہاں کے اصل باشندوں کو روہیلہ کہا جاتا ہے۔

(۲) ان کے والد شاہ عالم خاں تھے جن کی شاہ جہاں کے زمانہ ہی سے ہندوستان میں آمدورفت تھی۔ ان کے غلام یا متبنی داود خاں نے افغانستان سے ہندوستان آکر کٹھیر میں قسمت آزمائی کی یہاں تک کہ بعض علاقوں کو فتح کر کے حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ شاہ عالم خاں اس کے حالات سن کر اس کے پاس آئے مگر واپسی میں داود خاں کی سازش سے انہیں قتل کر دیا گیا۔ یہ ۱۱۲۳ھ یا ۱۱۲۴ھ (۱۷۱۱ء یا ۱۷۱۲ء) کا واقعہ ہے۔ پھر ۱۱۳۹ھ (۱۷۲۶ء) میں داود خاں کے قتل کا واقعہ پیش آیا (پوری تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو اخبار الصنادید اول صفحہ ۵۵ تا صفحہ ۷۹)

(۳) حیات حافظ رحمت خاں صفحہ ۱۳

(۴) داؤد خاں کو ایک جنگ میں قیدیوں میں ایک حسین لڑکا ہاتھ آیا۔ اس کے اس وقت کوئی اولاد نہیں تھی اس لئے اس کو پسر خواندہ بنالیا اور علی محمد خاں نام رکھا اور عمدہ طریق پر تربیت کی، سپہ گری کے تمام فنون سکھا دیئے۔ داؤد خاں کے مارے جانے کے بعد تمام روہیلہ سرداروں نے علی محمد خاں کو داؤد خاں کا جانشین بنالیا، حالانکہ علی محمد خاں خود روہیلہ نہیں تھا۔ اس نے کٹھیر کو بڑی ترقی دی اور اسی کے زمانہ میں یہ پورا علاقہ اور مفتوحہ علاقوں کے ساتھ روہیلکھنڈ کہلایا، نواب علی محمد خاں ==

اور نواب صاحب کی رفاقت میں کام کیا اور حکوت کی وسعت اور استحکام میں اہم رول ادا کیا۔ اپنے اخلاص و وفاداری اور شجاعت و بہادری سے وہ اعتماد حاصل کیا کہ نواب علی محمد خاں نے ان کو اپنا جانشین بنایا، مگر حافظ صاحب نے ایثار کر کے نواب صاحب کے صاحبزادہ نواب سعد اللہ خاں کو اپنی طرف سے نواب بنایا۔ اس وقت ان سے بڑے دو بھائی نواب عبد اللہ خاں اور نواب فیض اللہ خان احمد شاہ ابدالی کے پاس قندھار میں تھے۔ ۱۱۶۵ھ مطابق ۱۷۵۲ء میں واپس ہوئے تو بھائیوں میں ناچاقی پیدا ہوئی اور علی محمد خاں کا ملک ان کے بیٹوں میں تقسیم کیا گیا۔ پھر ۱۱۶۷ھ مطابق ۱۷۵۴ء میں ایک اور تقسیم عمل میں آئی جس کی رو سے روہیلکھنڈ نواب علی محمد خاں کے صاحبزادوں اور دوسرے سرداران روہیلکھنڈ میں تقسیم ہوا۔ بریلی اور شاہجہاں پور وغیرہ حافظ رحمت خاں کے حصہ میں آئے۔ ۱۱۷۵ھ مطابق ۱۷۶۲ء میں نواب سعد اللہ خاں کے انتقال کے بعد سرداران روہیلکھنڈ نے حافظ رحمت خاں کو متفقہ طور پر اپنا حاکم تسلیم کیا۔

حافظ الملک نے ملک دشمن طاقتوں سے خوب خوب ٹکر لی۔ مرہٹوں کی جنگ میں احمد شاہ درانی کے پورے شریک عمل اور نجیب الدولہ کے بعد اس کے سب سے زیادہ معتمد رہے۔ اس کے علاوہ سیاست دہلی میں بھی قابل تعریف کردار ادا کیا اور سلطنت میں جان ڈالنے کی کوشش کی۔ قرب و جوار کے نوابین سے بھی ہمیشہ دوستانہ تعلقات رکھے اور وقت پر سب کے کام آئے مگر زیادہ تر ان نوابین نے احسان فراموشی سے کام لیا۔

== کا انتقال ۱۱۶۲ھ میں ہوا۔
نواب علی محمد خاں کے حالات، دور حکومت اور کارناموں کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو اخبار الصنادید جلد اول صفحہ ۱۷۹ تا صفحہ ۱۹۷

(۵) بریلی، مرادآباد، سنبھل اور بدایوں کے اقطاع کو کٹھیر کہتے تھے۔ وجہ تسمیہ کے لئے دیکھئے اخبار الصنادید اول صفحہ ۵۰، وحیات حافظ رحمت خاں صفحہ ۱۔

(۶) نواب نیاز احمد خاں ہوش اس کے سبب پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب نواب علی محمد خاں جانسٹھ کے سیدوں کی لڑائی سے واپس آئے تو انہوں نے یہ دیکھا کہ اکثر روہیلے پسر متبنیٰ ہونے کے سبب سے میری طاعت میں دریغ کرتے ہیں۔ اپنے مشیروں سے مشورہ کیا تو یہ رائے قرار پائی کہ حافظ رحمت خاں بن شاہ عالم خاں کو روہ سے بلا لینا چاہئے ان کی فرمانبرداری سے روہیلے کبھی سر نہ پھیریں گے، نواب علی محمد خاں نے متواتر خط بھیج کر حافظ صاحب کو بلایا (تاریخ روہیلکھنڈ، بحوالہ حیات حافظ رحمت خاں صفحہ ۱۳)

انگریزوں سے ٹکراور شہادت

حافظ الملک، انگریزوں کے سخت دشمن تھے اور ان کے خطرے سے اچھی طرح واقف۔ان کے خلاف لڑنے کے کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ چنانچہ ۱۷۶۴ء میں جب شجاع الدولہ پٹنہ میں انگریزوں سے برسر پیکار تھا تو اس نے انگریزوں کے خلاف حافظ الملک کے جذبات سے واقفیت کی بناء پر ان سے امداد طلب کی۔ انہوں نے اپنے لڑکے عنایت خاں کی سرکردگی میں چھ ہزار آزمودہ کار پیدل اور سوار فوج روانہ کی جس نے جنگ پٹنہ میں شرکت کی جو بکسر سے پہلے پیش آئی تھی۔ پھر جب شجاع الدولہ نے بکسر میں پڑاؤ ڈالا تو آپسی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے تنگ آکر وہیں سے عنایت خان نے کٹھیر کا رخ کیا۔(۱)

جنگ بکسر کے بعد انگریزوں سے مقابلہ کی طاقت نہ پاکر ان کے ساتھ حافظ الملک کا بظاہر مصالحت کا معاملہ رہا مگر ان سے خلاصی حاصل کرنے کی برابر تدبیریں کرتے رہے۔ وہ شاہ افغانستان تیمور شاہ بن احمد شاہ ابدالی کی مدد سے انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنا چاہتے تھے۔(۲)

حافظ الملک کی ہوشمندی اور روز افزوں مقبولیت سے انگریز قلابیں کھانے لگے اور ان کو زیر کرنے کے لئے بے چین ہوگئے۔ دوسری طرف شجاع الدولہ جو بکسر کے بعد انگریزوں کا حلیف ہوگیا تھا اور روز بروز ان سے پینگ بڑھا رہا تھا (۳) حافظ الملک کو اپنا حریف سمجھنے لگا، یہاں تک ان کا جانی دشمن ہوگیا۔ دونوں نے مل کر ان کے خلاف زبردست سازش کی۔ پہلے اپنی فطرت سے مجبور ہوکر تمام سرداران روہیلکھنڈ کو حافظ الملک سے برگشتہ کردیا پھر ان کے مقابلہ میں ایک لشکر جرار (۴) میدان میں لے

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے حیات حافظ رحمت خان صفحہ ۱۲۷-۱۳۲

(۲) دیکھئے اخبار الصنادید جلد اول صفحہ ۲۷۳

(۳) یہاں تک کہ جیسا کہ سید الطاف علی بریلوی نے لکھا ہے کہ شجاع الدولہ کے دوست ہسٹنگز (گورنر بنگال) کے حکم سے مسٹر مڈلٹن اودھ کا ریذیڈنٹ مقرر کر کے بھیج دیا گیا تھا جو ہر وقت شجاع الدولہ کے ساتھ رہتا تھا اور ان کو ملک گیری کی چالیں بتاتا رہتا تھا (حیات حافظ رحمت خاں صفحہ ۲۰۵)

(۴) جس کی تعداد ایک لاکھ پندرہ ہزار تھی (اخبار الصنادید اول صفحہ ۲۹۷)

آئے۔ کرنل چمپین کی انگریزی فوج جس میں توپ خانہ بھی شامل تھا بطور ہراول سب سے آگے تھی۔

جنگ شروع ہونے سے پہلے حافظ الملک نے مصالحت کی پوری کوشش کی مگر انگریزوں اور شجاع الدولہ نے کوئی موقع نہیں دیا وہ تو بس یہی چاہتے تھے کہ کسی طرح حافظ الملک کو موت کے گھاٹ اتار دیں اور روہیلہ طاقت کو کمزور کریں۔ جب جنگ ناگزیر ہوگئی تو حافظ صاحب شہادت کی تیاری کے ساتھ نکلے۔ انہوں نے اب طے کر لیا تھا کہ ملک کی حفاظت میں جان دے دیں گے مگر کسی قسم کی بزدلی نہیں دکھائیں گے۔ ایک موقع پر جب بعض سردار صلح کی کوشش کر رہے تھے تو حافظ الملک نے فرمایا:

> ''شہادت میرے دل کی آرزو ہے، اپنے ملک کی حفاظت میں ایسی عزت کی موت مجھے پھر کب میسر آئے گی'' (۱)

عماد السعادت میں لکھا ہے کہ حافظ صاحب نہایت دلیر تھے ان کی غیرت بزدلی قبول نہیں کرتی تھی۔ انہوں نے میدان جنگ میں یہ چاہا کہ انگریزی فوج میں گھس کر سب کو تہ تیغ کر کے نواب شجاع الدولہ تک پہنچ جاؤں (۲)۔

انگریزی فوج نے جب توپ خانہ کا دہانہ کھولا اور گولہ باری شروع کی تو روہیلہ سردار جن کو پہلے ہی حافظ صاحب سے توڑ لیا گیا تھا، بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہ دیکھ کر پوری فوج تتر بتر ہوگئی یہاں تک کہ حافظ صاحب کے ساتھ بہت تھوڑی تعداد رہ گئی مگر حافظ الملک ڈٹے رہے اور پوری قوت کے ساتھ انگریزی فوج کا مقابلہ کرتے رہے لیکن تا بکے، بالآخر ایک گولہ حافظ صاحب کے سینہ پر لگا اور روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ یہ واقعہ ۱۱ر صفر ۱۱۸۸ھ مطابق ۲۳ر اپریل ۱۷۷۴ء کا ہے۔

حافظ الملک جرأت و شجاعت، ذکاوت و شہامت، شوق شہادت اور ذوق عبادت میں سلطان ٹیپو سے بہت مشابہ معلوم ہوتے ہیں۔ (۳)

(۱) حیات حافظ رحمت خاں صفحہ ۲۱۲

(۲) اخبار الصنادید اول صفحہ ۵۰۰

(۳) ملاحظہ ہو حیات حافظ رحمت خاں صفحہ ۲۱۳ تا صفحہ ۲۲۵، نیز صفحہ ۲۷۶ تا صفحہ ۲۷۸، یہاں تک کہ جنگ کے ہنگامی حالات میں بھی اوراد و وظائف سے ناغہ نہ ہوتا تھا۔ آخری دن بھی اس کا اہتمام کیا۔ جب انگریزی فوج کے حملہ کی خبر آئی تو اوراد سے فارغ ہو کر نماز اشراق میں مشغول تھے۔

مولوی محمد یعقوب ضیاء قادری بدایونی لکھتے ہیں :

حافظ رحمت خاں نہایت دلیر و شجاع ،متقی و پرہیزگار بزرگ تھے(۱)

حافظ الملک حافظ قرآن، علم دوست اور علم پرور ہونے کے علاوہ بلند پایہ شاعر وادیب اور زبردست عالم تھے خاص طور پر فقہ میں بڑا کمال حاصل تھا بعض کتابیں بھی یادگار چھوڑیں۔

روہیلکھنڈ کی پامالی

جنگ کے بعد انگریزوں اور شجاع الدولہ نے روہیلوں کو ایسی بے رحمی اور بے حرمتی کے ساتھ پامال کیا اور روہیلکھنڈ کو اس بری طرح سے لوٹا کہ لندن کے ہاوس آف کامنس House of Commons اور کورٹ آف ڈائرکٹرز Court of Directors میں اس پر اظہار تاسف کیا گیا۔ پوری زمین دہل کر رہ گئی۔ لارڈ میکالے کے الفاظ میں ''تمام ملک ایک شعلہٗ جوالہ تھا، ایک لاکھ سے زیادہ آدمی جنگل اور بن میں اپنا گھر چھوڑ کر چلے گئے اور یہ سمجھے کہ بھوک اور بیماری سے مرنا اور شیر ونہنگ کے منھ میں پڑنا اس ظالم کے پھندے میں پھنسنے سے اچھا ہے جس کے ہاتھ عیسائی گورنمنٹ نے ان کی جان و مال اور عزت وآبرو جورو بچے سب بیچ ڈالے ہیں''

مسٹر گلیج گورنر جنرل ہسٹنگز کے طرز عمل سے دفاع کرنے کے بعد صاف اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے :اگر ہم کچھ سمجھ رکھتے ہوں تو اس امر کو تسلیم کریں گے کہ برا کام کرنا اجرت پر برا ہے، لڑائی بھی ناحق کرنی جب تک دوسرا ہم کو نہ چھیڑے برا کام ہے اس لئے روہیلوں سے لڑنا برا تھا، ناحق خون کرنا بڑی بے عقلی و بے حرمتی ہے، یہ پیاری صورتیں اور موہنی مورتیں خدا کی خاص صنعت گری ہے اس کا مٹانا سخت سنگ دلی اور شقاوت ہے۔ روہیلوں کے ساتھ لڑنے کا کوئی اور مقصود نہ تھا سوا اس کے کہ ایک عمدہ انتظام ملکی کو شجاعت شعار اور معدلت گسار قوم سے لے کر ایک ظالم نامرد موذی کو دیدیں گورنر (ہسٹنگز) اس بات کو خوب سمجھتے تھے کہ میں کیا کرتا ہوں۔(۲)

---

(۱) اکمل التاریخ جلد اول صفحہ ۳۵

(۲) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو اخبار الصنادید جلد اول صفحہ ۵۳۰ تا صفحہ ۵۴۵۔

حافظ الملک کی فوج کے بعض سر برآوردہ علماء

حافظ الملک خود ایک بڑے عالم تھے اس لئے علماء کی بڑی قدر کرتے تھے۔ ان کی فوج میں علماء و مشائخ کی بڑی تعداد تھی جو ملک دشمن طاقتوں سے برسر پیکار تھی، حافظ الملک ان کو ہر موقع پر مقدم رکھتے، سفارت وغیرہ اہم معاملات میں انہی سے کام لیتے۔ بہت سے علماء فوج میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔

مولانا سید احمد شاہ

ان میں سب سے مشہور اور محترم مولانا سید احمد صاحب کی ذات تھی جن کا عرف شاہ جی بابا اور بقول بعض شاہ جی میاں تھا۔

آپ کا شمار روہیلکھنڈ کے با اثر علماء میں ہوتا تھا۔ آپ کے مریدین کا حلقہ وسیع تھا۔ اسی کے ساتھ ایک ماہر مدبر اور سپہ سالار بھی تھے۔ شاہ ولی اللہ کا آپ کے نام ایک مکتوب ہے جس سے آپ کی تنظیمی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ شاہ ولی اللہ آپ کے مداح تھے۔ (۱)

آپ نے اپنے اثر و رسوخ نیز اپنی تدبیر و انتظام سے نوزائیدہ روہیلہ سلطنت کے استحکام اور مخالف قوتوں کے معاملہ میں ہر طرح کی مدد دی۔

۱۷۴۹ء میں حافظ الملک نے آپ کو مع دو علماء کے نواب قائم خاں والی فرخ آباد کے پاس سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ (۲)

اس کے علاوہ بھی سفارت میں آپ کا نام آتا ہے۔

مولوی حکیم نجم الغنی خاں رامپوری لکھتے ہیں:

بڑے نیک خصلت اور عقل و دانش میں ارسطوئے زمانہ اور تہور و مردانگی میں یگانہ اور افاغنہ کے پیرزادے تھے اور حضرت سید علی بابا کی اولاد میں تھے جو سادات ترمذ سے ہیں۔ (۳)

---

(۱) ملاحظہ ہو شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات صفحہ ۵۴۔

(۲) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو حیات حافظ رحمت خاں صفحہ ۳۹ تا صفحہ ۴۲۔

(۳) اخبار الصنادید جلد اول۔ صفحہ ۲۰۵۔ سادات ترمذ حسینی سادات ہیں۔

۱۱۸۵ء سے ۱۱۸۸ء (مطابق ۱۷۷۱ء سے ۱۷۷۴ء) تک کے درمیان آپ کا انتقال ہوا۔(۱)

حضرت حافظ شاہ جمال اللہ

حضرت حافظ شاہ جمال اللہ اٹھارہویں صدی عیسوی کے مشہور بزرگوں میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے اپنے عہد کی تاریخ، تہذیب، سیاست اور معاشرت پر گہرے نقوش چھوڑے۔ آپ کی ولادت تقریباً ۱۱۳۷ھ مطابق ۱۷۲۴ء میں بمقام گجرات شاہ دولہ پنجاب میں ہوئی۔ سادات سے آپ کا تعلق تھا، شیخ سید عبدالقادر جیلانی کی اولاد میں تھے ابتدائی تعلیم وتربیت اپنے وطن اور وزیر آباد میں ہوئی، نو سال کی عمر میں قرآن حفظ کر کے اعلیٰ تعلیم کے لئے کسی غیبی اشارہ سے دہلی آئے اور یہاں کے علماء سے علوم دینیہ بالخصوص فقہ کی تحصیل کی، اسی دوران حضرت مولانا شاہ قطب الدین مجددی سے بیعت ہوئے۔(۲)

حکیم محمد حسین شفا صاحب لکھتے ہیں: پیر ومرشد شاہ قطب الدین صاحب نے حافظ شاہ جمال اللہ کی بارہ سال تک روحانی وفوجی تربیت مکمل کر کے ۱۱۷۳ھ (۱۷۶۰ء)

---

(۱) مولوی حکیم نجم الغنی رامپوری نے ۱۷۷۰ء کی مرہٹہ روہیلہ جنگ میں سید احمد شاہ کا ذکر کیا ہے۔ (اخبار الصنادید اول صفحہ ۳۸۶) اور حافظ الملک کی انگریزوں اور شجاع الدولہ کے ساتھ ہونے والی جنگ ۱۷۷۴ء کے وقت ان کا زندہ نہ ہونا معلوم ہوتا ہے (ملاحظہ ہو صفحہ ۴۷۹) اور صفحہ ۳۹۷ پر ۱۷۷۲ء کے ابتدائی واقعات میں حافظ صاحب کے فرخ آباد جانے کا تذکرہ کیا ہے، اسی ضمن میں ذکر کرتے ہیں کہ فرخ آباد میں حافظ صاحب کا ایک معتبر رسالہ دار سید احمد نامی اپنے غلام کے ہاتھ سے مارا گیا۔
اس سید احمد سے سید احمد شاہ ہی مراد ہیں جیسا کہ دوسرے موقع سے قطعی طور پر معلوم ہوتا ہے، اور اس کا بھی قرینہ ہے کہ سید احمد شاہ سے شاہ جی بابا مراد ہوں اگر یہ صحیح ہے تو شاہ جی بابا کا ۱۷۷۲ء کے اوائل میں انتقال ہونا متعین ہو جاتا ہے واللہ اعلم۔
روہیلکھنڈ کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والا کوئی اس کی تحقیق کرے۔

(۲) دیکھئے تذکرہ کاملان رامپور صفحہ ۹۶-۹۷۔ نیز حکیم محمد حسین شفاء کا مضمون بعنوان ''حضرت حافظ شاہ جمال اللہ صاحب اور ان کا عہد: سیاسی وسماجی مطالعہ'' یہ قلمی مضمون میں نے رامپور میں حکیم صاحب سے حاصل کیا تھا۔ بقول ان کے اس کا ترجمہ پاکستان میں چھپا تھا۔

کے لگ بھگ روہیلکھنڈ کی خلافت وولایت عطا کر کے حکم دیا کہ اب تم روہیلکھنڈ کے معاملات کی درستی اور روہیلوں کی اصلاح وتربیت کیلئے اپنی زندگی کو وقف کردو۔(۱)

چنانچہ آپ روہیلکھنڈ آئے اور اصلاح حال کی طرف پوری توجہ کی۔ سلطنت کے استحکام اور اندرونی و بیرونی خطرات سے اس کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی۔ حافظ الملک حافظ رحمت خاں نے بھی آپ کی اہمیت کو محسوس کیا اور اپنا مشیر کار بنایا اور ایک روایت کے مطابق حافظ الملک نے آپ سے بیعت بھی کی تھی (۲) انگریز مخالف سرگرمیوں میں حافظ الملک کے ساتھ پورے طور پر شریک تھے۔ آخری جنگ (۱۷۷۴ء) میں جس میں حافظ الملک کی شہادت ہوئی آپ پیش پیش تھے۔ آپ نے انگریزوں سے سرفروشانہ مقابلہ کیا یہاں تک کہ زخمی ہوگئے۔ بقول حکیم شفاء اس جنگ کے مجروحین میں حافظ شاہ جمال اللہ کا نام سرفہرست ہے۔(۳)

ریاست رامپور کے قیام کے بعد رامپور میں رہائش اختیار کی اور نواب فیض اللہ خاں کو مشورے دیتے رہے۔ نواب صاحب آپ کی بہت تعظیم کرتے تھے۔ آپ نے پٹھانوں کی اصلاح کی ہر طرح سے کوشش کی۔ ہزاروں لوگ آپ کی اصلاح سے خدا پرست ہوگئے۔ تمام معاملات میں آپ نے ان کا ساتھ دیا۔ حافظ احمد علی خاں شوق کے الفاظ میں انتقال تک حالت صلح و جنگ وقیام وگریز میں برابر پٹھانوں کے شریک حال رہے۔ ۳۰ رصفر ۱۲۰۹ھ (۳۱ راگست ۱۷۹۴ء) کو آپ نے انتقال کیا۔ آپ کے خلفاء میں رامپور کے مشہور بزرگ شاہ درگاہی، ملا فدا لکھنوی اور میاں سیف اللہ سنبھلی مشہور ہیں۔(۴)

مولانا غلام جیلانی خاں بہادر

اپنے زمانہ کے مشہور اور بااثر علماء میں تھے۔ مولانا عبدالعلی بحرالعلوم بن ملا نظام الدین کے ہم درس تھے۔ تحصیل علم کے بعد مرشد آباد گئے۔ میر قاسم نے اپنے زمانہ میں

---

(۱) مضمون مذکور۔

(۲) دیکھئے تذکرہ کاملان رامپور ص ۹۸

(۳) مضمون مذکور۔

(۴) تذکرہ کاملان رامپور ص ۹۸-۹۹

دہلی کے دربار میں سفیر مقرر کیا تھا جس کے صلہ میں شعبان ۱۱۷۲ھ میں عالمگیر ثانی شاہ دہلی نے خطاب خانی و بہادری جاگیر و منصب سہ ہزاری ذات و یک ہزار سوار عطا کیا بنگال پر انگریزی تسلط ہو جانے کے بعد نواب سعد اللہ خاں نے بلا کر ایک ہزار پیدل پر سپہ سالار کیا اور دو ہزار کی تنخواہ و جاگیر مقرر کی (۱) پھر حافظ الملک نے اپنے ساتھ رکھا۔ حافظ صاحب آپ کی بڑی قدر کرتے تھے۔ اہم معاملات میں آپ سے مشورہ لیتے تھے۔ آپ حافظ الملک کی فوج کے ممتاز افسر تھے۔ مرہٹہ روہیلہ جنگ ۱۷۷۰ء۔ ۱۷۷۱ء میں حافظ الملک کے ساتھ تھے۔ (۲)

معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں اور شجاع الدولہ سے حافظ الملک کی جنگ میں آپ حافظ صاحب کے ہمراہ تھے اسی وجہ سے شجاع الدولہ نے آنولہ میں ان کے مکان پر پہرہ بٹھا کر دانہ پانی سب قرق کر لیا تھا۔ (۳)

اس کے بعد نواب فیض اللہ خاں (۴) نے آپ کو اپنی رفاقت میں لیا اور دہریائی تحصیل بلاسپور کا علاقہ جاگیر میں عطا ہوا۔ مصطفیٰ آباد رامپور کی بنیاد ڈالی گئی تو آپ نے اس کو ترقی دینے میں قابل قدر خدمات انجام دیں۔

مولانا غلام جیلانی نے انگریزوں کے خلاف جنگ میں بھی بڑا کارنامہ انجام دیا،

---

(۱) تذکرہ کاملان رامپور صفحہ ۲۸۶

(۲) اخبار الصنادید اول صفحہ ۳۸۶

(۳) ایضاً صفحہ ۵۲۹

(۴) حافظ رحمت خاں کے مارے جانے کے بعد روہیلوں نے نواب فیض اللہ خاں کو اپنا سردار بنایا اسلئے کہ وہ نواب علی محمد خاں کی موجودہ اولاد میں سب سے بڑے تھے اور نہایت ہوشمند اور ذہین اور صاحب علم و فضل تھے۔ اب پورے روہیلکھنڈ پر شجاع الدولہ کا قبضہ تھا اور وہ خود انگریزوں کے زیر دست، چونکہ نواب فیض اللہ خاں روہیلکھنڈ کے جائز وارث تھے اس بناء پر ۷ر اکتوبر ۱۷۷۴ء کو انگریزوں اور شجاع الدولہ اور نواب فیض اللہ کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جسکی رو سے رامپور کا علاقہ نواب فیض اللہ خاں کو عطا کیا گیا اور اس کے عوض نواب فیض اللہ خاں نے پچاس لاکھ روپیہ کے قریب انگریزوں اور شجاع الدولہ کو دیئے۔ یہی ریاست رامپور کی بنیاد ہے جو ۱۹۴۷ تک قائم رہی۔

نواب فیض اللہ خاں کا انتقال ذی الحجہ ۱۲۰۸ھ مطابق جولائی ۱۷۹۴ء میں ہوا۔ (تفصیل کے لئے اخبار الصنادید ملاحظہ ہو)

رمضان ۱۱۹۵ھ مطابق ۱۷۸۱ء میں آصف الدولہ (جانشین شجاع الدولہ) اور انگریزی سپاہ کے ساتھ نواب فیض اللہ خاں کے سپاہیوں کی آپ کی قیادت میں لڑائی ہوئی جس میں انگریزی اور آصفی سپاہ کو شکست ہوئی۔ (۱)

آپ شجاعت، مروت، حسن اخلاق اور ایثار میں بے مثل تھے۔

۱۲۰۷ھ مطابق ۱۷۹۲ء میں نوے برس کی عمر میں رامپور میں انتقال کیا۔ (۲)

اس اعتبار سے ۱۱۹۵ھ میں انگریزوں سے جنگ کے وقت آپ کی عمر اسی سال کے قریب تھی پھر بھی فوج کی قیادت کر رہے تھے اور فتح بھی حاصل کی اس سے آخری درجہ کی آپ کی شجاعت اور تدبیر کا پتہ چلتا ہے۔

آپ نے اپنے بچوں کی بھی اسی طرز پر تربیت کی تھی، آپ کے چار لڑکے غلام حسن خاں، غلام حسین خاں، غلام محمد خاں اور غلام حیدر خاں، رامپوری فوج میں افسر تھے نواب غلام محمد خاں کے زمانہ حکومت میں ۱۲۰۹ھ مطابق ۱۷۹۴ء میں رامپوری فوج اور انگریزی و آصفی سپاہ میں لڑائی ہوئی۔ یہ چاروں لڑکے اس میں شریک تھے۔ یہ جنگ دو جوڑہ کے نام سے تاریخ میں مشہور ہے (۳)

ملا سردار خاں کمالزئی (۴)

روہ سے داود خاں کے عہد میں ہندوستان آئے۔ تو داود خاں نے ان کی بڑی عزت کی۔ اس کے بعد نواب علی محمد خاں نے اپنی رفاقت میں رکھا۔ اور جب کٹھیر پر

(۱) دیکھئے اخبار الصنادید اول صفحہ ۵۸۳

(۲) تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو تذکرہ کاملان رامپور صفحہ ۲۸۶ صفحہ ۲۸۸۔

(۳) جنگ کی تفصیل کے لئے دیکھئے اخبار الصنادید اول صفحہ ۶۳۷ تا صفحہ ۶۶۶۔

(۴) ایسے ہی جیسے ہندو پاک میں عالم کو عزت و احترام سے مولانا یا مولوی کہا جاتا ہے، افغانستان اور پاک افغان سرحدی قبائل کے پختون ملا یا مولا کہتے ہیں۔ چونکہ یہ علماء اصلاً افغانی تھے اور بعض تو خود افغانستان سے آئے تھے اس لئے ان کے نام کے آگے ملا آتا ہے۔ ہندوستان میں بھی مولانا اور مولوی کی اصطلاح کے رائج ہونے سے پہلے بڑے عالم کو ملا کہتے تھے جیسے ملا نظام الدین لکھنوی اور ملا بحر العلوم۔ محمد خواص خاں جو اسی علاقہ کے رہنے والے ہیں لکھتے ہیں پشتو زبان میں جمیع علماء کو مولیان کہتے ہیں ایک عالم کو مولا اور اسی مولا کا مخفف ملا ہو گیا۔ (روئیداد مجاہدین ہند صفحہ ۱۶۱)

قبضہ ہوگیا تو آپ کو اپنی فوج کا بخشی مقرر کیا۔ حافظ الملک آپ کی بڑی قدر کرتے تھے۔ آپ کے مشورہ کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ ہر جنگ میں شریک رہے اور حکومت کے استحکام میں اہم رول ادا کیا۔ اپنی اولاد کو بھی اس میں لگایا۔ آپ بڑے متقی عابد زاہد شجاع اور سخی تھے۔ تجویز و تدبیر میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ سو برس کی عمر میں ۱۱۸۶ھ یا ۱۱۸۷ھ میں وفات پائی۔ آنولہ میں قبر ہے۔ (۱)

ملا محسن خاں امان زئی

آغاز شباب میں روہ سے ہندستان آئے اور مدت تک طالب علمی کرتے رہے۔ حصول علم کے بعد نواب علی محمد خاں کے یہاں عہدہ پایا اور اپنے اخلاص اور قابلیت سے بہت جلد ترقی کی۔ پھر حافظ الملک نے اپنے ساتھ رکھا اور حکومت کے استحکام اور دشمنوں کی سرکوبی میں ان سے بہت کام لیا۔ ۱۷۵۱ء میں اٹاوہ انہی کی سرکردگی میں فتح ہوا۔ روہیلہ سرداروں میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ جگہ جگہ آپ کا تذکرہ آتا ہے۔ جنگ پانی پت میں بھی احمد شاہ ابدالی کے ہمراہ تھے۔

۱۱۸۰ھ مطابق ۱۷۶۹ء میں انتقال کیا۔ (۲)

سید معصوم شاہ

مولانا سید احمد شاہ جی بابا کے صاحبزادہ اور جانشین تھے۔ جنگ پانی پت میں شریک تھے۔ نواب علی محمد خاں کی شوریٰ کے رکن تھے۔ حافظ الملک حافظ رحمت خاں نے آپ کی اور قدر افزائی کی۔ بڑے بہادر سپاہی تھے، ہر موقع پر آگے آگے رہتے۔ کئی سفارتوں میں آپ کا نام آیا ہے۔

حافظ رحمت خاں آپ سے بیعت تھے (۳)۔ حافظ صاحب کے بعد زندہ رہے، سال وفات کا علم نہ ہو سکا۔

---

(۱) اخبار الصنادید اول صفحہ ۴۲۶

(۲) اخبار الصنادید کے متفرق مقامات سے آپ کے حالات مرتب کئے گئے ہیں۔

(۳) دیکھئے اخبار الصنادید اول صفحہ ۵۰۹۔ قیاس ہے کہ پہلے شاہ جی بابا سے بیعت ہوگی ان کے انتقال کے بعد صاحبزادے سید معصوم سے رجوع کر کے تجدید کی ہوگی۔

دیگر مجاہد علماء

ان کے علاوہ سینکڑوں علماء حافظ الملک حافظ رحمت خاں کے ساتھ ہر محاذ پر رہتے تھے۔ ۱۷۷۴ء کی انگریزوں اور شجاع الدولہ سے جنگ میں جس میں حافظ صاحب کی شہادت ہوئی تھی بہت سے علماء وفضلاء کو گرفتار کر کے جنگی قیدی کی حیثیت سے الہ آباد لے جایا گیا ان گرفتار شدگان میں ملا میر باز خاں، ملا حسن خاں، ملا عالم خاں، ملا عبد الواحد خاں اور قاضی محمد سعید خاں کے نام بہت نمایاں ہیں۔ مجاہد لیڈروں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ان کی اہمیت کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب آصف الدولہ (۱) نے اپنی تخت نشینی کی خوشی میں روہیلکھنڈ کے بہت سے قیدیوں کو رہا کیا تو دیگر کئی سرداروں کے ساتھ ان مذکورہ علماء کو رہائی نہیں دی اس لئے کہ یہ بڑے ذی حوصلہ، اولوالعزم اور سرگرم لوگ تھے۔ (۲)

(۱) جنگ کے بعد ہی شجاع الدولہ کو بیماری لاحق ہوگئی تھی اور اس کے چند مہینوں بعد اسی سال ان کا انتقال ہوا۔ گویا اللہ نے روہیلکھنڈ کو لوٹنے کا بہت جلد بدلہ دیا، آصف الدولہ ان کے جانشین ہوئے۔

(۲) ملاحظہ ہو اخبار الصنادید اول صفحہ ۵۶۴

تیسری فصل

فدائے وطن سراج الدولہ

بنگال کی سیاست پر ایک نظر

بنگال سلطنت مغلیہ کا سب سے آباد اور خوش حال صوبہ تھا۔ اورنگ زیب کے اخیر زمانہ میں (۱۷۰۴ء) مرشد قلی خاں بنگال کا صوبہ دار بنایا گیا۔ اس نے بڑی قابلیت سے بنگال کا بندوبست کیا اور مرشد آباد کے نام سے اپنے نام پر ایک عظیم شہر آباد کیا۔ آبادی اور دولت مندی میں اس شہر نے جتنی تیز حیرت انگیز ترقی کی اس نے فرنگی تاجروں کی حرص و آزر میں اور اضافہ کیا۔ وہ رشک و رقابت سے اس پر نظر ڈالنے لگے۔ مرشد قلی خاں کے چند سال بعد کلائیو (۱) یہاں آیا۔ وہ اپنے ایک خط میں لکھتا ہے کہ شہر (مرشد آباد) لندن کے برابر وسیع ہے۔ فرق ہے تو اتنا کہ لندن میں اتنے دولت مند لکھ پتی نہیں جتنے مرشد آباد میں آباد ہیں۔ (۲)

مرشد قلی خان (۱۷۰۴ء- ۱۷۲۵ء) بڑا دوربین تھا۔ اس نے فرنگیوں پر کڑی نگرانی رکھی۔ فرنگی تاجروں نے بھاری رشوتیں دے کر دربار میں تقرب حاصل کرنے کی کوشش کی، مگر ناکام رہے۔ جب مغل بادشاہ فرخ سیر نے انگریزی کمپنی کو تجارتی مراعات کے ساتھ یہ بھی اجازت دی کہ وہ کلکتہ کے آس پاس اڑتیں گاؤں خرید سکتی ہے۔ مرشد قلی خاں نے زمینداروں کو سمجھا دیا کہ کسی قیمت پر زمین فروخت نہ کریں۔ چنانچہ شاہی فرمان کمپنی کی قیمتی دستاویزوں میں دھرا رہ گیا۔ (۳)

مرشد قلی خاں کے بعد اس کا داماد شجاع الدین خاں (۱۷۲۵ء- ۱۷۳۹ء) شجاع الدولہ کے نام سے بنگال کا حاکم بنا۔ چونکہ یہ پہلے اڑیسہ کا صوبہ دار تھا اس لئے اس کے

(۱) اس کا ذکر آگے آرہا ہے

(۲) ملاحظہ ہو تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت جلد دوم صفحہ ۶۶۔

(۳) ایضاً صفحہ ۶۷۔

زمانہ میں یہ بھی حکومت بنگال میں شامل ہوگیا۔اسی کے آس پاس بہار کا صوبہ دار دربار دہلی کا معتوب ہوا اور یہ صوبہ بھی بنگال کے ماتحت کر دیا گیا۔

علی وردی خاں

اس کے بعد اس کا بیٹا سرفراز خاں (۱۷۳۹ء-۱۷۴۰ء) صوبہ دار ہوا۔اس نے دہلی میں نادرشاہی حملہ سے خوف زدہ ہوکر بنگال میں نادرشاہ کا خطبہ اور سکہ جاری کر دیا۔اس پر علی وردی خاں نے جو پہلے بہار کا نائب صوبہ دار تھا، سرفراز خاں پر بے وفائی اور غداری کا الزام لگایا اور اپنی خیر خواہی کے ثبوت میں شاہ دہلی کو گراں بہا نذرانے پیش کئے۔اور بنگال کی صوبہ داری کا فرمان حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔سرفراز سرنگوں ہوا اور علی وردی خاں نے بڑے طمطراق کے ساتھ اپنی مسند بچھائی۔ یہ بہت ہوش مند اور سیاست کے داؤں پیچ سے واقف تھا۔تادم آخر بنگال کو فرنگیوں سے بچاتا اور اپنی انگلیوں پر نچاتا رہا۔تجارت سے ایک قدم آگے بڑھنے نہیں دیا۔تجارتی کوٹھیوں کے گرد فصیل اور دمدمے بنانے کی اجازت نہیں دی۔کئی دفعہ انھوں نے مرہٹہ حملوں سے حفاظت کے بہانے جنگی عمارتیں اٹھائیں مگر نواب نے خبر ملتے ہی تڑوادیں۔سولہ برس بڑی ہوشیاری اور بیدار مغزی سے حکومت کرنے کے بعد ۱۷۵۶ء میں اس نے انتقال کیا۔

سراج الدولہ کی جانشینی اور علی وردی خاں کی اس کو وصیت

اس نے اپنے نواسے سراج الدولہ کو اپنا جانشین بنایا۔بستر مرگ پر اس نے سراج الدولہ کو جو آخری وصیت کی تھی اس سے اس کی ذہانت، بالغ نظری، وطن دوستی اور انگریزوں کے خطرہ سے آگاہی کا پتہ چلتا ہے۔

ہال ویل کی روایت ہے کہ علی وردی خان نے بستر مرگ پر سراج الدولہ کو یہ وصیت کی تھی:

> ''فرنگی اقوام نے جو طاقت ملک میں پیدا کر لی ہے اس کا ہمیشہ دھیان رکھنا۔اگر خدا مجھے کچھ اور زندہ رہنے کی اجازت دیتا تو میں تمہاری یہ فکر

بھی دور کر دیتا۔ بیٹا! اب یہ کام تمھیں سنبھالنا ہے اگر پدر نتواند پسر تمام کند...... بیٹا! انھیں قلعہ بندی کرنے یا فوج رکھنے کی کبھی اجازت نہ دینا۔ اگر ایسا کیا تو ملک گیا۔" (۱)

علماء کی ہمنوائی

علی وردی خاں نے ہر حیثیت سے ترقی یافتہ ایک وسیع صوبہ کی شکل میں بنگال سراج الدولہ کے حوالہ کیا تھا۔ علی وردی خاں دین پسند اور علم دوست شخص تھا۔ اس نے علم و دین کی ترویج کے لئے ہندوستان کے مشہور و مستند علماء کو بنگال میں آباد کیا تھا۔ (۲)

علی وردی خاں کے بعد وہ سراج الدولہ کیساتھ تھے۔ اور اسکے منصوبوں میں شریک۔ انگریزوں کے بے دخل کرنے کی تدبیریں سوچتے اور نواب کو مشورے دیتے۔ اسی وجہ سے انگریز انکی طرف سے خائف تھے۔ اور ان پر ڈورے ڈالنے کی کوشش میں رہتے تھے۔

قاضی واجد کا کارنامہ

خود انگریزوں نے صراحت سے یہ واقعہ لکھا ہے کہ جب کرنل اسکاٹ نے ہگلی کے قاضی واجد کو پھانسنے کی کوشش کی اور ان کو اپنے ساتھ ملانا چاہا تو وہ کامیاب نہ ہوسکا۔ اور انھوں نے نواب سے سارا حال کہہ سنایا۔ اور کرنل کی آمد کی اطلاع دی۔ (۳)

اسی کے بعد سراج الدولہ نے بڑے پیمانہ پر جنگی تیاریاں شروع کی تھیں اور پلاسی کا واقعہ پیش آیا تھا۔

جنگ پلاسی

قاضی واجد جیسے باحمیت اور وطن دوست لوگوں کو پھانسنے میں ناکامی ہوئی تو وہ مایوس نہیں ہوئے کہ یہاں بے وفاؤں اور غداروں کی کمی نہیں، ابھی جال ڈالو ابھی شکار ہاتھ آتا ہے۔ چنانچہ پورے بنگال میں انھوں نے سازش کا جال بچھا دیا۔ نواب کے بہت سے قریبی رشتہ دار اور وزراء بآسانی اس میں پھنس کر انگریزوں کے آلہ کار

(۱) سراج الدولہ صفحہ ۱۴۶۔۱۴۷۔

(۲) اس وقت بنگال میں آباد علماء و مشائخ کے لئے ملاحظہ ہو سیر المتاخرین جلد دوم صفحہ ۶۱۱۔۶۲۰۔

(۳) سراج الدولہ صفحہ ۱۴۵۔

بنے۔ میر جعفر تو غداری اور وطن فروشی میں ضرب المثل بن گیا ہے۔ یہ نواب کا پھوپھا اور اس کا وزیر تھا۔

انگریزوں نے ایک طرف تو یہ سازشیں جاری رکھیں اور دوسری طرف اسلحہ جمع کرنا شروع کیا۔ چار جنگی جہاز گولہ بارود سے بھرے لندن سے پہنچے۔ (۱)

پھر جنرل ڈریک جس نے پہلے معرکہ میں سراج الدولہ سے شکست کھا کر ارکاٹ کا رخ کیا تھا۔ وہاں موجود کمپنی کی ساری فوج لے کر دوبارہ بنگال کے ساحل پر نمودار ہوا۔ جنرل کلائیو اسی کے ساتھ ارکاٹ سے آیا تھا۔ جو وہاں قلعہ کا محافظ تھا۔ یہاں آ کر اس نے برّی فوج کی قیادت سنبھالی۔ اگرچہ انگریزی فوج کی تعداد صرف تین ہزار تھی مگر تنظیم آخری درجہ کی تھی۔ اور ادھر سراج الدولہ کی فوج ستر ہزار کے قریب تھی (۲)۔ جو ایک بھیڑ کے علاوہ کچھ نہ تھی۔ ناتجربہ کار اور سازشوں کی شکار۔ اس لئے جب حملہ شروع ہوا تو سراج الدولہ کی فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ ایک طرف انگریزی فوج توپ کے گولے سر کر رہی تھی تو دوسری طرف بندوق کی باڑھ پر باڑھ مارے جاتی تھی۔ بقول طباطبائی بندوق کی گولیاں اولوں کی طرح سراج الدولہ کی فوج پر برس رہی تھیں۔ (۳)

کہر کی وجہ سے انگریز اس وقت سراج الدولہ پر قابو نہ پا سکے۔ وہ جان بچا کر مرشد آباد پہنچا۔ مگر جلد ہی میر جعفر جیسے غداروں کی سازش سے دوبارہ معرکہ آرائی ہوئی۔ سراج الدولہ گرفتار ہوا۔ اور بڑی بے بسی سے جان دی۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہی مرشد آباد جہاں کبھی اس کی سواریاں قطار در قطار شاہانہ ٹھاٹ کے ساتھ نکلا کرتی تھیں آج وہیں اس کی لاش ہاتھی کے ہودج میں ڈال کر بطور تشہیر پھرائی گئی۔

یہ واقعہ ۱۵/شوال ۱۱۷۰ھ مطابق ۲۲/ جون ۱۷۵۷ء کا ہے۔ (۴)

---

(۱) تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت جلد دوم صفحہ ۲۷۔

(۲) سید طفیل احمد منگلوری نے لکھا ہے کہ چالیس ہزار پیادے اور پندرہ ہزار سوار تھے۔ (مسلمانوں کا روشن مستقبل صفحہ ۱۷ مطبوعہ لاہور)

(۳) سیر المتاخرین جلد دوم صفحہ ۶۴۴۔

(۴) جنگ کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو سیر المتاخرین جلد دوم صفحہ ۶۴۴-۶۴۱۔ نیز تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت جلد دوم صفحہ ۲۷-۲۷۔

فتح کے بعد جو دولت انگریزوں کے ہاتھ آئی۔اس کا اندازہ کرنے کے لئے کلایؤ کے سوانح نگار میکالے کا درج ذیل بیان کافی ہے۔

کمپنی اور اس کے نوکروں پر دولت کی موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔اسی لاکھ روپیہ دریا کے راستہ سے مرشد آباد سے کلکتہ روانہ کر دیا گیا۔سو سے زیادہ کشتیاں تھیں۔جھنڈیاں اڑ رہی تھیں۔باجہ بجتا تھا۔چند ماہ پہلے جو کلکتہ ویران تھا۔آج ایسا خوشحال ہوگیا کہ کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا۔تجارت چمک اٹھی۔ہر انگریز کے گھر میں دولت کے آثار دکھائی دینے لگے۔(۱)

پلاسی کے بعد

سراج الدولہ کو شکست دینے کے بعد انگریزوں نے میر جعفر کو اس کی خدمات کے صلہ میں بنگال کا نواب بنا دیا۔میر جعفر کو لوگ علانیہ ''کلائیو کا گدھا'' کہتے تھے۔تین سال بعد ۱۷۶۰ء میں میر جعفر کو نااہلی کے الزام میں جبراً معزول کر کے اس کے داماد میر قاسم کو اس کا جانشین بنایا گیا۔اور اس کے بدلے بڑی بھاری رشوت لی گئی۔(۲) وہ میر جعفر کی طرح نہیں تھا کہ انگریز گماشتے جب چاہیں اس سے روپیہ اینٹھ لیں۔اس کی انتظامی قابلیت کو قریب قریب تمام مؤرخین نے سراہا ہے۔کمپنی کے ملازمین اپنے تجارتی مال کو محصول راہ داری سے مستثنیٰ کرنا چاہتے تھے۔نواب پر اس کے لئے زور ڈالا گیا تو اس نے ان کی یہ شرط قبول تو کر لی مگر دیسی تاجروں کو بھی یہ رعایت دی۔اس سے انگریز

---

(۱) مسلمانوں کا روشن مستقبل صفحہ ۷۲۔

(۲) کمپنی نے رشوت ستانی کے لئے بنگال کی نوابی کے ساتھ جو کھیل کھیلا اس سے اس کی طبیعت کا اندازہ لگا سکتے۔

۱۷۵۷ء میں میر جعفر کی تخت نشینی پر	۳،۰۶،۱۰،۷۵۰ روپیہ
۱۷۶۰ء میں میر قاسم کی تخت نشینی پر	۲۶،۲۷،۶۹۰ روپیہ
۱۷۶۳ء میں میر جعفر کی دوبارہ تخت نشینی پر	۱،۴۱،۸۴،۹۹۰ روپیہ
۱۷۶۵ء میں نجم الدولہ کی تخت نشینی پر	۱۹،۷۶،۹۰۰ روپیہ
مجموعی رقم	۴،۹۴،۰۰،۳۳۰ روپیہ

(ملاحظہ ہو مسلمانوں کا روشن مستقبل صفحہ ۷۹)

برہم ہوئے اور جنگ کی ٹھانی۔ اور ۱۷۶۳ء میں اس کو معزول کر کے پھر میر جعفر کو نواب بنایا گیا۔ میر قاسم پہلے ہی کلکتہ کی یورشوں سے بچنے کے لئے مرشد آباد چھوڑ کر مونگیر چلا آیا تھا۔ یہاں انگریزوں سے کئی لڑائیاں ہوئیں۔ شروع میں تو کچھ فتوحات ہوئیں، مگر اس کے ساتھیوں نے ساتھ چھوڑنا شروع کیا۔ اخیر میں اس کا ممتاز معتمد علی نجف خاں بھی انگریزوں سے مل گیا بالآخر انگریزوں کو فتح ہوئی۔

بکسر کی لڑائی

میر قاسم اب بہار سے ہٹ کر اودھ چلا آیا کہ نواب اودھ شجاع الدولہ (۱۷۵۴ء-۱۷۷۵ء) کی اعانت سے مغل بادشاہ شاہ عالم (جو ان دنوں دہلی چھوڑ کر نواب اودھ کی پناہ میں آیا ہوا تھا) کو ساتھ لے کر انگریزوں پر جم کر حملہ کرے۔ دونوں دولت اور جمعیت کی کثرت دیکھ کر اس کی اعانت پر تیار ہوئے۔ لیکن آگے چل کر نواب اودھ نے بے وفائی کی اور میر قاسم کو نظر بند کر دیا اور اس کی فوج اور بادشاہ کو ساتھ لے کر انگریزوں سے لڑنے چلا۔ بکسر (مغربی بہار کے کنارے پٹنہ کے قریب معروف مقام ہے) کے مقام پر ۲۲/ اکتوبر ۱۷۶۴ء کو انگریزوں سے زبردست جنگ ہوئی، جسے انگریز مؤرخ ''پلاسی کا تکملہ'' بتاتے ہیں۔ نتیجتاً شاہ عالم کو شکست ہوئی (۱) اور بنگال سے اودھ تک انگریزوں کی حکومت مستحکم ہوگئی۔

بنگال کی دیوانی کمپنی کے نام

اگلے سال ۱۷۶۵ء میں شاہ عالم سے بنگال کی دیوانی بھی کمپنی نے اپنے نام لکھوالی۔ اس کے لئے کلائیو الہ آباد آیا۔ جہاں شاہ عالم، شجاع الدولہ کے ساتھ تھا۔ چوں کہ بادشاہ اور شجاع الدولہ دونوں انگریزوں کے سامنے بالکل بے بس تھے اس لئے چاروناچار کلائیو کی خواہش کے مطابق سند دیوانی تحریر کر دی گئی۔ اور اس کا ٹھیکہ

---

(۱) حالاں کہ انگریزی فوج کی تعداد صرف سات ہزار اور ہندوستانی فوج کی تعداد پچاس ہزار تھی۔ جنگ کی تفصیلات تاریخ کی سب کتابوں میں موجود ہیں۔ طباطبائی نے بڑی تفصیل سے اس کو لکھا ہے۔

سالانہ ۲۶ لاکھ روپیہ قرار پایا۔ طباطبائی نے لکھا ہے کہ اتنا عظیم معاملہ بغیر کسی عذر خواہی، چوں و چرا اور بدون لیت و لعل کے نہایت آسانی سے انجام پایا۔ کسی بار بردار گدھے اور چوپائے کی خریداری بھی اتنی جلدی بغیر کسی ردوکد اور تکرار کے طے نہیں ہوتی۔ جتنی جلدی اور جس سہولت سے یہ اتنا بڑا معاملہ طے پا کر ختم ہو گیا۔(۱)

اس معاہدہ کو ''عہد نامہ الہ آباد'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ انگریزوں کو صوبہ بنگال کی دیوانی کے علاوہ چند اضلاع جن میں دکن کی شمالی سرکاریں بھی شامل تھیں۔ جاگیر میں دیئے گئے۔ الہ آباد اور کوڑہ جہاں کے اضلاع بادشاہ کی جاگیر خالصہ تسلیم کئے گئے۔(۲)

مغلیہ سلطنت کی حالت

اس کے بعد مغلیہ سلطنت کی کیا حالت ہوئی اور مغل شاہی دربار کی کیا کیفیت رہی۔ منشی ذکاء اللہ اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اب خاندان تیمور کے بادشاہ کے پاس ملک میں صرف صوبہ الہ آباد تھا۔ اور آمدنی میں وہ روپیہ جو انگریز اس کو دیتے تھے۔ دربار کی یہ کیفیت تھی کہ پرانے پرانے سردار اس امید میں حاضر ہوتے تھے کہ شاید بادشاہ کے بھلے دن آئیں۔ بادشاہ بھی ان کی خاطر بہت کرتا تھا۔ انگریزی جرنیل کرنیل بھی موجود رہتے تھے۔ اور ملکی معاملات میں صلاح و مشورہ دیتے تھے۔(۳)

---

(۱) سیر المتاخرین جلد دوم صفحہ ۷۷۴۔

(۲) تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت جلد دوم صفحہ ۶۱۔

(۳) تاریخ ہندوستان جلد نہم صفحہ ۳۱۴-۳۱۵۔

چوتھی فصل

شہید حریت سلطان ٹیپو

انگریزوں نے مشرقی وشمالی ریاستوں پر اپنے بڑھتے اثرات دیکھ کر اطمینان کی سانس لی بھی نہیں تھی کہ جنوبی ہند کے دور دراز علاقہ سے ایک ایسی طاقت ابھری جس نے ان کے قدم ڈگمگا دیئے۔ اور جس سے ان کے عزائم کو زبردست جھٹکا لگا۔ یہ میسور کی سلطنت خداداد کی طاقت تھی جس کے ''ہیرو'' حیدر علی اور ٹیپو سلطان تھے۔

حیدر علی

حیدر علی نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز میسور کے ہندو راجا کی فوج میں معمولی سپاہی کی حیثیت سے کیا۔ مگر اپنی بہادری اور خداداد قابلیت کی بدولت جلد ہی ترقی کر کے سپہ سالار بن گیا۔ اس کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے راجہ اور اس کے مصاحبین گھبرا اٹھے۔ اور اس کے قتل کی سازش کرنے لگے۔ حیدر علی نے اس کو محسوس کیا تو بڑھ کر میسور کے تخت پر قبضہ کرلیا۔ یہ ۱۷۶۱ء کا واقعہ ہے۔ (۱)

حیدر علی نے جس وقت اقتدار اپنے ہاتھ میں لیا، اس کو ہر طرف سے مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک طرف اندرون ملک کی طاقتیں مرہٹہ اور نظام دکن اس سے برسر پیکار تھے تو دوسری طرف انگریز اس کا چراغ گل کرنے کی تدبیریں کر رہے تھے۔ چنانچہ اس کو انگریزوں سے ۱۷۶۷ء سے ۱۷۶۹ء تک جنگ لڑنی پڑی جو میسور کی پہلی جنگ کے نام سے مشہور ہے اور ۱۷۸۰ء میں میسور کی دوسری جنگ پیش آئی جو ۱۷۸۴ء تک جاری رہی۔ اثنائے جنگ ۱۷۸۲ء میں اچانک حیدر علی کا انتقال ہوا اور اس

(۱) وہ کیا صورت حال تھی جس میں حیدر علی نے اقتدار پر قبضہ کیا اور وہ کیا اسباب ومحرکات تھے جس نے اس کو اس پر مجبور کیا اور اس کا جواز فراہم کیا۔ تفصیل کے لئے دیکھئے تاریخ سلطنت خداداد صفحہ ۶۱۔ ۶۹۔ نیز سیرت سلطان ٹیپو شہید صفحہ ۱۰۹ تا ۱۱۵۔

کا فرزند ارجمند سلطان ٹیپو اس کا جانشین ہوا۔

حیدر علی کی غیر متوقع وفات نے انگریزوں کے اکھڑتے قدم جما دیئے۔ خود انگریز مؤرخین نے اس کا اعتراف کیا ہے۔(۱)

وہ اکثر اپنے دوستوں سے کہا کرتے تھا کہ اگر خدا مجھے توفیق دے تو میں اپنے وطن کو مشرک فرنگیوں سے پاک کر کے دم لوں گا۔(۲)

ٹیپو سلطان پر ایک طائرانہ نظر

فتح علی سلطان ٹیپو نے ۱۱۶۳ھ مطابق ۱۷۵۰ء میں آنکھیں کھولیں۔ بچپن ہی سے جوہر کھلنے لگے۔ سلطان مختلف کمالات کا جامع اور متنوع صفات کا حامل تھا۔ اس کی شجاعت و بہادری ضرب المثل بن چکی ہے۔ ٹیپو سلطان کے تصور ہی سے بہادری کا مجسم پیکر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ فنون حربیہ میں اس کا کمال ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ اس سب کے ساتھ اس نے علوم دینیہ میں بھی مہارت بہم پہنچائی۔ قرآن وحدیث اور فقہ کی تعلیم ماہر اساتذہ سے حاصل کی (۳) نیز زبانوں میں عربی، فارسی، اردو، کنڑ کے علاوہ انگریزی اور فرانسیسی سے بھی بقدر ضرورت واقفیت تھی۔(۴)

---

(۱) دیکھئے تاریخ سلطنت خداداد، صفحہ ۱۵۶-۱۵۷۔

(۲) سیرت سلطان ٹیپو شہید صفحہ ۱۵۔

(۳) اس حیثیت سے سلطان کا شمار طبقۂ علماء میں ہوتا ہے اس لئے اگر ہم ٹیپو کے (آزادی سے متعلق) کارناموں کے سلسلہ میں دراز نفسی سے کام لیں تو محل تعجب نہیں ہونا چاہئے۔ تاہم انگریزی اردو میں ٹیپو پر بہت تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ اس لئے یہاں ضروری تفصیلات ہی پر اکتفا کیا جائے گا۔

(۴) پروفیسر محب الحسن لکھتے ہیں: وہ ایک تربیت یافتہ دماغ کا مالک، بہت سے علوم سے واقف اور تمام موضوعات پر گفتگو کرنے کا اہل تھا۔ کنڑ اور ہندوستانی بول سکتا تھا۔ لیکن گفتگو عموماً فارسی میں کرتا تھا۔ اور اس زبان میں وہ روانی سے لکھ بھی سکتا تھا۔ سائنس، طب، موسیقی، نجوم اور انجینئرنگ سے بھی اسے دلچسپی تھی، لیکن مذہب اور تصوف اس کے خاص موضوعات تھے۔ شعراء اور علماء اس کے دربار کی زینت تھے۔ ان کے ساتھ مختلف موضوعات پر گفتگو کیا کرتا۔ خطاطی سے بھی اسے گہرا شغف تھا۔ رسالہ درطرز خط محمدی کے نام سے ایک فارسی کتاب بھی ملتی ہے جس میں خطاطی سے متعلق خود اس کے وضع کردہ اصول درج ہیں۔ علم نجوم پر بھی اس نے ایک کتاب زبرجد کے نام تصنیف کی تھی۔ ان کتابوں کے علاوہ تصوف، موسیقی، تاریخ، طب، فن حرب، قانون ==

ٹیپو غیر ملکی اقتدار کے لئے چیلنج

اس میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں کہ سلطان ٹیپو روح جہاد، جذبہ آزادی، وطن دوستی، اپنی مذہبیت اور اسلامی حمیت کی وجہ سے انگریزوں کی راہ کا سب سے پر خطر روڑا تھا۔ اپنے مقاصد کی تکمیل میں وہ اس کو سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے۔ سامراجیت کی پوری تاریخ میں انھوں نے ٹیپو سے زیادہ خطرناک رنگ میں کسی کو پیش نہیں کیا۔ اور نہ کسی سے اتنی نفرت و ہیبت کا اظہار کیا۔ اس کی موجودگی میں وہ نہ اپنا کوئی تجارتی فائدہ حاصل کر سکتے تھے نہ سیاسی مقصد پورا کر سکتے تھے، اور نہ تبلیغی مشن میں کامیاب ہو سکتے تھے۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی تحریر فرماتے ہیں :

ہندوستان کی تاریخ ٹیپو سلطان سے زیادہ بلند ہمت، بالغ نظر، مذہب و وطن کے فدائی اور غیر ملکی اقتدار کے دشمن سے آشنا نہیں۔ انگریزوں کے لئے ٹیپو سلطان سے زیادہ مہیب اور قابل نفرت شخصیت کوئی نہ تھی۔ بہت عرصہ تک (اور وہ زمانہ ہم نے بھی دیکھا ہے) وہ اپنے دل کی آگ بجھانے اور آزادی و جہاد کے اس ہیرو کی تذلیل و توہین کے لئے اپنے کتوں کو سلطان ٹیپو کے نام سے پکارتے تھے۔ (۱)

میسور کی تیسری جنگ سے پیشتر جب ٹیپو کے خلاف فضا بنائی جا چکی تھی۔ اور مرہٹہ و نظام کو اس سے لڑنے پر آمادہ کیا جا چکا تھا، گورنر جنرل کارنوالس نے مدراس کے گورنر میڈوز کو جو خط لکھا وہ اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ انگریز ٹیپو سے کس درجہ خائف

== اور حدیث کے موضوعات پر کم سے کم پینتالیس کتابیں اس کی سرپرستی میں تصنیف یا دوسری زبانوں سے ترجمہ کی گئی تھیں۔ اس کے پاس ایک نہایت بیش قیمت کتب خانہ تھا۔ جسمیں موسیقی، حدیث، فقہ، تصوف، ہندومت، تاریخ، فلسفہ، طب، صرف ونحو، نجوم، حربیات، شاعری اور ریاضی کے دو ہزار عربی، فارسی، ترکی، اردو اور ہندی مخطوطات تھے۔ (تاریخ ٹیپو سلطان صفحہ ۵۱۶) تفصیل کے لئے مولانا محمد الیاس ندوی کی کتاب ملاحظہ ہو، انھوں نے ایک پورا باب ٹیپو بحیثیت عالم وعلم دوست صفحہ ۴۷۶-۵۱۲۔ اس کے لئے مخصوص کیا ہے۔

(۱) سیرت سلطان ٹیپو شہیدؒ: مقدمہ صفحہ ۱۵-۱۶۔ یہاں تک کہ ان سے مرعوب ہو کر بعض ہندوستانی بھی اس خسیس حرکت کا ارتکاب کرتے تھے۔ بقول باری شمالی ہندوستان میں بعض بزدل کمینے اور ذلیل انسان اپنے کتوں کا نام ٹیپور کھتے ہیں۔ وہ خود کتوں سے زیادہ ذلیل ہیں۔ (کمپنی کی حکومت صفحہ ۲۳۹)

تھے۔ اس نے لکھا تھا :

''اس ملک میں اپنی شہرت اور عزت قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم ٹیپو سلطان سے نبرد آزما ہوں...... اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ہمیں نہ صرف ٹیپو کے خلاف لڑنا چاہیئے بلکہ اس کی طاقت کو ہمیشہ کے لئے مٹا دینا چاہیئے۔ موجودہ وقت سے بہتر کوئی وقت نہیں ہوسکتا۔ ملک کی دوسری طاقتیں ہماری امداد پر ہیں۔ اگر ٹیپو سلطان کو اس طرح چھوڑ دیا جائے اور فرانس اس قابل ہو جائے کہ ٹیپو کی مدد کر سکے تو اس صورت میں ہمیں ہندوستان کو خیر باد کہنا پڑے گا۔'' (۱)

ارتھر ولزلی جو آگے چل کر ڈیوک آف ولزلی بنا۔ ۱۷۹۶ء کے اواخر میں ہندوستان پہنچا۔ ٹیپو کی ہیبت کے متعلق لکھتا ہے :

''جب سے میں آیا ہوں۔ دیکھ رہا ہوں کہ ٹیپو انگریزوں کے لئے مستقل ہوّا بنا ہوا ہے۔ اور جب وہ کسی خوف کے بیان میں رنگ آمیزی کرنا چاہتے ہیں تو وہ یہ دریافت کر لیتے ہیں کہ ٹیپو کی فوج چل پڑی ہے۔'' (۲)

انگریزوں کے دلوں میں ہندوستان سے انگلستان تک ٹیپو سلطان کی جو دہشت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا اندازہ کرنے کے لئے یہی کافی ہے کہ انگلستان میں انگریزی مائیں اپنے بچوں کو ٹیپو کے نام سے ڈراتی تھیں۔ (۳)

آزادی وطن کا جذبہ اور وسیع منصوبہ

سلطان ٹیپو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں وطن کی آزادی مقصد زیست سمجھتا تھا۔ جب شہزادہ تھا اس وقت بھی اس کے یہی جذبات تھے۔ اور جب حاکم بااختیار کی حیثیت سے تخت نشین ہوا تو کھل کر انگریزوں کے سب سے بڑے حریف کی حیثیت

(۱) کمپنی کی حکومت صفحہ ۲۵۰۔
(۲) تاریخ ٹیپو سلطان صفحہ ۳۸۶۔
(۳) ملاحظہ ہو صحیفۂ ٹیپو سلطان صفحہ ۲۱۹۔

سے سامنے آیا۔

اس نے ۱۷۸۲ء میں تخت نشین ہونے کے بعد اپنے دربار میں سب سے پہلی جو تقریر کی، اس سے اس کے جذبات کی صحیح عکاسی ہوتی ہے۔اس نے کہا :

> ''میں ایک حقیر انسان ہوں۔میری حکومت اور وجاہت بھی مٹنے والی ہے۔میری زندگی بھی ناقابل اعتبار ہے۔تاہم میرا فرض ہے کہ جب تک زندہ رہوں۔وطن کی حفاظت اور آزادی کے لئے جہاد کرتا رہوں۔ہزاروں آدمی وطن کے لئے موت کے گھاٹ اتر سکتے ہیں۔لیکن حب وطن کے جذبات کبھی نہیں مٹ سکتے۔''

ایک امیر اعتمادالملک کا بیان ہے کہ سلطان پر اس وقت وجد طاری تھا اور وہ جھوم جھوم کر کہتے تھے :

> ''اے میرے پیارے ہندوستان ،میری محبت اور میرا دل تیرے لئے ہے۔میری حیات اور میرا وجود تیرے لئے ہے۔میرا خون اور میری جان تیرے لئے ہے۔''(۱)

اس طرح اس نے عنان حکومت سنبھالتے ہی رعایا کی معاشی وسیاسی ترقی، دینی واخلاقی اصلاح کی فکر کے ساتھ خاص طور پر جس چیز کا منصوبہ بنایا وہ ملک کی آزادی تھی۔اس نے طے کیا کہ انگریز جو ہندوستان پر چھائے جا رہے تھے، ان کے استیصال کے لئے ہندوستان کے تمام باشندوں کو متحد کرے اور ملک کے دفاع کو مضبوط کرنے کے لئے دیگر اقوام مشرق سے مدد لے اور ملک کو بچانے کے لئے پردیسی مال کی برآمد پر پابندی لگا کر دیسی مصنوعات اور ملکی تجارت کو فروغ دے۔(۲)

سلطان نے ایک ایک منصوبہ پر عمل کر کے دکھایا۔

سلطان کے بیشتر خطوط سے اس کے جذبۂ آزادی اور غیرت ایمانی پر روشنی پڑتی

---

(۱) شیر میسور از قیصر مصطفیٰ صفحہ۴ بحوالہ خورشید مصطفیٰ رضوی شیر ہندوستان صفحہ ۴۶

(۲) ملاحظہ ہو مسلم دیلوری، سلطان جمہور، صفحہ۴۳-۴۴-انہوں نے سلطان کے ابتدائی منصوبوں کا اچھا تجزیہ کیا ہے۔

ہے۔ایک خط میں لکھتا ہے :

"میرا مصمم ارادہ ہے کہ ان لوگوں کی سرزنش کروں جو مسلمانوں کو مسجدوں میں اذان دینے سے منع کرتے ہیں اور جو کافروں میں سب سے زیادہ سخت اور ناقابل رواداری ہیں۔اس لئے آں جناب سے توقع ہے کہ جاں بازان اسلام کی فتح کی دعا مانگیں گے۔تا کہ یہ بدعقیدہ لوگ تباہ ہو جائیں اور دین محمدی سرسبز ہو۔" (۱)

جذبۂ حب الوطنی اور غیرت ایمانی کی آخری مثال یہ ہے کہ صلح سرنگا پٹنم سے شہادت تک اس نے چارپائی پر سونا چھوڑ دیا تھا۔اور ایک موٹے کھدر کے کپڑے پر زمین پر سوتا تھا۔ (۲)

ملکی فرمانرواؤں اور راجاؤں سے رابطہ

سلطان نے عنان حکومت سنبھالنے کے ساتھ ہی اس کا آغاز کیا۔اس کو سب سے زیادہ خطرہ پڑوسی حکمرانوں نظام حیدرآباد اور مرہٹوں سے تھا۔یہ دونوں ہمیشہ سے حیدرعلی کی مخالفت کرتے آئے تھے۔اور حیدرعلی اور انگریزوں کی جنگ میں انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔اس لئے جاری جنگ سے فرصت ملتے ہی جشن فتح اور مراسم جاں نشینی کی ادائیگی کے دوران ہی اس نے مرہٹوں اور نظام دونوں کو ملک کی حفاظت اور آزادی کے لئے متحد ہونے اور نظام سے بالخصوص اتحاد اسلامی کا حوالہ دے کر انگریزوں سے تعاون نہ کرنے کی اپیل کرتے ہوئے خطوط لکھے۔اور اتحاد و یگانگت پیدا کرنے کے لئے قیمتی تحائف بھیجے۔ (۳)

(۱) صحیفہ ٹیپو سلطان صفحہ ۴۴۸۔کرک پیٹرک اس خط پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ سلطان نے اس مضمون کے خط بہت سے رئیسوں کو لکھے تھے۔جن میں شاہ عالم اور محمد بیگ خاں ہمدانی بھی ہیں۔اور اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹیپو انگریزوں کو ملک سے نکالنے پر تلا ہوا تھا۔ (ایضاً)
یہ خط کئی اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے۔جہاں اس سے سلطان کی انگریزوں سے نفرت اور جذبۂ آزادی پر روشنی پڑتی ہے وہیں اس کی ایمانی غیرت کا بھی اس سے پتہ چلتا ہے۔تیسری طرف انگریزوں کے بعض مظالم کا بھی علم ہوتا ہے۔

(۲) صحیفہ ٹیپو سلطان صفحہ ۴۵۷۔

(۳) ملاحظہ ہو سیرت سلطان ٹیپو شہید صفحہ ۱۹۶۔۱۹۷۔

ایک طرف یہ ہو رہا تھا مگر دوسری طرف نظام اور مرہٹہ، ٹیپو کی طاقت سے گھبرا کر اس کے خلاف سازش کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ انگریزوں اور ٹیپو کے معاہدہ منگلور (۱) کے چند دنوں کے بعد ہی ۱۸/ مارچ ۸۴ ۱۷ء کو ٹیپو کے خلاف ایک معاہدہ کیا۔ اس نے دونوں کے پاس سفارتیں بھیجیں۔ اور اس کے ساتھ مل کر غیر ملکی دشمن کے خلاف جنگ پر آمادہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ مرہٹہ سردار نانا فرنویس کو لکھا کہ میں نے مرہٹوں کے لئے انگریزوں سے لڑائی مول لی ہے اور جانی و مالی نقصان اٹھایا ہے، اس لئے میرے خلاف محاذ قائم کرنے کے بجائے انگریزوں کے خلاف جنگ کا منصوبہ بنانا چاہیئے۔ نظام کو لکھا کہ مسلمانوں کی فلاح کیلئے ہمیں ماضی کے اختلافات کو فراموش کر کے مشترک دشمن کے مقابلہ کے لئے متحد ہونا چاہیئے (۲)۔ نظام کی حمیت اسلامی کو للکارا، غیرت ایمانی کو جھنجھوڑا، اسلامی اخوت کا حوالہ دیا، اتحاد قائم کرنے کے لئے دونوں خاندانوں کے مابین نکاح کی پیش کش کی۔ مگر اس نے ایک نہ سنی۔ کسی بات کا اس پر اثر نہ ہوا۔ جیسے دل پر زنگ لگ گیا ہو۔ اور مرہٹوں سے مل کر سلطنت خداداد پر فوج کشی کی، مگر منہ کی کھائی۔ سلطان نے مرہٹہ نظام اتحاد کو شکست فاش دی۔ اس سے بھی انھوں نے سبق نہیں لیا۔ اس کے بعد بھی سلطان نے ان سے اتحاد کی کوشش کی مگر وائے حسرت اس کی ساری کوششیں بے نتیجہ ثابت ہوئیں۔ ایل بی بورنگ نے صراحت سے لکھا ہے کہ ٹیپو نے نظام اور مرہٹوں کو انگریزوں سے الگ کرنے کی کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ (۳)

ٹیپو سلطان نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور شہنشاہ ہندوستان شاہ عالم کی خدمت میں ایک عریضہ لکھا۔ جس میں تحریر کیا کہ

> ''یہ خادم اسلام، دین محمدی کی حمایت میں نصرانیوں کی سرکوبی میں مصروف ہے۔ جنھوں نے اس سرزنش کی تاب نہ لا کر ایک ذلیل صلح کر لی ہے۔ یہ معاملہ اس قدر مشہور ہے کہ اس عریضہ میں اس کے

(۱) اس کا ذکر آگے آرہا ہے۔

(۲) ملاحظہ ہو تاریخ ٹیپو سلطان صفحہ ۱۱۸۔ و صفحہ ۵۱۵-۵۱۶۔

(۳) ملاحظہ ہو شیر ہندوستان ٹیپو سلطان صفحہ ۵۷

اعادہ کی ضرورت نہیں۔ خدا کے فضل و کرم پر بھروسہ کرتے ہوئے اس خادم دین محمدی کی خواہش ہے کہ دشمنان دین سے جنگ کرے اور ان کو مٹا دے۔''(۱)

سلطان نے اپنی سرگرمیوں کا تذکرہ کر کے اس کی غیرت کو بیدار کرنے اور اس کو اپنا فرض منصبی یاد دلانے کی کوشش کی مگر اس (برائے نام ''شہنشاہ ہند'') کی غیرت کیا بیدار ہوتی جس نے خود بنگال کی دیوانی انگریزوں کے نام لکھ دی ہو۔ اور اپنے آپ کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہو۔ اور پھر ''شہنشاہ ہند'' کہلاتے ہوئے مرہٹوں کا وظیفہ خوار ہو کر زندگی گزارنے میں اسے کوئی ذلت محسوس نہ ہوتی ہو۔ چنانچہ جس کا اندیشہ تھا وہی ہوا۔ اس کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ مگر آزادی کی ایسی تڑپ اور حریت کا ایسا جذبہ سلطان کے اندر موجزن تھا کہ نظام و مرہٹہ کے اس رویہ اور شاہ عالم کی اس خاموشی کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا، نہ وہ مایوسی کا شکار ہوا۔ بلکہ چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں سے روابط قائم کئے۔ اگرچہ نظام و مرہٹہ کے مقابلہ میں ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی مگر سلطان ان کو نظر انداز کرنا نہیں چاہتا تھا بلکہ متعدد مصلحتوں کے پیش نظر سارے ہندوستان سے تعاون حاصل کر کے سب کو اس جنگ آزادی میں شریک کرنا چاہتا تھا۔ ماڈرن میسور کا مصنف لکھتا ہے :

''اس سلسلہ میں ہندوستان کی کوئی چھوٹی یا بڑی ایسی ریاست باقی نہیں رہی جہاں ٹیپو کے ایلچی اور خطوط نہ پہنچے ہوں۔ نیپال، کشمیر، جے پور اور جودھپور کی چھوٹی ریاستوں میں تک سلطان کے خطوط پائے گئے۔''(۲)

نیز کرنل ولکس لکھتا ہے کہ ۱۷۹۹ء میں سلطان ٹیپو کی شکست کے بعد دیکھا گیا کہ ہندوستان میں کوئی بڑی سی بڑی اور چھوٹی سی چھوٹی ایک بھی ریاست نہ تھی جہاں ٹیپو سلطان کی یہ اپیل نہ گئی ہو کہ بدیشیوں

---

(۱) صحیفہ ٹیپو سلطان صفحہ ۱۸۲۔ اس خط پر ۲۳ رجون ۱۷۸۵ء کی تاریخ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان نے شروع ہی سے شاہ عالم کی توجہ اس پر مبذول کرنے کی کوشش کی۔

(۲) تاریخ سلطنت خداداد۔ صفحہ ۳۷۸۔

کو ملک سے نکالنے کے لئے متحد ہو جاؤ(۱)

بیرونی سفارتیں

ٹیپو سلطان نے ملکی والیان ریاست اور فرمانرواؤں سے تعلقات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ وہ ملک کی آزادی کے لئے بین الاقوامی اتحاد کا خواہاں تھا یا کہیے کہ اندرونی امداد سے مایوس ہو کر اس نے بیرونی امداد حاصل کرنے طرف توجہ کی۔ چنانچہ اخیر اخیر تک اس کے لئے کوشاں رہا۔ وہ پہلا ہندوستانی حکمراں ہے جس نے اس طرف توجہ کی کہ ملک کی آزادی کے لئے باہر سے تعاون حاصل کیا جائے۔ اس سلسلہ میں اس نے بڑی وسعت ظرفی اور کشادہ ذہنی کا ثبوت دیا۔ مسلم اور غیر مسلم دونوں طرح کے ممالک سے رابطہ رکھا۔

فرانس کو سفارتیں

غیر مسلم ممالک میں فرانس سب سے زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ فرانسیسی اور انگریز باہم دست و گریباں تھے۔ ہندوستان میں ان کے مابین کشمکش جاری تھی اور یورپ میں تو وہ ایک فیصلہ کن مرحلہ سے گزر رہے تھے۔

دوسری جنگ میں فرانسیسیوں نے اپنے طرز عمل سے ٹیپو سلطان کے دل میں بہت تلخی پیدا کر دی تھی اور اس کو دھوکہ دیا تھا۔ مگر پھر منت سماجت کر کے فرانسیسی حکام نے معافی تلافی کی۔ اور ٹیپو بھی سمجھتا تھا کہ بیرونی طاقتوں میں فرانسیسی ہی انگریزوں سے مقابلہ میں سب سے مضبوط طاقت فراہم کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اس نے فرانسیسیوں سے رابطہ قائم کیا۔ فرانسیسیوں کو اپنا مفاد اس میں پنہاں نظر آتا تھا۔ اس لئے انھوں نے بڑھ کر خوش آمدید کہا، بلکہ ٹیپو کے ساتھ اتحاد قائم کرنے کے لئے نظام و مرہٹہ سے خط و کتابت شروع کی۔(۲)

ابتداء میں ٹیپو نے کوئی علاحدہ سفارتی مشن فرانس نہیں بھیجا۔ بلکہ ۱۷۸۵ء کے

(۱) سلطان جمہور صفحہ ۶۵-۶۶

(۲) ملاحظہ ہو تاریخ ٹیپو سلطان، صفحہ ۱۶۰-۱۶۲۔ مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ نظام نے تو اتنا صاف جواب دیا کہ حیرت ہوتی ہے ایک مسلمان ہوتے ہوئے کیسے اس کے منھ سے یہ بات نکلی۔ اس نے کہا ہندوستان پر انگریزوں کے حملے سے مجھے اتنی تکلیف نہیں پہنچی جتنی ٹیپو کے غصب سے پہنچی ہے۔

آخر میں جو سفیر ترکی بھیجے تھے، انہی کو ہدایت کی تھی کہ وہ قسطنطنیہ میں اپنا کام ختم کر کے پیرس جائیں اور پھر وہاں سے لندن جائیں۔ ان سفیروں کو ہدایت تھی کہ وہ فرانس سے دائمی معاہدۂ اتحاد کریں، جس کے تحت دس ہزار فوج فرانس سے بھیجی جائے۔ اور اس وقت تک انگریزوں سے صلح کی کوئی بات نہ ہو جب تک وہ اپنے تمام ہندوستانی مقبوضات سے دستبردار نہ ہوں (۱)

مگر یہ سفارت قسطنطنیہ سے آگے نہ جا سکی۔ اور وہیں سے واپس بلالی گئی۔ دوسری بار ۱۷۸۷ء میں پھر سفارتی مشن بھیجا گیا۔ جس کا زبردست استقبال ہوا۔ مگر چوں کہ فرانس خود اس وقت ثقافتی و معاشی و سیاسی بحران سے دوچار تھا۔ اس لئے کوئی فوجی مدد نہ کر سکا۔ البتہ صنعتی فوائد حاصل ہوئے۔ (۲)

لیکن ٹیپو پست ہمت نہیں ہوا۔ اس نے ۱۷۹۰ء میں پھر فرانس کے حکمراں کو متعدد خط لکھے، اور چھ ہزار سپاہی طلب کئے۔ لیکن فرانس کے اندرونی حالات نے پھر ناکامی سے ہم کنار کیا۔ (۳)

اس دوران فرانس میں وہ عظیم تاریخی انقلاب برپا ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے فرانس کے زمین و آسمان بدل گئے۔ بادشاہت کا تخت الٹ کر جمہوریت و مساوات کے علم بردار کی حیثیت سے نپولین بوناپارٹ برسر اقتدار آیا۔ ٹیپو نے اس موقع سے بھی فائدہ اٹھانے کی بھرپور کوشش کی اور اکتوبر ۱۷۹۷ء میں ایک سفارت روانہ کی۔ جزیرہ فرانس اور باربو کے گورنر جنرل ملارٹک نے بڑھ کر استقبال کیا۔ سفراء نے دفاعی معاہدے کی تجویز پیش کی۔ جس کی پہلی دفعہ یہ تھی کہ ٹیپو انگریزوں کے خلاف جنگ جاری رکھے گا۔ تا آں کہ ایک انگریز بھی ہندوستان میں باقی نہ رہے۔ (۴)

جنرل ملارٹک کے پاس اتنی فوج نہیں تھی کہ وہ براہ راست مدد کر سکے۔ اس لئے اس نے فرانس کی حکومت کو اس سے مطلع کرنا چاہا۔ اور ایک عام اعلان کیا جس میں

---

(۱) تاریخ ٹیپو سلطان صفحہ ۱۶۴۔ نیز ملاحظہ ہو تاریخ سلطنت خداداد صفحہ ۲۰۹۔ ۲۱۰۔
(۲) پروفیسر محب الحسن نے اس سفارت کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو تاریخ ٹیپو سلطان صفحہ ۱۶۴۔ ۱۷۱۔
(۳) ایضاً ۲۶۵۔
(۴) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو محب الحسن، تاریخ ٹیپو سلطان صفحہ ۳۹۸۔

سلطان کی امداد کے لئے ہندوستان جانے کی ترغیب دی۔(۱)

اس اعلان کے بعد جنرل ملارٹک (۲) نے مرکزی گورنمنٹ پیرس کو سلطان کے خطوط روانہ کئے۔ انگریزوں کو اپنے جاسوسوں سے اس کی بھنک لگ گئی۔ چنانچہ پیرس پہنچنے سے پہلے ہی راستے میں ایک انگریزی جہاز نے اس فرانسیسی جہاز پر حملہ کر دیا۔ جس سے فرانسیسی جہاز تباہ ہو گیا۔ اور ٹیپو سلطان کے یہ خطوط حکومت فرانس کو نہ پہنچ سکے۔(۳)

ادھر جنرل کے اعلان اور ترغیب کے نتیجہ میں کچھ رضا کار آمادہ ہوئے ان کا جہاز (مع ایلچیوں کے) ۲۵/مارچ ۹۸ ۱۷ء کو ساحل منگلور پر لنگر انداز ہوا۔ ۱۴/مئی کو ایک تقریب میں سلطان نے با قاعدہ ان کا استقبال کیا۔ جواب میں فرانسیسیوں نے ٹیپو کو اپنی حمایت کا یقین دلاتے ہوئے اسے ''عوامی بادشاہ'' کہہ کر مخاطب کیا۔ اس کے بعد ''شجر آزادی'' نصب کیا گیا۔ جس کی چوٹی پر ''کلاہ مساوات'' تھی۔ فرانسیسیوں نے آزادی یا موت کا عہد کرتے ہوئے جمہوریہ فرانس کے حلیف ٹیپو کے علاوہ دنیا کے باقی تمام بادشاہوں سے اپنی نفرت کا اعلان کیا۔(۴)

رضا کاروں کی تعداد مایوس کن تھی، لیکن سلطان نے پھر بھی ہمت نہیں ہاری، اور اس نے براہ راست حکومت فرانس کے پاس پیرس ایک سفارت روانہ کی۔ نپولین انگریزوں کا سخت دشمن اور ٹیپو کے مقاصد سے پوری طرح باخبر اور اس سے ہم آہنگ تھا۔ اس وقت وہ مصر میں تھا۔ اس نے جواب میں ٹیپو کو ایک خط لکھا جس کا عنوان ''آزادی اور مساوات'' تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ میں بحر قلزم کے کنارے پہنچ چکا ہوں۔ میری اور میری فوج کی دلی خواہش ہے کہ کسی طرح آپ کو برطانیہ کے پنجہ سے چھڑاؤں۔ آپ اپنے کسی قاصد کو قاہرہ بھیج دیں، تا کہ اس سے صحیح صورت حال کا جائزہ لوں۔ ابھی یہ خط سلطان کو پہنچا بھی نہیں تھا کہ اگست ۹۸ ۱۷ء میں انگریزی بیڑے نے

(۱) اعلان کی عبارت کے لئے دیکھئے تاریخ سلطنت خداداد صفحہ ۴۱۲-۴۱۳۔
(۲) محمود خاں بنگلوری نے اسکو ''ملارٹی'' لکھا ہے۔ حالانکہ صحیح ''ملارٹک'' (Malartic) ہے۔
(۳) تاریخ سلطنت خداداد۔ صفحہ ۴۱۴۔
(۴) تاریخ ٹیپو سلطان صفحہ ۳۹۹-۴۰۰۔

فرانسیسی بیڑے پر حملہ کر دیا۔ جس سے یہ بیڑا بحر روم میں تباہ ہو گیا۔ اور نپولین کو شام کی طرف رخ کرنا پڑا۔ جہاں ترکوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ (۱)

اس طرح سلطان کی ان ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ جو انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لئے فرانس سے فوجی تعاون کے سلسلہ میں اس نے کی تھیں۔ اس سے پہلے ۲/ اپریل ۱۷۹۷ء کو ماریشس (جو فرانس کا مقبوضہ تھا) کے گورنر کے پاس سفیر بھیجے تھے۔ مطالبہ یہ تھا کہ انگریزوں کے اخراج میں تعاون کے لئے یورپین اور نیگرو (حبشی) دستے بھیجے جائیں۔ یہ سفارت جنوری ۱۷۹۸ء کو ماریشس پہنچی۔ (۲)

اسی طرح ٹرانکیوبار میں جو ساحل کورومنڈل پر ڈنمارک کا مقبوضہ تھا سلطان کی انگریز مخالف سرگرمیاں زوروں پر تھیں جس کو ولزلی نے ناکام بنا دیا۔ (۳)

قسطنطنیہ میں سفارت

ترکی بلاد اسلامیہ میں سب سے زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ خلافت اسلامی کے امین اور اسلامی مفادات کے پاسبان ہونے کی حیثیت سے پوری دنیا کے مسلمانوں کے دلوں میں اس کی بڑی عزت تھی۔ بلکہ اس کو تقدس کا درجہ حاصل تھا۔ اس لئے ٹیپو سلطان کی نظر بھی ایک غیور مسلمان ہونے کی حیثیت سے سب سے پہلے ترکی ہی پر گئی۔

۱۷۸۴ء میں ٹیپو نے عثمان خاں کو یہ معلوم کرنے کے لئے قسطنطنیہ بھیجا کہ وہاں سفارت خانہ قائم کرنا ممکن ہے یا نہیں۔ امید افزا جواب پا کر اس نے سفارتی مشن بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ (۴)

اس پر نومبر ۱۷۸۵ء میں بڑی شان سے اس سفارت کا اہتمام کیا گیا۔ ۹/ مارچ

(۱) تاریخ سلطنت خداداد صفحہ ۴۱۵۔

(۲) ایل بی بورنگ۔ بحوالہ شیر ہندوستان، صفحہ ۶۴۔ یہ غالباً وہی سفارت ہے جس نے جنرل ملارتک سے ملاقات کی تھی جس کا اوپر ذکر آ چکا ہے۔ بعض دوسری روایتوں کے مطابق فرانسیسی ایکزیکٹو ڈائریکٹری (مجلس عمل) کو پہلی سفارت اپریل ۱۷۹۷ء پھر اکتوبر ۱۷۹۷ء اور تیسری سفارت جولائی ۱۷۹۸ء کو بھیجی گئی۔ مگر تیسری سفارت ۷/ فروری ۱۷۹۹ء کو روانہ ہو سکی (ملاحظہ ہو شیر ہندوستان ص ۴۲۶ نیز دیکھئے Secret Correspondence of Tipu Sultan p. 125)

(۳) تاریخ ٹیپو سلطان صفحہ ۲۰۲-۲۰۳۔

(۴) تاریخ ٹیپو سلطان صفحہ ۱۸۵۔

١٧٨٦ء کو میر غلام علی لنگڑا کی قیادت میں ساحل مالابار کی ایک چھوٹی سی بندرگاہ تدری سے یہ سفارت روانہ ہوئی۔(١)

سلطنت خداداد کے سب سے بڑے جنگی جہاز فخر المراکب کو اس کے لئے مختص کیا گیا۔ جس کے جلو میں چار جنگی جہاز تھے(٢) اور تقریباً نو سو افراد پر مشتمل ایک بہت بڑا عملہ تھا۔ جس میں وفد کی حفاظت کے لئے سپاہیوں کے علاوہ دیگر ملازمین تھے(٣)۔ اس سفارت کا ایک اہم مقصد میسور کی بادشاہت کے لئے عثمانی خلیفہ سے سند حاصل کرنا تھا(٤)۔ اپنے مشن کو کامیاب بنانے اور اس کی فوری اہمیت جتانے کے لئے اس نے خلیفہ عثمانی کے مذہبی جذبات کو ابھارتے ہوتے لکھا کہ پچیس تیس سال سے انگریزوں نے بنگال و کرناٹک اور ہندوستان کے دوسرے حصوں پر قبضہ کر لیا ہے۔ مسلمانوں پر مظالم ڈھا رہے ہیں۔ اور انہیں عیسائی مذہب قبول کرنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ اور مساجد و مقابر کو گرجا گھروں میں تبدیل کر رہے ہیں۔ ان ممالک میں کفر کا غلبہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس لئے میں ان کے خلاف جہاد میں مشغول ہوں جس میں آپ کی مدد و تائید کی ضرورت ہے(٥) نیز بصرہ کی بندرگاہ کا مطالبہ کرتے ہوئے لکھا کہ اس کے عوض میں ترکی حکومت کو سلطنت خداداد میں جس بندرگاہ کی ضرورت ہو، دی جائے گی۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ اگر ترکی سلطنت کی ایک بندرگاہ ہندوستان میں ہو تو سلطان ترکی کے جہازات ہندوستان آتے جاتے رہیں گے۔ اور اس طرح نصاریٰ کی آمد و رفت کا قلع

(١) تاریخ ٹیپو سلطان صفحہ ١٨٨۔ سیرت سلطان ٹیپو شہیدؒ ٢٣٨۔ میں ہے کہ ١٠ ر مارچ کو منگلور سے یہ سفارت روانہ ہوئی۔

(٢) تاریخ سلطنت خداداد صفحہ ٥٤١۔

(٣) تاریخ ٹیپو سلطان صفحہ ١٨٨۔ صحیفہ ٹیپو سلطان صفحہ ٢٩٩۔٣٠٠ پر اس وفد کے قائد غلام علی کے نام ٹیپو کا جو خط ہے اس میں سپاہیوں اور ملازمین کی تفصیل درج ہے جن کی کل میزان ٥٠١ ہوتی ہے ممکن ہے کہ مزید اہتمام کے پیش نظر چار سو عملہ کا اضافہ کیا گیا ہو۔

(٤) تاریخ ٹیپو سلطان ١٨٥۔

(٥) تاریخ ٹیپو سلطان صفحہ ١٨٧۔ معاہدہ کی دفعات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے دوسرے یہ کہ عثمانی حکومت ٹیپو کی مدد کے لئے فوج بھیجے جس کے اخراجات حکومت میسور برداشت کرے گی۔ اور جب بھی خلیفہ کو ان کی ضرورت ہوگی تو قسطنطنیہ تک ان کی واپسی کے اخراجات بھی اسی کے ذمہ ہوں گے۔

قمع ہو جائے گا۔ اور تمام ممالک اسلامیہ اور بلاد مقدسہ کے ساحل ان کی دست برد سے محفوظ رہیں گے۔

صنعت وحرفت اور تجارت پر زور دیتے ہوئے ماہر صناعوں کے تبادلہ کی بھی بات رکھی۔ اس سے اس کا مقصد اسلام اور ممالک اسلامی کی ترقی اور نصاریٰ کو زیر کرنا تھا۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا:

نصاریٰ ہر طرح سے یعنی صنعت وحرفت، تجارت اور ملک گیری کے ذریعہ اہل اسلام پر غالب آنا چاہتے ہیں اس لئے ضرورت ہے کہ دول اسلام بھی صنعت وحرفت اور تجارت کی طرف توجہ کریں۔

اسی طرح زائرین کی سہولت اور دیگر فوائد کے پیش نظر دریائے فرات سے نجف اشرف تک ایک نہر نکالنے کی اجازت طلب کرتے ہوئے لکھا کہ اس کا تمام خرچ سلطنت خداداد برداشت کرے گی۔

اس معاہدہ کی پہلی دفعہ یہ تھی کہ یہ دوستی اور یک جہتی ہمیشہ قائم رہے گی۔ (۱)

یہ قافلہ مسقط، بوشہر وغیرہ میں رکتا ہوا بصرہ پہنچا، جہاں طویل قیام رہا۔ بغداد سے ۲۹ رمئی ۱۷۸۷ء کو خشکی کے راستہ سے ترکی کے لئے روانہ ہوا۔ ۲۵ ستمبر کو قسطنطنیہ پہنچا۔ شہر کے ایک محل میں اس کے قیام کا انتظام کیا گیا۔ ۵ نومبر ۱۷۸۷ء کو سلطان نے سفیروں کو اعزاز کے ساتھ باریابی بخشی۔ یہ سلطان عبدالحمید اول (۱۷۷۳ء تا ۱۷۸۹ء) کا زمانہ تھا۔ (۲)

---

(۱) معاہدہ کی اصل عبارت کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ سلطنت خداداد صفحہ ۵۴۱-۵۴۵۔ یہ سفارت بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ سلطان ٹیپو خلافت اسلامیہ سے اتحاد کر کے پورے عالم اسلام بالخصوص خلافت عثمانیہ کو برطانوی دست برد سے بچانا اور ان کے خطرات سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ برطانیہ کو ہندوستان پر انگریزی قبضہ برقرار رکھنے کے لئے ایک نہ ایک دن شرق بعید کے اسلامی ملکوں پر قابض ہونا پڑے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

(۲) بعض کتابوں جیسے سلطنت خداداد، سیرت سلطان ٹیپو، اور شیر ہندوستان میں اس موقع پر سلطان سلیم درج ہے حالاں کہ تاریخی اعتبار سے یہ قطعاً غلط ہے۔ سلطان سلیم کا زمانہ ۱۷۸۹ء تا ۱۸۰۷ء کا ہے اور یہ سفارت اس سے پہلے کی ہے۔ دراصل یہ غلطی انگریز مورخ ولکس سے ہوئی ہے جس کو محمود خاں بنگلوری نے ایسے ہی نقل کیا ہے۔ پھر وہیں سے غالباً دوسری کتابوں میں نقل ہوئی۔

ساری باتیں خلیفہ کے سامنے پیش کی گئیں (۱)۔ لیکن اس نے کسی قسم کا معاہدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اور یہ کہہ کر ٹال دیا کہ دونوں سلطنتوں میں دوستی کا رہنا کافی ہے اور ساری تجویزیں مسترد کر دی گئیں۔ خاص طور پر فرات سے نجف تک نہر نکالنے کی تجویز کا مذاق اڑایا گیا۔ (۲)

یہ سفارت مارچ ۱۹۸۸ء میں بے نیل مرام قسطنطنیہ سے روانہ ہوئی۔ اسکندریہ وقاہرہ ہوتے ہوئے ٹیپو کی ہدایت کے مطابق مکہ و مدینہ کی زیارت کی، اور براہ جدہ ۲۹ دسمبر ۱۷۸۹ء کو کالی کٹ کے ساحل پر اتری۔ (۳)

(۱) سلطان ٹیپو نے سلطان ترکی کو بیش قیمت تحائف بھی بھیجے تھے۔ ماڈرن میسور کے مصنف کے بقول اس سفارت کے ذریعہ سلطان ترکی کو نہایت بیش قیمت تحائف کے علاوہ ٹیپو نے نئی بندوقیں جو اس کے کارخانوں میں تیار ہوئی تھیں۔ دس لاکھ روپئے جو نئے ڈھلے تھے۔ قیمتی پارچہ جات سونا اور جواہرات بھی بھیجے تھے۔ (تاریخ سلطنت خداداد صفحہ ۵۴۶۔ نیز ملاحظہ ہو صحیفہ ٹیپو سلطان، صفحہ ۳۰۹)

(۲) ولکس کی تاریخ سے اس کے الفاظ نقل کر کے محمود خاں بنگلوری لکھتے ہیں: یہ ایک حقیقت ہے کہ اس زمانہ میں ترکی اور تمام عالم اسلام پر ایک جمود طاری تھا۔ سترہویں صدی عیسوی میں ہر جگہ کے مسلمانوں کی یہی حالت تھی۔ ترکی جو دنیائے اسلام کی سب سے زبردست اور دنیا میں علم بردار اسلام کہلاتی تھی، تباہی کے عمیق غار میں گر چکی تھی۔ باب عالی میں یورپین اقوام کی ریشہ دوانیاں اور ان کے سفیروں کی آئے دن سازشیں ہوتی رہتی تھیں۔ ان میں سب سے بڑھ کر انگلستان حصہ لے رہا تھا۔ جو فرانس کے خوف سے ترکی کو اپنے ساتھ ملا لینا چاہتا تھا۔ صنعت و حرفت کا ملک میں نام و نشان تک نہیں تھا۔ اور تمام تجارت یورپین اقوام کے ہاتھوں میں جا چکی تھی۔ مذہبی و اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی ترک حد درجہ گر چکے تھے۔ (تاریخ سلطنت خداداد صفحہ ۵۴۷۔)

(۳) اس کے بعد پروفیسر محب الحسن لکھتے ہیں: اس سفارتی مشن پر میسور حکومت کی ایک بڑی رقم خرچ ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ سفیر کو دوران سفر میں ہر طرح کی مصیبتیں برداشت کرنی پڑی تھیں۔ ان چار کشتیوں میں سے تین سمندر کی نذر ہوئی تھیں۔ جن میں انھوں نے بصرہ تک سفر کیا تھا۔ اس کی وجہ سے شدید جانی و مالی نقصان ہوا تھا۔ اس قافلہ کے بہت سے لوگ پیچش بخار و طاعون (اس دوران قسطنطنیہ میں طاعون پھیل گیا تھا) میں جاتے رہے۔ تقریباً نو سو آدمیوں میں سے جو مالابار کے ساحل سے روانہ ہوئے تھے صرف مٹھی بھر آدمی اپنے گھروں کو واپس ہوئے۔

بے اندازہ اخراجات، سخت اذیتیں اور جانی و مالی نقصانات برداشت کرنے کے باوجود سفارتی مشن سلطان ترکی سے صرف سند شاہی حاصل کر سکا تھا۔ جس کی رو سے ٹیپو کو خود مختار بادشاہ کا لقب اختیار کرنے، اپنے سکے جاری کرنے اور اپنے نام کا خطبہ پڑھوانے کا حق حاصل ہو گیا تھا۔ (تاریخ ٹیپو سلطان صفحہ ۱۹۴)

لیکن سلطان اس سے مایوس نہیں ہوا۔ اس نے پھر دو سفارتیں روانہ کیں۔ دوسری سفارت ۱۷۹۸ء میں روانہ کی گئی تھی۔ اس وقت سلطان سلیم ثالث خلیفہ تھا۔ اور ترکی پوری طرح انگریزوں کے زیر اثر آ چکا تھا۔ سلطان سلیم نے اس کے جواب میں سلطان ٹیپو کو ایک خط لکھا جس میں انگریزوں سے جنگ کا خیال ترک کر کے اتحاد کرنے اور فرانسیسیوں پر بھروسہ نہ کرنے پر زور دیا تھا۔ نیز یہ بھی لکھا تھا کہ اگر سلطان کو انگریزوں سے کچھ شکایتیں ہوں تو ہم دور کرنے کے لئے تیار ہیں۔ (۱)

سلطان ٹیپو نے اس کے جواب میں جو خط لکھا اس کا خلاصہ یہ ہے: آپ کا گرامی نامہ جو فرانسیسیوں کی تذلیل وتوہین اور انگریزوں کی تعریف وتحسین اور ہمارے اور انگریزوں کے درمیان صلح صفائی کی پیش کش پر مشتمل تھا، ملا۔ جناب کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہم نے محض جہاد فی سبیل اللہ اور دین محمدی کے احیاء وترویج پر کمر باندھی ہے۔ اسی لئے انگریزوں کے خلاف صف آراء ہیں۔ فرانسیسیوں کی ذات جیسا کہ آپ نے لکھا ہے بڑی بے وفا ہے۔ ہم ان کی برائیوں اور مکاریوں سے خوب واقف ہیں۔ لیکن اس وقت مسئلہ ہمارے لئے فرانسیسیوں کا نہیں بلکہ انگریزوں کا ہے۔ جنھوں نے ہندوستان کی ایک اسلامی سلطنت پر یورش کی تیاری کی ہے۔ اس لئے نہ صرف ہم پر بلکہ تمام مسلمانوں پر جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ اب جناب عالی سے یہی گزارش ہے کہ اوقات خاص میں مدد اور توفیق الٰہی کی دعا کریں۔ اور ایک روایت کے مطابق سلطان نے انگریزوں کے خلاف اپنے عزم کا اظہار کرتے اور سلطان سلیم کی غیرت ملی کو بیدار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ آپ رات کے پچھلے حصے میں خدا سے دعا کریں کہ خدا مجھے انگریزوں کے مقابلہ میں شہادت عطا فرمائے۔ (۲)

سلطان ٹیپو کو خلیفہ عثمانی سے عالم اسلامی میں اس کی اہمیت اور مقام ومنصب کے پیش نظر بڑی امیدیں تھیں، مگر اس صاف جواب سے یہ بند بھی ٹوٹا، لیکن قربان جائیے

---

(۱) پورا خط اور اس کا جواب ملاحظہ ہو تاریخ سلطنت خداداد صفحہ ۵۴۹-۵۵۴۔ سلطان سلیم کے خط پر ۸ ربیع الآخر ۱۲۱۳ھ درج ہے۔ جب کہ سیرت سلطان ٹیپو سلطان شہیدؒ میں ۸ ربیع الاول ۱۲۱۳ھ لکھا ہے اور اس خط کا انگریزی ترجمہ اس کتاب میں بھی دیا گیا ہے جو ۱۸۵۵ء میں ٹیپو کے بیٹے غلام محمد کی تصحیح کے کر لندن سے شائع کی گئی تھی اس میں ۲۰ ستمبر ۱۷۹۸ء تاریخ دی گئی ہے۔ (ملاحظہ ہو شیر ہندوستان صفحہ ۸۶۶-۸۶۷) یہ ۸ ربیع الآخر کے مطابق ہے اس لئے ۸ ربیع الاول غلط ہے۔

(۲) سلطان جمہور صفحہ ۲۲۴

ٹیپو پھر بھی ہمت ہار کر نہیں بیٹھا۔(۱)

والیٔ افغانستان سے مراسلت

خلافت عثمانیہ کے رویہ سے سلطان سمجھ گیا کہ یہ خود انگریزوں کے دام میں گرفتار ہے۔ اسلئے اس سے مدد کی توقع تضیع وقت اور اتلاف جان و مال کے سوا کچھ نہیں۔ مگر اس نے عجیب بلند ہمتی پائی تھی۔ مایوسی اور پست ہمتی کا اس پر سایہ بھی نہیں پڑا تھا۔ چنانچہ اس نے دوسری طاقتور اور با اثر اسلامی سلطنتوں سے سفارتی تعلقات اور مضبوط کیے۔ جن میں افغانستان اور ایران سرفہرست ہیں معلوم ہوتا ہے کہ ٹیپو نے افغانستان سے مراسلت کا آغاز احمد ابدالی کے لڑکے تیمور شاہ (۱۷۷۳ء-۱۷۹۳ء) کے زمانہ ہی سے کیا تھا۔(۲)

اس کے بعد اس کے لڑکے زمان شاہ (۱۷۹۳ء-۱۸۰۱ء) کے ساتھ یہ سلسلہ جاری رکھا۔ بورنگ نے زمان شاہ سے نامہ و پیام ۱۷۹۶ء میں بتایا ہے۔(۳)

زمان شاہ کے نام ۱۷۹۷ء تا ۱۷۹۹ء جو خطوط دستیاب ہوئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ تثلیث پرستوں یعنی انگریزوں کو ختم کرنا اور ہندوستان سے اس بد اور بے حیا قوم کو نکالنا ہمارا مقصد ہے۔ زمان شاہ کو یہ بھی لکھا گیا تھا کہ مغل سلطنت پارہ پارہ ہو چکی ہے اور شاہ عالم مرہٹوں کا وظیفہ خوار کٹھ پتلی بن کر رہ گیا ہے۔ اس لئے اسکو معزول کر کے مغل خاندان کے کسی لائق اور مدبر شخص کو تخت پر بٹھایا جائے۔(۴)

---

(۱) اخیر میں ولزلی کی جنگی تیاریوں سے پریشان ہو کر اس نے سید علی محمد قادری کی قیادت میں ایک اور سفارت ترکی بھیجی۔ مگر انگریزوں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے وہ بصرہ سے آگے نہیں جا سکی۔ نومبر ۱۷۹۹ء کو ہندوستان کی طرف اس کی واپسی ہوئی۔ (تاریخ ٹیپو سلطان صفحہ ۴۱۰-۴۱۱) ممکن ہے کہ یہ سفارت ۱۷۹۹ء کے اوائل میں گئی ہو یا ۱۷۹۸ء کے اواخر میں بہر حال بصرہ پہنچنے کے چند دنوں بعد ہی سقوط سرنگاپٹنم اور سلطان کی شہادت کی خبر ملی تھی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ سلطان سلیم کے خط کا جواب اسی کے ساتھ بھیجا ہو۔

(۲) ملاحظہ ہو صحیفۂ ٹیپو سلطان صفحہ ۱۰۴۔ ٹیپو نے ابتداءً خلافت عثمانیہ کے پاس اس کا رجحان اور آمادگی معلوم کرنے کے لئے جو خط بھیجا تھا غالباً اس کی ایک ایک نقل شاہ افغانستان اور شاہ ایران کو بھیج دی گئی تھی۔ (ملاحظہ ہو کمپنی کی حکومت صفحہ ۲۴۱۔)

(۳) شیر ہندوستان ٹیپو سلطان صفحہ ۶۷-۶۸۔

(۴) خورشید مصطفیٰ رضوی، شیر ہندوستان ص ۱۴۷۔ مکمل خطوط کے لئے دیکھئے Kabir Kausar: Secret Correspondence of Tipu Sultan. p.148-152.

پھر ولزلی نے بڑے پیمانہ پر جب جنگی تیاریاں شروع کیں تو اس وقت کچھ تحائف اور ایک خط دو سفیروں کے ہمراہ روانہ کیے۔ خط کا مضمون کچھ اس طرح تھا :

''سلطنت خداداد میں ہر جمعہ کو بعد نماز جمعہ آپ کی سلطنت کی وسعت واستحکام کے لئے دعائیں کی جاتی ہیں۔ ہم ہمیشہ مسلم حکمرانوں کے درمیان دینی بنیادوں پر اتحاد کے خواہاں رہے ہیں۔ اس وقت اسلام دشمن طاقتیں ہم پر حملہ کی تیاری کر رہی ہیں۔ اس لئے اس سلسلہ میں ہم آپ کی مدد کے طالب ہیں۔ امید ہے کہ آپ ہمارا تعاون فرما کر اس کارِ خیر میں شامل ہوں گے۔''

اس پر ٹیپو کو زمان شاہ کی طرف سے بڑا ہمت افزا جواب ملا، اس میں تحریر تھا :

''چوں کہ دشمنانِ اسلام ایک اسلامی سلطنت کو نیست و نابود کرنے کے درپے ہیں، اس لئے ہم اللہ کی مدد سے ایک بڑا لشکر لے کر آپ کی طرف آ رہے ہیں تاکہ اس ملک کو کفر و بدعت سے پاک کریں۔''(۱)

زمان شاہ اپنے وعدہ کے مطابق ۳۲ ہزار سپاہیوں کا ایک لشکر جرار لے کر کابل سے روانہ ہوا۔ جب ولزلی کو اس کی اطلاع ملی تو اس نے اپنا وہی آخری حربہ استعمال کیا جس میں ہمیشہ انگریزوں کو کامیابی ملی ہے۔ یعنی مسلمانوں کو واپس میں لڑایا جائے۔ چنانچہ ولزلی نے مراد آباد کے ایک شیعہ مہدی علی خاں کو ایران بھیجا کہ وہ ایران کے شیعوں اور افغانستان کے سنیوں کے درمیان منافرت کے بیج بو کر ان کے مذہبی جذبات برانگیختہ کرے اور دونوں کو لڑا دے کہ زمان شاہ ٹیپو کا خواب بھی نہ دیکھ سکے۔ اس نے ایران میں افواہ پھیلائی کہ افغانستان میں شیعوں پر حد درجہ ظلم و ستم ہو رہا ہے۔ ان کی مذہبی آزادی سلب کر لی گئی ہے۔ زمان شاہ روزانہ ہزاروں شیعوں کو قتل کر رہا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی جانیں غیر محفوظ ہیں۔ ایران میں اس سے ایک آگ

---

(۱) سیرت سلطان ٹیپو شہیدؒ صفحہ ۳۰۳-۳۰۴۔ پورا خط ملاحظہ ہو تاریخ سلطنت خداداد صفحہ ۵۵۷-۵۵۸۔

لگ گئی۔ اس نے شاہ ایران کو یہ بھی یقین دلایا کہ انگریز افغانستان سے ان کے مقبوضہ علاقے واپس لینے میں فوجی مدد کے لئے تیار ہیں۔ شاہ ایران اس کے فریب میں آگیا۔ اور اس نے افغانستان پر حملہ کر دیا (۱)۔ زمان شاہ اپنی فوج کے ساتھ ۱۷۹۸ء کے اواخر میں لاہور تک پہنچ گیا تھا۔ مگر اپنے ملک پر حملہ کی وجہ سے ۱۷۹۹ء کے اوائل میں افغانستان واپس جانا پڑا (۲) اور چاہتے ہوئے بھی وہ ٹیپو کی مدد کو نہیں پہنچ سکا۔ اور انگریز اپنی چال میں کامیاب ہوئے۔ (۳)

ٹیپو کے سفیر شاہ ایران کے دربار میں

ٹیپو نے اسی زمانہ مین ایران سے بھی روابط قائم کئے۔ اور ۲۰ مارچ ۱۷۹۸ء کو میر عبدالرحمٰن اور میر عین اللہ کی قیادت میں ایک سفارت ایران روانہ کی اور تحفۂ شاہ ایران کی خدمت میں مع چار ہاتھی بیش قیمت تحائف بھیجے۔ یہ فتح علی شاہ قاچار (۴)

(۱) سیرت سلطان ٹیپو شہید، صفحہ ۳۰۴۔ ۳۰۵۔

(۲) تاریخ ٹیپو سلطان صفحہ ۲۰۸۔

(۳) اس ننگ دین ملت فروش مہدی علی خان کو اس خدمت کے عوض میں دو لاکھ دس ہزار روپے انعام ملے۔ (کمپنی کی حکومت صفحہ ۲۴۴۔ از باری علیگ۔) سیرت سلطان ٹیپو میں دو لاکھ اسی ہزار لکھا ہے۔

(۴) اس موقع پر تاریخ سلطنت خداداد (صفحہ ۵۵۴) اور سیرت سلطان ٹیپو شہید" (صفحہ ۳۰۶) میں شاہ ایران کا نام کریم خاں لکھا ہے جو کسی طرح صحیح نہیں۔ اس لئے کہ کریم خاں زند کا زمانہ حکومت ۱۷۵۰ء تا ۱۷۷۹ء ہے جب ٹیپو تخت سلطنت پر متمکن ہی نہیں ہوا تھا۔ اور سفارت ۱۷۹۸ء کی ہے جیسا کہ تاریخ میں صراحتاً مذکور ہے، اور اس وقت جیسا کہ عرض کیا گیا فتح علی شاہ قاچار کی حکومت تھی۔ اسی طرح محمود خاں محمود بنگلوری نے مہدی علی خان کی سازش کی وجہ سے شاہ ایران کے افغانستان پر حملہ کرنے کے سلسلہ میں شاہ ایران کا نام عباس شاہ صفوی لکھا ہے (تاریخ سلطنت خداداد صفحہ ۲۸۳) حالاں کہ ایران میں صفوی حکومت کا ۱۷۲۲ء ہی میں خاتمہ ہو گیا تھا۔ اس خاندان میں عباس شاہ صفوی اول اور عباس شاہ صفوی دوم کے نام سے دو بادشاہ گزرے ہیں پہلا کا زمانہ ۱۵۸۷ء تا ۱۶۲۹ء اور دوسرے کا زمانہ ۱۶۴۱ء تا ۱۶۶۸ء ہے (ملاحظہ ہو ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ دوم صفحہ ۲۵۱۔ ۲۵۴۔) بلکہ صحیح یہی ہے کہ اس وقت ایران کا حکمراں فتح علی شاہ قاچار تھا۔ کوثر کبیر کی کتاب میں بھی یہ صراحت ہے (صفحہ ۱۵۱)۔

قاچار ایران کا ایک حکمراں خاندان ہے جس نے ۱۷۹۷ء سے ۱۹۲۵ء تک حکومت کی تھی۔ خورشید مصطفیٰ رضوی صاحب نے اپنی کتاب صفحہ ۶۹ میں محب الحسن کے حوالہ سے ==

(۱۷۹۷ء-۱۸۳۵ء) کی حکومت کا زمانہ تھا۔ سفیروں نے ہندوستان کے تفصیلی حالات اور انگریزوں کی چیرہ دستیوں کا ذکر کرنے کے بعد شاہ سے فوجی امداد اور بندرگاہوں کے تبادلے کی درخواست کی۔ شاہ ایران نے معروضات کو ہمدردی کے ساتھ سنا۔ اور بندرگاہوں کے تبادلہ پر آمادگی ظاہر کی۔ اس پر ٹیپو نے شکریہ کا خط لکھا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے:

> آپ کا خلوص و محبت سے بھر پور گرامی نامہ ملا۔ پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی۔ حسب توقع آپ کو بھی طرفین میں اتحاد و اتفاق کی ضرورت کا احساس ہے۔ اتحاد و اتفاق سے نیکیوں کا ظہور ہوتا ہے۔ پھر دو صاحب شوکت حاکموں اور دو صاحب اقتدار بادشاہوں میں اتفاق ہو تو پھر کیا کہنا، اس سے بے شمار برکات و فوائد کا ظہور ہوتا ہے۔ میں اسلامی رشتہ کی بنیاد پر ایران کے تمام علاقوں اور جزیروں کو اپنا ہی سمجھتا ہوں۔ آپ بھی میرے تمام علاقوں کو اپنا تصور فرما کر جس بندرگاہ کی ضرورت محسوس ہو مجھے آگاہ کریں۔(۱)

اس پر بیش قیمت تحائف دے کر صحیح صورت حال معلوم کرنے کے لئے بابا خان اور فتح علی بیگ کو سفیروں کے ساتھ روانہ کیا۔ یہ لوگ ۱۲ اپریل ۱۷۹۹ء کو تہران سے روانہ ہوئے۔ سرنگاپٹم پہنچے تو انگریزوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔(۲)

ادھر مہدی علی خاں کی سازش سے افغانستان اور ایران میں جنگ چھڑ چکی تھی۔ اسلئے اتحاد و موانست کے باوجود ٹیپو کو ایران کی ہمدردی سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں ملا۔ انگریز اپنی سازش میں کامیاب ہو گئے۔ اور ٹیپو کی شہادت پر سارا معاملہ دھرا کا دھرا رہ گیا۔

== جو یہ لکھا ہے کہ ٹیپو نے قاچار کے شاہ کے دربار میں بھی سفیر بھیجے تھے۔ وہ غلط فہمی پر مبنی ہے۔ محب الحسن نے فتح علی شاہ قاچار لکھا ہے جو صحیح ہے۔ رضوی صاحب نے قاچار کو کسی علاقہ کا نام سمجھ لیا حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔ (خاندان قاچار کی تاریخ کے لئے ملاحظہ ہو ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ جلد دوم صفحہ ۴۰۹ تا صفحہ ۴۱۵۔

(۱) پورا خط ملاحظہ ہو تاریخ سلطنت خداداد صفحہ ۵۵۴-۵۵۷۔

(۲) تاریخ ٹیپو۔ ۱۱۱۱، صفحہ ۴۱۱۔

شاہ ایران کو ایک خط میں لکھا تھا کہ ہم مسلمانوں کا فرض ہے کہ ہندوستان سے اس مذہب دشمن قوم کو نکالیں اور وطن کو بچائیں۔(۱)

عرب ممالک میں سلطانی کوششیں

۱۷۸۶ء میں جو سفارت غلام علی لنگڑا کی قیادت میں ترکی گئی تھی اس نے راستہ میں دو مہینہ مسقط میں قیام کیا تھا۔ اس دوران وہاں انھوں نے حاکم مسقط کو ہندوستان کا پورا حال سنایا تھا اور انگریزوں کی زہرافشانی کی تفصیل بتائی تھی۔ مسقط کے گورنر خلفان بن محمد اور حاکم عمان نے ٹیپو کے معاملات میں دلچسپی لی تھی۔(۲)

اسی طرح یمن میں بھی سلطان کے سفیر پہنچے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ میسور اور خلیج فارس کے درمیان ہر سال پانچ چھ جہاز ٹیپو کے جھنڈے لئے ہوتے تھے۔(۳)

ہم عصر مؤرخ کرک پیٹرک نے لکھا ہے کہ خلیج فارس کی عربی ریاستوں میں (۴) انگریزوں کے خلاف جو جذبات و خیالات نشوونما پائے ہیں وہ سلطان کی سازشوں کا نتیجہ ہیں۔(۵)

عوام میں جذبہ آزادی پیدا کرنے کے لئے ٹیپو کے کارنامے

سلطان ٹیپو نے اندرون و بیرون کی سفارتوں پر اکتفا نہیں کیا بلکہ عوام میں جوش جہاد اور جذبہ آزادی کو فروغ دینے کے لئے اس نے متعدد کارنامے انجام دیئے۔

ٹیپو خاک ہندوستان سے اٹھنے والا پہلا شخص ہے جس نے عوام کو جنگ آزادی کا یہ مقبول نعرہ دیا کہ "ہندوستان ہندوستانیوں کے لئے ہے"(۶)

اس سلسلہ میں اس کا سب سے عظیم کارنامہ وہ اعلان جہاد ہے جس کو تیار کر کے

---

(۱) ملاحظہ ہو شیر ہندوستان صفحہ ۱۴۷۔

(۲) تاریخ ٹیپو سلطان صفحہ ۱۸۸۔

(۳) ملاحظہ ہو شیر ہندوستان صفحہ ۶۵۔

(۴) خلیج فارس کی عربی ریاستوں میں عمان، متحدہ عرب امارات، قطر، بحرین، عراق، کویت اور سعودیہ شامل ہیں۔ یہ سب اس وقت چھوٹی چھوٹی عربی ریاستیں تھیں۔ اور اکثر جگہوں پر قبائلی نظام رائج تھا۔

(۵) ملاحظہ ہو صحیفہ ٹیپو سلطان صفحہ ۶۴۰۔

(۶) تاریخ سلطنت خداداد۔ صفحہ ۱۴۔

اس نے پوری سلطنت میں تشہیر کروائی تھی۔ یہ قرآنی آیات سے مرصع ہے۔اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو :

"یہ ہماری دلی خواہش اور پکا ارادہ ہے کہ ان ناقابل اعتبار اور سرکش لوگوں سے جنھوں نے مسلمانوں سے ان کی گردن موڑ کر علم بغاوت بلند کیا ہے۔اس وقت تک لڑتے رہیں جب تک کہ وہ اسلام کی سیدھی راہ قبول کریں یا جزیہ دینے کے لئے تیار ہو جائیں۔خصوصاً اس وقت جب کہ ہندوستان کے حاکموں کی کمزوریاں دیکھ کر اس قوم نے یہ بیہودہ خیال قائم کرلیا ہے کہ مسلمان کمزور بزدل اور لائق نفرت ہو گئے۔انھوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا۔بلکہ جنگی تیاریاں کر کے مسلمانوں کے علاقوں پر چڑھ دوڑے ہیں اور اپنے ظلم وزبردستی کا ہاتھ مسلمانوں کے مال وآبرو پر دراز کرنا شروع کر دیا ہے۔اس لئے ہم خدا کی طاقت اور تائید پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے مذہب کے احکام پر عمل کرتے ہیں۔" (۱)

اس کے بعد جہاد کی آیتیں لکھ کر اس کے لئے جھنجھوڑا ہے۔(۲)

اس اعلان جہاد کو سلطان نے اپنی مملکت کے چپہ چپہ میں عام کیا۔اس کے لئے قاضیوں اور گورنروں کو حکم نامے بھیجے۔علماء کرام اور سجادہ نشینوں کو خطوط لکھے کہ زیادہ سے زیادہ اس کو پھیلا کر عوام میں جوش جہاد پیدا کیا جائے۔اور انگریزوں سے لڑنے کے لئے آمادہ کیا جائے۔

سلطان نے نہ صرف اپنی رعایا بلکہ ہندوستان بھر کے بااثر لوگوں کے پاس اس اعلان جہاد کے ساتھ اس قسم کے خطوط بھیجے۔اورنگ آباد، حیدرآباد اور بیجاپور کے سجادہ نشینوں اور مشائخ کے نام ایک خط میں تحریر کرتا ہے : (۳)

---

(۱) صحیفہ ٹیپو سلطان صفحہ ۵۲۰۔

(۲) پورا اعلان جہاد بطور ضمیمہ منسلک ہے۔

(۳) جنکے نام یہ خط ہے وہ یہ ہیں۔غلام حسین (اورنگ آباد) سجاد صاحب وابن صاحب (حیدرآباد) شیخین صاحب معصوم صاحب (بیجاپور) نیز ملاحظہ ہو صحیفہ ٹیپو سلطان صفحہ ۵۱۷۔

''خدمت والا میں ایک اعلان ملفوف ہے۔اس اعلان کو اسی یقین کے ساتھ بھیجا جاتا ہے کہ آپ دین اسلام کو ترقی دینے اور نصرانیوں کو نیست ونابود کرنے میں ہر طرح کی ممکنہ کوشش عمل میں لائیں گے۔اس اعلان کو یہاں کے عالموں نے آیات قرآنی اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حوالہ دے کر مرتب کیا ہے۔امید ہے کہ آپ خود اس پر عمل کرتے ہوئے اس کی ہر جگہ اشاعت بھی کریں گے۔''(۱)

جہاں ٹیپو نے سجادہ نشینوں کو ان کی خانقاہوں اور خلوت گاہوں سے نکال کر میدان جہاد میں لا کھڑا کرنے کی کوشش کی، وہیں ملک کے نامی جنرلوں اور کمانڈروں کے پاس بھی یہ اعلان بھیج کر ان کی غیرت ملی بیدار کر کے انگریزوں کے خلاف متحد ہو کر صف آرا ہونے دعوت دی۔محمد بیگ خاں ہمدانی جو دہلی میں نجف خاں کا سب سے بڑا کمانڈر تھا اور اس کی وفات کے بعد بہت بارسوخ ہو گیا تھا اور شاہ عالم پر کافی اثر رکھتا تھا کو اس کی ایک نقل بھیج کر خط میں تحریر کرتا ہے:

''ہمارے اپنے دین پاک کی مدد کے لئے ضروری ہے کہ تمام مسلمان متحد ہو جائیں۔اور نصرانیوں کی سرکوبی کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھیں، تاکہ دین محمدی دن بدن ترقی پذیر ہو۔مسلمانوں پر جو برا وقت آیا ہے اسکا بڑا سبب سلطنت ہندوستان (دہلی) کی کمزوری ہے۔اگر مسلمان اب بھی متحد ہو جائیں تو اگلی شان وشوکت پھر آسکتی ہے۔اور اس وقت ان نصرانیوں کو کہیں پناہ نہ مل سکے گی۔لہذا امیران اسلام کو ایسی کارروائی نہ کرنا چاہئے کہ روز فردا میں پیغمبر علیہ السلام کے سامنے شرمسار ہوں۔''(۲)

---

(۱) صحیفہ ٹیپو سلطان صفحہ ۳۳۸، خط نمبر ۲۷۶۔کرک پیٹرک اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے سلطان نے دوسروں کی رعایا کو اکسانے کی حد درجہ کوشش کی۔اور اس نے اسی قسم کے خطوط اور اعلانات تمام ہندوستان میں ہر جگہ جہاں درگاہیں تھیں روانہ کئے۔

(۲) صحیفۂ ٹیپو سلطان صفحہ ۳۸۸، خط نمبر ۳۳۲۔

اسی طرح بہت سے بزرگوں کو اپنی فتح ونصرت کی دعا کے لئے خطوط لکھے۔اس اعلان جہاد کے علاوہ سلطان نے اس مقصد کے لئے بہت سی کتابیں لکھوائیں۔جن میں سب سے مشہور تحفۃ المجاہدین (فتح المجاہدین) ہے اس کتاب میں جہاد کے اصول احکام اور فوجی اصول وضوابط کے علاوہ خاص طور پر مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دلائی گئی ہے۔

دوسری کتاب مؤید المجاہدین ہے۔سلطان نے مسلمانوں کو جہاد پر آمادہ کرنے کے لئے نئے خطبات کی تدوین کا حکم دیا تھا۔اس میں ۴۸ جمعہ کے خطبوں کے علاوہ عیدین کے دو خطبے ہیں۔ہر خطبہ میں مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دی گئی ہے۔(۱)

ایک کتاب وعظ المجاہدین کے نام سے ہے اسمیں متعدد قرآنی آیات کے حوالہ سے نصاریٰ وغیرہ سے جہاد کرنے اور ان کو ختم کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔(۲)

اسی طرح ایک اور کتاب زاد المجاہدین ہے اس میں جہاد کے فضائل وغیرہ بیان کئے گئے ہیں۔(۳)

ان کتابوں کی وسیع پیمانہ پر اشاعت کر کے عوام میں روح جہاد پیدا کرنے اور انگریزوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کا جذبہ پیدا کر کے اس کے لئے تگ ودو کرنے پر آمادہ کرنے کوشش کی گئی۔اس سلسلہ میں ٹیپو کا حیرت انگیز کارنامہ ایک اردو اخبار کا اجرا ہے۔۱۷۹۴ء میں جب اس کی آدھی سلطنت انگریزوں کے قبضہ میں جا چکی تھی، اور وہ مملکت کی از سر نو تنظیم میں مصروف تھا تو اس نے ایک پریس قائم کیا کہ یہ عوام میں بیداری کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔اسی سال اردو میں ''فوجی اخبار'' کے نام سے ایک ہفت روزہ اخبار جاری کیا گیا جو سلطان کی ذاتی نگرانی اور سرپرستی میں نکلتا تھا۔اس میں سلطنت کے مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے سپاہیوں کے نام سلطان کی ہدایت شائع ہوتی تھی۔نیز اس میں جہاد کے متعلق مضامین اور وطن کے دفاع کی فرضیت اور جنگ

---

(۱) تاریخ سلطنت خداداد صفحہ ۵۱۵۔وسیرت سلطان ٹیپو سلطان صفحہ ۴۸۲۔۴۸۳۔

(۲) سیرت سلطان ٹیپو شہید صفحہ ۴۹۳۔

(۳) اس کا ایک نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ میں راقم کی نظر سے گزر چکا ہے۔کتاب بہت خوش خط لکھی ہوئی ہے۔مصنف نے دیباچہ میں پورے دو صفحات میں سلطان کے القاب بیان کئے ہیں۔

آزادی کی اہمیت وضرورت پر مختلف لوگوں کی تحریریں شائع ہوتی تھیں۔ یہ اخبار سلطان کی شہادت تک مسلسل پانچ سال شائع ہوتا رہا۔(۱)

ترک موالات

بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ہندوستان بھر میں تحریک ترک موالات یا نان کوآپریشن کا غلغلہ تھا۔ یعنی انگریزوں کا کلی طور پر اقتصادی بائیکاٹ کیا جائے۔ ان سے خرید وفروخت کا کوئی معاملہ نہ کیا جائے۔ اس وقت وہ ایک نئی چیز معلوم ہوئی۔ مگر دراصل اس کی بنیاد اس سے ۱۳۵ سال قبل ٹیپو سلطان نے ڈالی تھی۔ ٹیپو نے عنان حکومت سنبھالنے کے بعد اطمینان کا سانس لیتے ہی اس پر عمل درآمد شروع کیا تھا۔ اور انگریز تاجروں سے خرید وفروخت کی سختی سے ممانعت کردی تھی۔ ۱۶/ جنوری ۱۷۸۶ء کو امام مسقط کے نام لکھے ہوئے خط میں بھی اس کا ذکر ہے۔(۲)

۲ر فروری ۱۷۸۷ء کو کالی کٹ کے فوجدار ارشد بیگ خاں کو خط لکھا :

> ''تم کو چاہئے کہ کالی کٹ کے تمام تاجروں اور باشندوں کو سخت حکم دو کہ جو انگریز تاجر وہاں آیا ہوا ہے، اس سے نہ کوئی چیز خریدو، اور نہ کوئی چیز اس کے ہاتھ فروخت کرو۔ اگر ایسا کیا گیا تو ظاہر ہے کہ وہ کتنا عرصہ وہاں ٹھہرے گا۔ آخر میں مایوس ہو کر وہاں سے خود ہی چلا جائے گا۔''(۳)

حد یہ ہے کہ وہ یورپین دواؤں تک کے استعمال کا روادار نہیں تھا۔ ۲۱ر دسمبر ۱۷۸۵ء کو فراست خواجہ اعتمادی کے نام ایک خط میں لکھتا ہے :

> ''تمہاری مرسلہ فہرست ادویات میں چند ایسے عطریات کے نام

---

(۱) ملاحظہ ہو سیرت سلطان ٹیپو شہیدؒ صفحہ ۴۹۷۔
قابل لحاظ بات یہ ہے کہ یہ اردو کا سب سے پہلا اخبار ہے۔ حالاں کہ اردو صحافت کی تاریخ لکھنے والوں نے اس کا ذکر ہی نہیں کیا ہے۔

(۲) ملاحظہ ہو صحیفہ ٹیپو سلطان صفحہ ۲۹۴، خط نمبر ۲۰۷۔

(۳) ایضاً صفحہ ۵۱۳۔ خط نمبر ۴۳۰۔

ہیں جو یورپین ملکوں کی پیداوار ہیں، لہٰذا حکیم محمد بیگ سے مشورہ کر کے تم ان کے بجائے یونانی ادویات تجویز کرو۔(۱)

ٹیپو ذاتی طور پر بھی اس پر بہت سختی سے کاربند تھا۔اس نے عمر بھر سوائے اپنے ملک کے بنے ہوئے کپڑوں کے دوسرے ملک کے کپڑے استعمال نہیں کئے۔مدراس کا نمک بھی وہ استعمال نہیں کرتا تھا اس لئے کہ وہاں انگریزوں کا قبضہ تھا۔اس کی یہ وطن دوستی اور انگریز دشمنی اس حد تک تھی کہ جب بنگلور کے چند تاجروں نے مدراس سے نمک منگوایا تو اس نے حکماً اس کی فروخت بند کر دی۔اور ان تاجروں کو نمک واپس کرنے پر مجبور کیا۔(۲)

وہ ہتھیاروں میں بھی ہمیشہ اپنی سلطنت کے بنے ہوئے ہتھیار ہی کو ترجیح دیتا تھا۔(۳) شہادت کے بعد اس کے قلعہ سے بے شمار اسلحہ برآمد ہوا۔اس میں تقریباً ایک ہزار توپیں تھیں۔صرف اکیاون توپیں یورپی ساخت کی تھیں۔بقیہ جس قدر توپیں، بندوق اور دیگر اسلحہ تھے،وہ سب سلطانی کارخانوں کے بنے ہوئے تھے۔(۴)

اس میدان میں اس کی سبقت کا سب کو اعتراف کرنا پڑا۔میتھک سوسائٹی جرنل کا شمارہ اکتوبر ۱۹۱۹ء صفحہ ۳۵ پر سردار کنت راج ارس (سابق دیوان میسور) نے لکھا ہے کہ جس تحریک کو آج سودیشی تحریک کہا جاتا ہے،اس کی بنیاد ٹیپو سلطان ہی نے ڈالی تھی۔اور اس سے اس کا مقصد اپنے ملک کو غیروں کی محتاجی سے بچانا تھا۔(۵)

(۱) صحیفہ ٹیپو سلطان صفحہ ۲۷۶،خط نمبر ۱۸۳۔

(۲) ایضاً صفحہ ۲۷۷۔

(۳) اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کی فوج میں کوئی نقص تھا۔بلکہ انگریزی فوج کے سپہ سالار کرنل آرتھر ولزلی نے خود اعتراف کیا ہے کہ سلطان کی کیولری (سوار فوج) دنیا میں سب سے بہترین فوج ہے۔(ماڈرن میسور صفحہ ۱۹۴ بحوالہ تاریخ سلطنت خداداد صفحہ ۵۱۱) حقیقت یہ ہے کہ اس نے خود اپنی مملکت میں ایسے ہتھیار تیار کئے تھے جو یورپین ہتھیار سے زیادہ کارگر تھے۔میجر ڈبسن کے الفاظ میں سرنگا پٹنم میں توپیں ڈھالی جاتی تھیں جو کسی طرح یورپ کی بنائی ہوئی توپوں سے کم درجہ پر نہیں تھیں۔بلکہ مار میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی توپوں سے زیادہ فاصلہ پر مارنے والی تھیں۔(تاریخ سلطنت خداداد صفحہ ۴۶۷۔)

(۴) ایضاً صفحہ ۴۶۷۔

(۵) صحیفہ ٹیپو سلطان صفحہ ۲۷۷۔

میدان جنگ میں

اس کی پوری زندگی انگریزوں کے ساتھ میدانی جنگ سے عبارت ہے۔ٹیپو نے زمام حکومت ہاتھ میں لی تو اس وقت وہ میدان جنگ میں انگریزوں سے برسر پیکار تھا۔اور بڑے بڑے جنرلوں کو شکست پر شکست دے رہا تھا۔اس سے بے بس ہو کر فتح وشکست کے فیصلے سے قبل انگریزوں نے انتہائی شاطر مزاجی سے کام لیتے ہوئے صریح شکست کے داغ بدنامی سے بچنے کے لئے صلح کی پیش کش کی۔جسے سلطان نے منظور کرلیا(۱)۔ اور ۱۱رمارچ ۱۷۸۴ء کو منگلور میں معاہدہ صلح پر دستخط ہوئے۔جس میں یہ طے پایا کہ دوسری جنگ سے قبل جو علاقے جس کے قبضہ میں تھے، اسی طرح بحال رکھے جائیں۔مگر یہ صلح ٹیپو کی کھلی فتح تھی۔خود انگریزوں نے کھلے لفظوں اسے اپنی شکست تسلیم کیا ہے۔(۲)

کارنوالس کی بدعہدی اور ٹیپو کے خلاف سازشیں

اس شکست کا بدلہ لینے کے لئے انگریز بے چین تھے۔وارن ہسٹنگز کی جگہ گورنر جنرل کے عہدہ پر لارڈ کارنوالس کا تقرر ہوا۔اور اسی زمانہ میں جنرل میڈوز کو مدراس کا گورنر بنایا گیا۔یہ دونوں انتہائی شاطرانہ دماغ رکھتے تھے۔پھر کارنوالس جس نے

(۱) اس پر محمود خاں بنگلوری نے لکھا ہے "سلطان باوجود فاتح ہونے کے جب اس کے دشمنوں نے اس کے آگے سر جھکا دیا تو اپنی دریا دلی سے بغیر تاوان جنگ یا کوئی حصہ ملک لینے کے صلح کے لئے رضامند ہو گیا۔کیا اس سے بڑھ کر دریا دلی اور فراخ حوصلگی کا ثبوت تاریخ اور کوئی دیتی ہے۔تاریخ سلطنت خداداد صفحہ ۲۰۹۔

(۲) مؤرخ سنکلیر اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ انگریزوں نے جب صلح کی درخواست کی تو سلطان کا پیمانہ غرور لبریز ہو گیا۔اس کی منہ مانگی مراد بر آئی۔کیوں کہ اس کا دشمن اس کے آگے سر جھکائے ہوئے طالب صلح تھا۔انگریزوں کا اس وقت ہندوستان میں اس قدر برا حال تھا کہ نظام اور مرہٹے اگر اس وقت سلطان کے ساتھ مل جاتے تو ہندوستان کی تاریخ کچھ اور ہی ہوتی۔یہی وہ شکستیں ہیں جن کی خبریں جب انگلستان میں ملیں تو وہاں ایک سراسیمگی پھیل گئی۔ایسٹ انڈیا کمپنی کی ساکھ گر گئی۔انگریزی مائیں اپنے بچوں کو ٹیپو کے نام سے ڈرانے لگیں۔پٹ جو وزیراعظم تھا اس نے اپنی شکستوں کا انتقام لینے کے لئے کارنوالس کو گورنر جنرل بنا کر بھیجا۔(امپائر ان ایشیاء از میجر ٹارنس بحوالہ صحیفہ ٹیپو سلطان صفحہ ۲۱۸۔۲۱۹۔)

امریکہ میں برطانوی مقبوضات کھوئے تھے، اپنی بدنامی کو مٹا کر شہرت حاصل کرنے کے لئے مضطرب تھا۔ اسے یقین تھا کہ ٹیپو سلطان کو میدان جنگ میں شکست نہیں دی جا سکتی۔ ایل بی بورنگ لکھتا ہے کہ دسمبر ۱۷۹۰ء کے آخری دنوں میں ٹیپو کی مہارت جنگ اور کامیابیوں کی وجہ سے انگریزوں کی حالت اس درجہ پر پہنچ گئی کہ ان کی پوری فوجوں کے تباہ ہو جانے کا اندیشہ لاحق ہو گیا۔

یہ خبریں جب کلکتہ میں کارنوالس کو پہنچیں تو وہ گھبرا گیا۔ ''رائز آف دی کرسچین پاور ان انڈیا'' کا مصنف لکھتا ہے کہ ''جب حالات اس قدر تاریک ہو گئے تو لارڈ کارنوالس نے یہی بہتر سمجھا کہ بذات خود میدان میں آ کر فوج کی کمان کرے۔(۱)

اس نے آتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ امبور میں کرنل ریڈ کے ماتحت سلطان کے امراء و وزراء سے سازشیں کرنے کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا۔(۲)

اس سے پہلے جنرل میڈوز نے ۱۷۹۰ء میں نظام اور مرہٹہ کو اپنے ساتھ ملا کر ٹیپو کے خلاف ایک معاہدہ کیا تھا۔ دوسری طرف میسور کے سابق حکمراں خاندان سے بھی ساز باز کیے ہوئے تھا۔(۳)

یہ صلح نامہ منگلور کی صریح خلاف ورزی تھی۔ جس کی ایک بنیادی دفعہ یہ تھی کہ ایک دوسرے کے دشمنوں کی علانیہ یا خفیہ طور پر کسی قسم کی مدد نہ کریں۔ مگر انگریز اب ٹیپو کے دشمنوں کے ہاتھ مضبوط کر رہے تھے۔ اور ان سے مل کر ٹیپو کے خلاف سازش کر رہے تھے۔ خود انگریز مؤرخین نے صاف اعتراف کیا ہے کہ ٹیپو کی طرف سے کوئی بدعہدی کی بات پیش نہیں آئی۔ کارنوالس کے مداح سر جان میلکم کو بھی لکھنا پڑا:

> ''اگرچہ اس وقت ٹیپو سلطان نے کمپنی یا اس کے حلیفوں کے خلاف کسی علانیہ مخاصمت کا اظہار نہیں کیا تھا، تاہم اس کا طرز عمل ضرور ایسا رہا ہوگا جس کی وجہ سے لارڈ کارنوالس کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ وہ لازمی طور پر مخاصمانہ ارادے رکھتا ہے۔ ورنہ گورنر جنرل حیدر آباد

---

(۱) ملاحظہ ہو صحیفہ ٹیپو سلطان صفحہ ۱۴۱۔
(۲) ایضاً صفحہ ۱۴۲۔
(۳) تفصیل کے لئے دیکھئے تاریخ سلطنت خداداد صفحہ ۳۶۷-۳۷۶۔

سے اس قسم کا سیاسی معاہدہ نہ کرتا جس کی حیثیت ازروئے انصاف سلطان ٹیپو کے خلاف ایک دفاعی معاہدہ سے کہیں زیادہ معلوم ہوتی ہے۔"(۱)

کرنل ولکس نے اس سے زیادہ صراحت کے ساتھ بغیر کسی تاویل کا سہارا لئے کھل کر اپنی تاریخ میسور میں لکھا ہے :

"کارنوالس جیسے سیاست داں اور انصاف پسند شخص سے یہ امید نہ تھی کہ اس طرح بدعہدی کرے گا۔"

یہ خبریں جب انگلستان پہنچیں تو مسٹر فاکس نے پارلیمنٹ میں کہا :

"کارنوالس نے لٹیروں کا ایک جتھا تیار کیا ہے اور اس کے ذریعہ سے وہ حقداروں کا حق لوٹ رہا ہے۔"(۲)

جب میدان ہموار ہوا اور فضا سازگار ہوئی، تو انگریزی فوجیں اعلان جنگ کئے بغیر خفیہ طور پر مملکت میسور میں داخل ہوتی ہیں، اور اس کی فتح کے بعد سرنگاپٹنم کی طرف بڑھتی ہیں۔ پہلے پہل شکست کھاتی ہیں۔ پھر مرہٹوں کی مدد سے شکست خوردہ اور سراسیمہ فوج میں جان پڑ جاتی ہے اور انگریز نظام و مرہٹہ متحدہ افواج سرنگاپٹنم کا محاصرہ کرتی ہیں۔ اور اندرونی سازشوں کی وجہ سے محاصرہ اتنا طول کھینچتا ہے کہ سلطان صلح پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور نتیجۃً اس کی آدھی سلطنت اس کے ہاتھ سے نکل کر اتحادیوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ اور بطور تاوان جنگ تین کروڑ روپئے اتحادیوں کو ادا کرتا ہے اور روپئے وصول ہونے تک دو شہزادے انگریزوں کے پاس بطور یرغمال رکھے جاتے ہیں صلح کی تاریخ ۲۳ر فروری ۱۷۹۲ء ہے یہ معاہدہ سرنگاپٹنم کے نام سے معروف ہے۔

آخری جنگ اور سلطان کی شہادت

روپئے ادا ہو کر ۱۷۹۶ء میں شہزادے واپس آتے ہیں اور معاہدہ صلح کی تکمیل ہوتی ہے۔ سلطان معاہدہ پر پوری طرح کاربند رہتے ہوئے سلطنت کی ازسرنو تنظیم کی طرف

(۱) سیاسی تاریخ ہند صفحہ ۵۱-۵۲۔

(۲) ملاحظہ ہو صحیفہ ٹیپو سلطان صفحہ ۴۲-۴۳۔

توجہ کرتا ہے۔اس کی حالت پہلے سے بدرجہا بہتر ہوتی ہے،تو انگریزوں کی آنکھوں میں خار بن کر کھٹکنے لگتی ہے، اور وہ پیچ وتاب کھانے لگتے ہیں اور آخری فیصلہ کن جنگ کی تدبیریں سوچنے لگتے ہیں۔اسی دوران لارڈ ماننگٹن (مارکوئیس آف ولزلی) گورنر جنرل بن کر ہندوستان آتا ہےاور بڑی چابکدستی سے جنگ کی طرف پیش قدمی کرتا ہے۔جنگی تیاریوں سے سلطان کو غافل رکھنے کی پوری کوشش کی جاتی ہے۔ادھر سلطان کے بھی بیرونی ممالک سے روابط میں تیزی آگئی تھی۔ٹیپو کوایک آزاد حکمراں کی حیثیت سے اس کا پورا اختیار تھا کہ جس سے چاہے معاہدہ کرے۔مگراسی کو بہانہ جنگ بنایا جاتا ہے اور ولزلی، ٹیپو کے نام خط میں یہ الزام لگاتا ہے کہ وہ فرانسیسیوں کے ساتھ مل کر انگریزوں کو تباہ کرنا چاہتا ہے۔اب کیا تھا مارچ ۱۷۹۹ء میں مسلح انگریزی افواج جنرل ہیرس کی کمان میں میسور کی طرف مارچ کرتی ہیں۔حیدرآبادی فوج بھی اس کے ساتھ ہوتی ہے۔وزراء اور امراء خوشگوار مستقبل کی امید میں اپنا ضمیر بیچ کر ٹیپو سے غداری کرتے ہیں اور انگریزی فوج بغیر کسی مزاحمت کے دارالسلطنت سرنگا پٹنم پہنچ جاتی ہے۔اور وزراء کی رہنمائی میں شہر کا مکمل محاصرہ کرلیتی ہےاور قلعہ تک اس کی رسائی ہے۔

آج ۴رمئی (۱۷۹۹ء) ہے۔سلطان حسب معمول مسجد اعلیٰ میں باجماعت فجر کی نماز ادا کرتا ہے۔نماز کے بعد سلطان کے پرائیویٹ سکریٹری میر حبیب اللہ نے عرض کیا۔وقت کا تقاضا ہے کہ حضور جان عزیز پر رحم فرمائیں اور شہزادوں اور شہزادیوں کی یتیمی واسیری کا تصور فرمائیں۔یعنی صلح کے لئے وہ آمادہ کرنا چاہتے تھے۔سلطان نے غیرت مندانہ اور مومنانہ جواب دے کران کو خاموش کردیا :

"یہ ملک خداداد ہماری رعایا اور بالخصوص مسلمانوں کی ملکیت ہے۔ہم نے سالوں اس کی حفاظت کی فکر کی اور اس کو بچانے کی تدبیریں کیں۔مگر وزراء اور افسران درپردہ اس کی تباہی میں لگے رہے۔اب اپنے اعمال کا مزہ چکھنا ضروری ہے۔جہاں تک میری ذات کا سوال ہے میں اپنی ذات، جان ومال اور اولاد کو دین محمدی پر نثار کرچکا ہوں۔انسان کو صرف ایک دفعہ موت آتی ہے۔اس سے ڈرنا

لا حاصل ہے۔ یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ کب اس کو موت آئے گی۔ دو سو سال بکری کی طرح جینے سے شیر کی طرح دو دن کی زندگی گزارنا پسند کرتا ہوں۔"(۱)

کچھ ہی دیر میں سورج طلوع ہوتا ہے اس میں بڑی تمازت ہے مگر وہ چمک اور روشنی نہیں جیسے کچھ ہی دیر میں وہ گہنا جائے گا۔

دوپہر کا وقت ہے سلطان قلعہ کی فصیلوں کا معائنہ کر کے خاصہ تناول کرنے کے لئے ایک سایہ دار درخت کے زیر سایہ بیٹھا ہے۔ ابھی ایک ہی لقمہ اٹھایا تھا کہ شور اٹھا کہ وفادار عبدالغفار شہید ہو گئے۔ سلطان نے سنتے ہی دستر خوان سے ہاتھ اٹھایا اور فرمانے لگا۔ عبدالغفار ایک بہادر شخص تھا۔ بہادر موت سے نہیں ڈرتے۔(۲)

ابھی ہم بھی کچھ ہی دیر کے مہمان ہیں۔ یہ کہہ کر ہاتھ دھوئے بغیر اٹھا۔ تلوار سنبھالی۔ دونالی بندوق تھام گھوڑے پر سوار دشمن کی طرف چل پڑا۔ راستے میں نمک حرام اور ضمیر فروش وزراء ملے۔ ان پر ایک حسرت بھری نگاہ ڈالی اور کہا۔ ایسی بات نہیں کہ ہم تمہاری غداری سے واقف نہیں۔ تم اپنی اس غداری اور بے وفائی کا جلد ہی مزہ چکھو گے۔ تمہاری آئندہ آنے والی نسلیں تمہارے سیاہ کارناموں کی نحوست سے ذلیل وخوار ہو کر دانہ دانہ کی محتاج ہوں گی۔(۳)

میر صادق نے فوراً انگریزوں کو اطلاع بھیجی کہ سلطان قلعہ سے نکل کر فلاں دروازہ کے قریب ہے، ادھر میدان خالی ہے، آجائیں۔ چنانچہ تمام انگریزی فوج فصیل پر چڑھ کر نہایت آسانی کے ساتھ قلعہ میں داخل ہو گئی۔ غدار وطن میر قاسم علی رہنمائی کے لئے سب سے آگے تھا۔ اب کیا تھا، سخت رن پڑا اور دوبدو جنگ ہونے لگی۔ بڑی بے جگری سے سلطان لڑتا رہا۔ بہت دیر سے مدافعت کرتے ہوئے پیچھے ہٹ کر قلعہ میں داخل ہونا چاہا، تو دروازہ بند پایا۔ دوسرے دروازے کی طرف گیا، تو غدار اس پر انگریزوں کا قبضہ کرا چکے تھے۔ اب سلطان تین طرف سے محصور تھا۔ پھر بھی دشمنوں پر

(۱) ملاحظہ ہو صحیفۂ ٹیپو سلطان صفحہ ۳۷۷۔ ۳۷۸۔

(۲) ایضاً صفحہ ۳۷۹۔

(۳) سیرت سلطان ٹیپو شہید صفحہ ۳۲۴۔ و تاریخ سلطنت خداداد صفحہ ۳۰۱۔

مسلسل فائر کئے جارہا تھا جس سے پانچ انگریزی فوج کے سپاہی اسی وقت ڈھیر ہوگئے۔گولیوں کی بوچھار سے سلطان پر بھی کئی زخم آئے۔وفاداروں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔مرد تو مرد ہندو مسلم خواتین بھی بڑی تعداد میں وطن پر قربان ہوچکی تھیں۔مغرب کا وقت تھا۔گھسان کی جنگ ہورہی تھی۔دو گولیاں سلطان کو لگ چکی ہیں۔گھوڑا زخم کھا کر بیٹھ گیا ہے۔اس وقت جب موت سر پر کھڑی ہے۔اس کا نو مسلم خادم راجہ خان کہتا ہے۔

اگر اب بھی جناب انگریزی سردار کے پاس چلے جائیں،اور اپنی جان کی حفاظت کے لئے خود کو اس کے حوالہ کریں،تو ضرور وہ جناب عالی کے منصب کا خیال رکھ کر جاں بخشی کرے گا۔

اس وقت سلطان نے جو جواب دیا وہ دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔اس نے کہا ''گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی اچھی ہے''

یہ کہہ کر دشمن کی صفوں میں گھس گیا۔دوپہر سے لڑ رہا تھا۔چلچلاتی دھوپ تھی۔اب شام کے سات بج رہے تھے۔پیاس سے نڈھال ہورہا تھا۔خادم راجہ خان سے پانی مانگا اس کے پاس چھاگل تھی مگر اس نے انکار کردیا۔پلٹ کر پھر سوال کیا،مگر اب بھی اس کا دل نہیں پسیجا۔اور اس نے ایک قطرہ پانی نہیں دیا(۱) اتنے میں دل کے قریب ایک گولی لگی۔اور سلطان زمین پر گر گیا۔دشمن قریب آئے تو غیرت نے اس کو پھر اسی حالت میں کھڑا کردیا۔کئی دشمنوں کو جہنم رسید کیا۔ناگاہ ایک گولی سلطان کی کنپٹی پر لگی جس سے وہ زمین پر آلیا اور روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی (۲)۔اور عین غروب شمس کے وقت یہ آفتاب حریت بھی ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔اور اقبال کے الفاظ میں ترکش کا جو آخری تیر تھا وہ بھی ختم ہوگیا۔

ترکش مارا خدنگ آخریں

---

(۱) سلطان ٹیپو کو حضرت حسینؓ سے بڑی عقیدت تھی۔تو اللہ نے انہیں کی طرح موت نصیب فرمائی۔ آخری وقت میں ٹیپو کی وہی کیفیت ہوئی تھی جو حضرت حسین کی تھی۔محمود خاں محمود بنگلوری نے صحیفۂ ٹیپو سلطان میں بڑے اچھے انداز میں دونوں کا تقابل کر کے دکھایا ہے (ملاحظہ ہو صفحہ ۲۴۷-۳۷۷)

(۲) جنگوں کی جزئی تفصیلات محب الحسن نے اپنی کتاب میں سینکڑوں صفحات میں بیان کی ہیں۔

اور اس دن بارہ ہزار جاں نثار وطن پر قربان ہوئے۔ سلطان کی روح پکار پکار کر کہہ رہی ہے اور اس کے ہر بن مو سے یہ صدا آ رہی ہے۔

آغشتہ ایم ہر سر خارے بہ خون دل
قانون باغبانی صحرا نوشتہ ایم

اور اس شعر نے کثرت استعمال سے اپنی معنویت کھو دی ہے مگر پھر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے گویا شاعر نے سلطان ٹیپو کی روح کو مخاطب کر کے کہا ہو ۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن (۱)
خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

ٹیپو کی شہادت پر انگریزوں کے تاثرات

ٹیپو کی شہادت اور سلطنت خداداد کا سقوط ہندوستان میں انگریزوں کی سب سے بڑی کامیابی تھی۔ اور اسی وقت ان کو جرأت ہوئی کہ وہ ہندوستان پر اپنا دعویٰ کر سکیں۔ چنانچہ جنرل ہیرس (۲) کو سلطان کی شہادت کی خبر پہنچی تو لاش کے پاس آ کر فرط مسرت سے پکار اٹھا :

آج ہندوستان ہمارا ہے

لارڈ ولزلی کو سر جان انیس تھروٹرا یک خط میں لکھتا ہے :

''ہماری تاریخ ہندوستان کا سب سے نمایاں، سب سے شاندار اور سب سے بڑا کارنامہ اس طرح آپ کے ہاتھوں انجام پانے پر میں آپ کو تہ دل سے مبارک باد دیتا ہوں۔'' (۳)

---

(۱) مگر آج اس کی اولاد کلکتہ میں تنگدستی کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ کچھ تو پیٹ کے لئے رکشہ چلانے پر مجبور ہیں۔ نہ مرکزی سرکار کو ان کی کوئی فکر ہے، نہ ریاستی حکومت کو ان کے ساتھ کوئی ہمدردی ہے۔ (اولاد کے بارے میں تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو خورشید مصطفیٰ رضوی : شیر ہندوستان ص ۲۱۵-۲۲۱)

(۲) عام اردو کتابوں میں ''ہارس'' لکھا ہے۔ انگریزی میں (Harris) ہے۔ اس لئے اردو میں اس کا املا ''ہیرس'' زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے، اسی لئے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی کتابوں میں اسی کو ترجیح دی گئی ہے۔

(۳) تاریخ سلطنت خداداد، صفحہ ۳۵۰۔

اسکاٹ نے بھی اس واقعہ کو یورپینوں کے ہندوستان میں ورود سے لے کر اس وقت تک کا سب سے بڑا واقعہ قرار دیا ہے۔(۱)

ایک انگریز مؤرخ نے اس فتح پر یوں رائے دی ہے :

> ''ہندوستان میں انگریزوں کی راہ میں ٹیپو ہی ایک سنگ گراں تھا۔''(۲)

سرجان میلکم ٹیپو کے بارے میں لکھتا ہے :

> ''برطانوی حکومت کا ہندوستان میں خاتمہ کرنا اس کا خاص مقصد تھا۔اور وہ ہمیشہ اسی ادھیڑ بن میں لگا رہتا تھا۔''(۳)

لارڈ ولزلی کی ہمت اس کے بعد اتنی بلند ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے ایک دوست کو خط میں لکھتا ہے :میں ہندوستان میں اپنی فتوحات کا دائرہ اس قدر وسیع کروں گا کہ خود ڈائرکٹران کمپنی ہندوستان پر رحم کرنے کے لئے درخواست کریں گے۔

اور ڈائرکٹران کمپنی کو ایک مراسلہ میں لکھتا ہے :

> ''ٹیپو کی موت اور اس کی سلطنت کا خاتمہ دیگر ہندوستانی حکمرانوں کے لئے ایک ایسا سبق ہے کہ وہ آئندہ ہمارے خلاف کچھ کرنے کی جرأت نہ کر سکیں گے۔''(۴)

۶ رفروری ۱۸۰۰ء کو لارڈ ولزلی نے کلکتہ پہنچ کر فتح کی خوشی میں ایسا شاندار جلوس نکالا کہ انگریزوں کا ایسا زبردست جلوس ہندوستان کی تاریخ میں نہیں نکلا تھا۔اور اس جلوس کو مذہبی رنگ دیا گیا۔جنرلوں اور سپہ سالاروں کو خطابات سے نوازا گیا اور ہر سپاہی کو علاوہ انعامات کے تمغے بھی دیئے گئے۔(۵)

فوج میں تقسیم کئے جانے والے انعامی فنڈ کی مجموعی رقم بیس لاکھ پونڈ تھی۔ان میں سے ۴۲،۹۰۲ پونڈ ہیرس کو ملے۔(۶)

(۱) تاریخ ٹیپو سلطان ص ۴۳۷

(۲) صحیفۂ ٹیپو سلطان صیحفہ ۴۷۔

(۳) سیاسی تاریخ ہند صفحہ ۱۷۷۔

(۴) تاریخ سلطنت خداداد صفحہ ۳۵۰۔

(۵) ایضاً صفحہ ۳۵۱۔

(۶) تاریخ ٹیپو سلطان صفحہ ۴۳۵۔

سرنگا پٹنم میں جو مال لوٹا گیا تھا، اس کا کوئی شمار نہیں۔ انگریزی فوج نے شہر کا ایک ایک گھر لوٹا۔ بہت سے گھروں کو نذر آتش کر دیا۔ اور شہریوں کو طرح طرح کی اذیتیں دیں۔ ارتھر ولزلی کے بیان کے مطابق اس رات جو کچھ ہو گیا اس سے زیادہ ممکن نہیں تھا۔ اس قدر مال غنیمت سپاہیوں کے ہاتھ آیا تھا کہ ہر سپاہی اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے کچھ سامان اپنے اس ساتھی کی طرف پھینک دیتا جو اسے راستے میں ملتا۔ بیش قیمت جواہرات اور سونے چاندی کی اینٹیں سپاہی، کیمپ میں فروخت کرنے کے لئے پیش کرتے تھے۔ (۱)

ٹیپو کی سیاست میں شریک بعض علماء و مشائخ

تاریخ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلطان ٹیپو کی فوج میں علماء و مشائخ کی بڑی تعداد تھی۔ ٹیپو نے تو سجادہ نشینوں تک کو میدان جہاد میں لانے کی کوشش کی۔ علماء کو خطوط لکھ کر انگریزوں کے خلاف صف آرا کیا۔ اسی طرح بہت سے وہ علماء تھے جو سلطنت خداداد میں متعدد عہدوں پر فائز تھے۔ اور سلطان کی تدبیروں اور حکمت عملیوں میں شریک۔ اس کے علاوہ ان علماء کی بھی بڑی تعداد تھی جنھوں نے ہزاروں لوگوں میں حب الوطنی کے جذبات پیدا کئے اور انگریزوں کے خلاف لڑنے پر آمادہ کیا۔ مگر تاریخ نے سب کے نام محفوظ نہیں رکھے۔ جن کے نام محفوظ ہیں ان میں سے چند صاحب اثر علماء کا ذکر کیا جاتا ہے۔

مولانا سعید محمد خان نائطی

ان کا تعلق اہل نوائط (۲) سے تھا۔ بہت بڑے عالم تھے۔ بہادری و جرأت میں

---

(۱) تاریخ ٹیپو سلطان صفحہ ۳۴۴۔

(۲) یہ ایک عربی النسل قوم ہے جن کا تعلق قبیلہ قریش سے ہے۔ جو بحیرہ عرب کے ساحلی علاقوں بھٹکل اور مضافات میں آباد ہے۔ نیز میسور، مدراس، حیدرآباد اور گجرات و کوکن کے بعض علاقوں میں بھی ان کی بڑی تعداد ہے۔ اس قوم نے بڑے بڑے علماء و مشائخ پیدا کئے۔ جن میں شیخ فقیہ مخدوم علی مہائمی (متوفی ۸۳۵ھ) مصنف "تبصیر الرحمن و تیسیر المنان فی تفسیر القرآن" المعروف بہ تفسیر مہائمی نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی۔ پھر تیرھویں صدی ہجری میں قاضی بدر الدولہ علامہ صبغۃ اللہ مدراسی (متوفی ۱۲۸۰ھ) ==

بھی بڑی شہرت تھی۔ٹیپو کی فوج کی سرکردگی ان کے ذمہ تھی۔ریاست میسور ہی میں وفات پائی۔(۱)

محمد باقر علی خاں مہکری

اہل نوائط سے تھے۔سلطنت خداداد کے چوٹی کے علماء وشعراء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔دارالسلطنت سرنگا پٹنم میں تمام سلطانی اداروں کی نظامت پر مامور تھے۔ٹیپو کی شہادت کے بعد ۱۸۰۸ء میں میسور کے چیف قاضی مقرر ہوئے۔کتابی شکل میں ان کا دیوان بھی موجود ہے۔(۲)

مولوی میر حبیب اللہ

بڑے علماء دین میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ٹیپو کے پرائیویٹ سکریٹری تھے(۳) شہادت کے دن بھی ساتھ تھے جیسا کہ گزر چکا ہے۔۱۲۲۳ھ میں سرنگا پٹنم میں انتقال کیا۔(۴)

حضرت سید باچھا معروف بہ میر بہادر خاں

ان کا شمار وقت کے مشائخ میں ہوتا تھا۔سلطان نے انہیں بنگلور کے قلعہ کا ناظم مقرر کیا تھا۔انگریز جنرل کارنوالس کی فوج کے مقابلہ میں قلعہ کی حفاظت کرتے ہوئے شہید ہوئے۔(۵)

== اور انکے خانوادہ نے علمی دنیا میں انمٹ نقوش قائم کیے، مشہور عالم و داعی ڈاکٹر حمید اللہ (فاتح فرانس) انہی کے پرپوتے ہیں، جو آج اپنی علمی و دعوتی خدمات کی وجہ سے بین الاقوامی شہرت کے حامل ہیں جنکا ابھی ۱۸ر دسمبر ۲۰۰۲ء کو انتقال ہوا۔محمود خاں محمود بنگلوری نے اپنی دونوں کتابوں تاریخ سلطنت خداداد اور صحیفۂ ٹیپو سلطان میں اس قوم کے بعض افراد کی ٹیپو کے ساتھ غداری کی وجہ سے پوری قوم کو سلطنت خداداد کا دشمن اور اسکے زوال کا اصل محرک ثابت کرنے کی بے جا سعی کی ہے اور اس پر بڑا زور لگایا ہے۔ایک فرد یا بعض افراد کی وجہ سے پوری قوم کو مورد الزام ٹھہرانا کہاں کی دیانت داری ہے؟

(۱) تاریخ النوائط صفحہ ۳۱۱۔وسیرت سلطان ٹیپو شہید۔صفحہ ۵۰۲۔
(۲) سیرت سلطان ٹیپو شہید صفحہ ۵۰۷۔
(۳) صحیفہ ٹیپو سلطان صفحہ ۳۶۷۔ (۴) سیرت سلطان ٹیپو شہید صفحہ ۵۰۴۔
(۵) یہ واقعہ ۷ر ا ر بیع ۱۷۹۱ء کا ہے (تاریخ ٹیپو سلطان صفحہ ۲۸۸)

حضرت سید شاہ فرید الدین شہید

تمل ناڈو کے ضلع ترچنا پلی کے رہنے والے تھے، اپنے عہد کے کبار اولیاء میں آپ کا شمار ہوتا تھا، معاش کے لئے کسی پر تکیہ نہیں کرتے تھے بلکہ خود اپنی روزی کماتے تھے۔ دعوت میں بڑا انہماک تھا۔ اسی بناء پر کفار آپ سے حسد کرنے لگے اور موقع پا کر انہوں نے آپ کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے شہید کر دیا۔ آپ ٹیپو سلطان کی فوج میں جنرل تھے۔ (۱)

حضرت سید مصطفیٰ شہید

چونکہ آپ سلطان ٹیپو شہید کے عہد میں ترچنا پلی آئے تھے اور آپ کے نام کے ساتھ شہید بھی لکھا ہے اس بنیاد پر ڈاکٹر جاوید ہ حبیب نے خیال ظاہر کیا ہے کہ آپ سلطان ٹیپو کی فوج میں رہے ہوں اور لڑتے ہوئے جام شہادت نوش کیا ہو۔ (۲)

حضرت ابراہیم شطاری قادری

یہ مشہور شیخ طریقت تھے۔ عام لوگ ان کو زندہ ولی کہتے تھے۔ لاہور سے نقل سکونت کر کے سلطنت خداداد میں آگئے تھے۔ اور ٹیپو کی فوج میں کمانڈر کے عہدہ پر فائز تھے۔ ان کا مزار کمہار پیٹ بنگلور میں واقع ہے۔

حضرت محب اللہ شاہ قادری

عہد ٹیپو کے مشہور اولیاء میں سے تھے۔ ان کو حضرت بے سر اولیاء کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ ٹیپو کی فوج میں ایک بڑے عہدہ پر فائز تھے۔ ٹیپو ان سے بڑا متاثر تھا۔

(۱) ڈاکٹر جاویدہ حبیب، تاریخ اولیاء تمل ناڈو صفحہ ۱۹۔ مصنفہ نے انہی کے ہم نام ضلع مدراس کے ایک بزرگ کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان کے بارے میں لکھتی ہیں کہ آپ حضرت ٹیپو سلطان شہید کی فوج میں سپاہی تھے اور جام شہادت نوش فرمایا تھا (صفحہ ۱۱۶) ممکن ہے کہ دونوں میں سے کوئی ایک بزرگ سلطان ٹیپو کی فوج میں رہے ہوں، ناموں کے اشتراک کی وجہ سے تذکرہ نگاروں کو اشتباہ ہوا ہو، اور دونوں کو سلطانی فوج کا سپاہی قرار دیا ہو۔

(۲) ایضاً صفحہ ۲۷

انگریزوں کے ساتھ میسور کی کی تیسری جنگ میں شہید ہوئے۔

مولوی غازی خان

حیدر علی کی فوج میں اعلیٰ فوجی افسر تھے۔اور سلطان ٹیپو کے استاد بھی۔نواب حیدر علی کے حکم سے ٹیپو کی فوجی تربیت انہوں نے ہی کی تھی۔وہ ایک کامیاب فوجی افسر کے علاوہ عالم بھی تھے۔(۱)

حسین علی کرمانی

عہد ٹیپو میں علمی میدان میں سب سے ممتاز تھے۔سلطنت خداداد میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے۔اس وجہ سے سلطان کی شہادت کے بعد انگریزوں نے ان کو گرفتار کر کے کلکتہ بھیج دیا۔ایام نظر بندی کے دوران ۱۸۰۶ء میں ان سے حیدر علی و ٹیپو سلطان پر ''نشان حیدری'' کے نام سے فارسی میں ایک کتاب لکھوائی۔جو کسی بھی زبان میں اس موضوع پر پہلی باقاعدہ کتاب ہے۔(۲)

قاضی عمر شہید نائطی

عہد ٹیپو کے مشہور قاضیوں میں تھے۔ادھونی (ضلع بلاری، کرناٹک) کی قضاءت کے عہدہ پر متمکن تھے۔آپ کا علم و فضل اور زہد و تقویٰ دور دور تک مشہور تھا۔(۳)

مولوی محمد محی الدین نائطی

مشہور علماء میں سے تھے۔ٹیپو کے زمانۂ حکومت میں منظر آباد (ضلع ہاسن، کرناٹک) کی قلعہ داری کی خدمت آپ کو تفویض ہوئی تھی۔آخر عمر میں (غالباً سقوط

(۱) ملاحظہ ہو سیرت سلطان ٹیپو شہید صفحہ ۵۰۲۔۵۰۳۔

(۲) چونکہ یہ کتاب زمانہ نظر بندی میں لکھی گئی۔اس لئے ظاہر ہے کہ اس میں بعض وہ باتیں آ گئی ہیں جن کو انگریز کتاب میں شامل کرنا چاہتے تھے۔کرنل ڈبلو مائلس نے اس کا انگریزی میں دو حصوں میں ترجمہ کیا ہے۔ہسٹری آف حیدر نائک اور ہسٹری آف رین آف ٹیپو سلطان۔اس کا اردو میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے جس کو راقم السطور نے دیکھا ہے۔

(۳) تاریخ النوائط صفحہ ۳۶۷۔

سرنگاپٹنم کے بعد) حیدرآباد چلے گئے تھے۔(۱)

مولانا محمد علی

مشہور اور باثر لوگوں میں سے تھے۔ کوڑیال بندر (منگلور) کے امیرالبحر تھے۔(۲)

مولوی محمد صبغۃ اللہ نائطی

مولوی محمد صبغۃ اللہ نائطی الملقب بہ بھانڈے بھونڈے نہایت مدبر اور ذی علم شخص تھے۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت جعفر طیارؓ تک پہنچتا ہے۔ ٹیپو سلطان کے زمانہ میں نواب عیدروس خاں نائطی حاکم قلعہ پاکٹور کے پاس مدارالمہامی کی خدمت آپ کے ذمہ تھی۔(۳)

مولوی حسن علی سعید نائطی

صاحب حیثیت علماء میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ مشاہیر میں سے تھے۔ عہد ٹیپو میں منظرآباد کی قلعہ داری آپ کے سپرد تھی۔(۴)

مولوی محمد حمزہ طاہر شافعی

آپ کا تعلق قوم نوائط سے تھا۔ نہایت مشہور عالم تھے۔ سلطنت میسور میں افتاء کی خدمت آپ کے ذمہ تھی۔(۵)

---

(۱) تاریخ النوائط صفحہ ۳۱۹۔۳۲۰۔

(۲) ایضاً صفحہ ۴۸۲۔ کوڑیال بندر سلطنت خداداد کی مشہور اور اہم بندرگاہ تھی۔ جہاں سے ٹیپو کی کئی سفارتیں روانہ ہوئی تھیں۔

(۳) ایضاً صفحہ ۴۷۴۔

(۴) ایضاً صفحہ ۵۰۲۔ مولوی محمد محی الدین سے پہلے اس منصب پر فائز رہے ہوں گے اس لئے کہ مولوی محی الدین کا سقوط سلطنت کے بعد زندہ رہنا ثابت ہے۔

(۵) ایضاً صفحہ ۳۳۷۔

شاہ ابو سعید حسنی رائے بریلوی

آپ حضرت سید احمد شہیدؒ کے حقیقی نانا تھے۔اور شاہ ولی اللہ کے ان چار شاگردوں میں تھے جن پر شاہ صاحب کو کلی اعتماد تھا۔وہ شاہ صاحب کی دعوت اور پیغام کے پوری طرح حامل تھے۔اس لئے ۱۱۸۷ھ میں جب انہوں نے حج کیا اور ہندوستان واپس آئے تو مدراس میں قیام اختیار کیا اور ایک مدت تک وہاں قیام پذیر رہے(۱) تاکہ جنوب میں شاہ صاحب کے پیغام کی اشاعت ہو اور عوام میں بیداری آئے۔اس عرصہ میں سلطان ٹیپو کے خاندان نے آپ سے بیعت وارادت کا تعلق قائم کیا۔کلکتہ میں سلطان ٹیپو کے اہل خانہ نے اسی تعلق کا حوالہ دے کر سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔۹ر رمضان ۱۱۹۳ھ (ستمبر ۱۷۷۹ء) کو رائے بریلی میں وفات پائی اور وہیں سپرد خاک ہوئے۔

شاہ ابو اللیث رائے بریلوی

آپ شاہ ابو سعید کے صاحبزادے اور سید احمد شہیدؒ کے حقیقی ماموں تھے۔سفر حج میں اپنے والد کے ساتھ تھے۔واپسی میں مدراس میں اترے اور سلطنت خداداد میں مستقل قیام اختیار کیا اور یہیں کے ہو رہے۔۱۲۰۸ھ (۹۴۔۱۷۹۳ء) میں یہیں کوڑیال بندر(۲) (موجودہ منگلور) میں پیوند خاک ہوئے۔انہیں کے زمانہ قیام میں سلطان ٹیپو کی جانشینی عمل میں آئی۔قرائن بتاتے ہیں کہ سلطان نے ان کی بڑی قدر کی۔اس لئے کہ ایک تو وہ سادات کا بے حد احترام کرتا تھا۔دوسرے خانوادہ ولی اللہی بالخصوص شاہ عبدالعزیز کی شہرت اس وقت ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں تھی۔اور ہر کوئی ان سے نسبت اپنے لئے باعث سعادت سمجھتا تھا۔اور سلطان جو خود علم دین کا شائق اور اہل دل کی صحبت کا حریص تھا، وہ کیوں اس کو غنیمت نہ سمجھتا۔اس نے اس دوہری نسبت کی بنیاد پر شاہ ابو اللیث کی بڑی قدر کی۔اور بعید نہیں کہ اس نے باصرار اپنی سلطنت میں ان کو

---

(۱) الإعلام (نزھۃ الخواطر) جلد ۶ رصفحہ ۱۳-۱۴

(۲) ایضاً جلد ۷ رصفحہ ۲۳-۲۴

روکا ہو۔ اور نہ صرف سلطان بلکہ ان کا پورا خاندان شاہ ابوالليث کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گیا۔ سفر حج میں روانہ ہوتے وقت جب حضرت سید احمد شہیدؒ کلکتہ میں مقیم تھے۔ اس زمانہ میں سلطان ٹیپو کے شاہزادے کلکتہ میں نظر بندی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ان کو جب معلوم ہوا کہ رائے بریلی سے ایک سید صاحب آئے ہوئے ہیں اور لوگ ان سے بیعت کر رہے ہیں تو انہوں نے شاہ ابوسعید اور شاہ ابوالليث سے ان کی نسبت معلوم کرنی چاہی تو سید صاحب نے فرمایا کہ شاہ ابوسعید ہمارے نانا اور شاہ ابوالليث ہمارے ماموں تھے، تو ان شاہزادوں نے کہلوایا کہ سید ابوسعید اور سید ابوالليث ہمارے خاندان کے مرشدوں میں ہیں۔ پھر سب نے سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی۔ (۱)

شاہ ابوالليث نے اس جوہر قابل کو پہچان لیا اور اس کی تربیت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ سلطان ٹیپو کے یہاں جو مذہبی غیرت اور انگریزوں سے حد درجہ نفرت پائی جاتی تھی اس میں خانوادہ ولی اللہی کے اس پروردہ کی تربیت کا بھی اثر تھا۔

(۱) وقائع احمدی صفحہ ۸۹۹۔ (قلمی) مخزونہ کتب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

ضمیمہ

سلطان ٹیپو کا اعلان جہاد

(۲۸/احمدی مطابق ۳/مئی ۱۷۸۶ء)

خاتم الانبیاء علیہ ﷺ کے وقت مسلمانوں کو جو احکام دیئے گئے تھے انہوں نے ان احکام کو بھلا دیا، جس کی وجہ سے ان پر زوال آ گیا۔ اس وقت خدا کے فضل و کرم سے ہم ان احکام کو اپنے دستخط اور مہر سے مسلمانوں کی آگاہی کے لئے دوبارہ جاری کرتے ہیں، تاکہ مسلمان ان سے ہدایت پائیں۔

آپ سے امید ہے کہ آپ ان احکام کو بہتر سے بہتر طریقوں پر عام مسلمانوں تک پہنچائیں گے، کیونکہ ان احکام جہاد کا مقصد ہی یہ ہے کہ ان سے ہر مسلمان واقف ہو۔ آپ کو چاہئے کہ ان احکام کی بے حساب نقلیں تیار کر کے تمام مسلمانوں میں تقسیم کریں۔

خدائے پاک حکم دیتا ہے :

قاتلوا الذین لا یومنون باللہ و لا بالیوم الاٰخر ولا یحرمون ما حرم اللہ ورسولہ ولا یدینون دین الحق من الذین اُوتوا الکتٰب حتیٰ یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون۔ (التوبۃ : ۲۹)

(ترجمہ: اہل کتاب میں سے جو لوگ اللہ اور آخری دن پر ایمان نہیں لاتے اور اللہ اور اس کے رسول کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام نہیں جانتے اور سچا دین (اسلام) قبول نہیں کرتے۔ تو تم مسلمانو! ایسوں سے مقابلہ کرو۔ یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھوں سے جزیہ دیں اور ذلیل ہو کر رہیں۔)

یہ ہماری دلی خواہش اور عزم مصمم ہے کہ ان ناقابل اعتبار اور سرکش لوگوں سے جنھوں نے مسلمانوں کی گردن موڑ کر بغاوت کا علم بلند کیا ہے اس وقت تک لڑتے

رہیں۔ جب تک کہ وہ اسلام کی سیدھی راہ قبول کریں یا جزیہ دینا قبول کرلیں۔ خصوصاً اس وقت جب کہ ہندوستان کے حاکموں کی کمزوریاں دیکھ کر اس قوم نے یہ بیہودہ خیال قائم کرلیا ہے کہ مسلمان کمزور، بزدل اور لائق نفرت ہوگئے۔ انہوں نے صرف اسی پر اکتفانہیں کیا۔ بلکہ جنگی تیاریاں کرکے مسلمانوں کے علاقوں پر چڑھ دوڑے ہیں۔ اور اپنے ظلم وزبردستی کا ہاتھ مسلمانوں کے مال وآبرو پر دراز کرنا شروع کردیا ہے۔ اس لئے ہم خدا کی طاقت اور تائید پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے مذہب کے احکام پر عمل کرتے ہیں۔

یاأیھاالذین اٰمنوا ھل أدلکم علی تجارة تنجیکم من عذاب ألیم۔ تومنون باللہ ورسولہ و تجاھدون فی سبیل اللہ بأموالکم و أنفسکم ط ذٰلکم خیر لکم ان کنتم تعلمون۔ یغفرلکم ذنوبکم و یدخلکم جناتٍ تجری من تحتھا الانھار و مساکن طیبة فی جنات عدن ط ذٰلک الفوز العظیم۔ وأخریٰ تحبونھا۔ نصر من اللہ وفتح قریب ط (الصف : ۱۰-۱۲)

(ترجمہ: اے ایمان والو! کیا میں تم کو ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں ایک دردناک عذاب سے بچائے۔ وہ تجارت یہ ہے کہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اللہ کی راہ میں اپنی جان ومال سے جہاد کرو۔ یہ تمہارے لئے بہترین کام ہے۔ اگر تم سمجھ سکتے ہو۔ وہ تمہارے گناہ بخش دیگا۔ اور تمہیں ان باغوں میں داخل کرے گا جن میں نہریں بہتی ہوں اور عمدہ گھروں میں جو ہمیشہ رہنے کے باغوں میں ہوں گے داخل کرے گا۔ یہ بڑی کامیابی ہے اور ایک چیز بھی دیگا جس کی تم تمنا رکھتے ہو۔ یعنی اللہ کی طرف سے مدد اور عنقریب ظاہر ہونے والی فتح ۔ اور ایمان والوں کو خوشخبری سنادو۔

ان احکام خداوندی پر سر جھکاتے ہوئے ہم نے مصمم ارادہ کرلیا ہے کہ ہم ان سے جہاد کریں۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں حکم دیا گیا ہے۔

ولتكن منكم امة يدعون إلى الخير و يأمرون بالمعروف و ينهون عن المنكر و أولئك هم المفلحون۔
(آل عمران : ۱۱۰)

(ترجمہ :اور چاہئے کہ تم میں سے ایک گروہ ایسا ہو جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے۔اور پسندیدہ بات کا حکم دے۔اور ناپسندیدہ باتوں سے منع کرے۔ اور وہی مراد کو پہنچیں گے۔)

اس لئے آپ کو چاہئے کہ نزدیک و دور کے اور ہر طبقہ کے مسلمانوں کو اصلی احکام اسلام سے آگاہ کریں۔اور ان کے کانوں سے غفلت کی روئی نکالیں اور خصوصاً ان لوگوں (مسلمانوں) کو توجہ دلائیں جو قرآن مجید کی اس آیہ شریفہ کو

يخدعون الله والذين أمنوا و ما يخدعون إلا أنفسهم و ما يشعرون في قلوبهم مرض فزادهم الله مرضاً و لهم عذاب أليم بما كانوا يكذبون۔

(ترجمہ:وہ اللہ اور ایمان والوں سے دغا کرتے ہیں۔حالانکہ یہ اپنے آپ ہی کو دھوکا دے رہے ہیں اور اس کا احساس نہیں کر رہے ہیں۔ان کے دلوں میں بیماری ہے پھر اللہ نے ان کی بیماری بڑھادی۔اور جھوٹ بولنے کے سبب ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔)

پس پشت ڈال کر کافروں کی اطاعت کر لی ہے۔اور ان بدبختوں کی ملازمت میں داخل ہیں۔اسلئے ان مسلمانوں کو جو کافروں کی حکومت میں رہتے ہیں خدا کا یہ حکم سنایا جائے۔

ولاتطع الكافرين والمنافقين إن الله كان عليماً حكيماً۔
(الأحزاب : ۱)

(ترجمہ :اور اطاعت نہ کرو کافروں اور منافقوں کی۔تحقیق اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے)

ان مسلمانوں پر، جن پر ان آیات قرآنی کا اطلاق ہوتا ہے، فرض ہے کہ وہ ان کافروں کے علاقوں کو خالی کر کے اپنی فلاح پر یقین و ایمان رکھتے ہوئے ہمارے

علاقوں میں آ کر آباد ہو جائیں۔ جہاں خدا کے فضل سے ان کی حالت ان کی موجودہ حالت سے بہتر ہوگی۔ اور ان کی آبرو اور مال خدا کی حفاظت میں رہیں گے۔ اور ان لوگوں کو جنھیں وہاں گزارہ کے لئے ذرائع حاصل نہیں ہیں، یہاں انہیں گزارہ کا بہترین ذریعہ حاصل کرنے میں مدد دی جائے گی۔ ہم نے اسی مقصد خاص کے لیے اپنی پوری سلطنت خداداد میں احکام جاری کر دیئے ہیں کہ

''جو لوگ سلطنت خداداد میں آ کر پناہ لینا چاہیں، حضوری میں ان کے حالات کے متعلق پوری معلومات فوراً مہیا کی جائیں۔ تاکہ ان کے گزارہ کا انتظام کیا جائے۔''

جو شخص بھی ان الفاظ پر (یعنی اس اعلان پر) توجہ نہ کریگا۔ یا ان احکام خداوندی کے خلاف کریگا۔ تو اس بد بخت کے متعلق سمجھا جائے گا کہ اس میں غیرت ایمانی باقی نہیں ہے۔ اور وہ ان برکات سے محروم ہو چکا ہے، جو خدا نے اپنے نیک بندوں کے لئے رکھے ہیں۔ اور ایسا شخص دائرۂ اسلام سے باہر سمجھا جائے گا۔ اور اسکا شمار کافروں میں ہوگا۔

ولا تقولن لشاىٔ إني فاعل ذلك غدا۔ إلا أن يشاء الله واذكر ربك إذا نسيت و قل عسىٰ أن يهدين ربي لأقرب من هذا رشدا۔ (الكهف : ٢٣-٢٤)

(ترجمہ: اور کسی کام کی بابت یوں نہ کہو کہ میں کل کروں گا مگر انشاءاللہ کے ساتھ اور جب تم انشاءاللہ کہنا بھول جاؤ جب یاد آئے تو اس وقت اپنے رب کو یاد کرو اور کہو کہ امید ہے کہ میرا رب مجھے اس سے زیادہ نیکی کی راہ دکھلائے۔

حافظ اگر قدم زنی در راہ خاندان عشق
بدرقۂ رہت شود ہمت شحنۂ نجف

(یہ اعلان جہاد اصل فارسی میں ہے۔ اصل کے دستیاب ہونے پر انشاءاللہ اگلے ایڈیشن میں اضافہ کیا جائے گا۔)

بـــاب پنجـــم

فتاویٰ دارالحرب
اوران کے مفتیان کرام کے مجاہدانہ کارنامے

پہلی فصل : شاہ عبدالعزیز
اورتحریک آزادی میں ان کا کردار

دوسری فصل : دہلی اور شمالی ہند کے علماء کے فتاوی دارالحرب

تیسری فصل : علماء بنگال اور مسئلہ دارالحرب

چوتھی فصل : سندھ پر انگریزوں کا قبضہ
اور علماء سندھ کے فتاوی دارالحرب

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

تمہید

فقہ اسلامی میں چند ہی مسائل ایسے ہیں جن پر امت کے تمام فقہاء کرام (حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی اور اہل حدیث) کا کلیۃً اتفاق ہو۔ انہی میں سے یہ مسئلہ ہے کہ اگر کسی اسلامی ملک پر کفار حملہ کر دیں یا قبضہ کر لیں تو تمام مسلمانوں پر جہاد فرض ہو جاتا ہے (۱)۔ فقہاء نے اس کی بھی صراحت کی ہے جہاد اس وقت اس طرح فرض عین ہو جاتا ہے جس طرح نماز روزہ ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اور کفار کے غلبہ سے وہ علاقہ دارالحرب ہو جائے گا۔ وہاں کے ہر ایک مرد و عورت پر فرض ہوگا کہ وہ اپنے دین وملک کی حفاظت کے لئے میدان میں نکل آئے۔ یہاں تک کہ بیوی شوہر کی اجازت کے بغیر، بچے بلا اجازت والدین، اور غلام بدون اذن آقا، اور سب پر ضروری ہوگا کہ اس سرزمین کی موجودہ حیثیت بدل کر سابقہ حالت بحال کرنے کی کوشش کریں اور کفار سے اس کو آزاد کرنے کے لئے ہر طرح کی جدوجہد کریں۔ ہندوستان پر انگریزوں کے غلبہ سے یہی صورت حال پیش آئی۔

انگریزوں کا بڑھتا ہوا تسلط اور علماء و عوام کی بے چینی

جب انگریزوں کے قدم ہندوستان کی سرزمین پر جمنے لگے اور ان کا تسلط قائم ہونے لگا تو لوگوں میں ایک عام بے چینی پیدا ہوئی اور وہ علماء و مشائخ کی طرف رجوع کرنے لگے۔ کچھ تو عوام تھے جو انگریزی سلطنت کے زوال کے لئے بزرگون سے دعا کی درخواست کرنے لگے۔ چنانچہ اس قسم کا ایک واقعہ محمود احمد عباسی نے شاہ معز الدین معروف بہ میاں موج (متوفی ۱۱۹۰ھ مطابق ۱۷۷۵ء) کے حالات میں نقل کیا ہے لکھتے ہیں:

آپ کے ابتدائی زمانہ میں اسلامی سلطنت کے بجائے برطانوی تسلط قائم

(۱) عبارتیں نقل کرنے سے بات طول پکڑے گی کتب فقہ سے رجوع کیا جائے۔

ہور ہا تھا لوگوں کے دلوں میں یہ خواہش موجزن تھی کہ غیر ملکی سلطنت زائل ہو کر پھر قومی حکومت قائم ہو۔ بعض اشخاص نے آپ سے کہا کہ حضرت دعا فرمائیں کہ موجودہ سلطنت کو زوال ہو۔

آپ نے فرمایا یہ سلطنت اس وقت تک رہے گی جب تمام زمین پر لوہے کا جال بچھ جائے گا۔ یہ اشارہ ریلوے لائن اور تار کی طرف تھا۔ حالاں کہ اس وقت ہندوستان میں نہ ریل کا کوئی وجود تھا نہ ٹیلی گراف کا۔(۱)

دوسری طرف کچھ فکرمند لوگ تھے جو علماء و مفتیان کرام سے سرزمین ہند کی حیثیت معلوم کرنے کے درپے ہوئے کہ آیا وہ دارالاسلام باقی ہے یا دارالحرب میں تبدیل ہو چکی ہے۔ تاکہ اس سے شرعی مسائل اور معاملات زندگی میں جو فرق پڑتا تھا اس کے مطابق عمل کر سکیں۔

تیسری طرف حساس اور باشعور علماء تھے جو حالات کا بہت باریکی اور گہرائی سے مطالعہ کر رہے تھے تاکہ اس سرزمین کی شرعی سیاسی حیثیت متعین کر کے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ کر سکیں اور کوئی عملی قدم اٹھا سکیں۔

ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتا ہے :

> ''علماء میں جو لوگ زیادہ زیرک تھے۔ انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی حیثیت میں آنے والے تغیر کو بہت پہلے بھانپ لیا تھا۔ یہ تغیر اب ایک حقیقت بن چکا ہے۔ وقتاً فوقتاً شائع ہونے والے فتوؤں سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے مآل اندیشانہ رویہ کے باوجود حکومت کا انقلاب ایک نامعلوم طریقے پر جاری نہ تھا۔ چنانچہ ان میں سے ایک فتویٰ میں صاف صاف اعلان کیا گیا ہے کہ ہندوستان اس وقت تک دارالاسلام رہ سکتا ہے جب تک مسلمان مفتی جن کو آگے چل کر ہم نے برطرف کر دیا تھا قانونی فیصلے کرتے رہیں۔
>
> ان میں سے دو فتوے یعنی ایک تو شمس الہند مولوی شاہ عبدالعزیز

(۱) تذکرۃ الکرام صفحہ ۱۴۹۔

صاحب اور دوسرا ان کے داماد (۱) مولوی عبدالحی صاحب کا سب سے زیادہ اہم ہیں۔ جب ہم نے نظام حکومت کو بہ تدریج اپنے ہاتھوں میں لیا تو اس وقت دین دار مسلمانوں مین اضطراب پیدا ہوا کہ ہمارے ساتھ ان کے تعلقات کیا ہونے چاہئیں۔ لہذا انھوں نے ہندوستان کے سب سے مستند علماء سے رجوع کیا اور اوپر کے دونون مشہور ومعروف علماء نے ان کے جواب میں فتوے صادر فرمائے۔'' (۲)

پہلی فصل

شاہ عبدالعزیز اور تحریک آزادی میں ان کا کردار

جس طرح اپنے والد کے انتقال کے وقت (۳) شاہ ولی اللہ سترہ برس کے تھے، ٹھیک اسی طرح شاہ ولی اللہ کا جب انتقال ہوا (۴) تو ان کے صاحبزادہ شاہ عبدالعزیز کی عمر سترہ سال کی تھی۔ بالکل ابھرتی نوجوانی مگر ایک قیادت کی بھرپور صلاحیت۔

۱۷۵۷ء کی لڑائی کے وقت جس میں سراج الدولہ کو انگریزوں کے مقابلہ میں شکست ہوئی تھی۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کی عمر گیارہ بارہ سال کی تھی۔ یہ وہ عمر ہے جب بچہ پورے شعور کو پہنچتا ہے اور واقعات وحوادث کا گہرا اثر لینے لگتا ہے۔ پھر شاہ عبدالعزیز جو بہت ذکی الحس اور رقیق الشعور تھے وہ کسی عام بچہ کی طرح نہیں تھے جو کھیل کود کو محبوب رکھتا ہو اور سیر وتفریح جس کا مشغلہ ہو، بلکہ شاہ ولی اللہ جیسے امام انقلاب کا فرزند اکبر اور صاحبزادہ گرامی قدر تھا اور مروج نصاب کا کافی حصہ پڑھ چکا تھا۔ تو اس کا ذہنی افق کتنا وسیع اور اس کی نظر کتنی عمیق ہوگی۔ پھر بڑے صاحبزادے ہونے کی وجہ سے شاہ ولی اللہ نے اپنے منظم ومکمل سیاسی، اقتصادی، سماجی، اخلاقی اور

(۱) کتاب میں بھتیجے لکھا ہے مگر صحیح داماد ہے اس لئے ہم نے بدل دیا ہے

(۲) ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۱۹۹۔

(۳) شاہ ولی اللہ کی پیدائش شوال ۱۱۱۴ھ کی ہے اور آپ کے والد شاہ عبدالرحیم کا انتقال صفر ۱۱۳۱ھ میں ہوا۔

(۴) شاہ ولی اللہ کا انتقال محرم ۱۱۷۶ھ میں ہوا۔ اور شاہ عبدالعزیز کی ولادت رمضان ۱۱۵۹ھ (اکتوبر ۱۷۴۶ء) میں ہوئی۔

اصلاحی پروگرام کے پیش نظر اس بچہ کی تربیت پر شروع ہی سے کتنی توجہ دی ہوگی۔اس بناء پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ شاہ عبدالعزیز اس کم عمری کے باوجود ۱۷۵۷ء میں انگریزوں کے مقابلہ میں ہندوستانیوں کی شکست سے بہت متاثر ہوئے اور اسی عمر سے مستقبل قریب میں والد کی جانشینی اور امت اسلامیہ ہندیہ کی قیادت کے لئے اپنے آپ کو پوری طرح تیار کرنے لگے۔پھر علمی وروحانی کمالات بھی ان کے اندر بدرجہ اتم موجود تھے۔ان کی اسی روحانی وعلمی قابلیت،فکری ونظری آفاقیت اور قائدانہ صلاحیت کی بناء پر شاہ ولی اللہ کے بعد ان کے مخصوص تربیت یافتہ اصحاب نے جو فکر ولی اللہی کے حقیقی ترجمان تھے (۱)۔اپنی ساری علمی وعملی قابلیتوں کے باوجود امارت وقیادت کی ذمہ داری شاہ عبدالعزیز کی سر ڈالی،جس کو انھوں نے پوری ذہانت،فراست،زیرکی اور بیدار مغزی سے نبایا۔تحریک کی تنظیم کی طرف پوری توجہ کی اور اس کا دائرہ اثر بہت وسیع کردیا۔جنوبی ہند کے دور دراز گوشوں میں بھی اپنے کارندے بھیجے۔(۲)

شاہ عبدالعزیز صاحب نے انگریزی استعمار کے روز افزوں خطرہ کو پوری طرح بھانپ لیا تھا۔ان کی دوررس نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ اگر اس سبزۂ بیگانہ کو جڑ سے نہیں اکھاڑا گیا تو بہت جلد وہ ایک تناور درخت بن جائے گا جس کی شاخیں لمبائی میں آسمان کو چھوتی ہوں گی تو پھیلاؤ میں وہ پورے ہندوستان کو اپنی گرفت میں لے لے گا۔وہ اس درخت کو دیکھ رہے تھے جس کے پھل زہریلے اور جس کی ڈالیاں خارزار ہوں،جن سے دامن الجھے اور سکون اور چین غارت ہوکر رہ جائے۔اور اس کے کڑوے کسیلے پھل سے لوگ گھٹ گھٹ کر مرنے لگیں۔اس لئے وہ موقع بموقع انگریزوں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے اور عوام کے دلوں میں ان سے نفرت پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔

---

(۱) ان کا تذکرہ گزر چکا ہے ملاحظہ ہو صفحہ ۱۵۱

(۲) مولانا عبیداللہ سندھی نے اسی زمانہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک عالم نے سارے ہندوستان کی سیاحت کی اور اسے علم حدیث کا کوئی بھی استاد ایسا نہ ملا جو امام عبدالعزیز کا شاگرد نہ ہو۔(شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک صفحہ ۸۲۔)

عوام میں بیداری کے لئے شاہ صاحب کی کوششیں

عوام میں دینی اور سیاسی ہر طرح کی بیداری پیدا کرنے کے لئے شاہ صاحب نے ہفتہ میں دو دفعہ وعظ کہنے کا اہتمام کیا تھا(۱) اور اس پر اخیر تک قائم رہے۔ اس کے ذریعہ عوام میں آپ کا اثر بڑھا اور آپ کی کسی بھی بات کو عوام میں سند کا درجہ حاصل ہونے لگا۔ مولانا عبیداللہ سندھی کے بقول امام ولی اللہ نے تو دہلی کے اعلیٰ طبقے سے اپنے علوم وافکار کا تعارف کرایا تھا مگر امام عبدالعزیز نے قوم کے متوسط طبقے کو بیدار کر کے عوام کو اس حقیقت سے آشنا کر دیا۔ یہی قومی حکومت کی تاسیس ہے۔(۲)

مشہور مؤرخ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں اگر برِاعظم کے مسلمانوں کو سیاسی غلامی سے نجات دلانی تھی تو انہیں کسی حد تک ایک وسیع سیاسی تحریک کے لئے تیار کرنا ضروری تھا۔ اس سمت پہلا قدم مسلمانوں کے متوسط طبقے اور عوام سے روابط قائم کرنا اور انہیں غفلت، سستی اور انحطاط سے دور لے جانا تھا۔ انہیں اس کام میں اپنے تبحر علمی، اپنے روحانی مرتبے اور اپنے غیر مشتبہ اخلاص سے بڑی مدد ملی۔ بتدریج اور آہستہ آہستہ ان کے مرید اور شاگرد پورے برِعظیم میں پھیل گئے۔ اس طریقے پر ایک زبردست تحریک شروع کرنے کے لئے ابتدائی تیاریاں مکمل ہوگئیں۔(۳)

شاہ عبدالعزیز نے دہلی میں ایک مرکز قائم کیا جس نے پہلے پہل ان کے اپنے بھائیوں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے گہرے تعاون سے کام کیا۔ دوسرا قدم یہ تھا کہ تمام شہروں اور بڑے قصبوں میں مرکز قائم کئے جائیں۔ جب یہ مقصد بھی حاصل ہوگیا تو زیادہ مؤثر عمل کے لئے فضا تیار تھی۔(۴)

چنانچہ اب مجلسوں میں انگریزوں کے بارے میں کھل کر بات ہونے لگی اور شاہ

---

(۱) فتاویٰ عزیزی، جلد اول صفحہ ۹ وصفحہ ۱۵۔۱۶۔ مولانا رحیم بخش صاحب دہلوی کے بیان کے مطابق منگل اور جمعہ کو کوچہ چیلان پرانے مدرسہ میں یہ مجلس منعقد ہوتی تھی جس میں خواص وعوام معمول سے زیادہ جمع ہوتے تھے (حیات ولی صفحہ ۵۹۸)

(۲) شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک صفحہ ۷۲۔

(۳) علماء میدان سیاست میں، صفحہ ۱۶۷۔

(۴) ایضاً صفحہ ۱۶۸۔۱۶۹۔

صاحب ان کے مظالم کا تذکرہ کر کے بے دھڑک اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگے۔

انگریزوں کے بارے میں شاہ صاحب کا نظریہ

ایک مجلس میں فرمایا کہ حدیث صحیح سے معلوم ہوتا ہے کہ آخری زمانہ میں نصاریٰ کا تسلط ہوگا (۱) ایک مرید نے عرض کیا کہ وہ یہی نصاریٰ ہیں یا کوئی اور؟ فرمایا۔ غالب کہ ہمیں ایشاں باشند۔ یعنی گمان غالب ہے کہ وہ یہی ہیں۔ پھر شاہ صاحب نے انگریزوں کے ظلم وستم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بڑی عجیب وغریب بات فرمائی۔ اپنے اس گمان کی علت بیان کرتے ہوئے فرمایا کیوں کہ اہل اسلام پر نہایت ظلم ہو رہا ہے۔ ملک کفر کے ساتھ قائم رہ سکتا ہے مگر ظلم کے ساتھ نہیں قائم رہ سکتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ اے مسلمانو! اہل فارس تم سے مقابلہ کریں گے مگر گم ہو جائیں گے چنانچہ ایسا ہوا۔ اسی طرح اہل روم یعنی نصاریٰ یکے بعد دیگرے قوم بہ قوم جماعت بہ جماعت تم سے مقابل ہوں گے اس لئے کہ یہ لوگ صابر ہیں اور آہستہ آہستہ

(۱) صحیح مسلم کی اس روایت کی طرف اشارہ ہے:

قال المستورد (بن شداد) القرشي عند عمرو بن العاص سمعت رسول الله ﷺ يقول: تقوم الساعة والروم أكثر الناس، فقال له عمرو: أبصر ما تقول، قال: أقول ما سمعت من رسول الله ﷺ، قال لئن قلت ذاك، إن فيهم لخصالا أربعاً، إنهم لأحلم الناس عند فتنة، وأسرعهم إفاقة بعد مصيبة، وأوشكهم كرةً بعد فرّة، و خيرهم لمسكين ويتيم وضعيف، وخامسة حسنة جميلة: وأمنعهم من ظلم الملوك. دوسری روایت میں عمرو بن العاص کے الفاظ ہیں إنهم لأحلم الناس عند فتنة، وأجبر الناس عند مصيبة، و خير الناس لمساكينهم و لضعفائهم. (صحيح مسلم كتاب الفتن، باب تقوم الساعة والروم أكثر الناس)

دوسری روایت جو شاہ عبدالعزیز نے بیان کی ہے وہ یہی بات ہے جس کو حضرت عمرو بن العاص نے بیان کیا ہے۔ اور جہاں تک اہل فارس کی نسبت اس بات کا تعلق ہے اس سے غالباً صحیح مسلم ہی کی اس روایت کی طرف اشارہ ہے جس کے الفاظ یہ ہیں "تغزون جزيرة العرب، فيفتحها الله، ثم فارس فيفتحها الله، ثم تغزون الروم فيفتحها الله، ثم تغزون الدجال فيفتحه الله" (صحيح مسلم، كتاب الفتن، باب ما يكون من فتوحات المسلمين قبل الدجال)

یہ دو الگ روایتیں ہیں، جن کو شاہ عبدالعزیز صاحب نے ایک ساتھ بیان کیا ہے واللہ اعلم۔

کام کرتے ہیں۔(۱)

شاہ عبدالعزیز صاحب نے انگریزوں کی نفسیات کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ان کی فطرت کا آپ کو پورا اندازہ تھا۔امیر شاہ خاں صاحب نے مولانا عبدالحی بڈھانوی کے پوتے مولانا یوسف صاحب کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ جب انگریزوں کا تسلط ہوا تو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے فرمایا کہ اب ہندوستان کی سلطنت حکماء کے ہاتھ میں آگئی ہے۔ان کے ہاتھ سے نکلنا بہت مشکل ہے۔(۲)

شاہ صاحب کی حقیقت پسندی اور انگریزوں کا شکوہ

شاہ عبدالعزیز صاحب غیر معمولی طور پر حقیقت پسند اور صاحب حمیت وعزیمت واقع ہوئے تھے۔حالات کا جائزہ لے کر انگریزوں کے بارے میں اس حقیقت کا دو ٹوک اظہار کیا ہے کہ اس وقت نقض امن کا سبب، بے چینی واضطراب کا باعث، مستقبل کی ترقیوں کے لئے سد راہ انگریز ہیں۔انھوں نے ہندوستانیوں کا خون چوس کر دولت کے خزانے جمع کیے ہیں۔فرماتے ہیں :

وإني أرى الافرنج أصحاب ثروة
لقد أفسدوا مابين دهلي وكابل

(میں فرنگیوں کو جو دولت کے مالک ہیں، دیکھتا ہوں کہ انھوں نے دہلی اور کابل کے درمیان فساد برپا کر رکھا ہے۔)(۳)

---

(۱) ملفوظات شاہ عبدالعزیز، صفحہ ۴۰۔

(۲) امیر الروایات (ضمن مجموعہ ارواح ثلثہ) صفحہ ۴۰۔

(۳) مولانا علی میاں: تاریخ دعوت وعزیمت حصہ پنجم صفحہ ۳۶۷۔حیات ولی صفحہ ۶۰۱ میں مولانا محمد رحیم بخش دہلوی نے یہ شعر اس طرح نقل کیا ہے :

ولكن أرى الكفار أرباب ثروة
لقد أفسدوا ما بين دهلي وكابل

مطبوعہ کتابوں میں غالباً حیات ولی ہی ان اشعار کا واحد ماخذ ہے۔حضرت مولانا علی میاں نے اپنے ماخذ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ممکن ہے کہ حضرت مولانا نے اپنے بزرگوں سے یہ شعر اسی طرح سنا ہو اور نسل درنسل اسی روایت سے یہ شعر پہنچا ہو، یا کسی قلمی بیاض میں اس طرح نظر سے گزرا ہو۔مولانا محمد منظور صاحب نعمانیؒ نے الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر کے دوسرے ایڈیشن میں ==

اسی طرح بعض اشعار میں شاہ صاحب نے ان کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی زیادتیوں کا شکوہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں :

== ایک قلمی بیاض کے حوالہ سے شاہ عبدالعزیز صاحب کے ایک شعر کی تصحیح کی ہے جو مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ نے حیات ولی سے نقل کیا تھا۔ مولانا نعمانیؒ کے پاس اس طرح کی قلمی بیاض کا ہونا مولانا علی میاں اور مولانا منظور صاحب کی علمی و عملی رفاقت کے پیش نظر اس خیال کو تقویت پہنچاتا ہے کہ حضرت مولانا علی میاں صاحب کی دسترس میں ایسی کوئی قلمی بیاض رہی ہو بالخصوص جب وہ تاریخ دعوت وعزیمت جیسی تحقیقی کتاب لکھ رہے تھے۔

شعر کی صحیح روایت معلوم کرنے کے لئے ہم نے محققین کو تکلیف دی۔ مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی صاحب نے لکھا کہ وإنی أری الکفار ہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ''افرنج'' کا وہاں کوئی موقع نہیں کیوں کہ شاہ عبدالعزیز صاحب کی یہ اشعار جس خط میں ہیں وہ شاہ اہل اللہ کے نام ہے اور شاہ اہل اللہ کی ۸۸۔۱۱۸۷ھ مطابق ۷۴۔۱۷۷۳ء میں وفات ہوگئی تھی۔ اس زمانہ میں جاٹوں وغیرہ نے مسلمانوں کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ اس کے برخلاف پروفیسر نثار احمد فاروقی صاحب کا خیال ہے کہ یہاں ''الافرنج'' ہی رہا ہوگا۔ انگریزوں نے اپنی عیاری سے اس تحریک کا رخ سکھوں کی طرف کردیا تو اس لفظ کو بھی کسی نے ''الکفار'' بنادیا ہوگا۔

(مکتوب بنام راقم)

مؤخرالذکر بات زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے، اس لئے کہ انگریزوں نے اس تحریک کا رخ سکھوں کی طرف کرنے کے لئے بڑی عیاری سے کام لے کر حقائق تک بدل دیئے تھے۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری کی کتاب سوانح احمدی میں نقل کردہ سید احمد شہیدؒ کے تحریف شدہ مکتوبات اس کا بولتا ثبوت ہیں، اس لئے یہاں الافرنج کا الکفار سے بدلنا محل تعجب نہیں۔

دوسرے یہ کہ مرہٹوں اور جاٹوں سے بڑھ کر اس وقت انگریزوں کا غلغلہ بلند تھا۔ مرہٹوں کا کافی زور ٹوٹ چکا تھا۔ چنانچہ خود شاہ عبدالعزیز مولانا شاہ نوراللہ پھلتی کے نام ایک مکتوب میں جو ۱۷۶۷ء یا ۱۱۶۹ھ کا ہے رقم طراز ہیں۔

وأما كفار مرهته فهم على ما كانوا عليه من السكون، جامدون في خيم الإدبار ومعسكر الخسران۔ (بیاض مولانا رشیدالدین خاں دہلوی، ورق ۲۳۔ب۔ قلمی فوٹو مملوکہ مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی) یعنی جہاں تک مرہٹوں کا تعلق ہے ان میں کوئی دم خم نہیں وہ سکون وجمود میں مبتلا ہیں اور ادبار وخسران کے خیموں میں سکونت پذیر ہیں۔

تیسرے یہ کہ ارباب ثروت یا اصحاب دولت مرہٹے، جاٹ یا سکھ نہیں انگریز تھے۔ انہیں پر اس کا اطلاق ہوتا تھا۔ انھیں نے ہندوستان کی دولت لوٹ کر اپنے گھر آباد کئے تھے اور عشرت کدوں میں داد عیش دے رہے تھے۔

چوتھے یہ کہ دہلی اگرچہ سب کفار کی آماجگاہ تھی، مگر کابل تک سوائے انگریزوں کے کسی کے ہاتھ دراز نہیں ہوئے تھے۔

پانچویں یہ کہ اس قصیدے میں آگے خود مرہٹوں اور سکھوں کا ان کے ناموں کے ساتھ ذکر ہے اور ان کے مظالم کا مستقل بیان ہے۔ اس طرح متعین ہوجاتا ہے کہ یہاں انگریز ہی مراد ہیں۔ ==

والنصاریٰ من الفرنج أتوا عرفوا بالوفاء۔دعی ذمام
یاخذون الخراج منتصفاً بسم من وسموا باسم إمام
ویریدون اقتطاع الملك من ذوی الأرض صاحبی الأقوام
ویریدون افتلاذ المال من ذوی المال أولی الأنعام(۱)

یعنی فرنگ سے نصاریٰ آئے ہیں۔(جنھوں نے اپنے تئیں وفادار مشہور کر رکھا ہے مگر) وہ ایفائے عہد میں بدنام ہیں۔

ان کا حال یہ ہے کہ بادشاہ اور حکومت کے نام پر کل آمدنی کا آدھا آخراج وصول کرتے ہیں۔

زمینداروں، حکمرانوں اور سربراہان قوم سے حصہ زمین حاصل کر کے اپنا قبضہ جمانا چاہتے ہیں۔

اور مالداروں اور مویشی والوں سے دولت بٹورنے کی فکر میں ہیں۔

انگریزوں کی ملازمت کے بارے میں شاہ صاحب کا فتویٰ

جیسے جیسے انگریزوں کا اثر بڑھنے لگا تو حساس مسلمانوں میں جہاں بہت سے سوالات جنم لینے لگے، وہاں ایک اہم سوال انگریزوں کی ملازمت کے متعلق تھا کہ اس کا کیا حکم ہے؟ اسی قسم کے ایک سوال کے جواب میں شاہ عبدالعزیز نے بڑی تفصیل سے وضاحت کرتے ہوئے نصاریٰ اور دوسرے کافروں کی ملازمت کی کئی قسمیں بتائی ہیں بعض مباح، بعض حرام، بعض گناہ کبیرہ قریب کفر۔ پھر اس طرح تفصیل بیان کی ہے: اگر چوروں اور ڈاکوؤں کی سزا کے لئے ہو یا عمارتوں کی تعمیر وغیرہ کے لئے ہو تو یہ جائز بلکہ مستحب ہے۔ اگر دوسرے امور کے لئے ہو، جن سے کفار کا اختلاط لازم آتا ہو،

== چھٹے یہ کہ عام طور پر شاہ عبدالعزیز صاحب نے مرہٹوں اور سکھوں کا ان کے ناموں سے ذکر کیا ہے۔ ان کے عربی خطوط و اشعار میں ''المرھتہ'' اور السکہ'' کے الفاظ موجود ہیں مگر انگریزوں کو عموماً کفار فرنگ یا نصاریٰ فرنگ سے یاد کرتے تھے۔
بہر حال شعر کی روایت الکفار ہو یا الافرنج۔ الکفار ہی کو صحیح مانیں تو بھی مذکورہ شواہد کی بنیاد پر ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس سے مراد انگریز ہی ہیں نہ کہ کوئی اور۔

(۱) حیات ولی صفحہ ۶۱۳۔

منکرات کا ارتکاب کرنا پڑتا ہو یا ظلم پر اعانت ہوتی ہو، مثلاً منشی گری، سپاہ گری، یا اٹھتے بیٹھتے ان کی تعظیم کرنی پڑتی ہو، یا خود کی تذلیل لازم آتی ہو تو یہ نوکری حرام ہے اور اگر کسی مسلمان کو قتل کرنے، کسی ریاست کو تباہ کرنے، اعمال کفر کو رائج کرنے یا دین کے اندر کوئی خرابی تلاش کرنے کے لئے ہو تو ایسا گناہ کبیرہ ہے جو تقریباً ارتداد کے مترادف ہے۔(۱)

بعض قسم کی ملازمتوں کو شاہ صاحب شرعاً جائز سمجھتے تھے اس کے باوجود وہ فرنگیوں کی صحبت کو بہت خطرناک سمجھتے تھے۔ شاہ غلام علی نے ایک مولوی صاحب کے انگریزوں کی نوکری قبول کرنے پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے شاہ صاحب سے فتویٰ طلب کیا تھا۔ انھوں نے مذکورہ شرائط کے ساتھ تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس شخص کو ہم نے پوری تاکید کی ہے کہ ہرگز ہرگز فرنگیوں کی صحبت میں نہ رہے۔ شہر میں مستقل مکان میں الگ قیام کرے۔

شاہ صاحب کا فتویٰ دار الحرب

شاہ عبدالعزیز صاحب کے جس فتویٰ کو تاریخ آزادی میں دستاویزی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں۔ سوال تھا کہ دارالاسلام دارالحرب ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اس کے جواب میں شاہ صاحب نے درمختار اور کافی کی عبارتیں نقل کرکے اس کے شرائط بیان کئے ہیں اس کے بعد ہندوستان کی موجودہ حالت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

دراین شہر حکم امام المسلمین اصلا جاری نیست، وحکم روساء نصاریٰ بے دغدغہ جاری است۔ ومراد از اجراء احکام کفر این ست کہ در مقدمۂ ملک داری، وبندوبست رعایا، واخذ خراج وباج، وعشور اموال تجارت، وسیاست قطاع	اس ملک میں مسلمانوں کے حاکم کا حکم ہرگز جاری نہیں۔ عیسائی حکام کا حکم بے روک ٹوک جاری ہے۔ اور احکام کفر کے جاری ہونے سے مراد یہ ہے کہ ملک داری کے مقدمات، رعایا کے انتظام، خراج ولگان

(۱) فتاویٰ عزیزی اول صفحہ ۸۶۔

الطریق وسراق، وفصل خصومات، و
سزائے جنایات، کفار بطور خود حاکم
باشند۔ آرے اگر بعضے احکام اسلام را
مثل جمعہ وعیدین واذان وذبح بقر تعرض
نکنند نکردہ باشند۔ لیکن اصل الاصول
ایں چیز ہا نزد ایشاں ہباو ہدر است۔ زیرا
کہ مساجد را بے تکلف ہدم مینمایند وہیچ
مسلمان یا ذمی بغیر استیمان ایشاں دریں
شہر ودر نواح آں نمی تو اند آمد۔ برائے
منفعت خود واردین ومسافرین وتجار
مخالفت نمی نمایند۔ اعیان دیگر مثل شجاع
الملک وولایتی بیگم بغیر حکم ایشاں دریں
بلاد داخل نمی توانند شد۔ وازیں شہر تا کلکتہ
عمل نصاری ممتد است۔ آرے درچپ
وراست مثل حیدرآباد ولکھنؤ ورامپور
احکام خود جاری نکردہ اند، بسبب مصالحہ
واطاعت مالکان آں ملک۔ وازروئے
احادیث وتتبع سیرت صحابہ کرام وخلفاء
عظام ہمیں مفہوم میشود، زیرا کہ در عہد
حضرت صدیق اکبر ملک بنی یربوع را
حکم دارالحرب دانند، حال آنکہ جمعہ
وعیدین واذان درآنجا جاری بود، مگر
انکار حکم زکوۃ کردہ بودند۔ وہم چنیں یمامہ
وگردونواح آنرا حکم دارالحرب دادند۔
باوجود یکہ مسلمانان درآں بلاد موجود

اور مال تجارت کے عشر کی تحصیل،
ڈاکوؤں اور چوروں کی سزا، رعایا کے
باہمی معاملات اور جرم وسزا کے
مقدمات میں بطور خود کفار حاکم بنے
بیٹھے ہیں اور انہی کا حکم نافذ
ہے۔ اگرچہ بعض احکام اسلام مثلاً
جمعہ وعیدین واذان اور گاؤکشی میں
کفار تعرض نہ کریں۔ لیکن اصل
اصول ان چیزوں کا ان کے نزدیک
بے فائدہ ہے۔ اسی وجہ سے مسجدوں
کو بے تکلف منہدم کر دیتے ہیں۔
کوئی مسلمان یا ذمی ان کی اجازت
کے بغیر ان اطراف میں نہیں آسکتا۔

مصلحتاً زائرین مسافرین اور تاجروں
سے جھگڑا نہیں مول لیتے۔ دوسرے
امراء جیسے شجاع الملک اور ولایتی بیگم
بلا ان کی اجازت کے ان شہروں میں
نہیں آسکتے۔ اس شہر سے کلکتہ تک
ہر جگہ نصاری کا عمل دخل ہے۔ البتہ
دائیں بائیں مثلاً حیدرآباد، لکھنؤ اور
رامپور میں انھوں نے اپنے احکام
جاری نہیں کیے۔ اسلئے کہ ان والیان
ملک نے ان سے صلح کر کے انکی
تابعداری اور فرماں برداری منظور
کر لی ہے۔

بودند۔ وعلی ھذا القیاس در عہد خلفائے کرام ہمیں طریق سلوک بود، بلکہ در عہد حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم فدک وخیبر راحکم دارالحرب فرمودند، حالاں کہ تجار اہل اسلام بلکہ بعضے سکنۂ آنجانیز درآں مکانات در وادی القری مشرف باسلام بودند، وفدک وخیبر را کمال اتصال بود مدینہ منورہ۔ (۱)

احادیث نبوی، صحابہ کرام اور خلفائے عظام کے حالات کے تتبع سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ عہد صدیقی میں بنی یربوع کے علاقہ کو دارالحرب قرار دیا گیا تھا۔ حالاں کہ جمعہ وعیدین اور اذان سب وہاں جاری تھے مگر وہاں کے لوگ زکوٰۃ کے منکر تھے۔ اسی طرح یمامہ اور اس کے گردونواح کے بارے میں یہی حکم تھا کہ وہ دارالحرب ہے جب کہ ان شہروں میں مسلمان بھی تھے۔ علی ھذا القیاس، خلفائے کرام کے زمانہ میں بھی یہی طریقہ جاری رہا، بلکہ خود حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے زمانہ میں فدک وخیبر کو دارالحرب قرار دیا تھا۔ حالاں کہ مسلمانوں کے تاجر بلکہ وہاں کے بعض باشندے بھی وادی القریٰ میں مسلمان ہو چکے تھے۔ اور فدک وخیبر کا مدینہ منورہ سے کمال اتصال تھا۔

یہ فتوی (۲) بہت جامع مکمل ومدلل اور شافی وکافی ہے، مگر شاہ عبدالعزیز نے اسی

(۱) فتاویٰ عزیزی جلد اول صفحہ ۱۶۔۱۷۔

(۲) مولانا حسین احمد مدنی فتوی کے مندرجات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس میں دو باتیں لحاظ رکھنے کے قابل ہیں:

۱۔ حضرت شاہ نے انگریزوں کے خلاف جو ظلم وستم کی شکایت کی ہے اس میں مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کا بھی ذکر کیا ہے۔ (مولانا کا اشارہ لفظ ذمی کی طرف ہے) دونوں شہر دہلی اور اس کے نواح میں امن کا پروانہ لئے بغیر نہیں آسکتے۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ شاہ صاحب انگریزوں کے مظالم سے صرف مسلمانوں کی نہیں بلکہ ہندوؤں کی بھی گلوخلاصی چاہتے تھے۔

۲۔ شاہ صاحب کسی ملک کے دارالاسلام ہونے کے لئے اس میں محض مسلمانوں کی آبادی ==

ایک فتویٰ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مختلف موقعوں پر متعدد مسائل کے ضمن میں ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا اعلان کیا۔

ایک استفتاء کے جواب میں دارالحرب کی تفصیل سے وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: معمولہ انگریزاں واشباہ ایشاں لاشبہ دارالحرب است۔(۱)

یعنی انگریزوں کی عمل داری اور ان کے مانند دوسرے (ظالم غیر مسلم) حکمرانوں کی عمل داری بلاشبہ دارالحرب ہے۔

ایک سے زائد موقعوں پر مسئلہ "سود" کی تشریح کرتے ہوئے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کی صراحت کی ہے۔(۲)

شاہ صاحب بڑے پیمانہ پر فتویٰ دارالحرب کی اشاعت کرنا چاہتے تھے انکی مجلسوں میں جہاں ہندوستان بھر کے لوگ حاضر رہتے تھے اسکا ذکر آتا تھا۔ملفوظات میں ہے:

رامپور ولکھنؤ وغیرہ دارالحرب نیست از کلکتہ تالاہور ہمہ دارالحرب باشند(۳)	رامپور ولکھنؤ وغیرہ دارالحرب نہیں اس لئے کہ یہ مسلم ریاستیں ہیں البتہ کلکتہ سے لاہور تک پورا علاقہ دارالحرب ہے۔

ایک دفعہ مجلس میں لکھنؤ کا ذکر آیا تو اس کے دارالحرب ہونے کی نفی کرتے ہوئے انگریزی عمل داری کے ساتھ اس کا موازنہ کر کے سامعین کی توجہ اس طرف پھیرنے کی کوشش کی کہ البتہ انگریزوں کی عمل داری دارالحرب ہے، اور ان کے ماتحت رہنا انتہا

== کو کافی نہیں سمجھتے بلکہ اس کے لئے وہ یہ بھی ضروری جانتے ہیں کہ مسلمان باعزت طریقہ پر رہیں اور ان کے شعار مذہبی کا احترام کیا جائے۔اس سے یہ ثابت ہوا کہ اگر کسی ملک میں سیاسی اقتدار اعلیٰ کسی غیر مسلم جماعت کے ہاتھوں میں ہو،لیکن مسلمان بھی بہر حال اس اقتدار میں شریک ہوں اور ان کے مذہبی و دینی شعائر کا احترام کیا جاتا ہو تو وہ ملک حضرت شاہ صاحب کے نزدیک بلاشبہ دارالاسلام ہوگا اور از روئے شرع مسلمانوں کا فرض ہوگا کہ وہ اس ملک کو اپنا ملک سمجھ کر اس کے لئے ہر نوع کی خیر خواہی اور خیر اندیشی کا معاملہ کریں۔(نقش حیات جلد دوم صفحہ ۱۱)

(۱) فتاویٰ عزیزی جلد اول ص ۱۱

(۲) ملاحظہ ہو فتاویٰ عزیزی جلد اول صفحہ ۳۲-وصفحہ ۱۲۲-

(۳) ملفوظات شاہ عبدالعزیز صفحہ ۵۸-

بے برکتی کا باعث ہے۔شاہ صاحب کے الفاظ ہیں: نواب وزیر کے عہد سے یہ ملک ابھی دارالحرب نہیں ہوا البتہ دارالرفض ہے مگر یہ تجربہ ہوا ہے کہ ان کی عمل داری میں بے برکتی ہے مگر انگریزوں سے کم۔(۱)

اور اس سے بھی آگے بڑھ کر نجی خطوط کے ذریعہ اپنے منتسبین ومعتقدین میں اس فتوی کو عام کرنے کی کوشش کی۔مولوی عبدالرحمٰن خان رامپوری (۲) اور ان کے بھائیوں کے نام حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے بعض خطوط ہیں جن سے ہندوستان کے سیاسی حالات سے ان کی بیزاری اور اس کے دارالحرب ہونے کی وجہ سے یہاں سے ہجرت کرنے کا ارادہ معلوم ہوتا ہے ایک خط میں لکھتے ہیں :

عمل کفار وغلبہ انہا دریں بلاد، وانسداد طرق معاش مسلمین خصوصاً زمرۂ فقراء وعلماء بسیار بے مزہ می دارد۔حق تعالیٰ غلبہ اسلام وانفتاح ابواب جمعیت ظاہر وباطن نصیب فرماید۔زیادہ بجز دعائے خیر چہ نویسد۔(۳)

ان شہروں میں کفار کا عمل دخل اور ان کا غلبہ بہت زیادہ ہوگیا ہے۔مسلمانوں اور خصوصاً زمرہ فقراء اور علماء کا طریق معاش بہت بے مزہ ہوگیا ہے۔حق تعالیٰ غلبہ اسلام اور ظاہر وباطن کے اطمینان کے دروازے کھول دے۔بجز دعائے خیر کے زیادہ کیا لکھا جائے۔

ایک دوسرے خط میں کفار (۴) کی جانب سے مسلمانوں کو اور بالخصوص اہل علم وصلاح کو پہنچنے والی اذیتوں کی وجہ سے ارادہ ہجرت ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں : بناء براں قصد مصمم میشود کہ طرفے ہجرت باید کرد (اسی وجہ سے کسی طرف ہجرت کر جانے کا پکا ارادہ ہوتا ہے) اسی خط میں آگے یہ الفاظ بھی آئے ہیں چارو ناچار تا حال در دارالحرب اقامت گزیدہ ایم (چار وناچار ابھی تک دارالحرب میں ٹھہرے ہوئے

---

(۱) ملفوظات صفحہ ۵۰۔

(۲) بڑے عالم تھے۔حافظ احمد علی خاں شوقؔ نے فاضل بے بدل لکھا ہے، اسی طرح باطنی حالت تھی۔بڑے اولیاء اللہ میں شمار تھا۔شاہ عبدالعزیز آپ کو فضیلت پناہ، فضیلت مآب، عزیز القدر محبت دستگاہ لکھا کرتے تھے۔۱۲۲۴ھ ۱۸۰۹ء میں انتقال ہوا۔(تذکرہ کاملان رامپور صفحہ ۲۰۲)

(۳) تذکرہ کاملان رامپور صفحہ ۲۰۳۔

(۴) واضح ہو کہ اس خط میں شاہ صاحب نے جاٹوں اور مرہٹوں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔

ہیں۔(۱)

فتویٰ دارالحرب کی تاریخ اور اس کا پس منظر

یہ ایک اہم سوال ہے کہ شاہ عبدالعزیز نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ کب دیا۔ کوئی تاریخ قطعیت کے ساتھ متعین نہیں کی جاسکتی، اس لئے کہ فتویٰ پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے۔ اس زمانہ میں اس کا التزام نہیں کیا جاتا تھا، نہ کسی معاصر مؤرخ نے اس سلسلہ میں کچھ نشاندہی کی ہے۔ لہذا جو کچھ بھی کہا گیا ہے وہ اپنے قیاسات اور اندازے ہیں۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنی تحریر فرماتے ہیں ۱۸۰۳ء میں جب کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے نمائندہ نے بادشاہ دہلی سے ملکی انتظام کا پروانہ جابرانہ طریقہ پر لکھوا کر ملک میں اعلان کرادیا کہ ''خلق خدا کی، ملک بادشاہ سلامت کا، حکم کمپنی بہادر کا'' تو حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے ہندوستان کے دارالحرب ہوجانے کا فتویٰ دیا اور مسلمانوں کو آزادی ہند کے لئے آمادہ کرنا ضروری سمجھا۔(۲)

مولانا سعید احمد اکبرآبادی لکھتے ہیں: ۱۸۰۳ء (۳) میں لارڈ لیک کی فوجیں دہلی میں داخل ہوگئیں اور اکبر و جہانگیر کے تخت وتاج کا وارث شاہ عالم انگریزوں کا وظیفہ خوار قیدی بن کر رہ گیا۔ یہ بالکل نئی صورت حال تھی جو اسلامی ہند کی تاریخ میں پہلی مرتبہ پیش آئی تھی اس بناء پر شاہ عبدالعزیز جو ایک جماعت کے ساتھ اپنے والد حضرت شاہ ولی اللہ کی فکری امانت کے حامل اور ترجمان تھے۔ انھوں نے صاف لفظوں میں

---

(۱) تذکرہ کاملان رامپور صفحہ ۲۰۴-۲۰۵۔ پر پورا اصل خط موجود ہے ملاحظہ کیا جائے۔

(۲) نقش حیات جلد دوم صفحہ ۳-۴۔

(۳) ۱۴؍ ستمبر ۱۸۰۳ء کو جنرل لیک کی فوجیں دہلی میں داخل ہوئیں اور مرہٹوں کو شکست دے کر قلعہ پر قابض ہوگئیں۔ دو دن بعد جنرل، دیوان خاص میں بادشاہ کے حضور میں باریاب ہوئے تو یہ خطاب ملا۔ ''صمصام الدولہ اشجع الملک خان دوران جنرل گرارڈ لیک بہادر فتح جنگ'' اور ساتھ ہی خلعت فاخرہ سے بھی سرفراز ہوئے۔ (واقعات دارالحکومت دہلی جلد اول صفحہ ۶۸۳)

ذرا غور کیجئے ملک اپنے ہاتھ سے جارہا ہے اور غیر ملکی اس پر قبضہ کر رہا ہے اور قابض و ظالم کو اس طرح خطاب وخلعت سے نوازا جارہا ہے۔ اس سے انتہائی مرعوب ذہنیت کا تصور کیا جاسکتا ہے۔

ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ صادر کیا۔(۱)

مولانا سید محمد میاں نے لکھا ہے کہ ۱۸۰۶ء میں انگریزوں کے دہلی میں تسلط کے بعد شاہ عبدالعزیز نے فتوی دارالحرب صادر کیا۔(۲)

پروفیسر محمد ایوب قادری دہلی پر انگریزی تسلط کی تفصیل پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ فتح دہلی (۱۸۰۳ء) کے بعد لارڈ ویلزلی گورنر جنرل باجلاس کونسل کی طرف سے شاہ عالم بادشاہ کے آئندہ گزارے، خاندان شاہی کی پرورش اور بادشاہ کے کاروبار لائقہ کے انصرام کے لئے جو لائحہ عمل سوچا گیا۔ اس کی اطلاع ۲/ جون ۱۸۰۵ء کو کورٹ آف ڈائرکٹرس (لندن) کو دی گئی۔ کورٹ آف ڈائرکٹرس کی منظوری سے گزر کر یہ لائحہ عمل ۱۸۰۶ء یا اس کے بعد روبعمل آیا ہوگا۔ ہمارا خیال ہے کہ جب دہلی اور اس کے علاقے میں انگریزوں کا عمل دخل پوری طرح ہوگیا تو شاہ عبدالعزیز دہلوی نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا ہوگا۔ پھر اس پر حاشیہ میں لکھتے ہیں :

ہمارا خیال ہے کہ شاہ عبدالعزیز نے دارالحرب کا فتویٰ ۱۸۰۶ء اور ۱۸۰۹ء کے درمیان دیا ہے۔ انھوں نے مولوی عبدالرحمٰن (المتوفی ۱۸۰۹ء) کو ایک خط لکھا ہے جس میں دارالحرب کا ذکر ہے۔(۳)

خواجہ احمد فاروقی نے جزم ویقین کے ساتھ لکھا ہے کہ ۱۸۰۳ء میں شاہ عبدالعزیز نے یہ فتویٰ دیا کہ پورا برطانوی ہند دارالحرب ہے اور ان انگریزوں سے لڑنا ہمارا فرض عین ہے۔ یہ فتویٰ انھوں نے نہ مرہٹوں کے خلاف دیا نہ سکھوں کے حالاں کہ ان دونوں طاقتوں کا اثر بہت دور تک پھیل گیا تھا۔(۴)

کے ایم اشرف نے بھی فتویٰ کا ۱۸۰۳ء میں صادر ہونا ظاہر کیا ہے۔(۵)

---

(۱) نفثۃ المصدور اور ہندوستان کی شرعی حیثیت، صفحہ ۳۷، مطبوعہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

(۲) دیکھئے ہماری اور ہمارے وطن کی حیثیت اور ترک وطن کا شرعی حکم صفحہ ۱۹۔

(۳) مولانا فضل حق خیر آبادی اور ۱۸۵۷ء، از ارمغان فاروقی (نذر خواجہ احمد فاروقی) صفحہ ۲۰۱، مرتبہ ظہیر احمد صدیقی۔

(۴) چراغ رہ گزر صفحہ ۱۲۲۔

(۵) احیاء اسلام کے حامی اور ۱۸۵۷ء کا انقلاب، از انقلاب اٹھارہ سو ستاون صفحہ ۹۰، مرتبہ پی سی جوشی۔

ڈاکٹر سید معین الحق نے ۱۸۰۳ء میں دہلی پر انگریزوں کے تسلط کے پس منظر میں اس فتویٰ کا ذکر کیا ہے۔ پھر وہ تحقیق کے بعد لکھتے ہیں کہ فتویٰ کی تاریخ کی تو کہیں بھی صراحت نہیں ہے۔ البتہ گمان غالب یہی ہے کہ ۱۸۰۳ء میں دہلی کے انگریزوں کے زیر نگیں ہو جانے کے بعد یہ فتویٰ دیا ہو۔(۱)

مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی نے اسی کو قرین قیاس قرار دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ دہلی پر انگریزوں کا عملی تسلط ۱۸۰۳ء میں ہوا تھا۔ حضرت شاہ صاحب کا فتویٰ غالباً اسی پس منظر میں ہے۔ اس سے پہلے کے واقعات اور مرہٹہ گردی وغیرہ سے اس کا تعلق معلوم نہیں ہوتا۔(۲)

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری نے مولوی عبدالرحمٰن خاں رامپوری کے نام شاہ صاحب کے مکتوب میں دار الحرب کے ذکر کی وجہ سے اس فتویٰ کا ۱۸۰۹ء سے قبل صادر ہونا بتایا ہے، مگر اس کے پس منظر میں وہ دوسری بات کہہ گئے ہیں۔ لکھتے ہیں : میرا خیال ہے کہ شاہ صاحب کا ذہن ہندوستان کے دار الحرب ہونے کا فیصلہ اس وقت کر چکا تھا جب حضرت سید احمد شہید کو نواب ٹونک سے وابستگی کا ایماء فرمایا تھا۔ مولانا غلام رسول مہر کی تحقیق کے مطابق سید صاحب ۱۰-۱۸۰۹ء میں ٹونک سے وابستہ ہوئے۔(۳)

مولانا حامد الانصاری غازی نے ۱۸۰۳ء میں دہلی پر انگریزوں کے قبضہ اور شاہ عالم اور انگریزوں کے معاہدہ کا ذکر کرتے ہوئے اس فتویٰ کا تذکرہ کیا ہے مگر انھوں نے عجیب وغریب بات یہ لکھی ہے کہ امام عبدالعزیز نے سب سے پہلے ۱۷۹۶ء میں یہ فتویٰ دیا تھا۔(۴)

اور اس سے بھی عجیب تر حیدر علی نعمانی کا بیان ہے جب کہ وہ فتویٰ کی تاریخ

---

(۱) The Great Revolution of 1857.p.42.

(۲) مکتوب بنام راقم

(۳) حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا فتویٰ دار الحرب تاریخی وسیاسی اہمیت صفحہ ۲۲۔

(۴) جنگ آزادی میں مسلمانوں کا حصہ، از مقدمہ لکھنؤ کانفرنس صفحہ ۱۵۔ مگر اس آخری بات کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ ہم نے مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی سے رجوع کیا تو ان کا کہنا تھا کہ مولانا غازی کی بات زیادہ لائق توجہ معلوم نہیں ہوتی۔

۱۷۶۳ء بتاتے ہیں۔(۱)

(۱) جنگ آزادی میں مسلمانوں کی قربانیاں، صفحہ ۳۶۔ میں نے دستی خط بھیج کر نعمانی صاحب سے اس کا ماخذ دریافت کیا۔ جواب آیا کہ ماخذ ذہن میں نہیں۔ غالباً طباعت کی غلطی ہے۔ اگلے ایڈیشن میں اصلاح کردی جائے گی۔

شاہ عبدالعزیز صاحب کے فتویٰ کے تعلق سے بعض مضمون نگاروں نے بالکل بے سروپا باتیں لکھی ہیں۔ ان کی وضاحت یہاں ضروری معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً جناب ضیاء الدین صدیقی (اورنگ آباد) لکھتے ہیں: ٹیپو سلطان نے ایک خط میں شاہ صاحب کے جہادی فتوے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ محض ایمان اور آزادی کے تحفظ کے لئے وہ انگریزوں سے لڑ رہا ہے۔ (ششماہی الحرکۃ نئی دہلی، جلد نمبر ۱، شمارہ ۲، رجب تا ذی الحجہ ۱۴۱۸ھ مطابق نومبر ۱۹۹۷ء تا اپریل ۱۹۹۸ء صفحہ ۷) جب کہ ٹیپو سلطان کی شہادت بالاتفاق مئی ۱۷۹۹ء میں ہوئی اور یہ فتویٰ مندرجہ بالا صراحتوں کے مطابق ۱۸۰۳ء کے بعد کا ہے پھر ٹیپو سلطان کی اس سے واقفیت کیسی؟

ہم نے ضیاء الدین صاحب کو خط لکھ کر اس کا حوالہ طلب کیا مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ دو تین مہینے انتظار کے بعد دوسرا خط لکھا پھر بھی خاموشی رہی۔ اس پر میں نے وقفہ وقفہ سے مزید دو خطوط دستی روانہ کئے اور بڑی لجاجت اور اصرار کے ساتھ ایک علمی ضرورت کے تحت اس کے حوالہ سے مطلع کرنے کی درخواست کی مگر آج تک کوئی جواب نہ آیا۔ ایک خط ''الحرکۃ'' کے ایڈیٹر کے نام لکھ کر وضاحت طلب کی لیکن اس طرف سے بھی مایوسی ہوئی۔

اس دوران میں نے ٹیپو سلطان پر علمی کام کرنے والوں میں ڈاکٹر بی یو علی شیخ صاحب، جناب سید خورشید مصطفیٰ رضوی صاحب اور مولانا محمد الیاس ندوی صاحب سے رابطہ کیا۔ نیز خانوادہ ولی اللہی پر تحقیقی نظر رکھنے والوں میں پروفیسر نثار احمد فاروقی اور مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی سے بھی رجوع کیا، مگر سب نے اس سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ ٹیپو سلطان کی شاہ عبدالعزیز صاحب سے مراسلت یا ٹیپو کی شاہ صاحب کے فتویٰ سے واقفیت کوئی بات تاریخ سے ثابت نہیں۔ اگر اس بات کا کوئی ثبوت ملے جو ضیاء الدین صاحب نے ذکر کی ہے تو ایک بہت بڑی تاریخ حقیقت کا انکشاف ہوگا اور ٹیپو سلطان نے تاریخ میں جو ناقابل فراموش کارنامہ انجام دیا ہے اس کا سہرا شاہ عبدالعزیز صاحب کے سر بندھے گا۔ مگر ثبوت سے پہلے کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔

میں اسی اُدھیڑ بن میں تھا کہ روزنامہ راشٹریہ سہارا لکھنؤ کے مؤرخہ ۲۰/اگست ۲۰۰۱ء کے شمارہ میں عبدالصمد قاسمی پورنوی صاحب کے ایک مضمون ''جنگ آزادی میں علماء کا کردار'' پر نظر پڑی اس میں انھوں نے شاہ عبدالعزیز صاحب کے فتویٰ دارالحرب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے اس فتوے کی روشنی میں مسلمان مجاہدین کی ایک جماعت ٹیپو سلطان کی قیادت میں انگریزوں سے مقابلے کے لئے نکل پڑی۔ اولاً عبارت کا یہ اسلوب ہی محل نظر ہے کوئی ایسا شخص یہ جملہ نہیں لکھ سکتا جو سلطان شہید کے کارناموں سے واقف ہو۔ خیر مجھے اس سے بحث نہیں۔ ہمیں اس کا تاریخی پہلو دیکھنا ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ ٹیپو کے مجاہدانہ کارناموں کو شاہ صاحب کے فتویٰ دارالحرب سے کوئی سروکار نہیں۔ اس لئے کہ یہ فتویٰ ٹیپو کی شہادت کے بعد کا ہے۔ یہ مضمون دیکھتے ہی مجھے مضمون نگار کے پتہ کی تلاش ہوئی۔ ==

یہ تو ہوا متعدد مصنفین و محققین کے بیانات وتحقیقات کا جائزہ مگر جہاں تک ذاتی

== خدا کا کرنا کہ اگلے ہی دن ۲۱/ اگست ۲۰۰۱ء کو راشٹریہ سہارا میں ان کا ایک مراسلہ شائع ہوا جس کے اخیر میں ان کا پورا پتہ درج تھا۔ میں نے فوراً اس پتہ پر عبدالصمد صاحب کو خط لکھ کر ان سے اس کی وضاحت چاہی جواب نہ آنے پر تقریباً دو مہینے کے بعد دوسرا خط لکھا مگر اب تک کوئی جواب نہ مل سکا۔ مذکورہ مضمون میں اگرچہ مضمون بہت مختصر تھا، اور بھی کئی باتیں تاریخی لحاظ سے سراسر غلط تھیں۔ مثلاً (۱) اس میں شاہ اسماعیل شہید کو شاہ عبدالقادر کا فرزند قرار دیا ہے۔ جب کہ شاہ اسماعیل شہید شاہ عبدالغنی کے فرزند اور شاہ عبدالقادر کے بھتیجے تھے۔ (۲) سید احمد شہید اور شاہ اسمعیل شہید کا ذکر کرکے ہوتے لکھا ہے کہ دونوں انگریزوں سے جہاد کرتے ہوئے بالاکوٹ کی پہاڑی پر شہید کردیئے گئے۔ حالاں کہ معرکہ بالاکوٹ سکھوں کے ساتھ تھا نہ کہ انگریزوں کے ساتھ (۳) مولانا ولایت علی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مجاہدین کے تعاون سے ایک آزاد ملک کی بنیاد ڈالی۔ حکومت کے نظم ونسق کے لئے سید اکبر شاہ تھانوی کو تخت حکومت پر بٹھایا۔ اور مولانا عنایت علی کو امیر مقرر کیا گیا۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ سید اکبر شاہ تھانوی کی بادشاہت سے مولانا ولایت علی کا کوئی علاقہ نہیں۔ یہ دوسرا واقعہ ہے۔ تفصیل انشاء اللہ کسی موقعہ پر آئے گی۔

میں اتنا لکھ چکا تھا اور مزید تحقیق میں لگا ہوا تھا کہ اس غلطی کی بنیاد کیا ہے کہ ایک دن مولانا ضیاء الرحمٰن فاروقی (پاکستان) کی ایک مطبوعہ تقریر بعنوان علمائے دیوبند کون ہیں اور کیا ہیں؟ پر نظر پڑی۔ اس میں وہ شاہ عبدالعزیز کے متعلق ایک جگہ کہتے ہیں۔ ۱۷۶۳ء میں اس بچہ نے دیکھا کہ انگریز کا بڑے بڑے علاقوں پر تسلط ہو گیا ہے۔ ۱۷۷۲ء میں سب سے پہلے ہندوستان کی تاریخ میں جس شخص نے انگریز کے خلاف دشمنی کا بیج بویا وہ شاہ عبدالعزیز تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے انگریزی حکومت انگریزی ذریت انگریزی قوم کے خلاف جہاد کا فتویٰ جاری کیا۔

شاہ عبدالعزیز کے اس فتویٰ کے بعد ایک آدمی جس کا نام حیدر علی تھا۔ وہ حیدر علی انگریز کی فوج میں شامل تھا۔ اس حیدر علی کے گھر ایک بچہ پیدا ہوا، اس نے یہ سنا کہ علماء نے انگریز کے خلاف جہاد کا فتویٰ جاری کر دیا ہے۔ وہ بچہ رضا کاروں کو تربیت دینے لگا۔ اس نے اپنی قوم کو زنجیروں میں جکڑا ہوا پایا۔ اس نے اپنی قوم کو غلامی کی زنجیروں میں پایا۔ اس سے رہا نہ گیا۔ اس نے ساڑھے تین سو رضا کاروں کا ایک دستہ مقرر کیا جس نے اس نوجوان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس نوجوان کو قوم کیا کہتی ہے؟ تاریخ کی زبان اس نوجوان کو جو حیدر علی کا بیٹا تھا سلطان ٹیپو کہتی ہے۔ فتح علی سلطان ٹیپو نے ۱۷۷۲ء میں شاہ عبدالعزیز کے فتویٰ کی وجہ سے میدان جنگ قائم کیا۔

پھر ذرا آگے لوگوں کو جھنجھوڑتے ہوئے کہتے ہیں: ٹیپو کے وہ خطوط اٹھا کر دیکھو جو انھوں نے سید احمد شہید کو لکھے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں انگریز کو ختم کرکے برصغیر پر اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتا ہوں۔ (۱۳-۱۴)

اس تقریر کو پڑھ کر میرے دل نے فیصلہ کیا کہ لغزش کا سرچشمہ یہی ہے اور اسی کو مبنی بر حقیقت سمجھ کر نقل کرنے والوں نے نقل کیا ہے۔ مقرر آدمی بھی جو زبان پر آئے، بلا تحقیق کہہ دیتا ہے، بعد میں سوچتا ہے۔ مجھے اس کی فروگزاشتوں پر تنبیہ کی یہاں چنداں ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ ان بے بنیاد باتوں کی تردید ہو چکی ہے۔ جس کی تاریخ پر نظر ہو وہ سمجھ سکتا ہے کہ اس میں کیا کیا غلطیاں ہیں۔ البتہ صرف آخری فقرہ کے متعلق اتنا عرض ہے کہ ٹیپو کی شہادت کے وقت ==

تحقیق کا تعلق ہے، وہ یہ ہے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب نے مذکورہ فتویٰ بہت ممکن ہے ۱۸۰۳ء کے بعد دیا ہو، بلکہ قرینہ یہی ہے۔ لیکن شاہ صاحب بہت پہلے سے ملک کو دارالحرب سمجھتے تھے۔ اس پر کسی کی نظر نہیں گئی کہ مولوی عبدالرحمٰن خاں رامپوری اوران کے برادران کے نام شاہ صاحب کے جس خط میں دارالحرب کا صاف ذکر ہے۔ اس میں شاہ صاحب نے اپنے برادر بزرگ شاہ محمد کا ذکر کیا ہے۔ جن کا انتقال ۱۲۰۸ھ مطابق ۱۷۹۴ء میں ہوا۔ بلکہ اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اس خط میں شاہ صاحب نے مکتوب الیھم کو اپنے برادر خورد شاہ عبدالغنی (والد شاہ اسماعیل شہید) کا سلام لکھا ہے۔ اوران کا انتقال صحیح روایت کے مطابق ۱۲۰۳ھ مطابق ۱۷۸۹ء میں ہوا۔ (۱)

== سید احمد شہید صرف بارہ برس کے لڑکے تھے اور تکیہ کلاں رائے بریلی میں محصور۔ دنیا سے ابھی ان کا سابقہ نہیں پڑا تھا پھر سلطان سے مراسلت کیسی۔

ان کے علاوہ بھی اس تقریر میں تاریخی اعتبار سے کئی جگہوں پر کھٹک محسوس ہوتی ہے اور بعض تو فاش غلطیاں ہیں جن کی تردید کا یہ موقع نہیں۔ خطیب مولانا ضیاء الدین فاروقی صاحب حیات ہوتے تو میں ان سے پوچھتا۔ اللہ ان سے درگزر فرمائے۔

(۱) محمود احمد برکاتی، شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان صفحہ ۱۱۴۔ انھوں نے کافی تحقیق سے یہ کتاب مرتب کی ہے اس لئے اس کے صحیح ہونے میں بظاہر کوئی شک نہیں۔ جب کہ مولوی بشیر الدین احمد دہلوی نے شاہ عبدالغنی کا سنہ وفات ۱۲۲۷ھ لکھا ہے بعمر ۵۷ سال (واقعات دارالحکومت دہلی، حصہ دوم صفحہ ۵۱۰) اسی کو ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی نے تراجم علمائے حدیث ہند، صفحہ ۶۳ پر نقل کیا ہے انھوں نے اور عجیب بات یہ لکھی ہے کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی نے آپ سے حدیث پڑھی۔ جب کہ ان کے بیان کردہ سنہ وفات کے بھی اکیس سال بعد ۱۲۴۸ھ میں مولانا نانوتویؒ کی پیدائش ہوئی۔ مولانا نے شاہ عبدالغنی بن شاہ ابو سعید مجددی (المتوفی ۱۲۹۶ھ) سے حدیث پڑھی تھی۔ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے بھی ۱۲۲۷ھ کے مطابق شاہ عبدالغنی کا سنہ وفات ۱۸۱۲ء لکھا ہے (مومن شخصیت اور فن صفحہ ۷۰)۔ اوران دونوں سے پہلے شاہ عبدالغنی کے متعلق اس قسم کی غلطی منشی محمد جعفر تھانیسری نے کی تھی جب کہ انھوں نے ان کو سید احمد شہیدؒ کے خلفاء میں شمار کیا ہے (سوانح احمدی صفحہ ۱۴۰)۔ یہ بات متعین ہے کہ شاہ عبدالغنی کا انتقال جب ہوا تو شاہ اسماعیل شہید بچے تھے۔ اور شاہ اسماعیل شہید کی پیدائش ۱۱۹۳ھ (۱۷۷۹ء) میں ہوئی تھی۔ (الاعلام (نزھۃ الخواطر ۷/۶۶) دوسری جگہ بھی مولانا نے صراحت کی ہے کہ ان الشیخ عبدالغنی توفی في عنفوان شبابه (ایضاً صفحہ ۳۲۸) اوران کی ولادت ۱۱۷۱ھ (۵۸-۱۷۵۷ء) میں ہوئی تھی۔ اور ۱۲۰۳ھ میں وہ ۳۲-۳۳ سال کے نوجوان تھے۔

مولانا نورالحسن راشد لکھتے ہیں کہ شاہ عبدالغنی کے سنہ وفات کی کوئی معاصر یا ایسی معتمد ==

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شاہ صاحب کا ملک کے دارالحرب ہونے کا خیال ۱۷۸۹ء یا اس سے پہلے کا ہے جس کا وہ نجی خطوط میں ذکر کرتے تھے۔ باقاعدہ فتویٰ اس وقت نہ دیا ہو۔ پھر جب اس سلسلہ میں استفتاء آیا (بظاہر ۱۸۰۳ء میں انگریزوں کے دہلی پر تسلط کے بعد) تو انھوں نے تفصیل سے مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے ملک کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ صادر کیا۔

فتویٰ کی تاریخ وسیاسی اہمیت

یہ فتویٰ انگریزوں سے آزادی کی تاریخ میں بنیادی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک انتہائی جرأت مندانہ اقدام تھا۔ یہ خطروں کو مول لینے کی کھلی دعوت تھی۔ یہ برسر اقتدار طاقت کے خلاف ایک چیلنج اور اس سے دشمنی کا صاف اعلان تھا۔ اس فتویٰ سے ملت اسلامیہ ہند میں حرارت عمل پیدا ہوئی، اور اس نے مسلمانوں کو دعوت فکر و عمل دی۔ اسی اعلان نے حکومت کے خلاف جدوجہد کا شرعی جواز فراہم کیا تھا۔ مگر اس کے باوجود تحریک آزادی کے عام مؤرخوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ اس لئے کہ دراصل یہ ایک ''فتویٰ'' تھا، جس کو عام مؤرخین صرف مذہبی معاملہ سمجھتے تھے۔ جن کے نزدیک مذہب اور سیاست دو الگ الگ راہیں تھیں۔ اس لئے اس کو تاریخ آزادی ہند میں جو مقام ملنا چاہئے تھا نہ مل سکا۔ اور اس کی سیاسی حیثیت نمایاں نہ ہو سکی۔ مگر یہ ماننا پڑے گا کہ اگر یہی فتویٰ مدرسہ رحیمیہ کے سربراہ شاہ عبدالعزیز کے دارالافتاء سے فتویٰ کی شکل میں شائع ہونے کے بجائے کسی قومی ادارہ یا سیاسی تنظیم کے پلیٹ فارم سے ''قرارداد'' یا ''ریزولیشن'' Resolution کے نام سے شائع ہوتا تو جنگ آزادی کی بنیادی دستاویز قرار پاتا اور تحریک آزادی کا اعلان اول شمار ہوتا۔ اس کا ''جرم'' یہی ہے کہ یہ ایک فتویٰ تھا، اس لئے عام مؤرخین نے اس کو لائق اعتنا نہ سمجھا۔

== روایت کہ جس کی تردید دشوار ہو، دریافت نہیں۔ لیکن جو سنین وفات نقل کیے جاتے ہیں اس میں صحیح ترین اطلاع سنہ ۱۲۰۳ھ کی ہے یعنی ۱۶ / رجب ۱۲۰۳ھ مطابق ۱۲ / اپریل ۱۷۸۹ء۔ یہ روایت میں نے متعدد قلمی تحریرات و مآخذ اور معلوم مطبوعہ کتابوں کے مطالعہ و تجزیہ سے اخذ کی تھی۔

فتویٰ کی شرعی حیثیت اور اس کا اثر

اس فتویٰ سے عام مسلمانوں کے سامنے یہ حقیقت آشکارا ہوگئی کہ اس سرزمین کی قانونی حیثیت بدل گئی ہے اور وہ غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ لہذا ہر مسلمان پر فرض ہے کہ اس کی موجودہ حیثیت کو بدلنے کے لئے ہر قسم کی جدوجہد کرے تا آنکہ آزادی بحال ہوجائے۔ اگر اس کی استطاعت نہیں تو پھر ہجرت شرعاً لازم ہوجاتی ہے۔

مولانا عبیداللہ سندھی فتویٰ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

امام عبدالعزیز کے نزدیک سلطان دہلی کی برائے نام حکومت ملک کو دارالاسلام نہیں بنا سکتی، چنانچہ ہندوستان میں مسلمانوں کی جو زبردست قوتیں موجود ہیں، ان کا فرض ہے کہ وہ یا تو یہاں سے ہجرت کر جائیں یا دشمن سے لڑ کر اپنی نئی اسلامی حکومت بنائیں۔ ہر وہ شخص جو دارالحرب میں رہتا ہو اس کا یہ مذہبی فرض ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا یہ مطلب ہوا کہ اگر اسلامی حکومت کا نظام دشمنوں کی غالب طاقت کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہو تو یہ فرض عام مسلمانوں پر عائد ہوتا ہے۔ ملت اسلامیہ کا اس سے تغافل برتنا اور اس معاملہ میں کچھ نہ کرنا شریعت کی نظر میں حرام ہے۔ جب یہ حالت ہو تو مسلمانوں کے ہر ہر فرد پر واجب ہے کہ دشمنوں کے غلبہ کو ختم کرنے میں اپنی پوری طاقت صرف کرنے کا ارادہ کرے اور پھر جیسے جیسے حالات پیش آتے رہیں اسی لحاظ سے اجتماعی نظام قائم کرتا رہے۔(۱)

ہجرت کرنا ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے کروڑوں مسلمانوں کے لئے آسان نہیں تھا اور نہ عملاً ممکن۔ اتنی بڑی تعداد ہجرت کر کے کیسے جاتی۔ اگر ایک جماعت چلی بھی جاتی تو مسئلہ اپنی جگہ پر باقی رہتا۔ لہذا حتمی طور پر دوسری راہ اختیار کی گئی اور اس سلسلہ میں ممکن بھر جدوجہد کا آغاز کیا گیا۔ جو طاقتیں انگریزوں سے برسرپیکار تھیں مسلمان ان کے ساتھ شامل ہو کر انگریزوں سے لڑنے لگے۔ مولانا سید محمد میاں اس پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں :

عام مسلمان جو انگریزوں کے تیز رفتار اقتدار سے حیرت میں رہ گئے تھے اور اپنے

(۱) شاہ ولی اللہ ۱۰۱،۱۰۰ کی سیاسی تحریک صفحہ ۷۱۔۷۲

اندر ایسی صلاحیت نہیں رکھتے تھے کہ مذہب کی روشنی میں فیصلہ کر سکیں کہ اس اقتدار کے مقابلہ میں ان کا طرز عمل کیا ہو، ان کے لئے ایک راستہ کھل گیا، جسکا فوری اثر یہ ہوا کہ باہمت جنگ جو طبقہ جا بجا اس طاقت سے وابستہ ہو گیا جو اس وقت انگریزوں سے برسرپیکار تھی۔ یہ طاقت اس وقت صرف مرہٹوں کی تھی۔ چنانچہ اس دور میں مسلمانوں اور مرہٹوں کی پرانی جنگ ختم ہوگئی اور صرف اتنا ہی نہیں ہوا کہ مرہٹی علاقوں کے مسلمان فوج میں شامل ہو کر آخر تک انگریزوں سے لڑتے رہے، بلکہ شمالی ہند کے بھی بہت سے مسلمان ان علاقوں میں پہنچے اور مرہٹوں کے ساتھ انگریزوں کی جنگ میں شریک ہو گئے۔ (۱)

اسی زمانہ میں سید احمد شہید نواب امیر خان سے وابستہ ہوئے جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

نواب امیر خاں سے شاہ عبدالعزیز کے تعلقات

محمد امیر خاں سالارزئی پٹھانوں میں سے تھا۔ اس کا دادا طالع خاں، محمد شاہ کے عہد میں ہندوستان آیا۔ روہیلکھنڈ کی لڑائیوں میں شریک رہا۔ اور سنبھل (ضلع مراد آباد) میں توطن اختیار کیا۔ اس کے بیٹے محمد حیات خاں نے بھی آبائی پیشہ اختیار کیا لیکن جب روہیلوں کو شکست ہوئی اور حافظ رحمت خاں شہید ہوئے۔ تو اس نے گوشہ نشینی اختیار کی۔ امیر خاں اسی کا فرزند تھا۔ ۱۱۸۲ھ (۶۹۔۶۸ ۱۷ء) میں اسکی پیدائش ہوئی۔ لکھنے پڑھنے سے مناسبت نہیں تھی۔ البتہ ابتدا سے فن سپہ گری کا شوق تھا۔ بیس برس کی عمر میں چند رفیقوں کو ساتھ لے کر قسمت آزمائی کیلئے گھر سے نکل پڑا۔ اور وسط ہند، گجرات، دکن وغیرہ کئی مقامات پر ملازمت کی۔ پھر خود ایک جمعیت پیدا کر لی۔ اور اپنی شجاعت وشہامت کا سکہ بٹھا دیا۔ بہت جلد سرداروں کی توجہ اپنی طرف مرکوز کر لی۔ ہر سردار اس کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرتا تھا۔ اسی زمانہ میں مختلف اسباب کی بناء پر مرہٹہ سرداروں سے روابط ہو گئے۔ مرہٹے اس زمانہ میں انگریزوں سے برسرپیکار تھے۔ یہیں سے امیر خاں کا رخ انگریزوں کی طرف پھر گیا اور وہ ان سے لڑنے لگا، کبھی تنہا اور کبھی

(۱) علماء ہند کا شاندار ماضی جلد دوم صفحہ ۸۳۔

مرہٹوں اور پنڈاریوں (۱) کے اتحاد کے ساتھ۔

شاہ عبدالعزیز صاحب نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور امیر خاں کے ساتھ تعلقات قائم کر کے اسکی رزم آرائیوں اور ترک تازیوں کو زیادہ مفید، کارگر اور بامقصد بنانے کی کوشش کی۔ عبیداللہ قدوسی صاحب کے الفاظ میں :

شاہ صاحب کی نظر میں ایک نواب امیر خاں کی شخصیت ہی اس قابل تھی کہ کسی موثر تحریک کو سرگرم رکھنے کے لئے ان سے مدد کی درخواست کی جاسکتی تھی، چنانچہ ان سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا جو خاصا عرصہ جاری رہا۔ (۲)

دوسری جگہ لکھتے ہیں: ہندوستان کی سیاست انگریزوں کی حیلہ سازی، مسلمانوں کی حالت زار اور مستقبل کے عزائم ان خطوط سے بھی واضح ہوتے ہیں جو شاہ عبدالعزیز صاحب نے نواب امیر خاں کو لکھے تھے۔ لیکن یہ خطوط بھی اہل غرض نے نکلوا لئے۔ بعض کی نقلیں داخل کردی تھیں۔ کئی اصل خطوط علی میاں (۳) اور مولانا آزاد نے حاصل کر لئے تھے۔ اس بات کا ذکر غلام رسول مہر صاحب (۴) نے بھی اپنی کتاب سید احمد شہیدؒ میں کیا ہے۔ انھیں یہ خطوط مولانا ابوالکلام آزاد نے دہلی میں دکھائے تھے۔ (۵)

شاہ صاحب کا اگلا پروگرام اور اقدام

مگر شاہ عبدالعزیز صاحب کو بہت جلد معلوم گیا کہ امیر خاں کی فوجی قیادت میں یہ نازک کام انجام نہیں پاسکتا۔ اس کے لئے کسی ایسی شخصیت کی ضرورت ہے جو علم دین کے ساتھ روحانی کمالات کی بھی جامع ہو اور پختہ عسکری تربیت وصلاحیت بھی رکھتی ہو۔ سید احمد شہید کے اندر انھیں یہ جوہر نظر آیا۔ چنانچہ ان کو امیر جہاد بنایا گیا۔ مولانا سید

---

(۱) پنڈاری کون تھے؟ ملاحظہ ہو صفحہ ۳۱۸

(۲) آزادی کی تحریکیں صفحہ ۸۴-۸۵

(۳) اس بات کا علم راقم کو حضرت مولانا علی میاںؒ کی رحلت کے بعد ہوا، ورنہ براہ راست اس کی تفصیلات معلوم کی جاتیں۔

(۴) مہر صاحب نے صرف اس بات کا ذکر کیا ہے کہ انکی درخواست پر مولانا آزاد نے بعض قلمی کتابیں ٹونک سے دہلی منگالیں تھیں جن سے انھوں نے دو دفعہ استفادہ کیا۔ (مقدمہ سید احمد شہید صفحہ ۸)

(۵) آزادی کی تحریکیں، صفحہ ۹۹۔

محمد میاں (۱) اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

۱- حضرت سید احمد صاحب کے زیر قیادت ایک گروپ (۲) بنایا گیا۔ مولانا عبدالحئی صاحب اور مولانا اسماعیل صاحب اس گروپ کے اہم ترین رکن اور سید صاحب کے مشیر خاص قرار دیئے گئے۔ ان تینوں حضرات کی سب کمیٹی کے سپرد کیا گیا کہ :

ا- ملک میں دورہ کرکے روح انقلاب پیدا کریں۔

ب- رضا کار بھرتی کریں، ان کو فوجی ٹریننگ دیں۔

ج- مالیہ فراہم کریں۔

د- دیگر ممالک سے تعلقات پیدا کریں۔

ہ- فوجی کارروائی یعنی باضابطہ جنگ۔

۲- دوسرا گروپ جس کی زمام قیادت خود حضرت شاہ عبدالعزیز نے اپنے ہاتھ میں لی اور اپنے سن رسیدہ مریدوں اور شاگردوں کو اس کا رکن بنایا۔

ا- مرکز کو سنبھالنا اس کا فرض تھا۔

ب- تعلیم و تربیت کا وہ سلسلہ جو شاہ ولی اللہ صاحب کے زمانہ سے جاری تھا اور ہمہ گیر انقلاب کو کامیاب بنانے کے لئے جس کا باقی رکھنا ضروری تھا اسی گروپ کے ذمہ تھا۔

ج- اور جب پہلا گروپ محاذ پر پہنچ جائے تو ملک کی فضا کو ہم نوا بنانا، نئے رضا کاروں کی بھرتی اور فراہمی مالیہ اسی گروپ کے سپرد تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے علاوہ اس گروپ کے خاص خاص رکن یہ تھے :

- مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب دہلوی (۳)

- مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب دہلوی (۴)

---

(۱) علماء ہند کا شاندار ماضی صفحہ ۸۹-۹۰۔

(۲) معلوم ہو کہ اس طرح کا کوئی خاص گروپ تو تشکیل نہیں دیا گیا تھا مگر مولانا محمد میاں صاحب کا یہ تجزیہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

(۳) شاہ محمد اسحاق کا مستقل تذکرہ آگے آرہا ہے۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۲۷۲

(۴) مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب دہلوی، شاہ عبدالعزیز کے نواسے اور شاہ محمد اسحاق کے چھوٹے بھائی تھے۔ شاہ رفیع الدین سے درسیات کی تکمیل کی، پھر دہلی میں مدت تک درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء میں اپنے بھائی کے ساتھ ہی مکہ مکرمہ ہجرت ==

- مفتی رشید الدین صاحب دہلوی (۱)
- مفتی صدر الدین صاحب دہلوی (۲)
- مولانا حسن علی صاحب لکھنوی (۳)
- مولانا حسین احمد صاحب ملیح آبادی (۴)
- مولانا شاہ عبدالغنی صاحب دہلوی (۵)

شاہ عبدالعزیز صاحب کے ساتھ انگریزوں کا برتاؤ

غالباً شاہ صاحب کی انہی انگریز مخالف سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے ریزیڈنٹ دہلی الگزنڈر سیٹن Alexander Seton شاہ عبدالعزیز صاحب کا مخالف

== کی اور وہیں ۱۲۸۲ھ/۱۸۸۶ء میں وفات پائی۔ ان کے مشہور شاگردوں میں نواب سید صدیق حسن خاں صاحب اور خواجہ احمد نصیر آبادی ہیں۔

(۱) دہلی کے مشہور علماء وفضلاء میں تھے۔ عمر بھر خانوادہ ولی اللہی سے وابستہ رہے۔ اکثر درسی کتابیں شاہ رفیع الدین سے پڑھیں اور شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر سے بھی علمی استفادہ کیا۔ سنت کے دفاع اور باطل کی تردید میں بہت سخت تھے۔ مولانا حکیم عبدالحیٔ حسنی نے آپ کی کئی کتابوں میں ذکر کیا ہے۔ ساٹھ سال کی عمر میں ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۷ء میں انتقال کیا۔

(۲) مشہور زمانہ عالم اور نادرۂ روزگار شخصیت کے مالک تھے۔ معقولات کی تحصیل مولانا فضل امام خیر آبادی سے کی۔ اور منقولات خانوادہ ولی اللہی سے حاصل کئے۔ ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کا تفصیلی تذکرہ دوسری جلد میں آئے گا ان شاء اللہ۔

(۳) لکھنؤ کے رہنے والے اور حدیث کے ممتاز ترین علماء میں تھے۔ مرزا حسن علی شافعی کے نام سے مشہور تھے۔ شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر سے علم حاصل کیا۔ شاہ عبدالعزیز سے اجازت حدیث لی۔ ۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء میں وفات پائی۔

(۴) اپنے زمانہ کے مشہور علماء میں سے تھے۔ ان کے اساتذہ میں مرزا حسن علی کا نام بھی آتا ہے۔ شاہ عبدالعزیز سے حدیث کی اجازت لی تھی۔ ملیح آباد ضلع لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ ۱۲۷۵ھ/۱۸۵۹ء میں انتقال کیا۔

(۵) شاہ ابوسعید مجددی کے صاحبزادہ اور اپنے وقت کے کبار علماء میں سے تھے۔ اپنے والد کے علاوہ شاہ اسحاق دہلوی اور شاہ مخصوص اللہ بن شاہ رفیع الدین دہلوی سے حدیث کی تحصیل کی اور اس میں کمال پیدا کیا۔ سنن ابن ماجہ پر ان کا وقیع حاشیہ ہے جو سنن کے ساتھ طبع ہوتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصہ لیا۔ ناکامی کے بعد ہجرت کر کے حجاز چلے گئے۔ اور مدینہ میں سکونت اختیار کی۔ ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۹ء میں وہیں وفات پائی۔ ان شاء اللہ دوسری جلد میں انکا مفصل تذکرہ آئے گا۔

تھا۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب نے مناقب فریدی کے حوالہ سے شاہ صاحب اور ریزیڈنٹ دہلی کے مابین اختلاف اور جھگڑے کا ذکر کیا ہے۔(۱)

ضمیمہ

شاہ عبدالعزیزؒ سے متعلق غیر مصدقہ روایات کی تردید

شاہ عبدالعزیز صاحب کے ساتھ انگریزوں کے برتاؤ سے متعلق زیادہ سے زیادہ یہی بات ثابت ہے۔ ورنہ چونکہ شاہ صاحب کا پروگرام زیادہ تر خفیہ طریقہ پر چل رہا تھا اس لئے انگریزوں کے ردعمل کی کوئی وجہ بظاہر معلوم نہیں ہوتی بلکہ ملفوظات اور بعض دیگر تحریروں سے انگریزوں کی طرف سے شاہ عبدالعزیز صاحب کے ساتھ ایک گونہ عقیدت معلوم ہوتی ہے۔ لہٰذا انگریزوں کی شاہ صاحب کو روح فرسا سزا دینے کے متعلق جو باتیں نقل کی جاتی ہیں وہ سراسر غلط ہیں۔

سلیمان علی خاں نے تو حد ہی کر دی ہے۔ شاہ ولی اللہ سے متعلق ان کے بیان کی ہم پہلے تردید کر چکے ہیں (دیکھئے صفحہ ۱۶۶) شاہ عبدالعزیز صاحب سے متعلق وہ لکھتے ہیں :

> ان کی سرکار مخالف سرگرمیوں پر انگریز حکمراں خاموش کب بیٹھنے والے تھے۔ انھیں فوراً گرفتار کر لیا گیا اور سزا کے طور ان کے جسم پر چھپکلیوں کا ابٹن لگایا گیا۔ جس سے انھیں برص کی بیماری لاحق ہوگئی۔ اسکے علاوہ انکے چاروں بھائیوں کو بھی شہر بدری کی سزا کا سامنا کرنا پڑا۔ (جنگ آزادی میں علماء کرام کا حصہ صفحہ ۵)

(۱) ملاحظہ ہو تاریخ مشائخ چشت، صفحہ ۴۹۳۔ (ندوۃ المصنفین دہلی طبع اول، ۱۹۵۳ء)۔ نہ جانے کیوں تاریخ مشائخ چشت حصہ پنجم کے نام سے ادارہ ادبیات دلی کی جانب سے جو کتاب شائع ہوئی ہے (۱۹۸۲ء) اس میں یہ اقتباس حذف کیا گیا ہے۔ تاریخ مشائخ چشت حصہ پنجم بالکل وہی کتاب ہے جو ندوۃ المصنفین کی طرف سے ۱۹۵۳ء میں تاریخ مشائخ چشت کے نام سے شائع ہوئی تھی، البتہ شروع کے چند ابواب اس میں نہیں ہیں)

اس روایت کی اساس بھی امیر شاہ خاں صاحب کا بیان ہے۔شاہ ولی اللہ سے متعلق اس روایت کا ایک حصہ نقل ہو چکا ہے۔جس میں نجف خاں کے شاہ صاحب کے پہنچے اتروانے کا ذکر ہے۔آگے وہ شاہ عبدالعزیز اور ان کے برادران کے ساتھ نجف خاں کے سلوک کا ذکر کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ اس نے......

شاہ عبدالعزیز صاحب اور شاہ رفیع الدین صاحب کو اپنے قلمرو(۱) سے نکال دیا تھا اور ہر دو صاحبان مع زنانوں کے شاہدرہ تک پیدل آئے تھے۔اس کے بعد مولانا فخر الدین کی سعی سے زنانوں کو تو سواری مل گئی تھی اور وہ پھلت روانہ ہو گئے تھے۔مگر شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالعزیز صاحب کو سواری بھی نہ ملی تھی۔اور شاہ رفیع الدین صاحب تو پیدل لکھنؤ چلے گئے تھے اور شاہ عبدالعزیز صاحب پیدل جون پور چلے گئے تھے۔کیوں کہ نہ ان دونوں کو سوار ہونے کا حکم تھا اور نہ ساتھ رہنے کا۔اور دو دفعہ روافض نے شاہ صاحب کو زہر دیا تھا اور ایک مرتبہ چھپکلی کا ابٹن ملوا دیا تھا، جس سے شاہ صاحب کو برص اور جذام ہو گیا تھا۔اور جون پور کے سفر میں شاہ صاحب کو لو بھی لگی تھی، جس سے مزاج میں سخت حدت پیدا ہو گئی تھی،جس سے جوانی ہی میں بینائی جاتی رہی تھی اور ہمیشہ سخت بے چین رہتے تھے۔(امیر الروایات مشمولہ ارواح ثلاثہ صفحہ ۳۳)

پہلی بات یہ ہے جیسا کہ شاہ ولی اللہ کے ذکر میں لکھی جا چکی ہے کہ نجف خاں کی طرف سے سنیوں کی ایذاء رسانی کے متعلق جو باتیں تاریخ میں ملتی ہیں اس کی وجہ اس کی متعصبانہ شیعیت ہے نہ کہ انگریز دوستی۔اس لئے تھوڑی دیر کے لئے اگر اس روایت کو صحیح مان بھی لیا جائے تو اس کا انگریزوں سے کوئی تعلق ثابت نہیں ہوتا چہ جائے کہ اس کو انگریزوں کی طرف منسوب کیا جائے۔جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ پوری روایت بالکل لچر پوچ اور لغویات کا مجموعہ ہے،صحت سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔

(۱) صاحب نور اللغات لکھتے ہیں کہ قلمرو کو آتش نے ایک جگہ مونث بھی لکھا ہے اب باتفاق مذکر ہے۔

نجف خاں دہلی اس وقت آیا جب شاہ عبدالعزیز صاحب کی عمر ۲۷ برس کی تھی اور جب آپ کی عمر ۳۷ برس کی ہوتی ہے تو نجف خاں کا انتقال ہو جاتا ہے اور چالیس برس کی عمر سے پہلے شاہ صاحب کی کسی تحریر یا تقریر سے کوئی بات شیعوں کے خلاف کھل کر ظاہر نہیں ہوتی۔ اگر شیعہ کبھی بھی شاہ صاحب کے اس حد تک دشمن ہوئے ہوں گے تو وہ تحفہ اثنا عشریہ کی تصنیف کے بعد ہی ہو سکتے ہیں حالانکہ تحفۂ اثنا عشریہ، نجف خاں کے انتقال کے کئی سال بعد سامنے آتی ہے۔

دوسرے یہ کہ اگر ان واقعات کو بفرض محال تسلیم کر بھی لیا جائے تو یقیناً یہ واقعات شاہ صاحب کی زندگی کے اہم ترین سانحے ہونے چاہئیں۔ مگر تعجب ہے کہ اس زمانہ کے کسی تذکرہ نویس یا اس کے قریبی زمانہ کے کسی تاریخ نگار نے اس کا قطعاً ذکر نہیں کیا۔ نہ لکھنؤ کے کسی تذکرہ میں یہ اشارہ ملتا ہے کہ شاہ رفیع الدین یہاں تشریف لائے اور نہ جون پور کی کسی تاریخ میں اس کا حوالہ ملتا ہے کہ شاہ عبدالعزیز یہاں کبھی تشریف لائے۔

علاوہ بریں ان کے تلامذہ کا جال پورے ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا۔ اور ان میں سے کسی نے ان حضرات کو اپنے یہاں نہ روکا کہ دھوپ کی شدت اور لُو کی تپش سے کچھ دنوں آرام کر لیتے۔ کیا شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین کی کوئی قدر نہیں تھی؟ وہ اتنے کمزور اور بے یار و مددگار تھے اور اتنے غیر معروف تھے کہ ان کے خلاف فریاد کرنے والا اور آواز اٹھانے والا بھی کوئی نہیں تھا؟

پھر یہ کہ اس کی قطعی شہادتیں موجود ہیں کہ شاہ صاحب کو یہ بیماریاں بالکل جوانی میں لاحق ہو گئی تھیں اور مولانا حکیم عبدالحئی حسنی کی صراحت کے مطابق پچیس سال کی عمر ہی سے وہ ان میں مبتلا تھے۔ جب کہ ابھی نجف خاں کا دہلی میں ورود بھی نہیں ہوا تھا۔

بہر حال یہ کوئی تاریخی روایت نہیں من گھڑت افسانہ ہے جس کو بے تحقیق ہوا دی گئی ہے۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ماہنامہ برہان دہلی نومبر ۱۹۶۴ء)

دیگر فتاوی دارالحرب

عموماً ہندوستان کے دارالحرب ہونے کے بارے میں تنہا شاہ عبدالعزیز صاحب کے فتوی کا ذکر کیا جاتا ہے مگر تحقیق سے اور بہت سے علماء کے فتوے سامنے آتے ہیں جن میں انھوں نے صراحت سے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا اعلان کیا ہے۔ ہنٹر نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔اس کے بقول جوں جوں ہماری طاقت مضبوط ہوتی گئی۔علماء کے فتووں میں ہندوستان کا دارالحرب ہونا زیادہ نمایاں ہوتا گیا۔(۱)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان علماء میں بہت سے حضرات شاہ عبدالعزیز صاحب کے خیالات سے متاثر اور بعض تو براہ راست ان کے شاگرد اور کچھ تو انہی کے ترجمان تھے۔اس لئے ان کے فتووں کو مستقل حیثیت نہ دی جائے تو محل تعجب یا قابل اعتراض بات نہیں۔مگر اس کے ساتھ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دیگر علماء جن کا بظاہر شاہ صاحب سے کوئی ربط و تعلق معلوم نہیں ہوتا، ان کا فتوی دارالحرب ان کے اپنے مقامی حالات کا نتیجہ اور ان کے ذاتی مطالعہ و تحقیق کا حاصل تھا۔اس لئے اس کو جنگ آزادی کی تاریخ میں مستقل حیثیت ملنی چاہئے تھی مگر افسوس کہ آج تک نہ مل سکی۔

مکرر عرض ہے کہ اس سلسلہ میں شاہ عبدالعزیز صاحب کا فتوی ہی اصل الاصول اور ان میں سے اکثر فتووں کی بنیاد ہے۔ ذیل میں ہم ان سارے فتووں کا ایک تحقیقی جائزہ پیش کرتے ہیں تاکہ جنگ آزادی کی تاریخ کا صحیح رخ متعین ہو جائے اور یہ فتوے اس طویل جہاد کا سنگ میل ثابت ہوں اور محققین اور دلچسپی رکھنے والے اس سے فائدہ اٹھائیں۔

---

(۱) ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۲۰۰۔

دوسری فصل

دہلی اور شمالی ہند کے علماء کے فتاوی

دہلی جو ہندوستان کا قلب اور بیرونی حملوں کی آماجگاہ تھی، انگریزوں کے بڑھتے ہوئے قدم اور ناپاک عزائم سے قدرتاً سب سے زیادہ متاثر تھی اور اس کا اثر قرب وجوار کے شہروں پر پڑنا لازمی تھا۔ اس لئے فطری بات تھی کہ یہاں کے علماء حالات کی نزاکت کا اندازہ کرتے اور مسائل متعلقہ پر ازسرنو غور وفکر کرتے۔ چنانچہ انھوں نے ایسا کیا اور اپنی بیدار مغزی اور حقیقت پسندی کا ثبوت دیا۔

شاہ رفیع الدین کا فتوی دار الحرب

اس سلسلہ میں سب سے پہلے شاہ رفیع الدین کا ذکر آنا چاہئے۔ اس لئے کہ وہ شاہ عبدالعزیز کے حقیقی بھائی اور ان کے تربیت یافتہ تھے۔ اور ان کے پورے ہم خیال وہم نوا تھے۔ شاہ رفیع الدین اپنے زمانہ کے مشہور محدث، متکلم اور اصولی تھے۔ نادرۂ روزگار علماء میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ شاہ عبدالعزیز آپ کے علم وفضل کے بڑے مداح اور معترف تھے بلکہ اپنے برابر قرار دیتے تھے (۱)۔ ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۸ء) میں آپ نے وفات پائی۔ (۲)

آپ کا ایک عظیم کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے سب سے پہلے اردو زبان میں مکمل

---

(۱) ملاحظہ ہو ملفوظات شاہ عبدالعزیز وغیرہ۔

(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے الاعلام (نزھۃ الخواطر) ۷/۲۰۴۔۲۰۸۔

عجیب بات کہ شاہ ولی اللہ کے صاحبزادگان کی ولادت ووفات میں ترتیب معکوس ہے۔ سب سے بڑے شاہ عبدالعزیز تھے پھر شاہ رفیع الدین پھر شاہ عبدالقادر پھر شاہ عبدالغنی (والد شاہ اسماعیل شہید) مگر وفات سب سے پہلے شاہ عبدالغنی کی ہوئی پھر شاہ عبدالقادر کی اس کے بعد شاہ رفیع الدین اور سب سے اخیر میں شاہ عبدالعزیز کی وفات ہوئی۔

قرآن مجید کا ترجمہ کیا۔(۱)

شاہ ولی اللہ کے عظیم فرزند ہونے کی وجہ سے حالات پر گہری نظر ہونا فطری بات ہے۔ملک کے انقلابات ان کی نگاہوں کے سامنے تھے اس لئے وہ انگریزی خطرہ کو شدت سے محسوس کرتے تھے۔چنانچہ انگریزوں کے غلبہ کے بعد آپ نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا۔تحریر فرماتے ہیں :

بداں کہ دارالحرب شدن ایں ملک اختلاف است لیکن راجح دریں باب اثبات است یعنی دارالحرب گشتہ است تفصیلش آنکہ......	معلوم ہونا چاہئے کہ اس ملک کے دارالحرب ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں اختلاف ہے لیکن راجح بات یہی ہے کہ یہ ملک دارالحرب ہو چکا ہے۔

پھر انھوں نے تفصیل سے اس کے وجوہات بیان کئے ہیں اور آخر میں لکھا ہے۔ایں ہمہ امور اینجا موجود اندپس دارالحرب ہست۔(۲)(یہ سب باتیں یہاں موجود ہیں پس یہ دارالحرب ہے)

قاضی ثناء اللہ پانی پتی اوران کا فتوی دارالحرب

حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی برصغیر کے بہت مشہور اور راسخ علماء میں سے تھے۔نسباً عثمانی تھے۔مشہور بزرگ شیخ جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتی (م ۷۶۵ھ) ان کے اجداد میں ہیں۔پانی پت میں ۱۱۴۳ھ/۱۷۳۰ء میں ولادت ہوئی۔سات سال کی عمر مین قرآن حفظ کیا۔ابتدائی تعلیم اپنے شہر کے اساتذہ سے حاصل کرکے دہلی کا رخ کیا اور حضرت شاہ ولی اللہ کی خدمت میں رہ کر متعدد علوم میں رسوخ پیدا کیا اور فراغت حاصل کی۔شیخ محمد عابد سنامی سے طریقت کی تعلیم پائی۔ان کے انتقال کے بعد حضرت مرزا مظہر جان جاناں سے فیض حاصل کیا۔انہی سے اجازت وخلافت تھی۔حضرت مرزا

---

(۱) مشہور تو یہ ہے کہ شاہ عبدالقادر کا ترجمہ سب سے مقدم ہے اور اکثر محققین کی یہی تحقیق ہے مگر اردو کے مشہور محقق ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے کہ شاہ رفیع الدین نے ان سے بھی پہلے ترجمہ کیا اور انھوں نے اس کے کئی قرائن بیان کئے ہیں۔(ملاحظہ ہو تاریخ ادب اردو، جلد دوم حصہ دوم صفحہ ۱۰۵۲)

(۲) بیاض قلمی حضرت مفتی الٰہی بخش صاحب کاندھلوی، مملوکہ مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی۔

مظہر نے آپ کو ''علم الہدیٰ'' کے لقب سے سرفراز فرمایا تھا۔ شیخ کو آپ پر فخر تھا۔ تفسیر میں آپ کا پایہ بہت بلند تھا۔ ان کی تفسیر مظہری اس کی شاہد ہے۔ حدیث وفقہ میں بھی کمال حاصل تھا۔ فقہ میں ان کی مشہور کتاب ''مالابد منہ'' آج تک بہت سے مدارس عربیہ میں داخل نصاب ہے۔ فقہ وحدیث میں تبحر کے پیش نظر شاہ عبدالعزیز آپ کو ''بیہقی وقت'' کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ حقائق ومعارف مجددیہ کے بیان میں آپ حضرت شاہ ولی اللہ کے تلامذہ میں سب پر فائق ہیں۔ شاہ ولی اللہ کی مجتہدانہ شان اگر آپ کے کسی شاگرد میں نمایاں ہے تو وہ صرف آپ کی ذات گرامی ہے۔ (۱)

مولانا رحمان علی لکھتے ہیں: ایک زمانہ تک افاضہ فیض ظاہر وباطن، اشاعت علوم، فصل خصومات، افتاء سوالات اور حل مشکلات میں مشہور رہے۔ علم تفسیر، فقہ، کلام اور تصوف میں نہایت فاضل تھے۔ پھر آپ کی چند کتابوں کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ آپ کی کتابوں اور رسالوں کی تعداد تیس سے زیادہ ہوگی۔ یکم رجب ۱۲۲۵ھ (مطابق ۱۸۱۰ء) کو آپ کی وفات ہوئی۔ (۲)

قاضی ثناء اللہ پانی پتی جو امام انقلاب حضرت شاہ ولی اللہ کے شاگرد رشید، اور قائد تحریک اصلاح وجہاد حضرت شاہ عبدالعزیز کے دوست اور رفیق تھے۔ وہ طبعاً ملک میں رونما ہونے والے واقعات اور دن بدن بدلتے ہوئے حالات پر گہری نظر رکھتے اور حقیقت پسندانہ جائزہ لیتے تھے۔ پھر ان کا زیادہ وقت خدمت افتاء اور حل مشکلات میں صرف ہوتا تھا۔ اس لئے یقیناً ان کے پاس ملک کی شرعی حیثیت اور متعلقہ احکام کے سلسلہ میں کثرت سے سوالات آتے رہے ہوں گے۔ اسی قسم کا ایک سوال مولانا ابوالحسن حسن ابن مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ نے کیا تھا۔ اسکے جواب میں قاضی صاحب نے تحریر فرمایا:

کفار کہ بریں ملک مسلط شدہ اند، مسلمانان ایں دیار حکم مستامنان دارالحرب دارند۔ مسلمانان مستامنان	کفار اس ملک پر مسلط ہوچکے ہیں اسلئے اس پورے دیار کے مسلمان دارالحرب کے مستامن مسلمانوں کے

(۱) دیکھیے تراجم علماء حدیث ہند، صفحہ ۲۰۷-۲۰۸۔

(۲) تذکرہ علماء ہند اردو ترجمہ صفحہ ۱۴۲۔ نیز الإعلام (نزہۃ الخواطر) ۷/ ۱۲۸-۱۲۹ تفصیل کے لئے دیکھیے تراجم علماء حدیث ہند صفحہ ۲۰۶۔ ۲۱۷۔

کہ در دارالحرب باشند، آنہارا گرفتن مال حربیاں بغدر جائز نیست، اگر بطریق قمار و مانند آں اگر گرفتہ باشد مضائقہ ندارد، جائز است۔ وبسرقہ وخیانت یا بامقتضائے غدراست گرفتن جائز نیست۔ عاصی میشود۔ لیکن خوردن مال حرام است۔	حکم میں ہیں اور جو مستامن مسلمان دارالحرب میں رہتے ہیں انکو حربیوں کا مال غدر سے لینا جائز نہیں اگر ربا قمار (سود اور جوا) یا اس کے مانند کسی طریقہ سے لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں، جائز ہے۔ اور اگر چوری خیانت یا غدر سے ہو تو لینا جائز نہیں۔ گناہ ہوگا۔ یہ مال کمانا حرام ہے۔

یہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے فتوی دارالحرب کا واضح اقتباس ہے(۱) جس میں وہ صراحت سے ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر حربیوں کا مال بطریق سود وقمار لینا جائز فرمارہے ہیں۔ قاضی صاحب کا انتقال ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء میں ہوا۔ اس لئے اس کا احتمال ہے کہ یہ فتوی شاہ عبدالعزیز صاحب کے فتوی سے پہلے کا ہو۔ اس کا ایک قرینہ یہ بھی ہے کہ مستفتی مولانا ابوالحسن حسن کاندھلوی تھے۔ جن کے خاندان کے شاہ عبدالعزیز سے دیرینہ اور مستحکم تعلقات تھے۔ اس لئے شاہ صاحب کے فتوی کے ہوتے ہوئے قاضی صاحب سے رجوع کرنے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ وہ شاہ صاحب کے فتوی کو یقیناً شافی وکافی سمجھتے۔ واللہ اعلم۔

ہندوستان کے دارالحرب ہونے کے سلسلہ میں سیّد احمد شہید کی وضاحت

درحقیقت سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد کی بنیاد ہی حضرت شاہ عبدالعزیز کا فتوی دارالحرب تھا۔ اس لئے اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ ہم آپ کے کلام میں اس کی صراحت تلاش کریں تفصیل سے سید صاحب کے مکتوبات آگے آپ کی نظروں سے گزریں گے۔ جن میں صاف لفظوں میں آپ پڑھیں گے کہ انگریزوں کے تسلط کی وجہ سے ہندوستان دارالحرب ہوگیا ہے انھیں سے وطن کو آزاد کرنے کیلئے ہم نے جہاد پر کمر

(۱) یہ پورا فتوی قاضی صاحب کے قلم سے مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی کے پاس محفوظ ہے۔ پہلی دفعہ یہاں شائع ہورہا ہے۔ اس کے لئے ہم مولانا کے انتہائی مشکور ہیں۔

باندھی ہے۔

تاہم اس باب کی تکمیل کی خاطر یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مکتوبات کے علاوہ ہم آپ کے کلام کا جائزہ لیں۔ چنانچہ ملفوظات میں جہاں جہاد کا مفصل بیان ہے اسکی وضاحت ہے کہ اس وقت ہندوستان کا اکثر حصہ دارالحرب بن چکا ہے۔ فرماتے ہیں:

حال ہندوستان را دریں جزو زماں کہ سنہ یکہزار و دو صدی و سوم است کہ اکثرش درایام دارالحرب گردیدہ (۱)	اس وقت کہ ۱۲۳۳ھ ہے (۲) ہندوستان کا اکثر حصہ دارالحرب بن چکا ہے۔

اور یہ سب کو معلوم ہے کہ اس وقت اکثر علاقوں پر انگریز قابض تھے۔

مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ اور فتویٰ دارالحرب

حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ، حضرت ولی اللہ کے پوتے اور شاہ عبدالغنی کے صاحبزادے تھے۔ شاہ اسماعیل ان علماء میں سے تھے جو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ علم میں ان کا پایہ اتنا بلند تھا کہ خود شاہ عبدالعزیز جیسے علامہ وقت نے اپنے اس شاگرد کو جو ان کے بھتیجے بھی تھے "حجۃ الاسلام" کا خطاب دیا تھا۔ بلا مبالغہ ان کی کتاب "تقویۃ الایمان" سے لاکھوں لوگوں نے ہدایت پائی اور شرک و بدعت سے محفوظ رہے۔

سید احمد شہیدؒ سے بیعت کے بعد سایہ کی طرح ان کے ساتھ لگے رہے۔ اور پوری زندگی ان کے تابع ہوکر جہاد میں گزاری اور انھیں کے ساتھ بالاکوٹ میں شہادت پائی۔ (۱۲۴۶ھ مطابق ۱۸۳۱ء) (۳)

---

(۱) صراط مستقیم (ملفوظات سید احمد شہید) صفحہ ۹۵۔ مرتبہ شاہ اسماعیل شہید۔

(۲) یہ وہی سنہ ہے جب سید صاحب امیر خاں کے لشکر سے لوٹے تھے۔ اور مستقل تنظیم جہاد کا فیصلہ فرمایا تھا۔

(۳) شاہ اسماعیل شہید پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ جن میں سب سے مشہور مرزا حیرت دہلوی کی (۱) حیات طیبہ ہے۔ مگر اس میں بیان کردہ بہت سی باتوں کی دوسرے ذرائع سے تصدیق نہیں ہوتی۔ ان کو ہم افسانہ قرار دے سکتے ہیں مثلاً شاہ اسماعیل شہید کا دورہ پنجاب نیز اس کو انگریزی نقطۂ نظر سے لکھا ہے (۲) تذکرہ حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ از معین الدین اختر (۳) شاہ اسماعیل شہید (مجموعہ مقالات) مرتبہ عبداللہ بٹ (۴) تذکرہ شاہ اسماعیل از مولانا نسیم احمد فریدی (۵) شاہ اسماعیل شہید از حسین حسنی۔ مگر پھر بھی ضرورت ہے کہ کوئی صاحب علم اس فاضل یگانہ اور مجاہد کبیر کے علمی و دعوتی کارناموں اور مجاہدانہ زندگی کے تمام پہلوؤں کا تحقیق سے جائزہ لے۔

شاہ اسماعیل شہیدؒ نے ہندوستان کے دار الحرب ہونے کا فتویٰ دیا تھا۔ جیمز اوکنلے کے بقول شاہ محمد اسماعیل نے کفار (انگریزوں) کے عروج اور اسلامی شریعت کے خاتمہ کو ہندوستان کے دار الحرب ہونے سے تعبیر کیا تھا اور اسی لحاظ سے انھوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا جواز پیدا کیا تھا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے انگریزوں کے عہد میں مسلمانوں کی حیثیت کو مصر میں فرعون کے ماتحت یہودیوں کی حیثیت کے مساوی قرار دیا تھا۔ (۱)

اس فتوی کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت شیخ الہند نے (انڈیا آفس لائبریری لندن میں محفوظ ریکارڈ کے مطابق) ہندوستان سے حجاز روانہ ہونے سے پہلے ریاست ٹونک سے مولانا محمد اسماعیل شہید کے فتاوی جہاد کے مجموعہ کی نقل حاصل کی تھی مگر اس کو تحریک کے بعض ارکان کے پاس چھوڑ گئے تھے۔ اس لئے کہ اس کا ساتھ لے جانا خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ (۲)

مولانا عبدالحی بڈھانوی کا فتوی دار الحرب

مولانا عبدالحیؒ بڈھانوی صدیقی النسب تھے خانوادہ ولی اللہی سے ان کا مضبوط نسبی وروحانی رشتہ تھا۔ آپ کے دادا مولانا نوراللہ شاہ ولی اللہ کے چار مخصوص شاگردوں میں تھے۔ جن کا تذکرہ گزر چکا ہے۔ اور وہ شاہ عبدالعزیز کے خسر بھی تھے۔ اس لحاظ سے شاہ عبدالعزیز، مولانا عبدالحی کے حقیقی پھوپھا ہوتے تھے۔ پھر انہوں نے مولانا

---

(۱) ڈاکٹر معین الدین عقیل تحریک ہجرت: تحریک مقاصد اور نتائج، از تحریک ہجرت: تاریخ افکار اور دستاویزات، مرتبہ شاہد حسین خاں صفحہ ۲۲۔

(۲) ملاحظہ ہو تحریک ریشمی رومال (تحریک شیخ الہند) مرتبہ مولانا محمد میاں، صفحہ ۲۸۰۔ اس سے مرزا حیرت دہلوی (حیات طیبہ صفحہ ۱۷۳، طبع دوم) اور مولوی محمد جعفر تھانیسری (سوانح احمدی صفحہ ۵۷) کی اس بات کی تردید ہوتی ہے کہ شاہ اسماعیل شہیدؒ نے انگریزوں کے خلاف جہاد کے عدم جواز کا فتوی دیا تھا۔ اول تو اس کا ثبوت ہی محل نظر ہے۔ اور اگر بالفرض اس کو صحیح مان بھی لیا جائے تو اس کی وہ تاویل ہوگی جس کو ہم نے کسی دوسرے موقع پر وضاحت سے بیان کیا ہے۔ دیکھئے صفحہ ۲۷۸ یا ڈاکٹر معین الدین عقیل کے مطابق شاہ اسماعیل کا ابتداءً یہی خیال تھا۔ (تصنیف مذکور صفحہ ۲۱۔) مگر یہ تاویل اس لئے صحیح نہیں معلوم ہوتی کہ مولوی محمد جعفر تھانیسری نے کلکتہ میں قیام کے دوران شاہ صاحب کی طرف اس قسم کا بیان منسوب کیا ہے جب کہ اس وقت صراط مستقیم مرتب ہو چکی تھی جس میں ہندوستان کے دار الحرب ہونے کی صراحت ہے۔

عبدالحیؒ کو اپنی دامادی کا شرف بھی بخشا تھا۔غرض مولانا عبدالحی اپنے زمانہ کے علماء کبار میں تھے۔علم وعمل میں مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ کے ہم پلہ تھے۔خود شاہ عبدالعزیز جوان کے استاد بھی تھے ان کو "شیخ الاسلام" کہا کرتے تھے۔شاہ اسماعیل کے ساتھ ہی سید صاحب سے بیعت ہوئے اور تحریک کی توسیع اور اس کو مؤثر بنانے میں ناقابل فراموش کردار ادا کیا، اور تادم مرگ سید صاحب سے چمٹے رہے۔ہجرت کے موقع پر سید صاحب نے بعض انتظامات کے لئے آپ کو ٹونک میں چھوڑ دیا تھا۔پانچ مہینے بعد طلب فرمایا تو آپ روانہ ہوئے مگر زیادہ زندہ نہیں رہ پائے۔۸/شعبان ۱۲۴۳ھ (۲۴ فروری ۱۸۲۸ء) کو وفات پائی۔(۱)

جہاد کے فرض کفایہ اور فرض عین ہونے کی تشریح کرتے ہوئے مولانا نے اس کی صراحت کی ہے کہ اس وقت انگریزوں کے تسلط کی وجہ سے تمام مسلمانوں پر جہاد فرض عین ہے۔تحریر فرماتے ہیں :

شہرے از اہل اسلام بدست کفار افتاد وآنہا حکم رانی کنند، پس بذمہ ہمہ مسلمین فرض است کہ سعی در دفع کفار ازآں شہر بعمل ارند۔وایں صورت در اکثر بلاد ہندوستاں پدیدار شدہ چنانچہ پوشیدہ نیست۔پس بر ہمہ مسلمیں مقابلہ فرض است۔(۲)

مسلمانوں کے کسی شہر پر کفار کا قبضہ ہوجائے اور وہ وہاں حکمرانی کرنے لگیں تو تمام مسلمانوں پر فرض ہوجاتا ہے کہ اس شہر سے کفار کا تسلط ختم کرنے کی سعی کریں۔ہندوستان کے اکثر علاقوں میں یہ صورت پیش آچکی ہے جو مخفی نہیں ہے پس تمام مسلمانوں پر اسکا مقابلہ فرض ہے۔

ڈبلیو ہنٹر نے مولانا کے صریح فتوے کا بھی ذکر کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ :

مولوی عبدالحی صاحب صاف طور پر حکم لگاتے ہیں عیسائیوں کی پوری سلطنت

---

(۱) دیکھئے الاعلام (نزھۃ الخواطر) ۷/۲۷۷-۲۷۸۔وجماعت مجاہدین صفحہ ۱۱۱-۱۱۸۔نیز سید صاحب کی سیرت کے متعلق کتابوں میں بھی آپ کے حالات ملتے ہیں۔

(۲) مکتوبات سید احمد شہید (قلمی) صفحہ ۶۷-۶۸، محفوظہ کتب خانہ ندوۃ العلماء ۳۵/۲۸۵۱۔مختلف علوم فارسی۔

کلکتہ سے لے کر دہلی اور ہندوستان خاص سے ملحقہ مما لک (یعنی شمالی مغربی سرحدی صوبے) تک سب کے سب دارالحرب ہے۔ کیوں کہ کفر اور شرک ہر جگہ رواج پا چکا ہے اور ہمارے شرعی قوانین کی کوئی پروا نہیں کی جاتی۔ جس ملک میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں وہ دارالحرب ہے۔(۱)

شاہ محمد اسحاق دہلوی کی نظر میں ہندوستان کا دارالحرب ہونا اور تحریک جہاد میں آپ کے کارنامے

شاہ محمد اسحاق دہلوی، برصغیر ہندو پاک کے مشہور ترین علماء میں سے تھے۔ آپ شاہ عبدالعزیز صاحب کے نواسے اور ان کے تربیت یافتہ تھے۔ ابتدائی عربی کتابیں مولانا عبدالحئی بڈھانوی سے پڑھیں اور بقیہ درسیات کی شاہ عبدالقادر سے تکمیل کر کے شاہ عبدالعزیز سے سند و اجازت حدیث حاصل کی۔ شاہ عبدالعزیز نے اخیر عمر میں اپنا گھر اور ساری کتابیں آپ کے سپرد کر کے آپ کو اپنا جانشین بنایا۔ دہلی میں آپ شاہ عبدالعزیز کے مسند درس پر سالہا سال تک درس دیتے رہے اور ایک عالم کو فیض یاب کیا۔

شاہ عبدالعزیز کی حقیقی جانشینی کا تقاضا تھا کہ انکے سیاسی منصوبہ کو بھی آگے بڑھاتے اور اس میں رنگ بھرتے۔ چنانچہ شاہ اسحٰق نے اپنی علمی مشغولیت کے باوجود اس پر پوری توجہ دی۔ سید صاحب کی تحریک جہاد کو تقویت پہنچانے میں ایک حیثیت سے آپ کا سب سے اہم رول رہا ہے۔ سید صاحب کے ہجرت کر جانے کے بعد ہندوستان میں مالیہ فراہم کرنے اور قافلوں کو روانہ کرنے کی ذمہ داری آپ پر تھی۔ یہ سب سے دشوار صیغہ تھا۔ ذرا سی لاپروائی، بے توجہی یا بدتدبیری سے پوری تحریک کیلئے خطرہ پیدا ہو سکتا تھا اور اٹھتی ہوئی تحریک یکدم سے بیٹھ سکتی تھی۔ مگر آپ نے پورے انہماک اور حکمت و دانائی سے یہ فریضہ انجام دیا اور نازک سے نازک وقت میں بھی یہ ذمہ داری نبھائی۔

مولانا محبوب علی دہلوی جب مرکز مجاہدین سے واپس آئے اور اس تحریک کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کر دیا تو ہندوستان سے قافلوں کا آنا بند ہو گیا۔ پھر مولانا شاہ محمد

---

(۱) ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۲۰۰۔

اسحٰق اوران کے برادر خورد شاہ محمد یعقوب کی کوششوں سے یہ فتنہ دبا اور قافلوں کی روانگی باقاعدہ شروع ہوگئی۔(۱)

آپ کی رائے میں ہندوستان دارالحرب تھا(۲) مگر ضرورۃً آپ یہاں رکے ہوئے تھے۔ تاکہ مجاہدین کو رسد پہنچاتے رہیں اور ہندوستان میں موجود لوگوں کی رہنمائی کرتے رہیں۔

چندہ کی وصولیابی اور زر کی فراہمی کا آپ کو اس قدر اہتمام تھا کہ ایک طرف مدرسہ میں درس ہوتا رہتا اور دوسری طرف ایک آدمی دروازہ پر تحصیل زر میں مصروف رہتا۔(۳)

شاہ اسحاق کے نام سید صاحب کے کئی خطوط ہیں۔ زیادہ تر یہ خطوط عربی میں ہوتے تھے۔ اور ان میں رموز کا استعمال ہوتا تھا(۴)۔ نہ کاتب کے نام کی وضاحت۔ نہ مکتوب الیہ کے نام کی تصریح، کاتب کی صفت اور مکتوب الیہ کے اوصاف نام کے قافیہ کی رعایت کے ساتھ، کہ سمجھنے والے سمجھیں اور اجنبی یا حکومت کے ہاتھ لگے تو ایک حرف سمجھ میں نہ آئے۔ مثلاً ایک خط کا آغاز اس طرح ہوتا ہے من عبداللہ المنتهض لإعلاء كلمة الله إلى كريم الأخلاق طيب الأعراق فاتح الأغلاق وإلى أخيه المحبوب ذی الخلق المرغوب العظيم اليعسوب. اور ایک خط کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے من عبدالله المنتهض لإعلاء كلمة الله ناصح كافة المسلمين الملقب بأمير المؤمنين إلى الشيخين الجليلين...... أما أحدهما فلا ريب فی أنه شجرة غابرة الأصول والأعراق، ناضرة الغصون والأوراق وأما أصغرها فلا شک فی أنه ثمرة طعمها مرغوب وريحها محبوب...... اسی طرح مبہم خطوط ہوتے تھے۔ اس میں زر کی فراہمی اور اس کی ترسیل کے سلسلہ میں مفصل ہدایات ہوتیں۔ ان خطوط سے ترسیل زر کی

---

(۱) دیکھئے سوانح احمدی، صفحہ ۱۰۸۔

(۲) آپ کی یہ رائے مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی کے پاس تحریری شکل میں موجود ہے۔

(۳) ملاحظہ ہو سرگزشت مجاہدین۔ صفحہ ۱۳۶۔

(۴) آبادشاہ پوری کے بقول انقلابی تحریکوں کی تاریخ میں پہلی بار خفیہ اصطلاحات اور خفیہ طور طریق اسی جماعت نے وضع کیے۔ ان اصطلاحات اور حربوں سے جماعت کے خاص کارکن ہی واقف ہوتے۔ خط و کتابت میں یہی خفیہ اصطلاحات استعمال کی جاتیں۔(سید بادشاہ کا قافلہ ص ۱۴۷)

مشکلات، اس سلسلہ میں رازداری اور حکومت کی نظروں سے بچنے کی کوشش اور احتیاط کا اندازہ ہوتا ہے۔ اگرچہ پٹنہ وغیرہ سے بھی روپے سرحد بھیجے جاتے تھے مگر دہلی کی حیثیت مرکز کی تھی، جس کی باگ شاہ محمد اسحٰق صاحب سنبھالے ہوئے تھے۔ ایک سرکاری بیان ملاحظہ ہو اس سے شاہ اسحٰق کی حیثیت کا بھی اندازہ ہوگا۔

سید احمد کے زمانے میں روپے کے بھیج بھجاؤ کے انتظام میں دہلی زیادہ اہم درجہ رکھتی تھی۔ دہلی میں اس کاروبار کا سب سے بڑا ایجنٹ ایک شخص اسحٰق نامی تھا۔ سید احمد قائدین عظیم آباد کے نام مکتوب میں ترسیل زر کے لئے اسحٰق کا نام ایک معتبر اور ثقہ شخص کی حیثیت سے لیتے ہیں۔ بعد میں پٹنہ مرکز بن گیا اور ترسیل زر تھانیسر اور راولپنڈی کے راستوں سے ہوتی تھی۔(۱)

تاہم شاہ محمد اسحٰق صاحب نے سید صاحب کی شہادت کے بعد بارہ سال تک کسی نہ کسی طرح اس کام کو جاری رکھا۔ مگر جب حکومت کڑی نظر رکھنے لگی تو اس راہ کی رکاوٹیں بڑھ گئیں۔ اور اس کام کو باقی رکھنا دشوار معلوم ہونے لگا۔ یا بالفاظ دیگر جس مقصد کی خاطر ہندوستان میں رکے تھے، وہی مقصد فوت ہوتا نظر آنے لگا، تو آپ کے نزدیک ہندوستان میں مزید رکنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ چنانچہ ۱۲۵۸ھ مطابق ۱۸۴۲ء میں آپ نے ہندوستان سے رخت سفر باندھا اور پورے خاندان کے ساتھ ہجرت کر کے مکہ مکرمہ چلے گئے۔ (۲)

حکیم مومن خان مومن نے یہ تاریخ کہی جس سے سبب ہجرت پر بھی روشنی پڑتی ہے :

آں مبنی دین وجان اسلام — عرفان مصور و مجسم
از کشور ہند رخت بربست — بیزار از کافران اظلم
اندیشہ سال ہجرت او — بر چرخ مہاجر و مکرم
ہم چشم مقربان حق بیں — ہمراز فرشتگان محرم
فرمود وحید عصر اسحاق — بر حکم شہنشہ دو عالم

(۱) ہندوستان میں وہابی تحریک، صفحہ ۱۸۹۔

(۲) ملا محمد نظام شاہ جہاں پوری جو خاندان ولی اللہی کے تربیت یافتہ تھے۔ انھوں نے شاہ محمد اسحٰق کی حیات ہی میں ان کے رسالہ مسائل اربعین کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ اس کے خاتمہ میں شاہ صاحب کے متعلق لکھتے ہیں اس ملک میں تسلط کفار کا دیکھ کر بے اس کے کہ بالکل دارالحرب کے احکام جاری ہوں گھربار، ریاست، برادری اور دوست آشنا، وطن چھوڑ کر ہجرت کر گئے۔ (دیکھئے اردو نثر کے ارتقاء میں علماء کا حصہ، صفحہ ۴۸۸)

بگذاشتہ دار حرب امسال جا کردہ بمکہ معظم (۱)

زندگی کے بقیہ ایام وہیں درس وتدریس میں گزار کر ۱۲۶۲ھ (۱۸۴۶ء) میں وفات پائی۔ اور جنۃ المعلاۃ میں ام المومنین حضرت خدیجہؓ کے قریب تدفین عمل میں آئی۔

مگر انگریزی حکومت آپ کو یوں ہی چھوڑنے والی نہیں تھی۔ حکومت کو چوں کہ آپ سے بہت خطرہ تھا، اس لئے اس نے بدلہ لینے کی پوری کوشش کی۔ ایک طرف کمپنی کی جانب سے بمبئی سے ایسے ہندوستانی بھیجے گئے جو انھیں وہابی ثابت کر کے حجاز سے

---

(۱) دیوان فارسی مومن خاں مومن (مطبوعہ) صفحہ ۱۴۱، مرتب عبدالرحمٰن آہی، مطبع سلطانی لال قلعہ دہلی، ۱۲۷۱ھ۔ قطعہ تاریخ اس طرح حل ہوگا۔ وحید عصر اسحاق کے اعداد ۵۵۸ ہوتے ہیں۔ اور مکہ معظم کے ۱۱۱۵، دونوں کے مجموعہ ۱۶۷۳ ہے۔ اس مجموعہ کے اعداد میں دار حرب کے کل عدد ۴۱۵ نکال دیں تو ۱۲۵۸ھ باقی رہتے ہیں، جو شاہ صاحب کا سنہ ہجرت ہے۔

حکیم احسن اللہ نے یہ تاریخ لکھی :

مولوی اسحاق صاحب فخر دیں تھا منور شہر جن کے نام سے
درس فرماتے تھے ہفتے میں دوبار فہم سے ادراک سے الہام سے
عالم وجاہل سبھی چھوٹے بڑے بہرہ ور تھے ان کے فیض عام سے
کر گئے ہجرت مع اہل وعیال سوئے کعبہ شوق کے احرام سے
سچ تو یہ ہے جو کہ احسن نے کہا شہر خالی ہوگیا اسلام سے

(دیکھئے احکام العیدین صفحہ ۴، از مولانا نواب قطب الدین دہلوی، مطبع نول کشور ۱۳۹۰ھ/ ۱۸۷۳ء) مصرع اخیر میں لفظ اسلام کے اعداد کم کرنے سے تاریخ نکلتی ہے "شہر خالی ہوگیا اسلام سے"۔ کے اعداد ۱۳۹۰ ہوتے ہیں۔ اسلام کے کل عدد ۱۳۲ گھٹانے سے ۱۲۵۸ باقی رہتے ہیں۔ میر ظہور علی نے صاف لفظوں میں تاریخ کہی :

مولوی اسحاق صاحب باکمال ترک خانہ کردہ سوئے کعبہ رفت
سال تاریخش چنیں گفتہ ظہور یک ہزار و دو صد و پنجاہ و ہشت

(حوالہ بالا)

ان قطعات تاریخ سے آپ کے سال ہجرت کی قطعی تعیین ہو جاتی ہے اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ وہ ۱۲۵۸ھ ہے۔ اس سے ان تمام مورخین اور سوانح نگاروں کی غلطی واضح ہوتی ہے جنھوں نے ۱۲۵۶ھ، یا ۱۲۵۷ھ، ۱۲۶۰ھ بتایا ہے۔

آپ کی ہجرت آسان نہیں تھی۔ آپ کے درس کا ایک عالم میں غلغلہ تھا، اس لئے لوگوں نے روکنے کی کوشش کی، مگر آپ طے کر چکے تھے اس لئے باز نہ آئے۔ سر سید لکھتے ہیں :

باوصف کہ تمام سکنائے شہر اور سلطان وقت بہ ساجت تمام مانع آئے۔ مگر شوق ماھوالحق غالب تھا۔ آپ ممتنع نہ ہوئے اور مکہ معظمہ جا کر توطن اختیار کیا۔ (آثار الصنادید صفحہ ۵۵۵)

نکلوانے کی کوشش کریں (۱) دوسری طرف حکومت نے ہندوستان میں ان کی جائداد قرق کرلی۔ (۲)

(۱) مولانا عبیداللہ سندھی، پیش لفظ تحریک شیخ الہند صفحہ ۲۷، از مولانا سید محمد میاں، یہ مولانا سندھی کا ایک مضمون ہے جو الرحیم حیدر آباد (سندھ) میں جنوری ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اسی کو مولانا محمد میاں نے اپنی کتاب کا پیش لفظ بنایا ہے۔

(۲) امیر شاہ خاں صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شاہ اسحٰق کی زندگی کا واقعہ ہے۔ (دیکھئے امیر الروایات در مجموعہ ارواح ثلثہ صفحہ ۱۰۴) نیز انھوں نے صراحت کی ہے کہ یہ تحصیل سکندرآباد ضلع بلند شہر میں حسن پور نام کا بہت بڑا گاؤں تھا۔ جو شاہ اسحٰق اور ان کے بھائی شاہ یعقوب کی جائداد تھا۔ مگر یہ دونوں باتیں غیر محقق ہیں۔ مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی کی تحقیق یہ ہے کہ جائداد کی ضبطی کا واقعہ ۱۸۵۷ء کے بعد کا ہے۔ ان کے بقول اس کی سرکاری دستاویزات ان کی نظر سے گزری ہیں، جن سے زمانہ کی تعیین ہوتی ہے۔ نیز یہ گاؤں ضلع بلند شہر میں نہیں بلکہ ضلع مظفرنگر میں ہے۔ راقم الحروف کو مولانا کے ساتھ وہاں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ کاندھلہ سے زیادہ دور نہیں ہے۔ مسلم آبادی پر مشتمل کافی بڑا گاؤں ہے۔

مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب کا جو حقیقی کردار ہے وہ ہم نے بیان کردیا۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک میں شاہ اسحاق کے قائم کردہ جس بورڈ کا ذکر کیا ہے نیز ترکی سلطنت سے اتصال کے بارے میں جو لکھا ہے وہ ان کی ذہانت کی پیداوار ہے۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا۔ معتبر ذرائع سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ بورڈ سے متعلق مولانا سندھی ہی کے متبعین کی مولانا سید محمد میاں نے علماء ہند کا شاندار ماضی میں تشریح کی ہے۔ یا بالفاظ دیگر انہی کی بنیاد پر عمارت کھڑی کی ہے۔ اسی طرح سلطنت عثمانیہ سے ربط اور حجاز میں بیٹھ کر شاہ صاحب کی اس سلسلہ کی کوششوں کو بھی تحریک آزادی پر لکھنے والے بعض مصنفین نے خوب پھیلا کر بیان کیا ہے۔ جیسے ضامن علی خان نے اپنی کتاب جنگ آزادی کے مسلم مجاہدین میں اور اسی طرح رتن لال کنسل نے اپنی کتاب جدوجہد آزادی اور تحریک ولی اللہی میں کیا ہے۔ اور یاد پڑتا ہے کہ میورام سوار یا نے بھی اپنی کتاب ہندوستان کی جنگ آزادی کے شہیدوں کی سچی کہانیاں میں بھی کچھ اسی قسم کی تفصیل بیان کی ہے۔ جیسے حقیقت حال کا بیان ہے۔

یہاں مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی کے خط کا ایک اقتباس فائدہ سے خالی نہیں ہوگا لکھتے ہیں:

دراصل یہ قصہ ہی سرے سے غلط ہے اور بے اصل ہے۔ ہندوستان کی آزادی اور انگریزوں کے خلاف عملی جدوجہد کے لئے حضرت شاہ عبدالعزیز یا حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحب نے کوئی بورڈ بنایا ہو۔ اس کی اطلاع میری معلومات میں صداقت سے عاری ہے۔ یہ بات مولانا عبیداللہ سندھی کی کتاب شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک سے چلی ہے۔ مولانا نے اس کے لئے کوئی حوالہ نہیں دیا۔ اور جو دیگر اطلاعات و مآخذ ہیں، وہ اس کی کسی طرح بھی تائید نہیں کرتے۔ شاہ محمد اسحاق اس قسم کا کوئی بورڈ یا مشاورتی انجمن بناتے تو اس کا کوئی اور بھی کہیں ذکر کرتا۔ ==

شاہ محمد اسحاق نے انگریز دشمنی اور وطن دوستی کے جذبات کو کس قدر فروغ دیا تھا اس کا اندازہ کرنے کے لئے صرف یہی کافی ہے کہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی قیادت کرنے والوں میں ان کے متعدد شاگرد نظر آتے ہیں جیسے مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا نوازش علی دہلوی اور مولانا عبدالجلیل کوئلی علی گڑھی وغیرہ۔

مفتی الٰہی بخش کاندھلوی اور ان کا فتوی دار الحرب

حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی، تیرہویں صدی ہجری میں برصغیر کے انتہائی مشہور اور باکمال علماء سے تھے۔ ۱۱۶۲ھ (۴۹۔۱۷۴۸ء) میں کاندھلہ میں پیدائش ہوئی۔ متوسطات تک گھر میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد دہلی پہنچے اور شاہ عبدالعزیز صاحب کی خدمت میں رہ کر تکمیل کی، اور ہر فن میں کمال پیدا کیا۔ آپ شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے ہم سبق تھے۔ شاہ عبدالعزیز آپ کے علم و فضل اور صلاح وتقوی کے بڑے قائل و معترف اور آپ کو اپنی نیابت کا سزاوار اور مستحق سمجھتے تھے۔ آپ پر شاہ صاحب کو کلی اعتماد تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب نواب ضابطہ خان بن نواب نجیب الدولہ نے شاہ عبدالعزیز صاحب سے اپنی ریاست غوث گڑھ کی سرپرستی کرنے اور مفتی اعظم کی حیثیت سے ریاست میں قیام فرمانے کی درخواست کی تو آپ نے معذرت کی اور اپنے قائم مقام کی حیثیت سے مفتی الٰہی بخش کو منتخب فرما کر ریاست میں بھیج دیا۔ یہی مفتی الٰہی بخش کی ملازمت کی ابتداء ہے اور اسی وقت سے مفتی آپ کے نام کا گویا جز بن گیا۔ پھر آپ نے کوٹہ (راجستھان) اور اس کے بعد بھوپال میں منصب افتاء کو زینت بخشی۔ بھوپال سے واپسی کے بعد وقفہ وقفہ سے اطراف کی بستیوں تھانہ بھون، بڈھانہ وغیرہ میں کچھ کچھ عرصہ قیام رہا اور زندگی کے آخری پندرہ سولہ سال مستقل وطن میں گذار کر ۱۴/ جمادی الاخری ۱۲۴۵ھ (۱۲ دسمبر ۱۸۲۹ء) کو سفر آخرت پر روانہ ہوئے۔

== کسی خط، تحریر، وعظ، تقریر میں اس کا ذکر آتا مگر کچھ بھی نہیں ہے۔ بہر حال یہ روایت جہاں بھی ہے مولانا سندھی سے لی گئی ہے۔ جو کسی طرح بھی صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ میری زیر طبع کتاب تذکرہ مولانا مملوک العلی میں بھی اس پر بحث ہے۔ میں نے اس کو بالکل رد کیا ہے۔ (مکتوب بنام راقم السطور)

سلوک میں بھی آپ کو شاہ عبدالعزیز سے اجازت وخلافت حاصل تھی۔ پھر اپنے چھوٹے بھائی مولانا شاہ کمال الدین کاندھلوی (متوفی ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۸۲۷ء) کے ہاتھ پر بیعت کی اور خلافت پائی۔ جب حضرت سید احمد شہید ۱۲۳۴ھ میں اپنے تبلیغی دورہ میں کاندھلہ تشریف لائے تو مفتی صاحب نے سید صاحب کا دامن تھام لیا۔ بایں مقام بلند سید صاحب سے بیعت ہو کر آپ کے علوم وکمالات سے مستفید ہوئے۔ جب کہ سید صاحب عمر میں آپ سے تقریباً چالیس سال چھوٹے اور علوم ظاہری میں فروتر تھے۔ سید صاحب نے بھی آپ کو اجازت عطا فرمائی۔ آپ کا سب سے عظیم الشان کارنامہ مثنوی مولانا روم کا تتمہ وتکملہ ہے۔ آپ کی تصنیفات کی فہرست پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہر فن مولی تھے۔ مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی نے آپ کی ایک سو پانچ کتابوں کا تعارف کرایا ہے، جن میں عربی کی ۳۷ فارسی کی ۵۹ اور اردو کی ۸۱ کتابیں ہیں۔ (۱)

آپ نے بھی ہندوستان کے دار الحرب ہونے کا فتوی دیا۔ چوں کہ آپ نے اپنی ابھرتی ہوئی جوانی کے دس سال دہلی میں گزارے تھے اور انگریزی سیاست کا داؤں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اس چیز نے آپ کی آتش غیرت وحمیت کو تیز کیا۔ خود صاحب فہم وفراست، اس پر شاہ عبدالعزیز جیسے نباض زمانہ کی شبانہ روز صحبت، اس نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ شاہ عبدالعزیز کے ساتھ مضبوط علمی فکری اور روحانی رشتہ اور سید صاحب کے ساتھ گہری عقیدت وتاثر (۲) نے بھی آپ کو اس پر آمادہ کیا ہوگا۔ پھر یہ کہ آپ مختلف ریاستوں میں منصب افتاء پر فائز رہے۔ انگریزوں کے تسلط کے بعد سرزمین ہندوستان کی شرعی حیثیت کے سلسلہ میں بہت سے فتوے آپ سے پوچھے گئے ہوں گے۔ پھر ریاستوں سے علاحدگی کے بعد آپ کی دور دراز شہرت اور فقہ وفتاوی میں مسلمہ حیثیت کی بنیاد پر خلقت نے آپ سے رجوع کیا ہوگا۔ مزید برآں آپ ایک

---

(۱) مفتی الٰہی بخش صاحب کے حالات وکمالات اور تصنیفات کی فہرست کے لئے دیکھئے مختصر تذکرہ حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی، از مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی۔

(۲) اسی کا نتیجہ ہے کہ آپ نے سید صاحب کے طریقہ تعلیم اور ملفوظات پر ''ملہمات احمدیہ'' کے نام سے ایک کتاب لکھی، جو شائع ہو چکی ہے۔

معروف شیخ طریقت بھی تھے اور جیسا کہ گذر چکا ہے کہ عوام انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اثرات سے بڑی بے چینی محسوس کرتے تھے اور مشائخ اور پیروں سے اپنی گھٹن اور پریشانی کی شکایت کرتے تھے۔(۱)

ان اسباب کے پیش نظر آپ کو ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ صادر کرنا پڑا۔آپ کا یہ فتویٰ انڈیا آفس لائبریری (لندن) میں موجود ہے۔(۲)

اتنا ہی نہیں کہ آپ نے صرف فتویٰ دیا ہو بلکہ آپ جذبۂ جہاد سے بھی سرشار رہتے تھے۔چنانچہ آپ نے فارسی میں منظوم رسالہ جہادیہ لکھا۔جس میں جہاد کے فرائض ومطالبات کو بیان کرنے کے ساتھ مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دی ہے اور ان کے حوصلوں کو بہت ابھارا ہے۔

آپ کی تعلیمات جہاد ہی کا اثر تھا کہ آپ کی اولاد، اہل خاندان اور تربیت یافتگان ہمیشہ جہاد میں پیش پیش رہے۔(۳)

مولانا ابوالحسن کاندھلوی:

[illegible] انگریز مخالف جدوجہد

مولانا ابوالحسن کاندھلوی حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کے بڑے صاحبزادے تھے،مولانا ابوالحسن اپنے زمانہ کے مشہور علماء میں سے تھے۔مولانا حکیم عبدالحئی نے آپ کے بارے میں لکھا ہے"أحد العلماء المشهورين"(۴)

---

(۱) دیکھئے صفحہ ۲۲۵

(۲) انڈیا آفس لائبریری ۱۳۰-U (اردو) بلوم ہارٹ۔۱۹۲۶ء،نمبر شمار ۱۶۸ (بشکریہ مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی، انھیں ڈاکٹر معین الدین عقیل نے اس کی اطلاع دی)۔میں نے ڈاکٹر فرحان نظامی ڈائرکٹر اسلامک سنٹر آکسفورڈ) کے ذریعہ انڈیا آفس لائبریری سے اس فتوے کے حصول کی بہت کوشش کی۔کتاب پریس جانے تک مسلسل کوشش کرتا رہا لیکن ہر مرتبہ یہی جواب ملا کہ یہ فتویٰ اس میں یہ فتویٰ ہے اپنی جگہ پر موجود نہیں ہے۔ڈاکٹر نظامی نے اس کے لئے کافی تگ ودو کی جس کے لئے ہم ان کے مشکور ہیں۔فتویٰ دستیاب ہو گیا تو ان شاء اللہ اگلے ایڈیشن میں کتاب میں شامل کرلیا جائے گا۔

(۳) دیکھئے حالات مشائخ کاندھلہ اول صفحہ ۱۰۴-۱۰۷

(۴) الاعلام (نزهة الخواطر) ۱۳/۷۔

تقریباً ۱۲۰۰ھ (۱۷۸۶ء) میں آپ کی ولادت ہوئی۔ والد ماجد سے تعلیم حاصل کی۔ طب کی کتابیں بھی ان سے پڑھیں اور مثنوی مولانا روم کا درس بھی لیا۔(۱)

مفتی صاحب نے بڑے اہتمام سے آپ کو پڑھایا۔ بعض کتابیں اس کی خاطر خاص آپ کے لئے تالیف فرمائیں۔(۲)

مولانا احتشام الحسن کاندھلوی تحریر فرماتے ہیں: تمام علوم منقول اور معقول میں یگانہ روزگار اور ممتاز شمار ہوتے تھے۔ خصوصاً علم طب میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ علم فرائض میں خصوصی دستگاہ حاصل تھی۔(۳)

آپ شیخ طریقت بھی تھے۔ سلوک کے منازل والد ماجد سے طے کیے۔ انہی سے اجازت وخلافت حاصل تھی۔

آپ قادر الکلام شاعر تھے اور اس فن میں خاصی شہرت رکھتے تھے چنانچہ کریم الدین پانی پتی نے طبقات شعرائے ہند میں اور مبتلا میرٹھی نے طبقات سخن میں اور دیگر بعض تذکرہ نگاروں نے اپنے تذکروں میں آپ کا تذکرہ کیا ہے۔

آپ حسن تخلص کرتے تھے۔ ترجمہ منظوم دفتر اول مثنوی مولانا روم کی تکمیل (یہ ترجمہ مفتی الٰہی بخش نے منبع فیض العلوم کے نام سے شروع فرمایا تھا مگر مصروفیات کی وجہ سے کام جاری نہ رکھ سکے۔ احباب کے اصرار پر مولانا ابو الحسن نے دفتر اول کی تکمیل کی) مثنوی گلزار ابراہیم، مثنوی بحر الحقیقت، متعدد دیگر مثنویاں، چند قصیدے اور ایک رسالہ جہادیہ (فارسی) ان کی یادگار ہے۔

۲۱ر جمادی الثانی ۱۲۶۹ھ مطابق ۲ر مارچ ۱۸۵۳ء کو آپ نے وفات پائی۔(۴)

مولانا ابو الحسن کاندھلوی ان علماء میں سے تھے جو ہندوستان کو دار الحرب سمجھتے تھے۔ ایسے باپ کے آغوش میں آپ نے تعلیم وتربیت پائی تھی جس کو شاہ عبد العزیز

---

(۱) امداد المشتاق، ضمیمہ از مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی صفحہ ۳۴۲۔
(۲) دیکھئے مختصر تذکرہ حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی صفحہ ۷۵
(۳) حالات مشائخ کاندھلہ جلد اول صفحہ ۱۱۹۔
(۴) آپ کے مفصل حالات اور تصنیفات کے لئے دیکھئے ضمیمہ امداد المشتاق صفحہ ۳۴۲-۳۵۱۔ مختصر تذکرہ حالات مشائخ کاندھلہ میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

اور سید احمد شہیدؒ دونوں سے خلافت حاصل تھی۔ پھر خاندان بھی ایسا تھا جہاں ہر وقت تعلیمات ولی اللہی کا چرچا اور سید احمد شہید کا تذکرہ رہتا تھا۔ اس لئے برطانوی اقتدار کی مخالفت اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی تڑپ ان کی فطرت میں داخل تھی۔ ان کے نزدیک انگریزوں کے تسلط کی وجہ سے ہندوستان دار الحرب ہو گیا تھا۔ اس کا اظہار ان کے اس قصیدہ کے بعض اشعار سے ہوتا ہے جو انھوں نے سید صاحب کی سفر حج سے واپسی پر ان کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اس کا ایک شعر ہے جس سے ان کے رجحان پر صاف روشنی پڑتی ہے۔ فرماتے ہیں :

ہند ہوجا تری امداد سے دار الاسلام
نہ رہے نام کو کافر کا کوئی یہاں سے گھر (۱)

مولانا ابوالحسن ایسے علمی مقام پر فائز تھے کہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی جیسے اساطین علم تک آپ کے معترف تھے۔ ساتھ ساتھ شیخ طریقت اور باکمال اور مشہور مدرس بھی تھے۔ نیز تحریر فتاوی سے اشتغال بھی تھا۔ (۲)

اس لئے اگر آپ جہاد کا فتوی صادر کرتے تو اس کو شہرت عام اور بقائے دوام حاصل ہوتا، مگر اس سب کے باوجود آپ نے از خود اس قسم کا کوئی فتوی نہ دیا۔ اس کی وجہ ان کا بڑھا ہوا تواضع تھا۔ (۳)

---

(۱) بیاض مولانا ابوالحسن حسن کاندھلوی ورق ۱۱۴، ب۔ مملوکہ مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی، نیز مجموعہ قصائد، صفحہ ۷، مطبوعہ مطبع الرحمٰن شاہجہاں آباد (دہلی) محلہ خاص بازار، ۱۲۶۸ھ۔
مجموعہ قصائد کے نام سے یہ مجموعہ ان تین قصائد پر مشتمل ہے جو مولانا حسن نے سید صاحب کی منقبت میں کہے تھے۔ مذکورہ شعر پہلے قصیدے کا ہے، جو ایک سو پندرہ اشعار پر مشتمل ہے۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری نے اس میں سے ۹۷ شعر تواریخ عجیبہ (سوانح احمدی) میں نقل کیے ہیں، مگر حیرت ہے کہ انھوں نے وہ اشعار نقل نہیں کئے جن سے مقصد جہاد پر روشنی پڑتی ہے، انہیں میں مذکورہ شعر بھی ہے۔ سوانح احمدی سے منتخب کر کے ۸۲ شعر مولانا علی میاں نے سیرت سید احمد شہید جلد اول صفحہ ۳۸۹۔۳۹۳ میں اور ۳۶ شعر غلام رسول مہر نے اپنی کتاب سید احمد شہید اول صفحہ ۲۴۲۔۲۴۳ میں درج کئے ہیں۔

(۲) مولانا احتشام الحسن صاحب لکھتے ہیں۔ تعلیم علوم وفنون اور تحریر فتاوی میں ہر وقت مشغول رہتے تھے۔ (حالات مشائخ کاندھلہ، صفحہ ۱۱۹)

(۳) ان کے آخری درجہ کے تواضع کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ والد ماجد سے باقاعدہ اجازت وخلافت حاصل تھی مگر متعلقین کے اصرار کے باوجود بھی کسی کو بیعت نہیں کیا۔ (ضمیمہ امداد المشتاق صفحہ ۲۴۳۔) مولانا ابوالحسن کے فتوی نہ دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ
==

تاہم آپ نے اپنے زمانہ کے علماء عظام اور مشہور مفتیان کرام کو اس مسئلہ پر غور وفکر کی دعوت دی، مؤثر انداز میں صورت حال پیش کر کے اپنے رجحان کی تائید میں ان سے فتوے حاصل کئے۔ مثلاً شاہ رفیع الدین دہلوی، قاضی ثناء اللہ پانی پتی اور مفتی شرف الدین رامپوری کے فتاوی دارالحرب آپ کے خاندانی ذخیرہ میں موجود ہیں۔ اسی طرح آپ کی بیاض میں مفتی شرف الدین کا جہاد سے متعلق ایک مفصل فتوی بھی موجود ہے۔ ان سب چیزوں سے اس مسئلہ سے آپ کی دلچسپی اور ذوق جہاد کا اندازہ ہوتا ہے۔

سید صاحب کی منقبت میں آپ نے جو قصیدہ کہا ہے، اس سے بھی آپ کے جذبات کا پتہ چلتا ہے۔ چند متفرق اشعار دیکھئے :

اس طرح توڑے گا تو حصن حصین کفار　　جد امجد نے جوں کے اکھاڑا خیبر
کافروں کا ہو ترے سامنے یوں پتلا حال　　جس طرح تند ہوا چلنے سے بھاگیں مچھر
ہوں تری تیغ سے سب لشکر کفار خراب　　لائیں اسلام ترے ہاتھ پہ عاجز ہو کر (۱)

اور یہ شعر ملاحظہ ہو :

قتلی قتلی ہوں بدن ایسی لگیں تلواریں
ٹکڑے ٹکڑے ہوں جگر پار ہوں ان سے خنجر

فارسی رسالہ جہادیہ میں عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس وقت جہاد سب پر فرض ہو گیا ہے۔ وہ غیرت دلاتے ہوئے جہاد پر آمادہ کرتے ہیں۔ کہتے ہیں :

فرض شد برہمہ جہاد کنوں　　کہ زحد شد بروں فساد کنوں
کافراں رابہیں تو در بازار　　دعوت کفر می کنند اظہار

== خود والد ماجد مفتی الٰہی بخش کا اس طرح کا فتوی موجود تھا مگر یہ احتمال ضعیف ہے اس لئے کہ مفتی صاحب مختلف جگہوں پر منصب افتاء پر فائز رہے تھے وہیں کہیں یہ فتوی دیا ہوا اور [illegible] ابوالحسن کو اس کا مطلق علم نہ ہوا ہو، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ مفتی صاحب کا یہ فتوی کا [illegible] نہیں ہے۔ کسی جگہ سے تحقیقات کے دوران انگریزوں کے ہاتھ لگا تھا جس کو انھوں نے انڈیا آفس لائبریری لندن میں محفوظ کرلیا ہے۔

(۱) اس کے قرائن موجود ہیں کہ یہاں کافروں سے ان کی مراد انگریز ہیں، اس لئے کہ اس ضمن میں یہ اشعار ہیں جس میں وہ ہندوستان کو دارالحرب کہہ رہے ہیں۔

بہر سامان او شتاب کنید عز دل گردرون دل دارید(۱)

اس رسالہ کے چند اور اشعار ملاحظہ ہوں، جن سے مولانا ابوالحسن کی غیرت وحمیت اور جوش جہاد کا اندازہ ہوتا ہے۔

دین اسلام سست گشت ببیں غلبہ کفر شدعیاں بہ زمیں
پیشوایان دین کہ بگو شتند کافراں را بہ امر حق کشتند
غلبہ دیں بہ زور شمشیر است ہرکہ گیرد بدست آں شیر است
سستی از پیشوا ہمی کردند گوے سبقت دریں نمی بردند
ہندآباد کے شدے ز اسلام دین اسلام می شدے گمنام
تابہ کے درمیان خانہ چوزن می نشینی بہ حب اہل وطن
غیر افسوس ثمرۂ سستی نیست حاصل ترا بکن چستی
غیرتے کن مکن تو نامردی زود خیز وبیا اگر مردی

پھر آگے خاص علماء کو جہاد پر ابھارتے ہوئے کہتے ہیں:

اکنوں اے مومنان پاک نہاد وقت آمد کہ می شود دل شاد
جان خود دررہش نثار کنید بر سر اہل کفر تیغ زنید
حضرت مولوی کتاب مخواں گیر شمشیر ورو سوئے میداں
وقت جانبازی است نے تقریر غیر شمشیر درخیال مگیر
چوں توئی رہنمائے دین متیں پیش دستی نما چوزن منشیں

سید صاحب کے ساتھ آپ کو بہت گہری عقیدت تھی۔ ان کے قصائد اس کے شاہد ہیں۔ باقاعدہ بیعت کا تو ثبوت نہیں ملا۔ البتہ مفتی الٰہی بخش نے چوں کہ سید صاحب سے رجوع ہونے کے بعد اپنے خلفاء و مریدین اور رشتہ داروں کو سید صاحب کے دامن تربیت سے وابستہ کردیا تھا اس لئے خاص ان کے صاحبزادہ اس سے کیوں محروم رہتے۔ انھوں نے ''رسالہ جہادیہ'' لکھ کر تحریک جہاد سے وابستگی کا حق ادا کردیا۔ ہزاروں کو تحریک سے جوڑا، اگرچہ خود عملاً جہاد میں شرکت نہ کرسکے۔(۲) سید صاحب

(۱) دیکھئے جماعت مجاہدین از غلام رسول مہر صفحہ ۲۹۹۔ یہ پورا رسالہ انھوں نے درج کیا ہے۔
(۲) جس کے بہت سے اسباب تھے۔ بڑا سبب والد صاحب کی ضعیفی اور گھربار اور ==

کی شہادت کے بعد ان کو اس پر افسوس ہوتا تھا۔ مثنوی بحر الحقیقت کے اختتام پر اس کا یوں اظہار کرتے ہیں۔

مرد جو چالاک تھے چلتے رہے — ہم کف افسوس ہی ملتے رہے
ناز و نعمت میں ہوئے ایسے غریق — خواب میں آنے کا بھی چھوڑا طریق
کر دیا مجھ کو جو یوں دل سے جدا — حق مجلس اور صحبت کیا ہوا
گر میں تھا نامرد تم تو مرد تھے — کیوں نہ مجھ کو ساتھ اپنے لے گئے

مولانا میں انگریزوں سے نفرت اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ اگر کبھی کسی وجہ سے مجبوری میں یورپین افسر سے ہاتھ ملانا پڑتا تو اس کو پہلے پاک کرتے تھے پھر کسی چیز کو ہاتھ لگاتے تھے۔(۱)

ملی غیرت، انگریز دشمنی اور حب الوطنی ہی کی وجہ سے ان مجاہدین سے ان کے روابط تھے جنھوں نے انگریزوں سے جہاد کا بیڑا اٹھایا تھا مثلاً مفتی محمد عوض بریلوی جنھوں نے ۱۸۱۶ء میں ہاؤس ٹیکس کی مخالفت کر کے بریلی میں انگریزوں سے زبردست جہاد کیا تھا۔ اور مفتی شرف الدین رامپوری جنھوں نے انگریزوں سے جنگ کی اسکیم تیار کی تھی جس کی تفصیل خالد حسن خاں کی تاریخ روہیلکھنڈ سے معلوم ہوتی ہے۔ قرائن بتاتے ہیں کہ ان دونوں مجاہد بزرگوں سے مولانا کے مستحکم تعلقات تھے۔(۲)

مولانا نے اپنے بچوں کی تربیت بھی اسی پر کی تھی چنانچہ جب جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے سب سے بڑے قائد مجاہد اعظم مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی نے اپنے پروگرام کو منظم طور پر آگے بڑھانے کے لئے ''مجلس علماء'' کی بنیاد رکھی تو مولانا ابوالحسن

== خویش و تبار کی ذمہ داری تھی۔ تاہم خاندان کے بہت سے جوان سید صاحب کے ساتھ رہے اور بعض نے جام شہادت بھی نوش کیا۔

(۱) دیکھئے حالات مشائخ کاندھلہ صفحہ ۱۲۸۔

(۲) مفتی محمد عوض بریلوی کے ساتھ گہری وابستگی ہی تھی جو انھوں نے ان کی تاریخ وفات کہی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ مفتی محمد عوض کی تاریخ وفات کا علم نواب صدیق حسن خاں تو در کنار جوان کے حقیقی نواسے تھے اور نہ ان کے صاحبزادہ نواب علی حسن خاں اس کی نشاندہی کر سکے۔ اس کا واحد ماخذ مولانا ابوالحسن کی بیاض ہے۔ جس میں انھوں نے ان کی تاریخ وفات لکھی ہے۔ اور مفتی شرف الدین کے بعض فتاوی جہاد کا ان کی بیاض میں موجود ہونا خود ان سے روابط کو بتاتا ہے۔

کے صاحبزادہ مولانا نورالحسن کو ہم اس کے بنیادی اراکین میں پاتے ہیں۔اس کی تفصیل انشاءاللہ میری زیر تصنیف کتاب ''۱۸۵۷ءاور علماء'' میں ملے گی۔

مفتی شرف الدین رامپوری: فتویٰ دارالحرب اور مجاہدانہ کارنامے

مفتی شرف الدین رامپوری کا تعلق علوی سادات سے تھا۔مشہور زمانہ عالم، مدرس اور مفتی تھے۔اصل میں پنجاب کے رہنے والے تھے۔سکھوں کے عمل دخل کی وجہ سے وہاں سے ہجرت کر کے رامپور آ گئے تھے۔حافظ احمد علی شوق لکھتے ہیں کہ رامپور آ کر علم وفضل میں وہ شہرت حاصل کی کہ علمائے رامپور کا سلسلہ علم آپ تک منتہی ہوتا ہے۔نواب احمد علی خاں نواب رامپور (۱۲۲۵ھ-۱۲۵۶ھ) آپ کی نہایت تکریم کرتے تھے۔عہدہ قضا آپ کے سپرد تھا۔(۱)

مولوی عبدالقادر رامپوری نے جو آپ کے شاگرد تھے،آپ کا اس طرح تذکرہ کیا ہے: اگر میں قرار واقعی ان کی تعریف لکھوں تو مرتبہ فنا فی الشیخ پر محمول ہوگا۔اکثر علوم میں فہم عالی کی قوت سے پوری قدرت رکھتے ہیں۔افتاء میں قاضی القضاۃ ابو یوسف کی یادگار ہیں۔اس وقت اس شہر میں ہر فن کی کتابیں پڑھانا اور ہر بات کا جواب دینا انہی کا کام ہے۔طلبہ کی تعلیم وتربیت کی جانب جب بھی متوجہ ہو جاتے ہیں تو اپنی نظیر نہ رکھتے۔اس بات کا یہ کھلا ہوا ثبوت ہے کہ جس کسی نے چند روز ان کی خدمت میں علم کی چاشنی حاصل کی پھر جس آفت میں بھی مبتلا ہوا اس فن کے مشغلے کو کبھی ہاتھ سے نہ دیا۔(۲)

نواب صدیق حسن خاں صاحب رقم طراز ہیں:

در استحضار کتب درسیہ وعلوم قوم باجمعھا وبحذافیرھا عدیم المثال وقت خود بودند، طنطنہ درس وتدریس شان در چارسوئے عالم رسیدہ است۔میان زمرۂ علماء توجھی وترحمی وشفقتی کہ ایشاں را بر حال طلبہ علم مبذول می بود، ہیچ کس را شنیدہ نشد عالم عالم طلبہ علم بحلقہ درس ایشاں رسیدہ بمنتہائے کمال علمی رسیدند وکتب فنون متداولہ را از بدایت تا نہایت گزرانیدند۔(۳)

(۱) تذکرہ کاملان رامپور صفحہ ۱۷۰

(۲) علم وعمل صفحہ ۸۷-۸۰-ترجمہ مولوی معین الدین افضل گڑھی۔ترتیب وحواشی محمد ایوب قادری۔

(۳) تاریخ قنوج (قلمی) صفحہ ۲۶۵ مخزونہ مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

مفتی صاحب نے کئی کتابیں یادگار چھوڑیں۔سراج المیزان، (منطق) حاشیہ میر زاہد قطبیہ، شرح سلم العلوم، شرح کافیہ ابن حاجب، حل الاشکال، علم فرائض میں ایک مختصر رسالہ اور بعض فتاوی۔ ان میں سے اکثر کتابیں رضا لائبریری رامپور میں موجود ہیں۔ ۵رشعبان ۱۲۶۸ھ (مئی ۱۸۵۲ء) میں مفتی صاحب نے وفات پائی۔

آپ کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے دہلی، کلکتہ اور لکھنؤ وغیرہ کا سفر کیا تھا، جہاں آپ کو انگریزی سیاست کا داؤ پیچ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا۔(۱)

انگریزوں سے جہاد کے لئے مفتی شرف الدین کی تدبیریں

چونکہ مفتی صاحب انگریزوں کے تسلط کی وجہ سے ہندوستان کو دارالحرب سمجھتے تھے۔ اسلئے عملاً بھی انھوں نے انگریزوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کی تدبیریں کیں۔

جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ رامپور دراصل اودھ کے کنٹرول میں تھا۔ جس کو ایک معاہدہ کے تحت نواب فیض اللہ خان نے خرید لیا تھا، اور ریاست کی بنیاد رکھی تھی۔ اس لئے یہ ریاست شروع دن ہی سے والی اودھ اور اس کے سرپرست انگریزوں کے رحم وکرم پر تھی۔

۱۷۹۹ء میں شاہ افغانستان زمان شاہ درانی کے اودھ پر حملہ کا خطرہ دکھا کر انگریزوں نے اس میں اپنے پنجے گاڑ لئے، اور ۱۸۰۱ء میں ایک معاہدہ کے موافق چند اضلاع انگریزوں کے حوالے کئے گئے، جس میں روہیلکھنڈ کا علاقہ بھی شامل تھا، جس کا صدر مقام رامپور تھا۔ اس وجہ سے روہیلے اور بالخصوص ان کے سربرآوردہ حضرات جن میں بڑی تعداد علماء کرام کی تھی، اور بگڑ گئے۔ جو پہلے ہی انگریزوں کے زخم خوردہ تھے۔ رامپور جو نواب فیض اللہ خاں کی علم دوستی کی وجہ سے علماء کا ملجا بنا ہوا تھا۔ مگر انگریزوں

(۱) مولانا ابوالحسن حسن کاندھلوی کی بیاض (ورق ۱۳۱ و ۱۳۲ الف، مملوکہ مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی) میں تحقیق جہاد کے سلسلہ میں مفتی صاحب کا ایک مفصل فتوی موجود ہے۔ جس کے اسلوب سے اندازہ ہوتا ہے کہ مفتی صاحب بشرط طاقت موجودہ حالات میں جہاد ضروری سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے موقع ملتے ہی تیاری شروع کی۔ مولانا نورالحسن راشد صاحب کا کہنا ہے کہ ان کے پاس ایک بیاض تھی جس کی دستیابی اس وقت مشکل ہورہی ہے اس میں ہندوستان کے دارالحرب ہونے کے متعلق مفتی شرف الدین صاحب کا صریح فتوی موجود تھا۔

کے عمل دخل کی وجہ سے یہاں سے بھی چین وسکون غارت تھا۔ اس لئے انھوں نے انگریزوں کو جڑ سے اکھاڑنے پھینکنے کا منصوبہ بنایا۔ اس وقت نواب احمد علی خان (۱۷۹۴ء۔۔۔ ۱۸۴۰ء) رامپور کے نواب تھے۔ وہ زیادہ تر لہو ولعب اور سیر وشکار میں مصروف رہتے تھے، اور اپنا اکثر وقت زنانے میں بسر کرتے تھے، اور دوسرے معتمدین نیابت کرتے تھے۔ اس زمانہ میں غلام حسن خاں پٹھان نیابت کے فرائض انجام دیتا تھا۔ چند اہل کاروں نے سازش کر کے اس کو قتل کروا دیا۔ اس کے قتل کے بعد نواب احمد علی خاں کی مدد کے نام پر انگریز افسروں کی سرکردگی میں انگریزی فوج کا دستہ رامپور آ گیا۔ نواب صاحب نے انگریزی پالیسی کو اپنے حق میں دیکھ کر مظالم میں شدت شروع کی۔(۱) اس کے کچھ عرصہ بعد نواب صاحب مجنون بن کر ایک بنگلے میں مقیم ہو گئے۔ انگریزی فوج کا دستہ بھی یہیں مقیم تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر سرداران قوم متفکر ہو گئے اور یکجا ہو کر مشورہ کرنے لگے کہ انقلاب احوال اور امن عامہ کو بحال کرنے کے لئے اس وقت کیا اقدام کرنا چاہئے۔ مفتی شرف الدین نواب احمد علی خاں کو قتل کر کے انگریزوں کے خلاف تحریک چلانا چاہتے تھے۔ خالد حسن خاں مرحوم لکھتے ہیں :

مفتی شرف الدین صاحب ان سب میں انتہا پسند تھے۔ ان کی رائے تھی کہ احمد علی خان کو قتل کر کے روہیلوں میں سے کسی کو نواب منتخب کیا جائے اور انگریز کے خلاف اعلان جہاد کر کے روہیلوں کو جمع کیا جائے تا کہ جنگ دوجوڑہ اور جنگ کٹرہ کمال الدین کی شکستوں کا انتقام لیا جا سکے۔ اس وقت اس فوجی مقابلے کے لئے حالات سازگار تھے یا نہ تھے۔ (غالباً نہ تھے) لیکن نتائج سے بے پروا ہو کر روہیلوں کا اٹھ کھڑا ہونا بعید از

---

(۱) مظالم تو پہلے سے جاری تھے۔ حکیم نجم الغنی کے بقول نواب صاحب کو اختیارات حاصل ہوتے ہی بدنظمی پیدا ہو گئی۔ ہزاروں نوکر تخفیف میں آئے۔ بہت سی مسجدیں ویران ہو گئیں۔ زیارت گاہیں کھنڈر۔ مدرسے ندارد۔ اکثر بزرگان اکابر اور روشناس مشاہیر شہر میں تنگ دست ہو کر جلا وطن ہو گئے۔ تباہ ہو گئے۔ جو رہے بدنام کرنے والے، آرام کے بندے، باپ دادا کی ہڈیاں بیچنے والے، جن کو بھی نواب نے نان شبینہ کو محتاج کر دیا، اور جو کچھ حسن عقیدت سے دیا وہ ان کی بسر اوقات کو کافی نہ تھا۔ سرکشی اور خانہ جنگی کی چاروں طرف سے پکار مچ گئی۔ بے گناہوں کا خون باتوں باتوں میں اڑ جاتا تھا۔ (اخبار الصنادید جلد اول صفحہ ۱۰۷-۱۱۱۔)

امکان نہ تھا۔ وہ انگریز کے ہاتھوں بے پناہ مصائب و آلام جھیلنے کے بعد بھی دہشت زدہ نہیں ہوئے تھے، اور ان کا غم و غصہ باقی تھا۔ اگر چہ جمعیت منتشر ہو چکی تھی اور کوئی سر دھرا باقی نہ تھا۔ مگر ابھی انہوں نے زمانہ سے ساز کرنا نہ سیکھا تھا۔ ''متاع کارواں'' لٹ چکا تھا مگر ''احساس زیاں'' باقی تھا۔ اس دور سے کئی نسلوں بعد تک تنزل کا سلسلہ جاری رہا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ مقابلہ اور مجادلہ کی اسپرٹ بھرنے کی خواہش و کوشش بھی چلتی رہی۔ خصوصاً اس عہد میں یہ کشمکش نمایاں تھی۔ انگریز کو بھی اس کا اندازہ تھا۔ اس لئے تشدد کی پالیسی پر کاربند تھا۔

بس ایک تسلسل تغیر حال قائم ہے
نصیب عشق فساد دوام بھی تو نہیں

مفتی صاحب مذکور نے کیا پروگرام بنایا تھا۔ ان کے وسائل کہاں تک تھے اور جماعت کی کس حد تک تائید حاصل تھی۔ اس سلسلہ میں بہت سی روایات ہمارے کان میں پڑی ہوئی ہیں۔ ان کا دربار سے واسطہ تھا، اس لئے انھیں روہیلوں کا اعتماد حاصل ہونے میں بھی کلام ہے۔ کیوں کہ جماعت نواب سے عملاً عدم تعاون کئے ہوئے تھی اور کسی ملازم سرکار کو اچھی نظر سے نہ دیکھتی تھی۔ ہمیں تو صرف اس سے بحث ہے کہ احمد علی خان کے دیوانہ ہونے کا مغالطہ کھا کر انھوں نے رائے اظہار میں جلدی کی اور عمل میں تاخیر۔ ورنہ تلوار تو دیوانے اور فرزانے کسی کے ساتھ رعایت نہیں کرتی۔ (۱)

چوں کہ انگریزوں اور نواب (احمد علی خان) کے درمیان یارانہ تھا۔ جس کی وجہ سے روز بروز رامپور میں ان کا اثر بڑھ رہا تھا۔ مفتی شرف الدین صاحب انگریزوں سے مقابلہ کے لئے ضروری سمجھتے تھے کہ پہلے نواب کو ٹھکانے لگایا جائے پھر انگریزوں سے

(۱) تاریخ روہیلکھنڈ صفحہ ۵۵۸۔ ۵۵۹۔ تاریخ روہیلکھنڈ پر اسی نام سے کئی کتابیں ہیں۔ مگر خالد حسن خاں کی یہ کتاب بعض اعتبارات سے سب سے ممتاز ہے۔ اس میں بہت سی باتیں ایسی ملتی ہیں جو دوسری کسی کتاب میں نظر نہیں آتیں انہی میں سے مفتی شرف الدین کے متعلق یہ تفصیل بھی ہے۔ تقسیم ہند کے وقت اس کا مخطوطہ پاکستان پہنچ گیا تھا جو بہت خوشخط تھا۔ عابد رضا بیدار صاحب نے جب وہ خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کے ڈائرکٹر تھے، اس کو حاصل کیا اور لائبریری کی طرف سے اس کا عکس شائع کیا۔ بیچ بیچ سے کئی صفحات غائب ہیں جس کی ناشر نے تفصیل دی ہے۔ جو موجود ہے بہت غنیمت ہے اور بیدار صاحب کا احسان اور ان کی بیداری کی دلیل ہے۔

نمٹا جائے۔ کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ ورنہ اندرون ملک انگریزوں سے مقابلہ دشوار ہو جائے گا۔ بہت سے مار آستین نکل آئیں گے اور خود گھر کے چراغ سے گھر کو آگ لگ جائے گی۔ نواب کی دیوانگی نے اس کا بہترین موقع دیا۔ گویا اس کے عزل وقتل کا جواز فراہم کیا۔ چنانچہ مفتی صاحب نے نواب کے قتل کا مشورہ دیا۔ حکیم نجم الغنی لکھتے ہیں:

> نواب صاحب فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اپنے کانوں سے مفتی صاحب کی زبانی یہ لفظ سنے تھے۔ ہاں اب دیر کیا ہے۔ بعض صاحبوں کا بیان ہے کہ جب نواب صاحب کی مصنوعی دیوانگی میں ان کے قید اور معزول کرنے کا مشورہ ہوا تو مفتی صاحب نے نواب صاحب کے قتل کرنے کے لئے ایما کیا تھا۔ (۱)

اخبار الصنادید کی یہ عبارت نقل کر کے خالد حسن خاں لکھتے ہیں کہ بعض صاحبوں کا بیان ہی نہیں متفقہ قومی روایت ہے کہ مفتی صاحب نے احمد علی خاں کے قتل کا پر زور مشورہ دیا تھا اور انگریز سے مقابلہ کی بھی تحریک کی تھی۔ تحریک کی ہو یا نہ کی ہو انگریز کی مخالفت کے علی الرغم احمد علی خان کو قتل کر کے کسی دوسرے شخص کو نواب بنانے کا انجام فوجی مقابلہ کے سوا اور کیا ہوتا۔ مفتی صاحب کی اس تجویز ہی میں معرکہ دو جوڑہ کی طرح ایک اور معرکہ برپا کرنے کی تمنا موجود تھی۔ (۲)

بہر حال جب احمد علی خان کو اپنی اس حکمت عملی سے معلوم ہو گیا کہ درباریوں اور معتمدین خصوصی میں سے کون ان کا مخلص و وفادار ہے، اور کون ان کا مخالف اور ان کے عزل وقید وقتل کا طرفدار، تو انھوں نے دیوانگی کا سوانگ ختم کر کے گہرے انتقامی جذبے کو چھپاتے ہوئے مذاق میں بات ٹال دی۔ کئی ہفتے شکار میں گزارنے کے بعد احمد علی خاں شہر میں واپس آئے۔ انگریزی فوج کا ہندوستانی دستہ ان کی حفاظت کے لئے موجود تھا ہی۔ اس کے انگریز افسر عطایا وعنایات کی بدولت ان کے حکم بردار تھے ہی۔ چند دن توقف کے بعد ان ملازمان کو جن کی عداوت ثابت ہو چکی تھی۔ اور جو ان کو

(۱) اخبار الصنادید اول صفحہ ۳۴۷۔
(۲) تاریخ روہیلکھنڈ صفحہ ۵۶۰۔

معزول، مقید اور قتل کرنے کی تجویز کے روح رواں تھے فرداً فرداً سزا دینا شروع کی کسی سردار کو جان سے مارا گیا اور کسی کو انتہائی دردناک اور رسوا کن سزا دی گئی۔ اب مفتی شرف الدین کی باری تھی۔ مفتی صاحب چونکہ سرکاری مفتی تھے۔ اور حکومت میں ان کا ایک وزن تھا۔ اس لئے نواب کے لئے ان سے بدلہ لینا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ مگر گورنر جنرل سے مشورہ کے بعد یہ بھی آسان ہو گیا۔ خالد حسن خاں لکھتے ہیں: گورنر جنرل مارکوئس ہسٹنگز اسی زمانہ میں بریلی آئے ہوئے تھے۔ احمد علی خاں وہیں جا کر ان سے ملے۔ روہیلوں کے بارے میں ان سے کیا کہا اور انھوں نے کیا جواب دیا۔ اس کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے۔ پھر بھی اتنا جانتے ہیں کہ احمد علی خاں پوری جماعت کے خلاف عناد کی آگ میں جل رہے تھے اور مارکوئس ہسنگز سے مل کر آنے کے بعد وہ اپنی منتقمانہ پالیسی میں بیباک تر ہو گئے۔ چنانچہ اب مفتی شرف الدین صاحب کی باری آئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سے بدلہ لینا احمد علی خاں ذرا مشکل سمجھتے تھے اور جب تک گورنر جنرل سے اپنی پالیسی کی از سر نو تصدیق و توثیق نہ کرالی، ان پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہ پڑی۔ اس جگہ یہ نکتہ بھی قابل غور رہے کہ افغانوں پر علماء کا بہت اثر ہوتا ہے، اسے انگریز بھی جانتا ہے، اور احمد علی خاں نے غالباً انہیں کے خلاف گورنر جنرل کو ورغلایا تھا۔ جب ہی تو اب کے بار اسی گروہ کو مشق ستم بنایا گیا۔ قصہ مختصر احمد علی خاں نے بریلی سے واپسی کے بعد مفتی شرف الدین صاحب کو گرفتار کرالیا اور گدھے کی دم سے ان کے ہاتھ اس طرح بندھوائے کہ رسی کے ایک سرے میں دم بندھی ہوئی تھی اور دوسرے میں ان کا ہاتھ۔ اس طرح تمام شہر میں تشہیر کرایا۔ انگریز فوج کا مسلح دستہ ساتھ تھا۔ گدھے کے آگے آگے شہنائی بجتی جاتی تھی جس میں یہ شعر گایا جا رہا تھا۔

نکل کے وادیٔ وحشت سے دیکھ اے مجنوں
کہ شور و دھوم سے آتا ہے ناقۂ لیلیٰ

اس کے بعد انھیں ایک چھت پر قید کر دیا گیا۔ عام لوگوں نے اس واقعہ کا جو بھی اثر لیا ہو، مگر ان کے شاگردوں نے حق استادی ادا کر دیا۔ انھوں نے قید میں ایک رات گزاری تھی۔ دوسری رات دس پندرہ پٹھان نوجوان چھت پر سے مفتی صاحب کو نکال لے گئے۔ نواب ان کی اس چیرہ دستی سے حیران اور خجل ہو کر رہ گئے۔ مفتی صاحب لکھنؤ

چلے گئے اور نواب کو پھر ان سے بدلہ لینے کی ہمت نہ پڑی۔

پھر لکھتے ہیں کہ احمد علی خاں نے گورنر جنرل سے مل آنے کے بعد جو ناقابل تلافی اجتماعی نقصان پہنچایا، وہ یہ تھا کہ علمائے شہر کو چن چن کر بتدریج شہر بدر کر دیا اور وہ رامپور جو اس وقت ''بخارائے ہند'' کہلاتا تھا۔ اس امتیازی شرف سے محروم ہو گیا۔ اخیر میں تجزیہ کرتے ہوئے بہت صحیح لکھا ہے کہ اگر احمد علی خان کو انگریز کی پوری پوری تائید اور فوجی تقویت حاصل نہ ہوتی، انگریز اور احمد علی خاں کے مصالح ہم آہنگ نہ ہوتے، یا کم از کم روہیلے فرداً فرداً علماء کے نکالے جانے کی پالیسی کو بروقت سمجھ لیتے، تو یہ کام اتنا آسان نہ تھا جس آسانی سے ہو گیا۔ (۱)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انگریز اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے علماء کو کس درجہ خطرناک سمجھتے تھے۔

تیسری فصل

علماء بنگال اور مسئلہ دارالحرب

بنگال اب تک انگریزوں کی بربریت کا سب سے زیادہ شکار ہوا تھا۔ جنگ پلاسی کے بعد انگریزوں نے اس کی اینٹ سے اینٹ بجائی تھی۔ بلکہ اس کا خون چوس لیا تھا۔ اس بنگال میں یقیناً بہت سے علماء اس وقت ایسے رہے ہوں گے جو ہندوستان کو دارالحرب سمجھتے ہوں گے۔ مگر چوں کہ انگریزوں کا دباؤ بہت سخت تھا، اس لئے وہ گھٹتے رہے۔ اور اس کا اظہار نہیں کر سکے۔ مگر شاہ عبدالعزیز صاحب نے جب جرأت سے کام لے کر ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا تو اس کی صدائے بازگشت پورے ہندوستان میں سنی گئی اور دوسرے علماء نے بھی اظہار رائے کی ہمت کی۔ علماء بنگال جو پہلے ہی سے زخم خوردہ تھے اب سامنے آنے لگے۔ اور انھوں نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس سلسلہ میں فرائضی تحریک کے بانی مولانا شریعت اللہ فرید پوری کا نام اور کارنامے سب سے روشن ہیں۔ ان کا مفصل تذکرہ مستقل باب

(۱) تاریخ روہیلکھنڈ صفحہ ۵۶۲۔۵۶۳

میں آپ پڑھیں گے۔ مگر یہاں اتنا معلوم ہو کہ ان کے ایک استاد بھی اسی نظریے کے حامی تھے کہ ہندوستان دارالحرب ہے۔

اس کے علاوہ بعض علماء ایسے تھے جو متعدد سیاسی مجبوریوں کی بناء پر اس کا بانگ دہل اعلان تو نہیں کر سکے، مگر وہ یہی سمجھتے رہے کہ ہندوستان دارالحرب ہے اور کسی حصہ زمین کے دارالحرب بن جانے کے بعد شرعی احکام میں جو فرق پڑتا ہے وہ اس کے پابند رہے مثلاً نماز جمعہ سے احتراز وغیرہ۔

مولانا کرامت علی جونپوری کا ہندوستان کو دارالحرب سمجھ کر ہجرت کا ارادہ کرنا

مولانا کرامت علی جونپوری۔ سید احمد شہید کے کبار خلفاء میں تھے۔ نسباً صدیقی تھے۔ ۱۲۱۵ھ/ ۱۸۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے بہت ذہین واقع ہوئے تھے۔ اس لئے جملہ علوم وفنون کو کم سنی میں کامل طور سے حاصل کر لیا تھا۔ چنانچہ انیس برس کی عمر میں آپ نے فقہ کی مشہور کتاب مفتاح الجنۃ عام فہم اردو زبان میں تصنیف فرمائی۔ جو بے حد مقبول ہوئی۔ آپ فن تجوید کے مشاق اور فن کتابت وخوشنویسی میں طاق تھے (۱)۔ سپہ گری میں بھی کمال پیدا کیا تھا، جس سے بعد کی زندگی میں بہت فائدہ اٹھایا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں رائے بریلی حاضر ہو کر سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی۔ سید صاحب نے اس جوہر قابل کو پہچان لیا اور پہلے ہی ہفتہ خلافت سے سرفراز فرمایا۔ اٹھارہ روز بعد وطن لوٹے اور تبلیغ وہدایت اور اصلاح رسوم میں سرگرم ہوئے۔ جون پور اس وقت جاہلانہ رسوم کا اڈہ بنا ہوا تھا۔ آپ نے بڑی جرأت سے کام لے کر ان کی اصلاح فرمائی اور مخالفتیں برداشت کیں۔ کچھ عرصہ کے بعد سید صاحب کے حکم سے عازم بنگال ہوئے۔ بنگال بالخصوص مشرقی بنگال ہندوانہ رسوم وعادات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اصلاح حال میں ہزاروں دقتیں اور مشکلیں حائل تھیں۔ سب کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے

(۱) آپ کے پوتے مولانا عبدالباطن جونپوری لکھتے ہیں کہ آپ ایک چاول پر پوری سورہ قل ھو اللہ مع بسم اللہ کے لکھتے تھے اور اخیر میں اپنا نام بھی لکھ دیتے تھے۔ خوبی یہ تھی کہ حروف نہایت صاف، خوش خط اور واضح ہوتے تھے کہ دیکھنے والے حیرت کرتے۔ (سیرت مولانا کرامت علی جونپوری صفحہ ۱۶۔)

اکاون برس تک بنگال وآسام میں تبلیغ دین اور اعلاء کلمۃ اللہ اور رد شرک و بدعت اور اشاعت سنت میں مصروف رہے۔ لاکھوں لوگوں نے آپ سے ہدایت پائی اور ہزاروں لوگ آپ کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوئے۔ آپ اپنے زمانہ کے کثیر التصانیف عالم تھے۔ مولانا رحمان علی نے اڑتالیس کتابوں کی فہرست درج کی ہے۔ (۱)

۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۳ء میں رنگ پور (مشرقی بنگال) میں آپ کا انتقال ہوا اور وہیں تدفین ہوئی۔ (۲)

سید صاحب کے دیگر خلفاء کی طرح آپ بھی انگریزوں کے سخت مخالف تھے۔ اور ہندوستان کو دار الحرب سمجھتے تھے۔ اوکینلیے نے ذکر کیا ہے کہ مولانا کرامت علی نے ۱۸۳۸ء میں ہندوستان کو چھوڑ کر دار الاسلام (مکہ یا مدینہ) چلے جانے کی خواہش کا اظہار کیا (۳) مگر انہوں نے ہجرت پر بنگال میں اشاعت دین کو ترجیح دی اور اس کو زیادہ نتیجہ خیز تصور کیا کہ دعوت وتبلیغ و اصلاح رسوم اور رد بدعات کے ساتھ انگریزوں کے خلاف آسانی سے زمین تیار کی جاسکتی ہے اور پھر ایک انقلاب عظیم برپا کر کے انگریزوں کو بے دخل کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ پہلے سے جاری اپنی دعوتی سرگرمیوں ہی میں مصروف رہے۔ مگر ساتھ ساتھ انگریزی حکومت کے خلاف لوگوں کے جذبات بھڑکاتے اور لوگوں کو جہاد پر آمادہ بھی کرتے رہے اور بڑی حکمت اور دوراندیشی سے اپنا یہ مشن جاری رکھا مگر چوں کہ حکومت کی خفیہ ایجنسیاں ہر جگہ کام کر رہی تھیں اور جگہ جگہ حکومت کے کارندے ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتے تھے۔ اس لئے مولانا کرامت علی کی یہ

---

(۱) دیکھئے تذکرۂ علماء ہند اردو ترجمہ صفحہ ۳۹۵-۳۹۶

(۲) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو سیرت مولانا کرامت علی جونپوری۔

(۳) ڈاکٹر معین الدین عقیل، تحریک ہجرت: تحریک مقاصد اور نتائج از تحریک ہجرت: تاریخ افکار اور دستاویزات مرتبہ شاہد حسین خاں صفحہ ۴۲۔ مولانا کرامت علی نے مولانا حاجی شریعت اللہ فرید پوری بانی فرائضی تحریک کی شدید مخالفت کی تھی۔ فرائضی تحریک کے بیان میں جس کی کچھ تفصیل آرہی ہے۔ موخر الذکر کہتے تھے کہ ہندوستان دار الحرب ہو گیا ہے۔ اس لئے یہاں جمعہ اور عیدین جائز نہیں ہیں۔ مولانا کرامت علی نے اس مسئلہ میں خاص طور پر ان سے مخالفت کی حالاں کہ وہ بھی ہندوستان کے دار الحرب ہونے کے قائل تھے۔ مگر ان کا کہنا تھا کہ دار الحرب میں تو اقامت جمعہ اور عیدین کی اور زیادہ ضرورت ہوتی ہے (رسالہ رد البدعت) دیکھئے موج کوثر صفحہ ۶۰)

کوششیں زیادہ عرصہ تک حکومت کی نظر سے پوشیدہ نہ رہ سکیں۔ چنانچہ مارچ ۱۸۴۳ء میں سپرنٹنڈنٹ پولیس نے حکومت کو مسلمان ''ملاؤں'' کے ایک جتھے کی موجودگی کی رپورٹ دی۔ جو باراسٹیٹ، جیسور، پٹنہ اور راج شاہی وغیرہ اضلاع کا چکر لگاتے اور انگریزی حکومت کے حلیفوں کے خلاف جہاد کا وعظ کرتے پھرتے ہیں۔ اور اس کے لئے رنگروٹ اور روپئے فراہم کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ اسی افسر نے بعد میں ایک اور رپورٹ دی جس میں اس نے ''ملاؤں'' کے اس گروہ میں بعض دوسرے علماء کے ساتھ مولانا کرامت علی کے نام کی صراحت کی ہے۔(۱)

مگر حکومت مولانا کے خلاف قانونی چارہ جوئی نہ کر سکی، لہذا مولانا اخیر تک اپنے دعوتی کاموں میں لگے رہے۔ یہاں تک کہ اسی راستہ میں جان جان آفریں کے سپرد کی۔(۲)

قاضی فضل الرحمٰن بردوانی

انہی علماء میں قاضی القضاۃ مولانا فضل الرحمٰن بردوانی تھے۔ان کے نزدیک ہندوستان دارالحرب تھا۔(۳)

مولانا فضل الرحمٰن اپنے زمانہ کے مشہور علماء میں تھے۔مولانا امین اللہ عظیم آبادی اور اپنے بھائی مولانا قاضی غلام سبحان قریشی بردوانی سے علم حاصل کیا۔ پھر انگریزی حکومت کی طرف سے ہندوستان کے سب سے بڑے قاضی بنائے گئے۔(۴)

آپ کے بھائی قاضی غلام سبحان، ملا بحر العلوم کے بیک واسطہ شاگرد تھے۔(۵) قاضی غلام سبحان انگریزی دور کے پہلے قاضی القضاۃ تھے۔ غالباً بھائی کی وفات کے بعد

---

(۱) ہندوستان میں وہابی تحریک صفحہ ۱۳۸

(۲) اٹھارہ سو ستاون کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد انگریزوں کے تئیں مولانا کے رجحان میں تبدیلی آ گئی تھی۔ بعد میں مولانا کا کیا موقف رہا اور جنگ آزادی میں مولانا کا کیا حقیقی کردار ہے؟ اس سلسلہ میں تحقیقی بحث کے لئے دوسری جلد کا انتظار کیجئے۔

(۳) دیکھئے ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۲۰۱۔

(۴) الإعلام (نزھۃ الخواطر) ۷/۴۱۶-۴۱۷۔

(۵) ملاحظہ ہو تذکرہ علماء ہند مترجم اردو صفحہ ۳۱۴۔

قضاءت آپ کے ذمہ آئی (۱)۔ آپ فقہ میں مہارت تامہ کے علاوہ منطق و فلسفہ میں بھی خاصا درک رکھتے تھے۔

بھوپال میں آپ نے کچھ مدت قیام کیا تھا۔ اسی زمانہ قیام میں الشفا ابن سینا کی ایک آدھ فصل کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ ترجمہ شائع بھی ہوا تھا۔ نیز فلسفہ کی مشہور کتاب ہدایۃ الحکمہ پر بھی آپ کا حاشیہ ایشیاٹک سوسائٹی نے شائع کیا تھا۔ مزید برآں ادبیات سے بھی شغف رکھتے تھے۔ فارسی شاعری کا اچھا ذوق تھا۔ (۲)

سید احمد شہید سے آپ کا قریبی تعلق تھا۔ سفر حج میں بھی آپکے ساتھ تھے۔ (۳)

---

(۱) بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا قاضی فضل الرحمن بردوانی ۱۸۴۳ء کے بعد کسی سنہ میں قاضی بنائے گئے۔ کیونکہ ۱۲۵۹ھ (۱۸۴۳ء) تک آپ کے بھائی کا قاضی القضاۃ ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ مولانا محمد وجیہ کلکتوی کی کتاب ''نظام الاسلام'' کے دوسرے ایڈیشن میں بہت سے علماء عصر کے دستخط ہیں جو ۱۲۵۹ھ میں شائع ہوا تھا۔ قاضی غلام سبحان کے دستخط کے نیچے قاضی القضاۃ لکھا ہے۔ اس میں مولانا فضل الرحمن کے بھی دستخط ہیں جن کے آگے ''مدرس اول مدرسہ مرشد آباد'' لکھا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مولانا فضل الرحمن قاضی القضاۃ بننے سے پہلے مرشد آباد کے مدرسہ میں مدرس اول تھے۔

(۲) مکتوب مولانا ابومحفوظ الکریم معصومی بنام راقم الحروف۔ مولانا نے آپ کا ایک فارسی شعر بھی لکھا ہے۔

فضل رحمٰن را ز خاک خطہ شیراز پاک   وائے قسمت بر زمین بردواں انداختہ

(۳) مولانا غلام رسول مہر نے سید صاحب کے سفر حج کا ایک واقعہ نقل کیا ہے جس میں منشی فضل الرحمن بردوانی کا نام آیا ہے۔ (سید احمد شہیدؒ، استدراک، صفحہ ا) بظاہر یہ قاضی فضل الرحمن بردوانی ہی معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا سفر حج میں سید صاحب کے ساتھ ہونا ممکن ہے۔ اس کے قرائن موجود ہیں۔ قاضی فضل الرحمن کے اساتذہ میں مولانا امین اللہ عظیم آبادی کے نام آتا ہے۔ جن کا انتقال ۱۲۲۳ھ میں ہوا۔ جو براہ راست شاہ ولی اللہ کے شاگرد تھے۔ اور پھر انھوں نے شاہ عبدالعزیز صاحب سے بھی استفادہ کیا تھا۔ اس تعلق سے قاضی صاحب یقیناً سید صاحب کے بہت قریب رہے ہوں گے۔ پھر ان کا تعلق بردوان سے تھا، جو کلکتہ سے زیادہ دور نہیں ہے اور حج کو جاتے ہوئے سید صاحب کا کلکتہ میں طویل قیام ہوا تھا، جہاں سینکڑوں کی تعداد میں لوگ ہر روز بیعت ہوتے تھے۔ اور قرب و جوار سے آ آ کر حلقہ ارادت میں شامل ہوتے تھے۔ اور کثیر تعداد میں لوگ قافلہ حج کے ساتھ جڑ رہے تھے تو قاضی فضل الرحمن کیوں ساتھ نہیں ہوں گے۔ جب کہ سید صاحب کے نام اور مقام سے وہ پہلے سے آشنا تھے۔

اور سن وسال کے لحاظ سے بھی اس میں کوئی بعد نہیں۔ اگر ہم قاضی صاحب کو مولانا امین اللہ کا آخری دور کا شاگرد بھی تسلیم کریں تو ان کے انتقال کے وقت بیس سال کے رہے ہوں گے اور سید صاحب کا سفر حج اس کے پانچ سال بعد کا ہے اس طرح قاضی فضل الرحمن کی عمر اس وقت پچیس سال کی ہوتی ہے اور سید صاحب کے ساتھ ایسے جوانوں کی کثیر تعداد تھی۔ ==

کیا بعید کہ اسی اثر سے آپ ہندوستان کو دارالحرب گردانتے ہوں۔(۱) ۱۸۷۰ء کے آس پاس آپ کا انتقال ہوا ہوگا۔(۲)

مولانا محمد وجیہ کلکتوی

مولانا محمد وجیہ صدیقی ہندوستان کے مشہور علماء میں تھے۔آپ اصلاً بہار کے رہنے والے تھے۔آپ کے والد مولانا مولی بخش کا شمار بھی کبار علماء میں ہوتا تھا۔

شیخ عبداللہ سراج مکی (۳) نے ہندوستان آمد پر مولانا محمد وجیہ سے ملاقات کی تھی۔شیخ نے مولانا کے علم وفضل کی تعریف کی ہے۔(۴)

== غرض اس تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ قاضی فضل الرحمٰن بردوانی سید صاحب کے قریبی رفقاء میں تھے۔اتنا لکھ چکا تھا کہ اس کی صراحت ملی کہ آپ سید صاحب کے خاص مرید تھے (دیکھئے مقامع المبتدعین مشمولہ ذخیرۂ کرامت حصہ دوم صفحہ۲۲۱) بلکہ آپ کے بڑے بھائی مولانا غلام سبحان بھی سید صاحب سے بیعت تھے۔وقائع احمدی (قلمی) میں اس کا مفصل واقعہ لکھا ہے۔(دیکھئے صفحہ۸۹۳)

(۱) اس پر نظر بظاہر اعتراض ہوسکتا ہے کہ سید صاحب کی جماعت کا رکن ہوتے ہوئے انگریزی حکومت کا عہدہ کیسے قبول کیا۔جبکہ سید صاحب انگریزوں کے شدید مخالف تھے؟ دراصل بات یہ ہے کہ قاضی فضل الرحمٰن کے خاندان میں قضاءت تھی۔آپ سے پہلے آپ کے بھائی قاضی تھے۔اور آپ پورے لائق فائق۔اسلئے لامحالہ بھائی کے بعد حکومت کی نظر آپ پر پڑتی۔اور انکار بغاوت کے مرادف ہوتا اس لئے بادل ناخواستہ آپ کو قبول کرنا پڑا۔اس کے باوجود اپنی رائے پر قائم رہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تحریک کے رہنماؤں کے مشورے سے آپ اس عہدہ سے منسلک رہے ہوں تاکہ سرکاری عہدہ پر رہتے ہوئے حکومت کو دھوکہ میں رکھ کر اپنے اثر ورسوخ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تحریک کو ترقی دی جائے۔اگر ایسا ہے تو رازداری کی بابت تحریک مجاہدین کے ایک نئے گوشہ کا اضافہ ہوگا کہ انھوں نے اس طرح بھی اپنے منصوبوں کو راز میں رکھنے اور حکومت کی نظروں سے بچانے کی کوشش کی واللہ اعلم۔

(۲) کافی تلاش وجستجو کے باوجود تاریخ وفات کا علم نہ ہوسکا،صرف نزہۃ الخواطر میں چند سطروں میں آپ کے حالات ہیں مگر وفات کی تاریخ درج نہیں۔ڈبلیو ہنٹر نے ۱۸۷۱ء میں اپنی کتاب لکھی اس نے آپ کو سابق قاضی القضاۃ لکھا ہے۔اس سے اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت عہدہ پر نہیں تھے مگر وفات کے بارے میں کوئی پتہ نہیں چلتا اس لئے اوپر صرف اندازاً لکھا گیا ہے اہل علم تحقیق کرکے مطلع کریں۔

(۳) شیخ عبداللہ سراج مکی،مکہ کے علماء کبار میں سے تھے۔سید احمد شہیدؒ سے ان کے سفر حج میں ملاقات کی تھی اور متاثر ہوئے تھے۔شاہ اسماعیل شہید کے درس میں بھی شرکت کرتے تھے۔۱۲۶۴ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

(۴) دیکھئے الاعلام (نزہۃ الخواطر) ۷/۵۱۱ بحوالہ تذکرۃ العلماء از مولانا شمس الحق ڈیانوی عظیم آبادی۔

مولانا کرامت علی جونپوری نے لکھا ہے کہ آپ سید احمد شہیدؒ کے خاص مریدوں میں سے ہیں۔(۱)

اور ڈاکٹر محمد ایوب قادری کی تحقیق کے مطابق آپ سید صاحب کے خلیفہ تھے۔اور مولانا احمد علی سہارنپوری کو آپ سے تلمذ حاصل تھا۔(۲)

مولانا عبدالستار (سابق لکچرار مدرسہ عالیۂ ڈھاکہ) نے ان القاب کے ساتھ آپ کا ذکر کیا ہے: جامع معقول و منقول، حاوی فروع واصول، استاذ الاساتذہ۔آپ تقریباً ۱۸۳۷ء سے ۱۸۵۶ء تک مدرسہ عالیہ کے صدر مدرس رہے۔بہت سی نایاب کتابیں آپ کی تصحیح اور تنقیح کے بعد فورٹ ولیم سے شائع ہوئیں۔(۳)

اس کے علاوہ آپ نے کئی کتابیں بھی تصنیف کیں۔آپ کی کتابوں میں دافع الشرور (مطبوعہ ۱۲۷۶ھ) ارشاد الرشاد فی فضل المیلاد (۱۲۷۶ھ) اثبات قیام (۱۸۶۵ء) اور نظام الاسلام (مطبوعہ ۱۲۵۷ھ)۔مؤخر الذکر کتاب میں تقلید کی شرعی حیثیت اور اس کی حقیقت اور ضرورت سے بحث کی ہے۔یہ کتاب ایک زمانہ میں بہت مشہور تھی۔

۱۸۶۷ء میں آپ کا انتقال ہوا اس مصرعہ سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔

چراغ مدرسہ گل شد خرد گفت

عبدالغفور نساخ کی قبر کے پاس آپ کی قبر ہے جو اب بے توجہی کی شکار ہے۔(۴)

آپ ہندوستان کو دارالحرب سمجھتے تھے(۵)۔مگر اس کے باوجود عہدہ پر قائم رہے۔یہی پیش نظر رہا ہوگا کہ صدر مدرسی کے منصب پر بحال رہتے ہوئے طلبہ کے اندر انگریز مخالف رجحانات پیدا کئے جا سکتے ہیں اور بغاوت کے جذبات کو فروغ دیا جا سکتا

---

(۱) ذخیرہ کرامت حصہ دوم صفحہ ۲۲۱۔رسالہ مقامع المبتدعین۔

(۲) اردو نثر کے ارتقاء میں علماء کا حصہ صفحہ ۲۳۷۔

(۳) تاریخ مدرسہ عالیہ حصہ دوم صفحہ ۱۶۷۔

(۴) دونوں مآخذ میں سنہ وفات کا ذکر نہیں۔اس لئے میں نے مولانا معصومی کی خدمت میں اس کے لئے عریضہ ارسال کیا۔مولانا مدظلہ نے لکھا کہ مادہ تاریخ کا یہ مصرعہ ذہن میں ہے۔حساب لگانے سے مذکورہ سنہ برآمد ہوا جو درج کیا گیا ہے۔

(۵) ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۲۰۱۔

ہے۔اس کی خاطر انھوں نے عہدہ کو غنیمت سمجھا ہوگا۔اور ایسا لگتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ کے بعد ان کی طبیعت نے اس کو بھی گوارہ نہیں کیا اور وہ مستعفی ہو گئے۔اس لئے کہ ۱۸۵۶ء تک ان کا صدر مدرس رہنا معلوم ہوتا ہے۔

مولانا بشارت علی کلکتوی

مولانا بشارت علی کلکتہ کے مشہور عالم تھے۔بچوں کو قرآن مجید کی تعلیم دیتے تھے۔مولانا حاجی شریعت اللہ فرید پوری بانی فرائضی تحریک جب اپنے گاؤں سے حصول تعلیم کی غرض سے کلکتہ آئے،تو سب سے پہلے انہی کے حلقہ میں شامل ہوئے اور انہی سے قرآن پاک کی تعلیم حاصل کی تھی۔مولانا بشارت علی نے ان کی تعلیم وتربیت کا خاص انتظام کیا تھا۔

مولانا بشارت علی کلکتہ میں انگریزوں کی ریشہ دوانیاں اپنی آنکھوں سے روز دیکھتے تھے۔انگریزوں کا تسلط اور مسلمانوں کی تذلیل ان کے لئے ناقابل برداشت ہوگئی تھی۔اس وجہ سے ہندوستان ان کی نظر میں دارالحرب ہوگیا تھا،ان کی غیرت مند طبیعت نے گوارہ نہیں کیا کہ وہ مزید ہندوستان میں قیام کریں۔چنانچہ ۱۷۹۹ء میں انھوں نے ہندوستان سے ہجرت کی اور مکہ معظّمہ جابسے۔(۱)

ان کا یہ کارنامہ کچھ کم نہیں ہے کہ انہوں نے ایسا شاگرد تیار کیا جس نے بڑی قوت کے ساتھ اصلاح وجہاد کی تحریک چلائی اور انگریزوں سے خوب ٹکر لی۔

مولانا عبدالحق آروی

مولانا عبدالحق آروی کا تعلق سید احمد شہیدؒ کی تحریک سے تھا۔ان کے نزدیک ہندستان انگریزی تسلط کے بعد دارالحرب ہوگیا تھا۔وہ یہاں رکنا صحیح نہیں سمجھتے تھے چنانچہ ہجرت کرکے سندھ میں مقیم ہوگئے۔۱۸۴۳ء میں انگریز سندھ پر بھی قابض ہوگئے تو وہاں سے رخت سفر باندھ کر سرحد چلے گئے،اور آزاد کوہستانی علاقہ میں طرح

(۱) A History of the Faraidi Movement Part 11-p.2-3
غالباً ٹیپو سلطان سے انہیں آس بندھی تھی۔ان کی شہادت کے بعد ان کی ساری امیدیں ہوا ہو گئیں۔اور ہجرت کے بغیر کوئی چارہ نظر نہیں آیا۔

اقامت ڈال دی۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے بہت جلد وہاں اپنی حیثیت بنالی تھی۔ ان کی معاملہ فہمی اور مجاہدانہ جذبات کی وجہ سے ان لوگوں کے نزدیک ان کی بڑی وقعت تھی جو انگریزوں سے جہاد کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ۱۸۴۹ء میں سید اکبر شاہ تھانوی نے اخوند صاحب سوات کے مشورہ سے جب سوات میں اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی (۱) تو مولانا عبدالحق آروی کو میر منشی کا عہدہ دیا تھا۔ جنگ امبیلہ (جو مجاہدین اور انگریزوں کے درمیان ۱۸۶۳ء میں ہوئی تھی) میں مولانا بنفس نفیس شریک ہوئے پھر "غزوہ بونیر" کے نام سے شاہنامے کی بحر میں اس جنگ کے مفصل حالات لکھے۔ آخری عمر میں الاڈنڈ ڈھیری (سوات) میں مقیم ہوگئے تھے۔ وہیں وفات پائی۔ (۲)

چوتھی فصل

سندھ پر انگریزوں کا قبضہ اور علماء سندھ کے فتاوی دار الحرب

جس طرح ہندوستانی صوبوں میں بنگال صنعت و حرفت میں سب سے آگے تھا۔ اسی طرح صوبہ سندھ کی سرزمین زراعتی لحاظ سے سب سے موزوں تھی۔ نیز اس کا محل وقوع ایسا ہے کہ تجارت کو ترقی دینے کے بھی وہاں خوب مواقع تھے۔ تو کب تک یہ خطہ زمین انگریز جیسی حریص اور خود غرض قوم کی دست برد سے بچ سکتا تھا۔ انیسویں صدی کے آغاز ہی سے سندھ پر انگریزوں کی استعماری نظر پڑنے لگی تھی۔ مگر کئی سال تک انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ امراء سندھ اور کمپنی کے مابین کچھ تجارتی معاہدے ہی ہوتے رہے۔ سندھ کے متعلق انگریزوں کے منصوبے کیا تھے؟ اس کا اندازہ کرنے کے لئے ایک واقعہ کا ذکر ضروری ہے۔

۱۸۳۰ء میں بمبئی فوج کے الیگزنڈر برنس کو تعینات کیا گیا تھا کہ گھوڑے اور دوسرے تحائف جو شاہ انگلستان نے رنجیت سنگھ کو بھیجے تھے، بجائے پنجاب کے سندھ کی راہ سے لے جائے۔ اس سفر کے اصل مقصد پر تبصرہ کرتے ہوئے ٹروٹر لکھتا ہے:

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو صفحہ ۵۱۹

(۲) دیکھئے سید احمد شہید جلد اول صفحہ ۲۵۔۲۶، و سرگزشت مجاہدین صفحہ ۳۰۶۔

اس کا صاف مقصد یہ تھا کہ دریائے سندھ کو برطانوی تجارت کے لئے کھول دیا جائے۔ مگر ساتھ ہی اپنے گردوپیش کا خوب معائنہ کرے۔ سندھ کی سیاست سے متعلق معلومات حاصل کر کے اس بڑے دریا (سندھ) کا جائزہ لے اور تحقیق کرے، جس کے بارے میں ہمیں اس وقت کچھ واقفیت نہ تھی۔ اور اس کے دونوں کناروں پر امراء سے دوستی گانٹھے۔ برنس کا مشن امراء سندھ کو بالکل پسند نہ آیا۔ وہ اپنا ملک غیر ملکی تاجروں کے لئے کھولنا نہ چاہتے تھے اور ایسی طاقت کی طرف سے کسی اقدام پر ان کو اعتماد نہ تھا، جسے وہ صرف اس کے جوع الارض کے لئے پہچانتے تھے۔ ایک بلوچی افسر نے کہا ''بلا تو آ چکی انگریزوں نے ہمارا ملک دیکھ لیا''۔ (۱)

اس طرح بتدریج انگریز سندھ کی طرف پیش قدمی کرتے گئے یہاں تک کہ ۱۸۳۸ء میں حیدرآباد میں انگریز ریزیڈنٹ مقرر کیا گیا۔ (۲)

۱۸۳۹ء میں جب انگریزوں نے افغانستان پر حملہ کیا تو معاہدہ کو توڑ کر سندھ سے اپنی فوجیں افغانستان لے گئے۔ اس کے بعد انھوں نے سندھ پر قبضہ کرنے کے لئے ۱۸۴۳ء میں سندھ پر حملہ کر دیا۔ ناصر خاں امیر حیدرآباد اور رستم خاں امیر خیرپور نے حیدرآباد سے چند میل دور میانی کے مقام پر ۱۷ ارفروری ۱۸۴۳ء کو جنگ کی۔ لیکن شکست کھائی اور انگریزوں کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ میرپور کے امیر شیر محمد نے بھی حیدرآباد سے دس میل دور ڈبہ Duba کے مقام پر مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی۔ انگریزوں کا اب پورے سندھ پر قبضہ ہو گیا۔ (۳)

ان حالات میں علماء کیسے خاموش بیٹھ سکتے تھے۔ انھوں نے بلا تاخیر سندھ کو دارالحرب قرار دے دیا۔ بعض علماء نے تو اپنی فراست کا ثبوت دیتے ہوئے سندھ پر انگریزوں کے منحوس قدم پڑتے ہی اس قسم کا فتویٰ دیا۔ تفصیل اگلے صفحات میں پڑھئے۔

---

(۱) ہندوستانی میں وہابی تحریک، صفحہ ۱۱۸۔
(۲) کمپنی کی حکومت، صفحہ ۳۴۳۔
۱۸۳۴ء میں رنجیت سنگھ نے سندھ پر تسلط کا منصوبہ بنایا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریزوں نے امراء سندھ کو سکھوں کا خطرہ دکھا کر حیدرآباد میں برطانوی ریزیڈنٹ مقرر کرنے میں کامیابی حاصل کی۔
(۳) ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ جلد دوم صفحہ ۳۹۴۔

مخدوم محمد ابراہیم ٹھٹھوی اور ان کا فتویٰ دار الحرب

شیخ محمد ابراہیم ٹھٹھوی علمی گھرانہ کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کے دادا شیخ محمد ہاشم سندھی (م ۱۱۷۴ھ) اپنے زمانہ کے مشہور ترین علماء کبار میں سے تھے۔ آپ کی ولادت اپنے بزرگ دادا کی زندگی میں ٹھٹھ میں ۱۱۶۲ھ (۱۷۴۸ء) میں ہوئی۔ بچپن میں نامور دادا سے استفادہ کیا بعد میں تمام تعلیم والد گرامی شیخ مخدوم عبداللطیف سے حاصل کی۔

میر خلیل تکملہ مقالات الشعراء میں لکھتے ہیں کہ ان کے زمانہ میں کوئی بھی مخدوم محمد ابراہیم سا عالم نہ تھا۔ آپ کے مریدین ہر شہر اور دیہات میں تھے۔ علمی رسوخ کے ساتھ طریقت میں بھی آپ کا پایہ بہت بلند تھا۔

''مونس المخلصین'' کا مصنف لکھتا ہے کہ مخدوم محمد ابراہیم، ولی کامل اور راسخ عالم تھے۔ خواجہ صفی اللہ دولی (م ۱۲۱۲ھ) سے اجازت و خلافت حاصل تھی۔

آپ کی عربی تحریر میں بڑی روانی ہے۔ آپ بہت بڑے مصنف بھی تھے۔ پیر حسام الدین راشدی نے تکملہ مقالات الشعراء (فارسی) کے حواشی میں آپ کی تصنیفات کی مکمل فہرست دی ہے۔ چند معروف کتابوں کے نام یہ ہیں۔ جو سب کی سب عربی میں ہیں۔ ۱ – تهذيب البيان في أجوبة أسئلة وحيد من أكابر الإخوة والخلان ۲ – توثيق الأسباق في مسئلة الصداق ۳ – الإجازة للطريقة النقشبندية ۴ – دماج المغنم ۵ – الجفر الجعفري.

مخدوم محمد ابراہیم کی وفات ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰ء) میں ٹھٹھ میں ہوئی۔ محمد امین سندھی نے آپ کے فضائل و مناقب پر مکمل رسالہ لکھا ہے۔ (۱)

مخدوم محمد ابراہیم پہلے عالم ہیں جنھوں نے سندھ کو دار الحرب قرار دیا۔ ان کے سنہ وفات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بالکل شروع میں یہ فتویٰ دیا تھا جب انگریزوں

---

(۱) شیخ مخدوم محمد ابراہیم ٹھٹھوی کے تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو رسالہ ''الرحیم'' حیدرآباد سندھ (سندھی)، تیرہویں صدی کے مشاہیر سندھ، مدیر: مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب، بابت جولائی ۱۹۸۸ء۔ شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا سہ ماہی کتابی سلسلہ۔ مختصر ان کے حالات تذکرہ صوفیائے سندھ صفحہ ۲۵۱ (حاشیہ) پر بھی ہیں۔

نے سندھ کی سرزمین میں قدم رکھا ہی تھا۔اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے کتنی گہری نظر سے انگریزی سیاست اور ڈپلومیسی کا مطالعہ کیا تھا۔

مخدوم ابراہیم نے غالباً دو فتوے دیئے تھے ایک پورے سندھ سے متعلق تھا کہ یہ علاقہ دارالحرب ہے، جیسا کہ آگے آنے والے ایک فتویٰ سے معلوم ہوتا ہے۔ اور ایک فتویٰ خاص جودھپور سے متعلق تھا۔ اس کی عبارت ملاحظہ ہو۔

وما ذكره عن صدر الإسلام أبي السير في سير الأصل أيضاً أن دارالإسلام لا تصير دارالحرب مالم يبطل جميع مابه صارت دارالإسلام، فمعناه أن لا تصير محكوماً عليها بكونها دارالحرب بعد ما كانت دارالإسلام إلا وأن يكون جريان أحكام الإسلام فيها باطلًا بأن جرت فيها أحكام أهل الكفر بعد أن كان أحكام الاسلام جارية فيها.وأن يكون تحقق بلدة من بلاد الإسلام والمسلمين بينها وبين دارالحرب باطلًا، بأن كانت متاخمة بديار أهل الحرب ليس بينها وبين ديار أهل الحرب بلدة من بلاد المسلمين بحيث يصل المدد من المسلمين حين الحاجة اليها.وأن يكون بقاء مسلم أوذمي آمناً بالأمان الأول باطلا، بان لم يبق مسلم أوذمي فيها آمناً بأمان المسلمين قبل استيلاء الكافرين،فالمنصف الذى له أسوة حسنة في رسول الله صلى الله عليه وسلم، يرى بعيني الإنصاف بطلان جميع هذه الأمور الثلاثة في جودپور فكيف تكون دارالاسلام.وأى حاجز من أن يقال صارت دارحرب.

(نقل من رسالة نشرحلاوى المعارف و العلوم، تصنيف مخدوم المخاديم، سند الاقاليم، العارف بالله

تعالیٰ، مولانا المخدوم، ابراهیم التتوی قدس الله تعالی سره العزیز۔)(۱)

صدر الاسلام ابوالسیر سے سیر الاصل میں جو ذکر کیا گیا ہے کہ دارالاسلام اس وقت تک دارالحرب نہیں ہوتا جب تک وہ تمام چیزیں باطل نہ ہو جائیں جن کی بنیاد پر وہ دارالاسلام ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو دارالحرب نہیں قرار دیا جائے گا۔ جب کہ وہ پہلے دارالاسلام تھا۔ مگر یہ کہ دارالاسلام کے احکام کا نفاذ ختم ہو جائے یعنی اہل کفر کے احکام جاری ہو جائیں۔ اور یہ کہ اس کی سرحدیں دارالحرب کی سرحدوں کے ساتھ اس طرح ملی ہوں کہ اس کے اور دارالحرب کے درمیان مسلمانوں کا کوئی شہر نہ ہو، بایں طور کہ ضرورت پر مسلمانوں کی طرف سے وہاں مدد پہنچ سکے۔ تیسرے یہ کہ کافروں کے تسلط سے پہلے مسلمانوں کو جو امان حاصل تھا یا مسلمانوں کے امان کی بنیاد پر ذمی کو جو امان حاصل تھا وہ ختم ہو جائے۔ پس وہ منصف جو رسول اللہ ﷺ کو اسوہ حسنہ سمجھتا ہو۔ وہ اپنی انصاف کی آنکھوں سے جو دھپور میں ان تینوں امور کا باطل ہونا دیکھ سکتا ہے۔ تو وہ کیوں کر دارالاسلام رہے گا۔ اور کونسا امر مانع ہے کہ اس کو دارالحرب کہا جائے۔

مخدوم محمد ترپٹائی اور ان کا فتویٰ دارالحرب

مخدوم محمد، درسگاہ ٹرپٹ (موجودہ تعلقہ سیوہن، ضلع دادو، سندھ) کے بانی اور جید عالم تھے۔ اپنے معاصروں میں مشہور و معروف تھے۔ ٹرپٹ (Tripat) ہی کے رہنے والے تھے، اسی نسبت سے ترپٹائی لکھا جاتا ہے۔ ان کا زمانہ بارھویں صدی ہجری کا آخر تا نصف تیرھویں صدی کا ہے۔ (۲)

سندھ پر انگریزوں کے نامبارک قدم پڑے تو انھوں نے اس کو دارالحرب قرار دیا۔ دیار کچھ کے متعلق اپنے عربی رسالہ میں لکھتے ہیں:

---

(۱) ماخوذ از اوراق گم گشتہ صفحہ ۱۹۸۔۱۹۹۔ مرتبہ رئیس احمد جعفری۔ رئیس صاحب نے جو ترجمہ نقل کیا ہے وہ غیر واضح ہے۔ اسلئے ترجمہ ہم نے خود کیا ہے۔ نیز عربی عبارت میں بھی کچھ غلطیاں تھیں۔

(۲) مکتوب ڈاکٹر نبی بخش بلوچ بنام راقم السطور۔

ثم ما زال المسلمون يتوطنون في دارالحرب مع إقامة الصلوات وسائر وظائف الطاعات،فما وجد من أهل الشرك إلااستحسانهم۔ وقد غلب الفرنج وغيرهم من الكفرة على أكثر ديار الإسلام شرقا وغرباً۔ فما سمعناهم يمنعون من إقامة الصلوات بالجماعات ومن الجمع والأعياد،لكن مع ذلك كله لما كان أهل كل ملة يسعى في إعلاء دينه وترويج ملته، وصارت الغلبة والاشتهار لأحكامهم، والعزة في تلك البلاد لدينهم وانعكس أحوال أكثر المسلمين وانقمع أحكام المومنين۔ والعياذ بالله، صارت ديار حرب۔ ربنا لا تجعلنا فتنة للقوم الظالمين۔(١)

مسلمان اب تک دارالحرب میں قیام پذیر ہیں، جب کہ نمازیں بھی پڑھتے ہیں اور عبادت الٰہی کے جملہ فرائض بھی انجام دیتے ہیں۔

مشرق و مغرب میں اکثر اسلامی علاقوں پر فرنگیوں اور دوسرے کافروں کا غلبہ ہوگیا ہے۔ہم نے نہیں سنا کہ وہ نماز باجماعت سے روکتے ہوں، یا جمعہ وعیدین کی ادائیگی میں مانع ہوں۔لیکن اس کے باوجود چونکہ ہر صاحب مذہب اپنے دین کی سربلندی اور اپنے مذہب کی ترویج کے لئے کوشاں ہے اور ان کے احکام کو غلبہ حاصل ہو چکا ہے اور وہ رواج پا چکے ہیں، اور ان شہروں میں ان کے مذہب کا دبدبہ ہے اور اکثر مسلمانوں کا حال دگرگوں

(۱) دیکھئے اوراق گم گشتہ، صفحہ ۱۹۹۔

مذکورہ فتوی کی عبارت سے پہلے ہے قال الفاضل العلامة المخدوم محمد التهتهاني. اور ترجمہ میں فاضل غلام محمد ٹھٹھوی چھپا ہے۔اس سے بعض لوگوں کو شبہ ہوا کہ اس سے غلام محمد ٹھٹھوی مراد ہیں۔ مگر تحقیقی نظر سے دیکھا جائے تو مخدوم غلام محمد مراد نہیں ہو سکتے۔اس لئے کہ وہ کافی متقدم ہیں۔ ان کا انتقال ۱۱۵۲ھ میں ہوا۔ اس وقت انگریزوں کا عمل دخل برائے نام تھا۔ بلکہ یہاں مخدوم محمد ہی صحیح ہے۔جیسا کہ اصل عبارت میں ہے مگر یہ ٹھٹھوی نہیں الترپائی ہیں۔ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے مطابق یہاں تحریف ہوئی ہے۔وہ لکھتے ہیں۔ بعینہ یہی عبارت "قال الفاضل العلامة المخدوم الترپائی، یہاں کی بعض بیاضوں میں میری نظر سے گزری ہے۔ٹھٹھہ کا کوئی عالم بنام محمد معروف نہیں ہے۔

ہو گیا ہے اور اہل ایمان کے احکام معرض التواء میں ہیں۔ (اللہ ہمیں پناہ میں رکھے) ان وجوہات کی بناء پر یہ سارا علاقہ دارالحرب ہو گیا ہے۔ اے پروردگار ہمیں ظالموں کی آزمائش میں نہ ڈالنا۔

شیخ عبدالرحیم ٹھٹوی اور ان کا فتویٰ دارالحرب

شیخ فاضل عبدالرحیم ٹھٹوی سندھی، ٹھٹھ کے علمی گھرانے کے فرد تھے۔ یہاں کے نامور علماء سے نحو، فقہ اور اصول وغیرہ کی کتابیں پڑھ کر الہ آباد پہنچے۔ اور وہاں کے باکمال عالم شیخ غلام حسین الہ آبادی سے حکمت اور فلسفہ کی تعلیم حاصل کی۔ یہاں سے فراغت کے بعد فرخ آباد تشریف لے گئے۔ اور عرصہ تک وہاں درس وتدریس کا کام کرتے رہے۔ پھر اپنے وطن سندھ واپس آ گئے۔ (۱) اور غالباً یہاں منصب افتاء ان کو تفویض ہوا۔ (۲)

صحیح سنہ وفات کا علم نہ ہو سکا۔ اندازاً تیرہویں صدی ہجری کی چوتھی یا پانچویں دہائی میں انتقال ہوا۔ (۳)

انھوں نے سندھ کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا۔ فتویٰ سندھی زبان میں ہے جس کا ترجمہ یہ ہے۔

> ''اب تو اس ملک کو دارالحرب کہنا چاہئے اور جو تحریریں علماء ہند کی نگر (ٹھٹھ) میں موجود ہیں اگر وہ دیکھو تو ہرگز سندھ کو دارالاسلام نہ کہو'' ۔ (۴)

---

(۱) عہد کلہوڑا کی سیاسی علمی اور ثقافتی تاریخ صفحہ ۳۳۴-۳۳۵۔

(۲) جیسا کہ سندھ کے مشہور محقق ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ نے خیال ظاہر کیا ہے۔

(۳) اس لئے کہ مشہور شیعہ مجتہد مولانا دلدار علی نے تقریباً ستر سال کی عمر میں ۱۲۳۵ھ (۱۸۲۰ء) میں وفات پائی، اور مخدوم عبدالرحیم سندھی کے حالات سے بھی معلومات ہوتا ہے کہ انھوں نے بھی کافی عمر پائی۔ اور دونوں مولانا غلام حسین الہ آبادی کے شاگرد تھے۔

(۴) دیکھئے اوراق گم گشتہ صفحہ ۲۰۱۔

پروفیسر محمد ایوب قادری نے اس فتویٰ کو نقل کر کے اخیر میں مفتی کا نام مخدوم ابراہیم ساکن کوٹ عالم لکھا ہے (مقدمہ: مکاتیب سید احمد شہید، صفحہ ۲۹۔) قادری صاحب سے نقل میں غلطی ہوئی ہے۔ فتوؤں کے اخیر میں حررہ الفقیر عبدالرحیم ساکن کوٹ عالم عفی عنہ لکھا ہے۔ نیز قادری صاحب نے لکھا ہے کہ علماء سندھ کے فتاویٰ مخطوطہ کی شکل میں ہمارے پاس ہیں۔ ہم نے جناب محمد راشد شیخ صاحب (کراچی) کے ذریعہ پروفیسر ایوب قادری مرحوم کے صاحبزادے پروفیسر ==

مولانا عبدالرسول چوٹیاری کا فتویٰ دارالحرب

مولانا عبدالرسول چوٹیاری کا شمار سندھ کے مشاہیر میں ہوتا تھا۔قصبہ چوٹیاری اور مدرسہ چوٹیاری کے علماء اور اساتذہ میں سے تھے۔کتابوں سے بڑا شغف تھا۔اسی کا نتیجہ تھا کہ اپنا کتب خانہ جدا طور پر قائم کیا اور کتاب کی نسبت سے کتابی کہلائے گئے۔فن کتابت اور خوشنویسی میں بھی خاصا درک تھا۔ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی بہت سی کتابیں موجود ہیں۔انہی میں شرح تفتازانی بھی ہے جس کی کتابت رجب ۱۲۹۸ھ کی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ۱۲۹۸ھ کے آخر تک زندہ تھے۔(۱)

مولانا عبدالرحیم ساکن کوٹ عالم تحریر کرتے ہیں:

مخدوم صاحب مولانا مخدوم ابراہیم ٹھٹھوی اور مرحوم عبدالرسول چوٹیاری والے دونوں نے لکھا ہے اور جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ملک دارالحرب ہے اور میں نے حضرات سندھی دام ارشادھم سے جناب حاجی میاں عبدالرحمٰن صاحب کے روبرو سنا ہے کہ سندھ دارالحرب ہے۔اور سادات کے پاس جو ہندو لڑکا ٹیاری میں مسلمان ہوا۔اس وقت کیا حالات ہوئے اور دفتروں میں کیسے مقدمے فیصل کئے جاتے ہیں۔جج کیسے فیصلے کرتے ہیں۔جو کہ انگریزوں نے قاضی بنا کے بٹھا دیئے ہیں۔ان کو دیکھئے کہ فیصلے کیسے ہوتے ہیں۔اگر مخدوم مرحوم مولانا مخدوم عثمان قدس سرہ (۲) نے یہ واقعات دیکھے ہوتے،تو ہرگز اس ملک کو دارالاسلام نہ کہتے۔ھذا والسلام۔(۳)

مولانا عبدالکریم ٹیاروی کا فتویٰ دارالحرب

مخدوم عبدالکریم بن مخدوم عثمان ٹیاری کے مشہور اور جید علماء میں سے تھے۔غیرت وخودداری ان کا نمایاں وصف تھا۔ان کی درسگاہ (ٹیاری) سے بڑے

== سعید قادری صاحب (استاد شعبہ اردو،اردو کالج کراچی) سے رابطہ کیا تو انھوں نے قادری صاحب کے کتب خانہ میں تلاش کر کے فرمایا کہ ان کے یہاں یہ فتاوی موجود نہیں ہیں۔ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ ایوب قادری مرحوم نے یہاں واحد متکلم نہیں بلکہ جمع متکلم کا صیغہ استعمال کیا ہے اس لئے ممکن ہے یہ فتاوی اس زمانہ میں انکے کسی دوست یا کسی ادارہ یا کسی کتب خانہ میں موجود ہوں۔

(۱) مکتوب ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ بنام جناب محمد راشد شیخ صاحب۔

(۲) مخدوم محمد ابراہیم ٹھٹھوی کے فتوی دارالحرب کا رد مولانا مخدوم عثمان ٹیاروی نے لکھا تھا یہ اسی کی طرف اشارہ ہے۔اور ڈاکٹر نبی بخش صاحب کے مطابق یہ جودھپور دارالحرب والے فتوے کا رد تھا۔

(۳) دیکھئے اوراق گم گشتہ صفحہ ۲۰۰۔

ہونہار شاگرد پیدا ہوئے۔ٹیاری کے مخدوم محمد اور مشہور شاعر ناطق مکرانی ان کے شاگردوں میں تھے۔۱۲۵۹ھ (۱۸۴۳ء) میں جب انگریزوں نے سندھ پر قبضہ کرلیا تو ارض سندھ کو دارالحرب قرار دے کر جہاد کا فتوی دیا۔فرمایا ہم فرنگیوں کو دیکھ نہیں سکتے اور بڑھاپے کی وجہ سے لڑ نہیں سکتے، لہذا ہجرت کر کے مکہ مکرمہ چلے گئے۔اور ۱۲۶۱ھ میں وہیں وفات پائی۔کسی نے یہ قطعہ تاریخ کہا :

سیدی قبلتی ومولائی خرج من بیته إلی الله
ما نال مقصداأقصی أدرکه داعیا إلی الله
قیل فی فوته بدء خروج قد وقع أجره علی الله (۱)

مولانا عبدالرحیم کوٹی کا فتوی دارالحرب

مولانا عبدالرحیم سندھ کے علاقہ کوٹ عالم (۲) کے رہنے والے تھے۔انھوں نے انگریزی تسلط کے بعد بڑی قوت سے اس پورے علاقہ کو دارالحرب قرار دیا۔اور اپنی تائید میں علماء کے فتوے نقل کیے۔ان کے فتوی کی عبارت یہ ہے :

ولا یخفی أن ما نحن فیه من دیار السند ونحوها بعد ما ظهرت الغلبة فیها لکفار الفرنج قد صارت دیار حرب بلا ریب۔(۳)

یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ سندھ اور اسکے قرب وجوار کے جن شہروں میں ہم رہتے ہیں۔جب سے ان میں فرنگی کافروں کا غلبہ ہوگیا ہے یہ بلا شبہ دارالحرب ہوگئے ہیں۔

---

(۱) ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، مکتوب بنام راقم الحروف۔

(۲) کوٹ عالم جسے سندھی میں کوٹ عالمو Kote Alimo کہتے ہیں، ضلع حیدرآباد کے شہر ٹنڈہ محمد خاں اور ٹھٹھ ضلع کے شہر سجاول کے بین بین واقع ہے۔یہاں کے سادات علماء مشہور ہیں۔(ڈاکٹر نبی بخش بلوچ)

(۳) اوراق گم گشتہ صفحہ ۱۹۹ پر اس عبارت کے بعد ولهذا قال العلامة المخدوم محمد التهتائی لکھا ہے اور ترجمہ میں غلام محمد ٹھٹھائی ہے۔(جیسا کہ گزرا) اس سے پروفیسر ایوب قادری کو وہم ہوا اور انھوں نے اس فتوی کو غلام محمد تتوی کی طرف منسوب کیا۔(مکاتیب سید احمد شہید (مطبوعہ) مقدمہ، صفحہ ۲۹۔) جب کہ یہ عبارت تائیدی فتوی سے پہلے ہے اور اس کے بعد اور دو فتوے نقل کیے ہیں پھر اخیر میں لکھا ہے حررہ الفقیر عبدالرحیم ساکن کوٹ عالم عفی عنہ۔اس سے بظاہر یہی مترشح ہوتا ہے کہ یہ عبارت انھیں عبدالرحیم کی ہے اور پھر یہ غلام محمد بھی نہیں محمد ہیں جیسا کہ مفصل گزر چکا۔

باب ششم

حضرت سیّد احمد شہید کا
تحریک آزادی میں کردار

پہلی فصل : سیّد صاحب کے ابتدائی مجاہدانہ کارنامے

دوسری فصل : سیّد صاحب کا انگریزوں سے جہاد
ان کے مکتوبات کی روشنی میں

تیسری فصل : سیّد صاحب کا انگریزوں سے جہاد
مزید حقائق وشواہد

چوتھی فصل : سکھوں کے خلاف جہاد کے اسباب

پانچویں فصل : سرحد کو مرکز کیوں بنایا

پہلی فصل

سید احمد شہید کے ابتدائی مجاہدانہ کارنامے

حضرت سید احمد شہیدؒ کا تعلق رائے بریلی کے حسنی قطبی سادات سے ہے۔ جو اعلیٰ خاندانی صفات، موروثی خصوصیات، علمی و عملی امتیازات اور صحت نسب میں برصغیر میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔

آپ کی پیدائش ۱۲۰۱ھ مطابق ۱۷۸۶ء میں ہوئی۔ آپ شاہ ابوسعید حسنی رائے بریلوی کے نواسے تھے، جو شاہ ولی اللہ دہلوی کے رفیق خاص اور مرید با اختصاص تھے۔ اور ان چار شاگردوں میں تھے (۱) جن پر شاہ صاحب کو کلی اعتماد تھا۔ جنھوں نے شاہ صاحب کے مشن کو آگے بڑھایا۔ اس کے علاوہ سید صاحب کے چچا مولانا سید نعمان حسنی اور ماموں شاہ ابواللیث حسنی بھی شاہ ولی اللہ کے مریدوں میں تھے۔ نیز آپ کے خاندان کے بیشتر افراد کا خانوادۂ ولی اللہی سے مضبوط علمی و روحانی رشتہ تھا۔ چنانچہ سید احمد شہید نے ایسے ماحول میں آنکھیں کھولیں اور ایسی فضا میں پروان چڑھے جہاں ہر طرف شاہ ولی اللہ کی روح کارفرما تھی اور جس کے چپہ چپہ میں ان کی تعلیمات کا اثر تھا۔ ابھی طفل ناتواں ہی تھے کہ آپ کے کان پیغام ولی اللہی سے آشنا ہوئے اور دل نے ان کی تعلیمات کا اثر لینا شروع کیا۔

بچپن میں سید صاحب کا جذبہ جہاد اور اس کی تیاری

بچپن ہی سے سید صاحب کی طبیعت کا میلان تعلیم سے زیادہ ورزشی کھیلوں کی طرف تھا۔ (۲) حضرت مولانا علی میاں صاحب لکھتے ہیں :

---

(۱) ان کا ذکر گزر چکا ہے ملاحظہ ہو صفحہ ۱۵۱

(۲) اس سے یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ سید صاحب نے متداول تعلیم زیادہ حاصل نہیں کی، جیسا کہ بعض لوگوں کا بے جا اصرار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سید صاحب پورے عالم دین تھے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے راقم کا مقالہ، سید احمد شہید کا علمی مقام (ماہنامہ الفرقان لکھنؤ ستمبر اکتوبر ۲۰۰۱)

آپ کو بچپن میں کھیل کا بڑا شوق تھا۔ خصوصاً مردانہ اور سپاہیانہ کھیلوں کا۔ کبڈی بڑے شوق سے کھیلتے۔ اور اکثر لڑکوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیتے اور ایک گروہ دوسرے گروہ کے قلعے پر حملہ کرتا اور فتح کرتا۔ اس طرح نادانستہ آپ کی جسمانی و فوجی تربیت کی جا رہی تھی۔ (۱)

سید صاحب کے بچپن کے واقعات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو کسی عظیم جہاد کے لئے تیار کیا جا رہا تھا۔ ہر وقت جہاد کا سودا سر میں سمایا رہتا تھا۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری لکھتے ہیں:

بستی کے ہم سن لڑکوں سے ایک ''لشکر اسلام'' جمع کر کے بطور جہاد بہ آواز بلند تکبیریں کہتے ہوئے ایک فرضی ''لشکر کفار'' پر حملے کیا کرتے تھے۔ اور ''وہ مارا'' اور ''یہ فتح ہوا'' یہی صدائیں آپ کے لشکر اطفال سے بلند ہوتی تھیں۔ (۲)

سید صاحب خود فرماتے ہیں کہ عہد طفلی سے یہ بات میرے دل میں جم گئی تھی کہ میں کافروں سے جہاد کروں گا۔ (۳)

اس سراپا جہاد طفل سعادت نہاد نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو دہلی کی طرف رخت سفر باندھا، تاکہ خانوادۂ شاہ ولی اللہ سے استفادہ کرے اور اس کی رہنمائی میں اگلا قدم اٹھائے۔ سید صاحب نے وہاں کافی حد تک علمی اور اعلی درجہ کی روحانی تربیت حاصل کی۔ ۱۲۲۲ھ کے اواخر یا ۱۲۲۳ھ کے اوائل میں رائے بریلی واپس ہوئے۔

امیر خاں کی رفاقت اور انگریزوں سے جنگیں

۱۲۲۶ھ میں رائے بریلی سے دوبارہ دہلی تشریف لے گئے اور چند مہینے قیام فرما کر ۱۲۲۷ھ (۴) میں نواب امیر خاں کے لشکر میں تشریف لے گئے۔

---

(۱) سیرت سید احمد شہیدؒ جلد اول صفحہ ۱۱۰۔۱۱۱۔

(۲) سوانح احمدی صفحہ ۱۷۔

(۳) غلام رسول مہر: سید احمد شہیدؒ جلد اول صفحہ ۵۹۔

(۴) ۱۲۲۷ ہجری، ۱۸۱۲ عیسوی کے مطابق ہوتا ہے۔ اس وقت شاہ عبدالعزیز جیسا کہ تفصیل سے گزر چکا ہے، ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتوی دے چکے تھے۔ اب ملک دشمن طاقتوں سے مقابلہ ضروری ہو گیا تھا۔ جس میں انگریز سرفہرست تھے۔ سید صاحب کو اس جہاد کی = =

مولانا علی میاں اس کی توجیہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

سید صاحب کو اللہ تعالیٰ نے جس عظیم مقصد کے لئے تیار کیا تھا اور آپ نے جن بلند مقاصد کو اپنے پیش نظر رکھا تھا، ان کی سربراہی مزید تکمیل و پختگی اور عملی مشق و تربیت کی متقاضی تھی۔ اگرچہ سید صاحب نے شروع سے سپہ گری اور سپاہیانہ اعمال و اشغال اپنے فطری ذوق و رجحان سے سیکھے تھے۔ لیکن آپ کو عملی معرکہ آرائی اور میدان جنگ اور اس کے نشیب و فراز سے گزرنے کا اس سے پیشتر موقع نہیں آیا تھا۔ اس کے لئے کسی محاذ جنگ کی ضرورت تھی۔ جہاں رہ کر آپ فوجوں کی قیادت اور دست بدست جنگ کا عملی تجربہ حاصل کریں۔

نیز ایک ایسے شخص کو جو ہندوستان میں اسلام کے غلبے اور دینی حکومت کے قیام کے لئے کوشاں ہو۔ سب سے پہلے اس کا جائزہ لینا ضروری تھا کہ اس ملک میں کہاں کہاں ایسی آزاد فوجی طاقت پائی جاتی ہے جو صحیح رہنمائی کے بعد اس عظیم مقصد کے حصول میں معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ (۱)

سید صاحب نے امیر خاں کی رفاقت کو کیوں ترجیح دی؟

اس وقت کے ہندوستان کا حال دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک میں افراتفری کا عالم تھا۔ انگریز کا ستارۂ اقبال روز بروز بلند ہوتا جا رہا تھا۔ ان کے مقابلے کی کسی میں طاقت نہیں تھی۔ جو طاقتیں تھیں وہ انگریزوں کے دبدبے کے سامنے چوکڑی بھول چکی تھیں۔ دکن کی نظام شاہی سلطنت اور اودھ کی سلطنت اس کا مظہر تھیں۔ دونوں انگریزوں کی سرپرستی قبول کر چکی تھیں۔ تیسری طاقت جس پر نظر جا سکتی تھی وہ مرہٹے تھے۔ دکن اور وسط ہند میں جن کی حکومتیں تھیں۔ مگر وہ خود مسلمانوں کا وجود ختم کرنے کے درپے تھے، اور لوٹ مار اور آپسی انتشار کا بری طرح شکار تھے۔ چوتھی طرف پنجاب میں سکھوں کی طاقت زور پکڑ رہی تھی جو مسلمانوں پر ظلم ڈھانے میں سب سے سبقت لے جا رہے تھے۔

اندریں حالات ان ملکی طاقتوں میں اگر کوئی طاقت اس جہاد میں رفاقت و اعانت

== قیادت کرنی تھی۔ مگر باقاعدہ جہاد کے لئے مزید تکمیل اور پختگی اور عملی مشق کی ضرورت تھی۔ اس کیلئے فی الوقت امیر خاں سے بڑھ کر کوئی موزوں نہیں تھا۔ اسلئے سید صاحب وہاں تشریف لے گئے۔

(۱) سیرت سید احمد شہید اول ۱۳۲-۱۳۳۔

کا حق ادا کر سکتی تھی تو وہ صرف امیر خاں کی طاقت تھی جو ایک جری، نڈر اور حوصلہ مند افغان زادہ تھا۔ افغانی حمیت اس کی رگوں میں دوڑ رہی تھی۔ اس کی جرأت و شجاعت، بہادری اور جوانمرادی کی دھاک دور دور تک بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ روہیلکھنڈ اور شمالی ہند کے دلیر پٹھانوں کی ایک طاقت ور جمعیت تھی۔ سامان حرب وضرب میں بھی وہ بہت فائق تھا۔ (۱)

اس کو مرہٹہ سردار اور راجپوت والیان ریاست ہمیشہ اپنے ساتھ ملانے کی کوشش میں رہا کرتے تھے اور جس کی شمولیت فتح و شکست کے لئے اکثر فیصلہ کن ثابت ہو جایا کرتی تھی۔ اس جمعیت میں ہندوستان کا بہترین فوجی عنصر مسلمانوں کا گرم اور تازہ خون، ہندوستان کی فاتح طاقت کا بچا کھچا کر سرمایہ اور وقت کے بہت سے شاہین و شہباز تھے۔

ایک خوبی جو معاصر مسلم فرمانرواؤں سے اسے ممتاز کرتی تھی وہ اس کی ذاتی دینداری، نماز روزہ کی پابندی اور خشیت الٰہی تھی۔ امیر نامہ کے مصنف نے انگریزوں کے ساتھ ایک معرکہ کے ضمن میں لکھا ہے: چونکہ امیر نماز روزہ کے بڑے پابند تھے۔ سخت معرکوں اور یقینی مہالک میں بھی نماز قضا نہ کرتے تھے۔ ادائے نماز میں مشغول ہوئے۔ نماز پڑھ کر فتاح حقیقی اور ناصر قوی سے دعائے فتح وظفر کر کے سوار ہوئے۔ (۲)

ظاہر ہے کہ سید صاحب کے لئے دوسروں کے مقابلہ میں یہاں کشش زیادہ تھی۔ اور بقول مہر جس خصوصیت نے اسے اقران و اماثل میں سب سے بڑھ کر بلند کر دیا تھا وہ یہ تھی کہ اس پر انگریزی اثر کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی تھی۔ وہ بالکل آزاد تھا۔ اس لئے

---

(۱) ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۰ء) میں جب وہ سرونج کی طرف گیا ہے تو ستر اسی ہزار سوار اور پیادے اس کے ہمراہ تھے۔ ۱۲۳۰ھ (۱۸۱۵ء) میں اس نے پچاس ہزار پیادے اور بارہ ہزار سوار اپنے ایک فوجی افسر میاں محمد اکبر کے سپرد کیے تھے (سیرت سید احمد شہید اول صفحہ ۱۴۴) کسی زمانہ میں سوار فوج کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ ایک موقعہ پر ایک سو پندرہ توپیں اس کے پاس تھیں۔ (مہر۔ سید احمد شہید اول صفحہ ۸۹)

موہن سنہا مہتہ نے لکھا ہے کہ امیر خاں ایک قابل قائد اور بہادر سپاہی تھا۔ اس کی فوج نہایت اسلح تھی اور ہندوستان کی تمام ریاستی فوجوں میں سے بہترین ساز و سامان والی فوج سمجھی جاتی تھی (مہر بحوالہ بالا)

(۲) امیر نامہ صفحہ ۲۹۸۔ ۲۹۹۔

اسلام ووطن کی آزادی کی خاطر صلاحیت جہاد میں کوئی اس کا ہمسر نہ تھا۔ نظر بظاہر یہ آخری خصوصیت ہی سید صاحب کے لئے بطور خاص جذب وکشش کا باعث بنی ہوگی۔(۱)

سید صاحب نے دراصل اشارۂ غیبی سے یہ قدم اٹھایا (۲) اور اپنے شیخ ومرشد شاہ عبدالعزیز صاحب کو اس سے مطلع کیا۔ شاہ صاحب نے بھرپور تائید فرمائی۔ گویا یہ ان کی دلی خواہش تھی جو بروقت برآئی۔(۳)

سید صاحب امیر خاں کے لشکر میں کم وبیش چھ سات سال رہے۔ اس عرصہ میں امیر خاں نے انگریزوں سے کئی جنگیں لڑیں۔ سید صاحب امیر خاں کے ساتھ عملی طور پر جنگوں میں شریک رہے۔ امیر خاں سید صاحب کو بہت قریب رکھتا تھا۔ آپ کی جدائی یا آپ سے دوری اس کے لئے بہت شاق تھی۔ چونکہ سید صاحب لشکر کے امام بھی تھے اور اس کے ساتھ روحانیت کے انتہائی مقام پر فائز، اس لئے بہت جلد امیر خاں کی فوج پر سید صاحب کا اثر پڑا جو روز بروز گہرا ہوتا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے آپ کی حیثیت ''پیر''

---

(۱) سید احمد شہید اول صفحہ ۸۶۔

(۲) وقائع احمدی میں صراحت ہے کہ ایک روز سید المجاہدین بالہام الٰہی قصبہ رائے بریلی سے روانہ ہو کر نواب امیر خاں کے لشکر میں تشریف لے گئے۔(صفحہ ۲۰ قلمی)

خود سید صاحب نے ایک روز جب وہ نواب صاحب کے لشکر میں تھے، فرمایا تھا کہ ایک روز قصبہ رائے بریلی میں مجھ کو جناب الٰہی سے الہام ہوا کہ تو یہاں سے نواب نامدار امیر الدولہ بہادر کے لشکر میں جا۔ وہاں کی خدمت ہم نے تجھ کو دی۔ وہاں ہم کو بعض کام تجھ سے اور بھی (لینے) ہیں۔ یہ مژدۂ غیبی سن کر میں وہاں سے روانہ ہوا۔ چند روز میں آ کر ملازمت نواب صاحب ممدوح کی حاصل کی اور لشکر ظفر پیکر میں رہنے لگا۔(وقائع احمدی صفحہ ۵۴، مخطوطہ۔ نیز ملاحظہ ہو مہر: سید احمد شہید اول صفحہ ۸۴۔)

(۳) وقائع احمدی کے حوالے سے آگے تفصیل آ رہی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب کو سید صاحب کی امیر خان کی رفاقت سے پورا اتفاق تھا۔ نیز یہ کہ سید صاحب لشکر کے حالات سے شاہ صاحب کو مطلع کرتے رہتے تھے۔ غالباً یہیں سے مولانا سندھی نے دعویٰ کیا ہے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب نے خاص پروگرام کے تحت سید صاحب کو فوجی تربیت کے لئے امیر خاں کے پاس بھیجا تھا۔(شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، صفحہ ۹۲) مہر نے بڑی قوت کے ساتھ اس کی تردید کی ہے اور مولانا سندھی کے دعویٰ کو بے بنیاد ٹھہرایا ہے۔ اگرچہ تحقیقی طور پر مہر صاحب کی بات ہی اقرب الی الصواب ہے مگر اتنی سخت تردید کی بھی کوئی خاص ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ ہم نے تطبیق کی کوشش کی ہے جو قرین قیاس اور قرین انصاف ہے۔ واللہ اعلم۔

کی ہوگئی۔لوگ آپ سے اصلاح لیتے اور دعا کراتے۔اس طرح سید صاحب کو دعوت واصلاح کے اچھے مواقع ہاتھ آئے۔جس سے سید صاحب نے پورا فائدہ اٹھایا۔اور اندازہ ہے کہ ان میں سے بہت سے لوگوں نے بعد میں سید صاحب کی رفاقت اختیار کی ہو،اس لئے کہ آپ کے لشکر میں روہیلوں کی بڑی تعداد تھی۔(۱)

امیر خاں کی انگریزوں سے مصالحت

یہی حالات تھے کہ ایک دن امیر خاں نے انگریزوں کے ساتھ صلح کر لی۔واقعہ کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے اس کی کچھ تفصیل ضروری معلوم ہوتی ہے۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ مرہٹہ سردار باہمی کشمکش کا شکار تھے۔اس کشمکش سے نجات حاصل کرنے کے لئے ایک مرہٹہ سردار جسونت راؤ ہلکر نے امیر خاں سے ملکر اپنی میراث حاصل کرنے کی کوشش کی۔دونوں کے درمیان عہد و پیمان ہوا کہ ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے اور جو کچھ ہاتھ آئے گا آدھا آدھا بانٹ لیں گے۔امیر خاں کی وجہ سے تھوڑی ہی مدت میں جسونت راؤ ہلکر نے بڑی حیثیت حاصل کی۔

اسی دوران مرہٹوں اور انگریزوں کے درمیان لڑائی چھڑ گئی۔تو ہلکر اس لڑائی سے الگ رہا۔مرہٹے شکست کھا گئے۔ہلکر نے اگر چہ لڑائی میں شرکت نہیں کی تھی تاہم اس کی خاندانی اہمیت،امیر خاں کی رفاقت اور شانِ امارت کی وجہ سے انگریزوں کو اس کی طرف سے کھٹکا تھا۔اس لئے وہ اس سے بھی معاملہ طے کر لینا چاہتے تھے۔مگر اس نے ایسی سخت شرطیں پیش کیں جنھیں انگریز نہ مان سکے۔اسطرح لڑائی ناگزیر ہوگئی۔جسونت اور امیر خاں نے مل کر انگریزی فوج پر شدید حملے کئے اور اسے سخت نقصان پہنچایا۔

یہ حال دیکھ کر انگریزوں نے امیر خاں کو اپنے جال میں پھانسنا چاہا۔پہلے اورنگ آباد کی جنگ کے موقع پر جنرل واسلی نے ساٹھ لاکھ روپئے اور اٹھارہ لاکھ روپئے کے ملک کا لالچ دلا کر مصالحت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی (۲) مگر امیر راضی نہ ہوا۔پھر

---

(۱) امیر خاں کی فوج میں شرکت اور اس مدت رفاقت کے واقعات وقائع احمدی میں پوری تفصیل کے ساتھ موجود ہیں وقائع میں یہ بیان صفحہ ۲۰ سے شروع ہو کر صفحہ ۸۵ پر ختم ہوا ہے۔

(۲) امیر نامہ صفحہ ۲۸۴۔

بھرت پور کی جنگ کے موقع پر ۱۲۲۱ھ (۱۸۰۶ء) میں جنرل لیکی نے جو امیر خاں کی شجاعت سے واقف تھا اور اس کی حشمت سے ڈرتا تھا، مزید تیرہ لاکھ روپیہ کا ملک دے کر مصالحت کرنے کوشش کی مگر امیر عالی ہمت نے قبول نہ کیا۔ جواب دیا کہ ہمارا عزم ہے کہ تمام ہندوستان پر حکمرانی کریں۔ اتنا سا ملک و مال کیوں لیں۔ (۱)

امیر خاں نے اس سلسلہ میں رنجیت سنگھ جس نے بہت جلد پنجاب میں اثر و رسوخ پیدا کرلیا تھا اور اس کی طاقت میں بھی روز بروز اضافہ ہو رہا تھا، سے تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی۔ راجہ پٹیالہ کی دعوت پر پہلے پٹیالہ گیا، پھر رنجیت سنگھ والی لاہور کو آمادہ کرنے کے لئے امرتسر کا رخ کیا۔ امیر نامہ میں ہے کہ پٹیالے سے اس عزم پر نہضت کی کہ رنجیت سنگھ سے سازش کر کے انگریزوں پر لوٹیں۔ اگر سکھ ساتھ نہ دیں، شاہ شجاع الملک بادشاہ کابل سے ملیں۔ شاہ کے ظل حمایت میں معاندین سے انتقام لیں۔ نواب نے امرتسر تک سکھوں کے کئی سرداروں سے سازش کر کے مہاراج کو لکھا کہ میں نے کئی سرداروں کو موافق کرلیا ہے۔ عنقریب رنجیت سنگھ کو بھی راہ پر لاتا ہوں۔ (۲)

مرہٹہ سرداروں میں پہلے ہی تذبذب کے آثار ظاہر ہو چکے تھے۔ ہلکر میں جو کچھ بھی رمق تھی وہ امیر خاں کے بل بوتے پر تھی۔ اس بیچ انگریزوں نے دونوں پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی۔ ہلکر پھنس گیا مگر امیر نے صاف انکار کردیا۔ اب ہلکر نے خود امیر کی ہمت پست کرنی شروع کی۔ امیر نامہ کے مطابق :

> مہاراج امیر خاں کے پاس آئے اور بات کو چھپا کر امیر سے کہا کہ رنجیت سنگھ وغیرہ رئیسوں میں یہ ہمت نہیں کہ ہماری امداد کریں۔ شجاع الملک کا لانا کیسا۔ وہاں تک پہنچنے ہی کا خرچ ہمارے پاس نہیں۔ کہئے آپ کی کیا صلاح ہے؟ امیر نے کہا رنجیت سنگھ وغیرہ میں ہمت نہیں نہ سہی۔ میں کابل جاتا ہوں۔ بہر طور شاہ کو کمک پر لاتا ہوں۔ ہمارے پاس دس پندرہ لاکھ کے جواہر ہیں، یہ شاہ کو دوں گا۔ باقی دہلی لکھنؤ سے وصول کر کے دینے کا اقرار کروں گا۔ انگریزوں کو ہند سے نکالوں گا۔ مہاراج نے کہا اور جو شاہ نہ

---

(۲) امیر نامہ صفحہ ۳۲۲۔۳۲۳۔

(۳) ایضاً صفحہ ۳۶۰۔

آئے۔ امیر نے کہا کچھ پرواہ نہیں۔ اٹک تک جا کر اپنے ہم وطن ہم قوم پٹھانوں کو جمع کروں گا۔ لاکھوں یوسف زئی ساتھ لے کر لوٹوں گا، ان ملکوں کو لوٹوں گا، اعداء سے انتقام لوں گا۔ یا سرند رسودا ہے یا انجام حصول مدعا ہے۔ (۱)

پھر مہاراج نے امیر سے پوشیدہ اپنے سرداروں کو جمع کیا۔ اظہار حال کے بعد مشورہ کیا۔ سب نے بالاتفاق کہا اگر امیر کابل گئے اور شاہ کو لائے بھی تو تمہیں کیا فائدہ ہوگا۔ شاہ اور وہ حکومت کریں گے تمہیں ہرگز دخل نہ دیں گے تم انگریزوں سے صلح کر لو چین سے بیٹھو۔ (۲)

یہ بات اس کے دل کو لگی اور اس نے انگریزوں سے صلح کا فیصلہ کر لیا۔ مالوہ، اندور اور مضافات کا علاقہ لے کر بیٹھ گیا۔ چونکہ ہلکر اور امیر خان ایک دوسرے کے حلیف اور انگریزوں کی نظر میں ایک جان دو قالب تھے۔ اس لئے معاہدہ کی توثیق کے لئے انگریز امیر کی بھی مہر چاہتے تھے۔ ہلکر نے امیر کے سامنے ایسی لجاجت کی کہ حکمت و تدبیر پر امیر کی انسانی شرافت غالب آ گئی اور اس نے مہر اس کے حوالہ کی کہ جہاں چاہتے ہو لگا کر اپنا مدعا پورا کر لو۔ (۳)

کہنے کو تو اس معاہدہ پر امیر خاں کے دستخط ہو گئے۔ مگر اس کی آزاد طبیعت نے انگریزوں کی ماتحتی قبول نہیں کی۔ اپنی آزادانہ حیثیت برقرار رکھتے ہوئے وہ راجپوتانہ پہنچ گیا اور وہاں اپنی ترک تازیاں جاری رکھیں۔

انگریزوں نے ایک طرف راجستھان کی ریاستوں کو ایک ایک کر کے اپنے ساتھ ملا لیا۔ دوسری طرف انگریزی افواج نے چاروں سمت سے بڑھنا شروع کیا اور نواب کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ جنرل ڈنکین آگرہ سے لشکر جرار کے ساتھ آ دھمکا۔ اور جنرل اکٹرلونی دہلی سے زبردست فوج اور بھاری توپ خانے کے ساتھ آ گیا اور پیش قدمی شروع کی۔ ایک طرف پنڈاروں (۴) امیر خاں اور سندھیا کے درمیان انگریزی فوج

---

(۱) امیر نامہ صفحہ ۳۶۴۔

(۲) ایضاً صفحہ ۳۶۵۔

(۳) ملاحظہ ہو مہر: سید احمد شہید اول صفحہ ۸۸۔

(۴) پنڈارے جنوبی ہند کی ایک غیر منظم اور جنگ جو طاقت تھی۔ ان کی حیثیت بے قاعدہ ==

اس طرح بیٹھ گئی کہ باہم گفت وشنید یا میل جول کا کوئی موقع نہ رہا۔ دوسری طرف ایک انگریزی لشکر نواب صاحب کی فوج کے دو حصوں کے بیچ میں حائل ہو گیا۔ خود انگریز مؤرخین کا بیان ہے کہ کمپنی نے اپنی سب سے بڑی فوجی طاقت جو ایک لاکھ چوبیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی، اس موقع پر استعمال کی تھی۔ اسی کے ساتھ امیر خاں کے بعض قدیم رفیقوں کو لالچ دے کر انگریزوں نے توڑ لیا۔ اور سخت اندیشہ پیدا ہو گیا کہ دوسرے افسرانِ فوج امیر خان کو گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے نہ کر دیں۔ ان نازک حالات میں انگریزوں نے بعض معتمدین کے ذریعہ امیر خاں کے ساتھ مصالحت کی بات چیت شروع کی۔ یہ ایک سوچی سمجھی انگریزوں کی سازش تھی۔ دہلی سے عہد نامہ کا مسودہ امیر خاں کے پاس بھیجا گیا۔ امیر خاں اس وقت مادھو راج پور کے قلعہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ اس نے مجبور ہو کر محاصرہ اٹھا لیا۔ اور اپنے معتمد علیہ سفیر داتا رام کو جو جے پور میں تھا، لکھا کہ انگریزوں کے ساتھ گفتگو کر کے صلح نامہ مرتب کر لو۔ نواب اور جنرل اکٹرلونی کی ملاقاتیں شروع ہوئیں۔ صلح نامہ کا مسودہ دہلی بھیجا گیا۔ اور ۹ر نومبر ۱۸۱۷ء کو نواب کے وکیل نے اصل معاہدے پر دستخط کر دیئے۔ ۱۵ر نومبر کو گورنر جنرل نے اس معاہدہ کی تصدیق کر لی۔ یہی ریاست ٹونک کی بنیاد ہے۔ (۱)

عہد نامہ کی قابل ذکر شرطیں یہ تھیں:

۱۔ جو علاقے ہلکر نے نواب کو دیئے تھے، وہ اسی کے قبضے میں رہیں گے اور اسی سے ریاست ٹونک وجود میں آئے گی۔

۲۔ علاقے کے انتظام کے لئے ضروری فوج کے علاوہ ساری فوج منتشر کر دی جائے گی۔

۳۔ توپ خانہ اور ساز و سامان جنگ مناسب معاوضہ دے کر انگریز لیں گے۔

== لشکروں کی تھی۔ مرہٹہ گردی کے ابتدائی دور میں یہ ابھرے تھے اور وسط ہند میں قیامت برپا کر دی تھی۔ (مزید معلومات کے لئے دیکھئے سید احمد شہیدؒ اول صفحہ ۱۰۲۔ ۱۰۵، سیرت احمد شہیدؒ اول صفحہ ۱۴۵، علماء ہند کا شاندار ماضی دوم صفحہ ۸۴۔ ۸۵)

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو امیر نامہ صفحہ ۵۵۷ تا صفحہ ۵۷۷۔ نیز سید احمد شہید اول صفحہ ۱۰۱۔ ۱۰۶، و سیرت سید احمد شہید اول صفحہ ۱۴۴۔ ۱۴۵۔

۴۔نواب کسی علاقہ پر حملہ نہیں کرے گا، بلکہ پنڈاروں کو ختم کرنے میں انگریزوں کو مدد دے گا۔(۱)

مصالحت رکوانے کے لئے سید صاحب کی کوششیں

ناکامی اور امیر خان سے علاحدگی

مصالحت کی ساری کارروائی پوشیدہ طور پر ہورہی تھی۔سید صاحب مورچے پر تھے کہ اچانک نظر پڑی کہ ایک شتر سوار معاہدہ کا مسودہ لے کر سرپٹ امیر خاں کے پاس پہنچا۔دیکھتے ہی سید صاحب سناٹے میں آ گئے۔جب کہ اکثر سرداران لشکر کی رائے تھی کہ مصالحت کرلی جائے۔مگر سید صاحب نے اس کی سخت مخالفت کی۔وقائع احمدی میں اس کی پوری تفصیل ہے۔اسی کی عبارت ملاحظہ ہو:

> آخرالامر فرنگی سے ملنے کی ٹھہری۔حضرت سید المومنین وامام المجاہدین نے ہر چند فہمائش کی اور منع کیا کہ حضور پرنور کفار نصاری سے نہ ملیں، بلکہ لڑیں۔خدائے تعالیٰ آپ کے ساتھ ہے۔اگر آپ کو فتح ہوئی فھو المراد۔اور اگر شہید ہوئے تو بھی بہتر۔مگر ان سے ملنا اور مصالحت کرنا بہت برا ہے۔نواب نامدار دولتمند ارنے فرمایا کہ حضرت میں بھی یہی چاہتا ہوں مگر ناچار کیا کروں۔لشکر کا سامان درست نہیں، تمام لوگ خودغرض، آپس میں اتفاق نہیں۔اس وقت ملنا ہی مناسب ہے۔ان سے دس پانچ لاکھ روپے لے کر جیسے مہاراج ہلکر نے لئے۔پھر سازوسامان لشکر کا درست کرکے لڑیں گے۔حضرتؒ نے فرمایا مصالحت کرنے کے بعد آپ سے کچھ نہ ہوسکے گا۔حضور (امیر خاں) کے خیال میں اس وقت سوا ملنے کے کچھ بھی نہ آیا اور ملنے کی تیاری کرنے لگے۔حضرت نے فرمایا اگر آپ نصاریٰ سے ملنے کو جاتے ہیں، میں آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔حضور نے بہتیرا سمجھایا۔حضرت نے نہ

(۱) اصل عہدنامہ فارسی میں ہے ملاحظہ ہو تاریخ ٹونک صفحہ ۶۰۔

مانا۔ چند آدمی ہمراہ لے کر وہاں سے جے پور کو چلے گئے۔

سید صاحب کی اس طرح جدائی سے نواب امیر خاں کو بڑی فکر لاحق ہوئی۔ وہ سید صاحب سے ملنے اور مطمئن کرنے کے لئے جے پور تک گیا۔ وہاں صبح کی نماز میں ایک مسجد میں ملاقات ہوئی۔ وہ سید صاحب کا ہاتھ پکڑ کر باتیں کرتا ہوا باہر نکلا۔ سید صاحب نے فرمایا:

> نواب صاحب ابھی کچھ نہیں گیا۔ اختیار باقی ہے۔ اب بھی آپ کی فہمائش کو آیا ہوں۔ اگر میرا کہنا مان لو تو ان کافروں سے لڑو اور ہرگز نہ ملو۔ ملنے کے بعد آپ سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ یہ کفار بڑے دغاباز و مکار ہیں، کچھ آپ کے واسطے جاگیر یا تنخواہ وغیرہ مقرر کر کے کہیں بیٹھا دیں گے کہ روٹیاں کھایا کیجئے۔ پھر یہ بات ہاتھ سے جاتی رہے گی۔

نواب صاحب نے پھر وہی جواب دیا کہ میں لڑ کر عہدہ برآ نہ ہو سکوں گا۔ اس وقت ملنا ہی مناسب ہے۔ آخر سید صاحب نے کہا کہ خیر آپ مختار ہیں۔ میں آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔ ایک روز حضرت پھر لشکر میں تشریف لائے۔ جس کسی سے کچھ لینا دینا تھا لیا دیا اور نواب صاحب سے ملاقات کی۔ نواب صاحب بہت آبدیدہ ہوئے کہ حضرت جو کچھ تقدیر میں تھا وہی ہوا۔ حکم الٰہی سے چارہ نہیں۔ آپ اگر دہلی کو جاتے ہیں تو صاحبزادہ محمد وزیر خاں کے ہمراہ جائیے۔ آپ نے قبول کیا۔ پھر کئی دن کے بعد ایک نیاز نامہ حضرت خاتم المحدثین مولانا شاہ عبدالعزیز کو لکھا۔ یہ خاکسار سراپا انکسار حضرت کی قدم بوسی میں عنقریب حاضر ہوتا ہے یہاں لشکر کا کارخانہ درہم برہم ہو گیا ہے۔ نواب صاحب فرنگی سے مل گئے ہیں اب یہاں رہنے کی کوئی صورت نہیں۔ (۱)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی اس واقعہ کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: آپ نے آخر آخر تک نواب صاحب کو اس سے باز رہنے کا مشورہ دیا اور اس کے خطرات سے آگاہ کیا، لیکن نواب اپنے کو ان حالات میں بالکل مجبور و بے بس پاتے تھے۔ سالہا سال کی تگ و دو اور جانفشانیوں کا (جو افسوس ہے کہ بے نظمی اور بے تدبیری

---

(۱) وقائع احمدی (مخطوطہ) صفحہ ۸۲۔۸۵۔ خفیف تغیر اور کچھ اختصار کے ساتھ۔

کے ساتھ جاری رہیں) نتیجہ دیکھ کر ان پر ایسی افسردگی اور پست ہمتی طاری تھی اور انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقبال سے وہ اس درجے متاثر تھے کہ وہ چھوٹی سی ریاست کے گوشۂ عافیت کو غنیمت سمجھ رہے تھے۔ سید صاحب حالات سے اس درجہ متاثر نہ تھے، ان کے نزدیک مایوسی کی کوئی وجہ نہ تھی۔ نواب کو انگریزوں کا مقابلہ اور بڑھتے ہوئے خطرے کا سد باب کرنا چاہئے تھا۔ جس کی زد میں سارا ہندوستان اور بالآخر سارا عالم اسلام تھا۔ ان کے نزدیک یہ ہندوستان کی آخری آزاد اور جنگ جو طاقت تھی، جس کو آسانی کے ساتھ سپر انداز اور مقابلے سے دستبردار نہیں ہونا چاہئے تھا۔ مگر ان کو جلد معلوم ہو گیا کہ نواب کی قوت مقابلہ جواب دے چکی ہے اور صلح کے سب مراحل طے ہو چکے ہیں۔ اس کے باوجود بھی آپ نے افہام و تفہیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ جب یہ محسوس کر لیا کہ اب کوئی گفتگو کارگر نہیں ہوسکتی اور مصالحت طے شدہ امر ہے، تو آپ نے لشکر سے مفارقت اور دہلی کو واپس آجانے کا فیصلہ فرما لیا۔ گویا آپ کی رفاقت و شرکت کی شرط یہی تھی کہ نواب ایک آزاد طاقت کی حیثیت سے باقی رہیں اور مطمح نظر یہ تھا کہ آپ جلد یا بدیر اس آزاد طاقت کو صحیح رخ پر لگائیں اور اس سے اسلامی اقتدار کے قیام اور ہندوستان کے استخلاص و استقلال کی مہم میں کام لیں۔ یہ امید بالکل منقطع ہو گئی تو آپ نے لشکر سے مراجعت فرمائی اور دہلی کا رخ کیا۔(۱)

آپ کی مراجعت رجب یا شعبان ۱۲۳۳ھ مطابق مئی یا جون ۱۸۱۸ء میں ہوئی۔(۲)

مستقل تنظیم جہاد

اب سید صاحب نے مستقل تنظیم جہاد کا فیصلہ فرمایا۔ اور از خود جہاد کی تیاریاں شروع کیں۔ مگر اس کے لئے پہلے ہندوستان کی فضا سازگار بنانے کی ضرورت تھی تاکہ جو مجاہد ملیں وہ محض لڑنے والوں کا گروہ یا مال غنیمت کی حریص کوئی جماعت نہ ہو، بلکہ قرآن کی بولتی تصویر اور شاہ عبدالعزیز اور سید صاحب کے خوابوں کی تعبیر ہو۔ جو جذبۂ

---

(۱) سیرت سید احمد شہید اول صفحہ ۱۴۶۔۱۴۷۔

(۲) مہر، سید احمد شہید اول صفحہ ۱۱۱۔

جہاد سے سرشار، جان و مال کی قربانی کے لئے تیار، وفا شعار اور اطاعت گزار ہو۔ چنانچہ آپ نے سب سے پہلے وسیع پیمانہ پر اصلاحی و دعوتی دورے کئے۔ ملک بھر میں اپنے کارندے پھیلائے۔ حتی کہ سید صاحب نے جنوبی ہند کے دور دراز علاقوں تک اپنے رفقاء بھیجے۔ جنھوں نے پوری تندہی اور سرگرمی کے ساتھ آپ کا مشن جاری رکھا اور آپ کی دعوت پھیلائی۔ جس کا مقصد رسوم و بدعات کی مخالفت اور مقابلہ، سنت سنیہ کی حمایت و اشاعت، شعائر اسلام کی حفاظت، اسلامی طرز زندگی کا احیاء، غیر ملکی اقتداء سے نفرت اور جذبۂ جہاد کو فروغ دینا تھا۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے جو زمین تیار کی تھی، اس پر حضرت سید احمد شہید نے بیج ڈالے اور فصل اگائی۔ طاغوتی طاقتوں سے ٹکر لینا اور وطن کو ان کے چنگل سے نجات دینا ان کے بنیادی مقاصد میں تھا۔

دوسری فصل

سید احمد شہید کا انگریزوں سے جہاد ان کے مکتوبات کی روشنی میں

سید صاحب نے اپنے خطوط و مکتوبات میں جابجا اپنے اصلی جذبات و خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ جن سے ایک عام فہم رکھنے والا شخص بھی بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ سید صاحب کے اصلی مقاصد اور اس عملی جدو جہد کے حقیقی اسباب و محرکات کیا تھے۔ اس کو سمجھنے کے لئے آپ کے مکتوبات (۱) وارشادات سے بڑھ کر کوئی مستند ذریعہ نہیں ہوسکتا۔ اس لئے ذیل میں ہم انہی مکاتیب کے چند اقتباسات پیش کررہے ہیں۔ یہ مکاتیب اتنے صاف اور واضح ہیں کہ ہمیں کسی استنباط یا قیاس آرائی کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ قاری ازخود فیصلہ کرتا جائے گا۔ انگریز کی دسیسہ کاریوں کو سید صاحب چشم حقیقت بیں سے دیکھ رہے تھے۔ اس لئے مسلمانوں کو حریت کا سبق پڑھاتے ہوئے حیرت واستعجاب کے ساتھ لکھتے ہیں :

سبحان اللہ! کسانیکہ تخریب شعائر اسلام از دست کفار لیام می بیند و می شنود، باز غیرت ایمانی در دل ایشاں جوش نمی زند و حمیت اسلامی در سینہ

سبحان اللہ! جو شخص کفار کے ہاتھوں شعائر اسلام کی پامالی دیکھ رہا ہو اور سن رہا ہو پھر بھی غیرت ایمانی اور حمیت اسلامی اس کے دل میں جوش نہ مارے

(۱) مکتوبات سید احمد شہید کے دو قلمی اور ایک مطبوعہ نسخہ ہمارے پیش نظر ہے۔ قلمی نسخوں میں ایک نسخہ بڑے سائز کے ۴۱۶ صفحات پر تمام ہوا ہے۔ یہ نسخہ نہایت خوش خط ہے مگر اغلاط سے پر ہے۔ دوسرے نسخے میں ۳۰۲ صفحات ہیں جو ناقص الاخیر ہے۔ یہ دونوں نسخے حضرت مولانا علی میاں کے خاندانی کتب خانے کے ہیں اس وقت ندوۃ العلماء کی لائبریری میں مختلف علوم فارسی میں بترتیب ۲۸۵۱/۳۵ و ۲۸۱۴/۳۴۔ محفوظ ہیں۔ مطبوعہ نسخہ جو مکتبہ رشیدیہ لاہور نے شائع کیا ہے وہ ایک خطی نسخہ کا عکسی ایڈیشن ہے جو ۲۸۱۴/۳۴ والے قلمی نسخے کے عین مطابق ہے اور مکمل ہے مگر کہیں کہیں معمولی لفظی تغیر ہے۔ قاری کی سہولت کے پیش نظر ہم نے حوالہ عموماً مطبوعہ نسخہ ہی کا دیا ہے۔ مگر جگہ جگہ قلمی نسخوں سے ملایا ہے اور ضرورت پر ان کا حوالہ بھی دیا ہے۔

ایشاں خروش نمی کند، چگونہ ادعائے ایمان می نمایند، وجان خودرا در زمرہ محمدیان می شمارند(۱)

وہ کیسے ایمان کا دعویٰ کرتا ہے۔ اور خود کو زمرہ محمدی میں شمار کرتا ہے۔

اہل کفر کا غلبہ، مسلمانوں کی بے بسی اور شعائر اسلام کی بے حرمتی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

ہر چند قتال اہل کفر وطغیان در ہر زمان وہر مکان لازم است۔ اما دریں جزو زمان کہ شورش اہل کفر وطغیان از حد گزشتہ کہ فریاد مظلومان از دست تظلم ایشاں سر بفلک کشیدہ، وتخریب شعائر اسلام از دست تعدی ایشاں ہویدا گردیدہ، پس بریں تقدیر اقامت ایں رکن رکین یعنی مقابلہ مشرکین برذمہ جمہور مسلمین اوکد واوجب گردیدہ۔ (بنام شرفاء وسادات وعلماء ومشائخ ہندوستان)(۲)

اگرچہ کفار اور سرکشوں سے ہر زمانے اور ہر مقام میں جنگ کرنا لازم ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ اس زمانے میں کہ اہل کفر وطغیان کی سرکشی حد سے گزر چکی ہے۔ مظلوموں کی آہ وفریاد کا غلغلہ بلند ہے۔ شعائر اسلام کی توہین ان کے ہاتھوں صاف نظر آرہی ہے۔ اس بناء پر اب اقامت رکن دین یعنی اہل شرک سے جہاد عامۂ مسلمین کے ذمے کہیں زیادہ مؤکد اور واجب ہوگیا ہے۔(۳)

شاہ محمود سلطان ہرات کے نام اپنے خط میں اسی مضمون کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

اقامت جہاد وازالہ بغی وفساد در ہر زمان وہر مکان از اہم احکام حضرت رب العباد است، خصوصاً

جہاد قائم کرنا اور بغی وفساد کو دور کرنا ہر زمانے میں اور ہر جگہ خدا تعالیٰ کے اہم ترین احکامات میں سے ہے۔

(۱) مکاتیب سید احمد شہید مطبوعہ صفحہ ۲۷، الف۔

(۲) مکاتیب مطبوعہ صفحہ ۳۵، ب

(۳) یہ ترجمہ اور اس کے علاوہ جو چند مکتوبات حضرت مولانا علی میاں نے سیرت سید احمد شہید میں نقل کئے ہیں۔ ان کے تراجم وہیں سے ماخوذ ہیں مگر چونکہ حضرت مولانا کے پیش نظر ۔۱۲۸۵۱/۳۵ والا نسخہ ہے۔ اس لئے الفاظ میں کہیں کہیں کچھ فرق ہے۔

دریں جزو زمان کہ وقت شورش اہل کفر وطغیان بحدے رسیدہ، کہ تخریب شعائر دین وافساد حکومت سلاطین از دست کفرہ متمردین وبغات مفسدین بوقوع آمدہ، واین فتنۂ عظیم تمام بلاد ہندوسند وخراسان را فرا گرفتہ، پس در ایں صورت تغافل در مقدمہ استیصال کفرہ متمردین، وتساہل در باب باغیان مفسدین از اکبر معاصی و افتح آثام است۔ بناءً علیہ ایں بندہ درگاہ حضرت الٰہ از وطن مالوفہ خود برخاستہ، در دیار ہند وسند وخراسان دور وسیر نمودہ، ومؤمنین آں اقطار و مسلمین آں دیار بایں معنی ترغیب کرد۔ (۱)

مگر خصوصاً اس زمانہ میں کہ اہل کفر وطغیان کی شورش اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ سرکش کافروں اور فتنہ پرور باغیوں کے ہاتھوں شعائر اسلام کی پامالی ہورہی ہے اور سلاطین کی حکومتیں مٹ رہی ہیں۔ یہ فتنۂ عظیم پورے ہندوستان سندھ اور خراسان میں بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ پس اس صورت حال میں ان سرکش کافروں اور باغیوں کے بیخ کنی اور سرکوبی میں غفلت وتساہل بہت بڑا گناہ ہے۔ اسی بنیاد پر محض خدا کے لئے اس بندہ نے اپنے محبوب وطن سے نکل کر ہندوستان سندھ اور خراسان کا دورہ کر کے مسلمانوں کو اس کی ترغیب دی۔

شاہزادہ کامران کے خط میں یہ الفاظ آئے ہیں :

مہاجرت از بلاد کفر وفساد، ومجاہدہ با اہل کفر وعناد، ومقابلہ ارباب بغی وفساد، از اعظم ارکان اسلام است۔ وتساہل وتغافل دریں امراز افتح معاصی وآثام۔ لہذا وقتیکہ بلاد ہندوستان از شیوع آثار اہل کفر وطغیان مملو ومشحون گردیدہ۔ ایں جانب از وطن مالوف خود برخاستہ بہ نیت ہجرت وجہاد بسمت خراسان متوجہ شد۔ (۲)

شاہ بخارا کو اس کی تاکید کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

ہرگاہ بلاد اہل اسلام در دست کفار لئام افتد، بر جماہیر اہل اسلام عموماً ومشاہیر

جب اسلامی ملک پر کافر مسلط ہو جائیں تو عام مسلمانوں پر عموماً اور حکام پر خصوصاً

(۱) مکاتیب مطبوعہ صفحہ ۱۸، الف۔ ومکتوبات قلمی نمبر ۳۴، صفحہ ۳۷ - ۳۸۔
(۲) مکاتیب مطبوعہ صفحہ ۱۸، ب۔ وقلمی نمبر ۳۴، صفحہ ۳۹۔ عبارت تقریباً پہلے خط کے مماثل ہے۔ اس لئے ترجمہ کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی۔

حکام خصوصاً واجب وموکد می گردد کہ سعی وکوشش در مقابلہ ومقاتلہ آنہا بجا آرند، تا وقتیکہ بلاد مسلمین را از قبضۂ ایشاں برآرند و إلا آثم وگنہگار می شوند وعاصی وستمگار۔ از درگاہ قبول مردود می گردند واز ساحت قرب مطرود۔ (۱)

واجب ہو جاتا ہے کہ ان غیر مسلموں کے خلاف مقابلہ ومقاتلہ کی کوششیں اس وقت تک جاری رکھیں جب تک مسلمانوں کا ملک ان کے قبضہ سے واپس نہ لے لیں ورنہ مسلمان گنہ گار ہوں گے اور بارگاہ الٰہی میں ان کے اعمال مقبول نہ ہوں گے اور وہ خود قرب حق کی برکتوں سے محروم۔

اسی خط میں آگے لکھتے ہیں :

مقصود از برپا کردن تمام ایں معرکہ پیرائی وعربدہ آرائی غیر از اعلائے کلمہ رب العالمین، واحیائے سنت سید المرسلین، واستخلاص بلاد مومنین از دست کفرہ متمردین چیزے دیگر نیست۔ (۲)

اس تمام معرکہ آرائی اور جنگ آزمائی کا مقصود صرف یہ ہے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت زندہ ہو۔ اور مسلمانوں کا ملک سرکش کافروں کے قبضے سے نکل آئے۔ اس کے سوا کوئی مقصود نہیں۔

---

(۱) مکاتیب مطبوعہ صفحہ ۲۶، الف و قلمی نمبر ۳۴، صفحہ ۵۵۔
(۲) مکاتیب مطبوعہ صفحہ ۲۶، ب۔ و قلمی نمبر ۳۴، صفحہ ۵۶۔

مولانا سید محمد میاں صاحب نے سید صاحب کے ایک مکتوب کا یہ ترجمہ نقل کیا ہے : خدا گواہ ہے کہ ہمارا منشا نہ دولت جمع کرنا ہے نہ اپنی حکومت قائم کرنا۔ ہم خدائے بالا وبرتر کے ناچیز بندے ہیں، نہ بندگان خدا پر جبر وقہر کا کوئی وسوسہ ہمارے دل میں ہے اور نہ کسی کی حکومت چھین لینے کا کوئی جذبہ۔ ہمارا منشا وطن کو آزاد کرانا ہے اور بس، اور یہ اسلئے کہ تقاضائے مذہب یہی ہے اور اسی میں رضائے مولیٰ مقصود ہے (پھر حاشیہ میں لکھتے ہیں۔ مکتوب سید صاحب بنام شاہ بخارا و مکتوب بنام سردار بدھ سنگھ جنرل افواج مہاراجہ رنجیت سنگھ) (علمائے ہند کا شاندار ماضی دوم صفحہ ۱۹۲۔ ۱۹۳۔ شاہ بخارا کے نام سید صاحب کا جو مکتوب ہم نے اوپر نقل کیا ہے۔ اس میں یہ الفاظ آئے ہیں :

ایں بندۂ عبودیت شعار وعاجز خاکسار آرزوئے حصول معنی تملک خزائن بے شمار وتسلط بر بلاد وامصار، وتجبر بر بندگان ملک منان، وفرماں روائی برا قران واخوان، وطلب عزت ووجاہت وریاست وامارت، واہانت رؤسائے عالی مقدار، وطلب سلطنت سلاطین والا تبار، وامتیاز خود بہ نسبت سائر بندگان، وامتہان رسالت پناہی خطور تم نکردہ ووسوسہ آں ہم نرسیدہ بلکہ مقصود از برپا کردن۔ الخ۔ ==

شاہزادہ کامران (۱) اور نواب شاہ سلیمان (۲) کے نام خطوط میں بھی تقریباً یہی الفاظ آئے ہیں۔

شاہ سلیمان کو مزید لکھتے ہیں :

ایں فقیر بہ تحصیل مال ومنال، وتصرف بلاد وامصار غرضے ندارد۔ ہر کہ از اخوان مؤمنین استخلاص بلاد از دست کفار ومشرکین نمودہ، دراجرائے احکام رب العالمین وافشائے سنت سید المرسلین کوشید، وقوانین شریعت درریاست وعدالت مرعی داشت۔ مقصود فقیر حاصل گشت۔ ونیز سعی من بہدف نشست۔ (۳)

اس فقیر کو مال ودولت اور حصول سلطنت وحکومت سے کچھ غرض نہیں۔ دینی بھائیوں میں سے جو شخص بھی کفار کے ہاتھوں سے ملک کو آزاد کرے۔ رب العالمین کے احکام کو رواج دینے اور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو پھیلانے کی کوشش کرے گا۔ اور ریاست وعدالت میں قوانین شریعت کی رعایت وپابندی کرے گا۔ فقیر کا مقصود حاصل ہوجائے گا۔ اور میری کوشش کامیاب ہوجائے گی۔

شاہ سلیمان کے اسی خط کا ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو :

قضا را از مدت چند سال حکومت وسلطنت ایں ملک برایں منوال گردیدہ، کہ نصاری نکوہیدہ خصال ومشرکین بدمآل بر اکثر بلاد ہندوستان

تقدیر سے چند سال سے ہندوستان کی حکومت وسلطنت کا یہ حال ہوگیا ہے کہ بدکردار عیسائیوں اور بدانجام مشرکین نے ہندوستان کے اکثر حصے پر غلبہ حاصل

== غالباً اسی کا خلاصہ مولانا محمد میاں نے اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ مگر سردار بدھ سنگھ کے نام کوئی خط ہمارے پیش نظر مجموعہائے مکاتیب میں نہیں ملا۔ البتہ مولانا سید جعفر علی نقوی نے ''منظورۃ السعداء'' ص ۸۱۱-۸۱۳ (قلمی، مخزونہ کتب خانہ ندوۃ العلماء) میں سردار بدھ سنگھ کے نام سید صاحب کا ایک طویل مکتوب نقل کیا ہے مگر اس میں وہ پورا مضمون نہیں ہے جو مولانا محمد میاں صاحب نے ذکر کیا ہے۔ مولانا نے حوالہ بھی نہیں دیا کہ یہ خط کہاں سے انھوں نے نقل کیا ہے۔

(۱) مکاتیب مطبوعہ صفحہ ۱۹۔ الف۔

(۲) مکتوبات قلمی ۲۸۵۱/۳۵، صفحہ ۲۰۴۔

(۳) مکتوبات قلمی نمبر ۳۵۔ صفحہ ۵۰۵۔

استیلا یافتند، وآں دیار را بظلمات ظلم وبیداو مشحون ساختند، ودرآں بلاد وامصار رسوم کفروشرک اشتہار یافتہ، وشعائر اسلام رو باستتار آوردہ، ناگزیر سینہ بے کینہ معاینہ ایں حال پراز رنج وملال بود، وبشوق ہجرت مالامال، غیرت ایمانی بدل در جوش بود، واقامت جہاد برسر خروش۔(۱)

کرلیا ہے اور ظلم وبیداد شروع کردی ہے۔کفر وشرک کے رسوم کا غلبہ ہوگیا ہے اور شعائر اسلام اٹھ گئے ہیں۔یہ حال دیکھ کر ہم لوگوں کو بڑا صدمہ ہوا اور ہجرت کا شوق دامن گیر ہوا۔دل میں غیرت ایمانی اور سر میں جہاد کا جوش وخروش ہے۔

شاہ بخارا کے نام خط میں اسی قسم کا مضمون ذرا اور وضاحت کے ساتھ اس طرح ہے :

از مدت چند سال بتقدیر قادر فعال حال حکومت وسلطنت ایں ممالک بریں منوال گردیدہ، کہ نصاری نکوہیدہ خصال ومشرکین بدمآل بر اکثر بلاد ہندوستان از لب دریائے اباسین تا ساحل دریائے شور کہ تخمیناً شش ماہہ راہ باشد، تسلط یافتند۔ودام تشکیک وتزویر بنابر اخمال دین رب خبیر برباقتند۔ وتمامی آں اقطار را بظلمات ظلم وکفر مشحون گردانیدند۔وعزت روسائے کبار را انواع ذلت مقرون، وجماہیر مسلمین را عموماً ومشاہیر حکام را خصوصاً بانواع تکالیف رنجانیدند۔وبر مساجد ومعابد اہل اسلام دست تعدی رسانیند۔ ودر مقدمات ریاست وسیاست،

چند سال سے تقدیر الٰہی سے اس ملک کی حکومت وسلطنت کا حال یہ ہوگیا ہے کہ بدکردار عیسائیوں اور بدانجام مشرکین کا ہندوستان کے اکثر حصوں دریائے سندھ سے لے کر سمندر تک تسلط ہوگیا ہے۔یہ اتنا بڑا خطہ ہے کہ انسان پیدل چلے تو ایک سرے سے دوسرے سرے پر پہنچنے میں چھ مہینے لگ جائیں،اور انھوں نے اسلام کی بربادی کے لئے تشکیک وتزویر کا جال پھیلایا ہے۔اور انھوں نے اس سارے علاقے کو ظلم وکفر کی تیرگی سے بھر دیا ہے۔ بڑے بڑے رئیسوں کی عزت ذلت میں بدل چکی ہے اور تمام مسلمان عموماً اور مسلمان حکام خصوصاً مختلف قسم

(۱) مکتوبات قلمی نمبر ۳۵،صفحہ ۴۰۲۔

ومعاملات قضاو عدالت قوانین شرع را بر باد داده، وآئین کفر را بنیاد نہادہ، بالجملہ درآں بلاد وامصار واضلاع واقطار رسوم کفر مقہور گردیدہ، وشعائر اسلام مستور، ورایات ظلم منصوب شدہ، واعلام عدل منکوب۔ حق پرستی مفقود گشتہ وہوا پرستی۔ (۱)

کی تکالیف میں مبتلا ہیں اور مسلمانوں کی مسجدوں اور عبادت گاہوں پر انھوں نے دست ظلم دراز کر رکھا ہے، اور ریاست وسیاست کے مقدمات اور قضاو عدالت کے معاملات میں شریعت کے قوانین کو برباد کر کے کفر کے قانون کی بنیاد رکھی ہے۔ خلاصہ یہ کہ ان علاقوں میں کفر کے رسوم کا غلبہ ہے اور شعائر اسلام مستور، ظلم کے جھنڈے لہرا رہے ہیں اور عدل وانصاف کے جھنڈے سرنگوں ہیں۔ حق پرستی مفقود ہے اور خواہش پرستی کا بازار گرم ہے۔

سید صاحب انگریزوں کی مکاری اور حیلہ سازی سے پوری طرح واقف تھے۔ شاہ بخارا کے اسی خط میں آگے لکھتے ہیں:

کفار فرنگ کہ بر ہندوستان تسلط یافتہ اند، نہایت تجربہ کار وہوشیار اند وحیلہ باز ومکار۔ اگر بر اہل خراسان (۲) بیایند بسہولت تمام جمیع بلاد آں بدست آرند۔ باز حکومت آنہا بحدود ولایت آنجناب متصل گردد واطراف دارالحرب باطراف دارالاسلام متحد شود۔ (۳)

جو فرنگی کافر ہندوستان پر قابض ہوئے ہیں وہ نہایت تجربہ کار، ہوشیار، حیلہ باز اور مکار ہیں۔ اگر اہل خراسان (افغانستان) پر چڑھائی کر دیں تو بڑی سہولت کے ساتھ ان کے ملک پر قابض ہو جائیں گے۔ پھر ان کی حکومت کی حدیں آپ کی حکومت سے مل جائیں گی اور دارالحرب اور دارالاسلام کے اطراف متحد ہو جائیں گے۔

---

(۱) مکاتیب مطبوعہ صفحہ ۲۵۔

(۲) سید صاحب کے مکتوبات وارشادات میں جہاں بھی خراسان آیا ہے اس سے مراد افغانستان ہے۔

(۳) مکاتیب مطبوعہ صفحہ ۲۸۔الف۔

اسی خط کا ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو :

بلاد ہندوستان از اصل دارالحرب نیست۔ بل کفرہ ہندو فرنگ بالفعل برآں مسلط گردیدہ، پس استخلاص بلاد مذکورہ از دست آنہا برذمہ جماہیر اہل اسلام عموماً ومشاہیر حکام خصوصاً واجب۔ وایں فقیر بقدر استطاعت خود کوشش می نماید۔ آنجناب را لازم کہ بقدر طاقت خود سعی فرمانید۔(۱)

ہندوستان اصلاً دارالحرب نہیں، مگر چونکہ ہندوستانی وفرنگی کفار اس پر مسلط ہوگئے ہیں (اس لئے وہ دارالحرب ہوگیا ہے) چنانچہ اس ملک کو ان کے ہاتھوں سے بچانا تمام مسلمانوں پر عموماً اور حکام پر خصوصاً واجب ہے۔ یہ فقیر مقدور بھر کوشش کررہا ہے۔ جناب والا کے لئے بھی ضروری ہے کہ اپنی طاقت کے بقدر اس کے لئے کوشش فرمائیں۔ (اور ہمارا ساتھ دیں)

راجہ ہندوراؤ وزیر گوالیار کو صاف لکھتے ہیں :

برائے سامی روشن ومبرہن است کہ بیگانگان بعیدالوطن ملوک زمین وزمن گردیدہ اند، وتاجران متاع فروش بپایۂ سلطنت رسیدہ۔ امارت امرائے کبار وریاست روسائے عالی مقدار برباد کردہ اند، وعزت واعتبار ایشاں بالکل ربودہ۔ چوں اہل ریاست وسیاست زاویۂ خمول نشستہ اند، ناچار چندے از اہل فقر ومسکنت کمرہمت بستہ۔ ایں جماعت ضعفاء محض بنا برخدمت دین رب العالمین برخاستہ اند۔ ہرگز ہرگز از دنیاداران جاہ طلب نیستند۔ محض بنا برخدمت دین رب ذوالجلال برخاستہ

جناب کو خوب معلوم ہے کہ یہ پردیسی، سمندر پار رہنے کے والے، دنیا جہاں کے تاجدار اور یہ سودا بیچنے والے سلطنت کے مالک بن گئے ہیں۔ بڑے بڑے اہل حکومت کی حکومت اور ان کی عزت وحرمت کو انھوں نے خاک میں ملا دیا ہے۔ جو حکومت وسیاست کے مردمیدان تھے۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ اس لئے مجبوراً چند غریب وبے سروسامان کمر ہمت باندھ کر کھڑے ہوگئے۔ محض اللہ کے دین کی خدمت کے لئے اپنے

(۱) مکاتیب مطبوعہ صفحہ ۲۸۔ب۔ نمبر ۳۴

اند، نہ بنابر طمع مال ومنال۔ وقتیکہ میدان ہندوستان از بیگانگان دشمنان خالی گردیدہ، تیر سعی ایشاں بر ہدف مراد رسیدہ، آئندہ مناصب ریاست وسیاست بطالبین آں مسلم باد، وبیخ شوکت وسطوت ایشاں محکم شود۔ واین ضعفاء را از روٴسائے کبار وعظمائے عالی مقدار ہمیں قدر مطلوب است کہ خدمت اسلام بجان ودل کنند وبر مسند مملکت متمکن شوند۔ (۱)

گھروں سے نکل آئے۔ یہ اللہ کے بندے ہرگز دنیا دار اور جاہ طلب نہیں ہیں۔ محض اللہ کے دین کی خدمت کیلئے اٹھے ہیں۔ مال ودولت کی ان کو ذرہ بھر طمع نہیں۔ جس وقت ہندوستان ان غیر ملکی دشمنوں سے خالی ہوجائے گا۔ اور ہماری کوششوں کا تیر مراد کے نشانے تک پہنچ جائے گا۔ حکومت کے عہدے اور منصب ان لوگوں کو ملیں گے جن کو ان کی طلب ہوگی، اور ان (ملکی) حکام واہل ریاست کی شوکت وقوت کی بنیاد مستحکم ہوگی۔ ہم کمزوروں کو والیان ریاست اور بڑے بڑے سرداروں سے صرف اسی بات خواہش ہے کہ جان ودل سے اسلام کی خدمت کریں اور اپنی مسند حکومت پر برقرار رہیں۔

ریاست گوالیار کے ایک مسلمان عہدیدار غلام حیدر خاں (۲) کے نام ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :

---

(۱) مکاتیب مطبوعہ صفحہ ۷۹۔ قلمی صفحہ ۱۷۰۔ یہ ہندوراؤ مہاراج دولت رائے سندھیا والی گوالیار کا وزیر اور برادر نسبتی تھا۔

(۲) غلام حیدر خاں پہلے اپنے والد حبیب اللہ خاں (جو سلطنت اودھ میں رسالدار تھے) کے عہدہ پر اودھ میں مامور رہے۔ پھر نواب امیر خاں کے ساتھ کچھ عرصہ رہے۔ اس زمانہ میں سید صاحب کے گہرے دوست بن گئے تھے۔ جب نواب صاحب کا کارخانہ درہم برہم ہوگیا تو وہاں سے ترک تعلق کرکے ریاست گوالیار میں بمشاہرہ پندرہ سو روپیہ رکن ریاست رہے۔ وکالت رزیڈنسی ان سے متعلق کی گئی تھی (سیرت سید احمد شہید اول صفحہ ۴۵۲۔ وسید احمد شہید اول صفحہ ۲۸۔

اکثر بلاد ہندوستان بدست بیگانگان افتادہ۔ وایشاں ہر جا بنیاد آئین جور و ظلم نہادہ۔ ریاست روسائے ہندوستان برباد رفتہ۔ کسے تاب مقاومت ایشاں نمی دارد۔ بلکہ ہر کس ایشاں را بجائے آقائے خود می شمارد۔ چوں روسائے کبار از مقابلہ ایشاں نشستند۔ لاچار چندے از ضعفاء بے مقدار کمر ہمت بستند۔ پس دریں صورت روسائے عالی مقدار لازم، چنانچہ بر مسند ریاست سالہا سال متمکن ماندہ اند، بالفعل در اعانت ضعفائے مذکورین مساعی بلیغہ بجا آرند وآں را باعث بنیان ریاست خود شمارند(۱)

ملک ہندوستان کا بڑا حصہ غیر ملکیوں کے قبضے میں چلا گیا ہے اور انھوں نے ہر جگہ ظلم وزیادتی پر کمر باندھی ہے۔ ہندوستان کے حاکموں کی حکومت برباد ہوگئی۔ کسی کو ان کے مقابلے کی تاب نہیں۔ بلکہ ہر ایک ان کو اپنا آقا سمجھنے لگا ہے۔ چوں کہ بڑے بڑے اہل حکومت ان کا مقابلہ کرنے کا خیال ترک کر کے بیٹھ گئے ہیں۔ اس لئے چند کمزور و بے حقیقت اشخاص نے اس کا بیڑا اٹھایا۔ اس صورت میں ان بڑے سرداروں کے لئے مناسب یہی ہے جو سالہا سال سے اپنی مسند ریاست پر متمکن چلے آرہے ہیں کہ اس وقت ان کمزوروں کی ہر طرح امداد کریں۔ اور اس بات کو اپنی حکومت کے استحکام کا باعث سمجھیں۔

راجہ ہندوراؤ اور غلام حیدر خاں کے نام ان خطوط کے بعض اقتباسات کو نقل کر کے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی صاحب لکھتے ہیں :

ان اقتباسات سے بلاشبہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سید صاحب ایسٹ انڈیا کمپنی کے بڑھتے ہوئے اثر و تسلط اور انگریزی اقتدار کو حقیقی خطرہ سمجھتے ہیں اور اس خطرے کے ازالے اور ان ''بیگانگان بعید الوطن'' اور ''تاجران متاع فروش'' کے اخراج کے لئے غیر مسلم والیان ریاست اور اہل حکومت وطاقت کو اپنے ساتھ جدوجہد کرنے اور تعاون

(۱) مکاتیب مطبوعہ صفحہ ۸۰، الف۔

کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ جو ان کی اعلیٰ سیاسی بصیرت کی دلیل ہے۔ اس کے ساتھ وہ ان کو یقین دلاتے ہیں کہ اس منظم و متحد مقابلے اور جدوجہد ہی میں ان کی ریاست اور طاقت کی بقا ہے۔ ان کی زندگی اور عزت و منزلت اسی پر منحصر ہے کہ انگریزی غلبہ واقتدار کا یہ ''سرطان'' ہندوستان کے جسم سے خارج کر دیا جائے۔ اور ملک کو اس غیر ملکی طاقت کے چنگل سے نکال لیا جائے۔ آپ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس مقصد کے حصول کے بعد وہ اہل ریاست و سیاست جنھوں نے اس مقصد کے لئے اشتراک عمل کیا ہے، اپنے منصبوں (ریاست و امارت کی گدیوں) پر فائز رہیں گے۔ وہ مناسب عہدوں اور منصبوں سے سرفراز ہوں گے اور ان کی شوکت و سطوت میں جو انگریزوں کے اثر و تدبیر سے ہر دم متزلزل اور رو بہ زوال ہے استحکام پیدا ہو جائے گا۔ (۱)

یہاں ایک قابل لحاظ بات یہ بھی ہے کہ یہ صریح باتیں اس ریاست کے عہدیداروں کو لکھی جا رہی ہیں جو انگریزوں کے ماتحت اور ان کے زیر حفاظت تھی۔ جس کا انگریزوں سے صلح کا معاہدہ تھا۔ یہ سید صاحب کی بے باکی اور جرأت ایمانی کا واضح ثبوت ہے۔

اس سلسلہ مکاتیب کا آخری اقتباس ملاحظہ ہو جس سے صاف معلوم ہوگا کہ سید صاحب اگرچہ اپنی سرگرمیاں سرحد میں جاری رکھے ہوئے تھے، مگر ان کی نگاہیں ہندوستان پر لگی ہوئی تھیں۔ اس کے حالات ان کو مضطرب و بے چین کئے دے رہے تھے۔ وہ جلد سے جلد سرحد کے کام سے نمٹ کر ہندوستان کی طرف رخ کرنا چاہتے تھے کہ ہندوستان کو انگریزوں کے چنگل سے آزاد کرائیں اور باشندگان ملک کو ان کے پنجہ استبداد سے نجات دلائیں۔ اس لئے کہ مقصود اصلی ہندوستان ہی تھا۔ سرحد تو ایک راستہ تھا جس کو مجبوراً چند طبعی اور شرعی تقاضوں کے تحت اختیار کیا گیا تھا۔ لکھتے ہیں:

بعد از پاک کردن ایں بلاد از انجاس مشرکین والواث منافقین بمستحقین حکومت و سلطنت و مستعدین ریاست

اس ملک (سرحد) کو مشرکین کی نجاستوں سے پاک کرنے اور منافقین کی گندگی سے صاف کرنے کے بعد حکومت و سلطنت کا

(۱) سیرت سید احمد شہید اول، صفحہ ۴۱۹۔

و مملکت تفویض کردہ خواہد شد۔ اما بشرطیکہ شکر ایں انعام الٰہی بجا آرند، وعلی الدوام جہاد را بہر حال قائم دارند وگاہے معطل نہ گذارند، ودر ابواب عدالت وفصل خصومات از قوانین شرع شریف سرمو تفاوت وتجاوز بمیاں نیارند، واز ظلم وفسق بہ کلی اجتناب ورزند۔ باز خود ایں جانب مع مجاہدین صادقین بسمت بلاد ہندوستان بنا بر ازالہ اہل کفر وطغیان متوجہ خواہد شد کہ مقصود اصلی خود اقامت جہاد بر ہندوستان است، نہ توطن در دیار خراسان (۱)

(بنام شاہزادہ کامران)

استحقاق اور ریاست وانتظام سلطنت کی استعداد رکھنے والوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ احسان خداوندی کا شکر بجا لائیں گے۔ اور ہمیشہ اور ہر حال میں جہاد کو قائم رکھیں گے، اور کبھی اس کو موقوف نہیں کریں گے، اور انصاف اور مقدمات کے فیصلے میں شرع شریف کے قوانین سے بال بھر بھی تجاوز وانحراف نہیں کریں گے، اور ظلم وفسق سے کلیۃً اجتناب کریں گے۔ اس کے بعد میں اپنے مجاہدین کے ساتھ ہندوستان کا رخ کروں گا۔ تاکہ اس کو شرک وکفر سے پاک کیا جائے۔ اسلئے کہ میرا مقصود اصلی ہندوستان پر جہاد ہے نہ کہ ملک خراسان (سرحد وافغانستان) میں سکونت اختیار کرنا۔

(۱) مکاتیب مطبوعہ صفحہ ۱۹، ب۔ وقلمی نمبر ۳۴ صفحہ ۴۰۔

تیسری فصل

سید صاحب کا انگریزوں سے جہاد

مزید حقائق و شواہد

۱۔ تفصیل سے سید احمد شہید کے مکتوبات کا جائزہ لیا گیا جو آپ کے مقصد جہاد کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان صریح مکتوبات کی روشنی میں سید صاحب کا مقصود اصلی ہندوستان میں جہاد کر کے انگریزوں کا استیصال اور ملک کی آزادی کا حصول تھا۔ (۱)

۲۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کا فتوی دارالحرب جس میں انگریزوں کے مظالم اور دست درازیوں کا وضاحت سے ذکر کیا ہے، اس بات کی روشن دلیل ہے کہ سید صاحب انگریزوں کے خلاف اٹھے تھے۔

۳۔ خود سید صاحب کی سابقہ زندگی اور انگریزوں سے جنگ کے لئے امیر خان کی رفاقت، اور پھر امیر خاں کی انگریزوں سے مصالحت کے بعد اس سے جدائی، اور ارادہ

---

(۱) اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سید صاحب انگریزوں سے جہاد کر کے ہندوستان کی سرزمین کو ان کے چنگل سے نجات دلانا چاہتے تھے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ سید صاحب محض جنگ آزادی کے ایک رہنما تھے اور بس، ہرگز نہیں بلکہ درحقیقت سید صاحب احیاء خلافت راشدہ کے لئے اٹھے تھے۔ آپ کا مقصد قانون الٰہی کا نفاذ اور طریقہ محمدی کی اشاعت تھا۔ چونکہ انگریز اس راہ کا روڑا تھے اس لئے سب سے پہلے ان کو راستہ سے ہٹانا آپ ضرور سمجھتے تھے۔ اس لئے سید صاحب نے اس جانب قدم بڑھایا اور پوری تندہی کے ساتھ اس میں لگے رہے۔ اور ہندو راجاؤں اور مسلمان والیان ریاست سب کو اس میں شرکت کی دعوت دی اور باہمی تعاون کی درخواست کی اور ان کی غیرت قومی کو بیدار کیا۔ مگر آپ صرف جنگ آزادی کے ایک قائد نہیں تھے بلکہ آپ کا مقصد بہت عظیم اور آپ کا کام نہایت جامع اور وسیع تھا۔ تحریک آزادی ان کی عظیم تحریک کا ایک حصہ تھی۔ اس میں بھی سید صاحب کے فکر و خیال اور جوش و جذبہ کا جو عالم تھا آپ نے ملاحظہ کیا۔ اس سے سید صاحب کے علو ہمت اور آپ کی تحریک کی وسعت و جامعیت کا کچھ اندازہ کر سکتے ہیں۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نوراللہ مرقدہ نے اس سلسلہ میں جو لکھا ہے ضرور دیکھئے۔ سیرت سید احمد شہید جلد اول صفحہ ۴۱۷-۴۲۲۔

صلح سے باز رکھنے کے لئے سید صاحب کی انتھک کوشش بتاتی ہے کہ سید صاحب نے دراصل انگریزوں سے مقابلہ کے لئے تنظیم جہاد کی تھی۔

۴۔ کئی انگریز مؤرخین اور تجزیہ نگاروں نے صراحت سے لکھا ہے کہ سید صاحب کا جہاد انگریزوں سے تھا۔

ڈاکٹر ولیم ہنٹر لکھتا ہے۔

(حج سے) پہلے جو چیز ان کی نظر میں محض خواب وخیال تھی اب وہ ان کو حقیقی روشنی میں نظر آنے لگی۔ جس میں انھوں نے اپنے آپ کو ہندوستان کے ہر ضلع میں اسلامی جھنڈا گاڑتے اور صلیب کو انگریز کافروں کی لاشوں کے نیچے دفن ہوتے ہوئے دیکھا۔ (۱)

بیلو نے لکھا ہے کہ سید احمد مختلف ہمسایہ مسلم حکومتوں اور لوگوں کو اکسایا کرتا تھا کہ اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جائیں جو اسلامی سلطنت کے دوبارہ قیام کے لئے اور جزیرۂ نمائے ہند کو کفار انگریزوں سے آزاد کرنے کے لئے بلند کیا گیا ہے۔ (۲)

۵۔ جس زمانہ میں سید صاحب مصروف جہاد تھے اس وقت سید صاحب کا طرز عمل جن صاحب فراست اور ذہین آدمیوں نے دیکھا، انھوں نے سید صاحب کے مقاصد کا صحیح اندازہ لگاتے ہوئے سمجھ لیا تھا کہ سکھوں کے استیصال کے بعد سید صاحب کا مقصد ہندوستان کو فتح کر کے انگریزوں کو بے دخل کرنا تھا۔ ایک انگریز سیاح میسن جس نے اس زمانہ میں افغانستان، بلوچستان اور سرحد کی سیاحی کی تھی۔ اس نے سید صاحب کے مقاصد یہ بتائے تھے:

سکھوں کا استیصال اور پنجاب پر قبضہ پھر ہندوستان اور چین پر تسلط (۳)

۶۔ سید صاحب نے ابتداء میں توریہ سے کام لیا۔ ہندوستان کے حالات اس

---

(۱) ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۸۹۔

(۲) ہندوستان میں وہابی تحریک۔ صفحہ ۳۵۴۔ انگریزوں کی مزید شہادتوں کے لئے صفحہ ۳۵۵ بھی ملاحظہ ہو۔

(۳) سید احمد شہید (مہر) اول صفحہ ۲۵۸۔

بات کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ کھل کر انگریزوں سے جنگ کی بات کی جائے۔(۱) ٹیپو سلطان وغیرہ کا انجام ان کے سامنے تھا۔ اس لئے جب غلام ہندوستان کے حدود سے نکل گئے تو چوں کہ انگریزوں سے بظاہر کوئی خطرہ نہیں تھا، اس لئے اب پوری وضاحت کے ساتھ اپنے مقصد کو آشکارا کیا اور اس کی دعوت دی۔ سرحد کے قیام کے دوران جہاں سکھوں سے مقابلہ تھا، سید صاحب نے صراحت سے انگریزی خطرہ سے آگاہ کیا اور ان کے خلاف آواز اٹھائی۔

انگریز بھی اس حقیقت کو سمجھتے تھے۔ چنانچہ کیپٹن گنگھم نے (Gunningham) تاریخ سکھ (A History of the Sikh) میں لکھا ہے کہ سید صاحب کے عمل سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کافروں سے ان کی مراد صرف سکھ تھے، لیکن ان کے صحیح مقاصد پورے طور پر نہیں سمجھے گئے۔(۲) وہ انگریزوں پر حملہ کرنے میں ضرور محتاط تھے۔ لیکن ایک وسیع اور آباد ملک پر ایک دور دراز کی قوم کا اقتدار ان کی مخالفت کے لئے کافی سبب تھا۔(۳)

(۱) اس سے ان سارے واقعات کی بآسانی توجیہ ہوسکتی ہے جن کو بنیاد بنا کر سید صاحب کے خلاف ایک طبقہ نے مخالفت کا طومار باندھا ہے۔ سید صاحب نے سفر حج کے دوران بعض انگریزوں کی دعوت اسی لئے قبول کی تھی کہ انکار شبہ میں ڈال سکتا تھا۔ (واقعہ دیکھئے وقائع احمدی (قلمی) صفحہ ۶۱۴، نیز سیرت سید احمد شہید اول صفحہ ۲۸۰)
نیز بعض معتقدوں نے جو واقعات نقل کئے ہیں اگر وہ صحیح ہوں تو ان کی بھی یہی توجیہ ہوگی۔ مثلاً مولوی محمد جعفر تھانیسری نے جو واقعہ نقل کیا ہے جسمیں سید صاحب نے انگریزوں سے جہاد کے سلسلہ میں ایک سوال کے جواب میں فرمایا تھا کہ کسی کا ملک چھین کر ہم بادشاہت کرنا نہیں چاہتے (سوانح احمدی صفحہ ۷۱)۔ اس موقع پر سید صاحب کے الفاظ بھی قابل غور ہیں، یہ نہیں فرمایا کہ ہم انگریزوں سے جہاد نہیں کریں گے بلکہ اس کے بجائے سکھوں کے مظالم بیان کرکے ان سے جہاد کی وجہ بیان فرمائی اور دنیاوی دولت وعزت سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے بڑی دانشمندی سے سوال کا رخ دوسری طرف پھیر دیا۔

(۲) ڈبلیو ہنٹر نے بھی اسی طرح کے خیال کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے: ۲۲۔۱۸۲۱ء تک سید احمد صاحب کی تبلیغ کی طرف انگریزی حکام نے کوئی توجہ نہ کی۔ انھوں نے اپنے جانثار مریدوں کی ہمراہی میں ہمارے صوبجات کا دورہ کیا اور ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کو مرید بنایا اور ایک باقاعدہ گدی مذہبی ٹیکس اور ملکی حکومت کی قائم کردی۔ اس اثناء میں ہمارے افسران اپنے اردگرد کی بہت بڑی مذہبی تحریک سے بے خبر ہوکر صرف مالیہ جمع کرنے، انصاف کے لئے عدالتیں قائم کرنے اور فوجوں کو پریڈ کرانے ہی میں مصروف رہے۔ ۱۸۳۱ء میں اپنی اس بے خبری سے بری طرح جھنجھوڑے گئے۔ (ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۶۷۔)

(۳) ملاحظہ ہو سیرت احمد شہید طبع اول صفحہ ۳۲۵۔

۷۔ سید صاحب نے خود تو پنجاب کا رخ کیا تھا مگر اپنے ایک مرید خاص تیتو میر (۱) کو بنگال میں چھوڑ دیا تھا، جہاں انگریزوں کا تسلط تھا۔ تیتو میر نے سید صاحب کی حیات ہی میں انگریزوں کے خلاف جہاد شروع کیا تھا۔ اس لئے کہ بنگال کی صورت حال کا یہی تقاضا تھا۔ برخلاف پنجاب کے کہ وہاں حالات دگرگوں تھے۔ اگر اس میں سید صاحب کا اشارہ یا کم سے کم مرضی نہ ہوتی تو تیتو میر ہرگز اس خطرہ کو نہ مول لیتے یا آخری درجہ میں سید صاحب ان کو اس سے ضرور منع کرتے۔ مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کا اصل مقصد انگریزوں کا اخراج تھا۔

۸۔ شاہ اسماعیل شہید جو سید صاحب کے دست و بازو تھے۔ انھوں نے صراحت کی ہے کہ سید صاحب کا مقصد لاہور اور کلکتہ دونوں کی فتح یا بالفاظ دیگر سکھ اور انگریز دونوں سے مقابلہ تھا۔

بعض لوگوں کو وسوسہ پیدا ہوا کہ سید صاحب کی جمعیت بہت کم ہے اور مقابلہ کانٹے کا۔ شاہ اسماعیل شہید نے ان جیسے وسوسوں اور اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے ایک مفصل مکتوب میں حقیقت حال واضح کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ”کس شخص نے آپ کو بتایا کہ امام ہمام اسی قلیل جمعیت سے لاہور اور کلکتہ لینے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ وہ تو رات دن مسلمانوں کی جمعیت بڑھانے اور ان کی شوکت میں اضافہ کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں“۔ (۲)

جو لوگ سید صاحب کے مقاصد جہاد سے آنکھیں موند لیتے ہیں اور اس کو غلط رخ دینے کی کوشش کرتے ہیں وہ اس پر غور کریں کہ شاہ اسماعیل شہید خود کہہ رہے ہیں کہ کلکتہ سید صاحب کے مقاصد جہاد میں تھا۔ ٹھیک ہے لاہور سکھوں کے زیر تسلط تھا لیکن کلکتہ ان سے بہت دور، وہاں سکھ گردی کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی تھی۔ وہ تو خالص انگریز کا مرکز بلکہ ان کا گڑھ تھا۔

اس سے اس روایت کی تردید ہوتی ہے جس کو مولوی محمد جعفر تھانیسری نے نقل کیا

---

(۱) ان کا مستقل ذکر آگے آرہا ہے۔ دیکھیے صفحہ ۴۵۱

(۲) مکتوبات (قلمی) نمبر ۳۵، صفحہ ۸۹۔ و مکاتیب مطبوعہ صفحہ ۷۶، الف

ہے کہ قیام کلکتہ کے زمانہ میں شاہ اسماعیل شہید نے انگریزوں کے خلاف جہاد کے عدم جواز کی بات کی تھی۔(۱) اگر اس روایت کو صحت پر محمول کیا جائے تو اس کی تاویل یہ ہوگی کہ دراصل شاہ صاحب نے توریہ سے کام لیا تھا، اس لئے کہ انگریزوں کے مرکز میں اس وقت ان سے علانیہ جہاد کی بات کرتے تو تحریک دعوت و جہاد وہیں بیٹھ جاتی۔

۹۔مولوی محمد قاسم پانی پتی سید صاحب کے بہت سرگرم رفقاء میں تھے۔(۲) ان کے ایک انگریز میجر ایبٹ سے سوال و جواب سے بھی سید صاحب کے مقاصد جہاد پر روشنی پڑتی ہے۔

میجر ایبٹ (جس کے نام پر پاکستان کا مشہور شہر "ایبٹ آباد" ہے) ۱۸۴۷ء میں جب وہ وہاں آیا تو اس نے مولوی محمد قاسم پانی پتی کو بلا کر چند سوالات کئے۔ اس کا ایک سوال تھا کہ اب آپ کس سے جہاد کریں گے۔ آپ کے دشمن سکھ تو مغلوب ہو چکے ہیں؟ انھوں نے بڑی جرأت و بیباکی کے ساتھ جو جواب دیا اس کا ماحصل یہ ہے کہ سکھ مغلوب ہو گئے تو کیا جہاد ختم ہوگا؟ ہمارا جہاد اب آپ سے ہے۔ چنانچہ اس کی پاداش میں ان کو نظر بند کیا گیا۔(۳)

۱۰۔سید صاحب کے بعض نیاز مندوں کی آپسی گفتگو سے بھی مقصد اصلی پر روشنی پڑتی ہے۔ اس قسم کے دو واقعات ملاحظہ ہوں:

سید صاحب کے ایک خلیفہ سید قطب علی نقوی (۴) ساکن مجھوا میر (ضلع بستی، یو پی) تھے ان کے فرزند مولانا سید جعفر علی نقوی (۵) (صاحب منظورۃ السعداء) سید صاحب کے منشی خانے میں کام کرتے تھے۔ جنگ بالاکوٹ کے بعد وطن واپس آئے تو ایک روز سید قطب علی نے اپنے فرزند سے کہا:

اب مجھے موت سے کوئی خوف نہیں، زندہ رہوں یا مروں۔ آرزو تھی کہ

(۱) سوانح احمدی صفحہ ۵۷۔
(۲) ان کے کارنامۂ جہاد کے لئے دیکھئے صفحہ ۳۶۷
(۳) رائیداد مجاہدین ہند صفحہ ۲۴۹-۲۵۰۔
(۴) آپ مولانا سید مرتضیٰ مظاہری (سابق ناظر کتب خانہ علامہ شبلی ندوۃ العلماء لکھنؤ) اور مولانا ڈاکٹر سیّد محمد اجتباء ندوی کے سکڑ دادا تھے۔ حالات کے لئے دیکھئے جماعت مجاہدین صفحہ ۱۹۳-۱۹۴۔
(۵) ان کے لئے دیکھئے جماعت مجاہدین صفحہ ۱۹۴-۲۱۳۔ نیز کاروان ایمان وعزیمت صفحہ ۸۹-۹۱۔

اللہ تعالیٰ سید صاحب کے ذریعے سے اس سرزمین (ہندوستان) کو کفار نگونسار سے پاک کر کے اسلام کی شان وشوکت دکھائے۔ اب وہ دنیا میں باقی نہ رہے تو مجھے بھی زندگی کی کوئی تمنا نہیں (۱)

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ مولانا سید جعفر علی جہاد کے لئے جاتے ہوئے شیخ غلام علی الہ آبادی (۲) سے ملے تو انھوں نے فرمایا:

اکنوں نظر ما بر فتح لشکر اسلام است وبس، واصلاح معاش ما موقوف برآں (۳)	اب ہماری نظر لشکر اسلام (سید صاحب کے لشکر) کی فتح پر جمی ہوئی ہے اور ہماری معاش کی اصلاح بھی اسی پر موقوف ہے۔

اس کو نقل کر کے مہر صاحب لکھتے ہیں:

الہ آباد اور مجھوا میر کے نیاز مندوں کی تمنائیں تنہا سکھوں کی شکست سے پوری نہ ہوسکتی تھیں، جن کی حکومت دریائے ستلج پر پہنچ کر ختم ہو جاتی تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ تمام نیاز مندوں کو یقین تھا کہ سید صاحب پورے ہندوستان کے استخلاص کیلئے کھڑے ہوئے ہیں اور انگریزوں سے جنگ سید صاحب کے مقاصد میں داخل ہے۔ (۴)

۱۱۔ اس سلسلہ کی ایک اور شہادت مشہور شاعر حکیم مومن خان مومن دہلوی کا فارسی قصیدہ ہے۔ ان کے ایک نعتیہ قصیدے میں دعائیہ اشعار ہیں جو اس حقیقت کا مزید ثبوت پیش کر رہے ہیں کہ سید صاحب اور ان کے تمام نیاز مندوں کے نزدیک تطہیر ہند

---

(۱) منظورۃ السعداء (قلمی) صفحہ ۱۲۳۹۔ مخزونۂ کتب خانہ علامہ شبلی ندوۃ العلماء لکھنؤ

(۲) سید صاحب کے خاص ارادت مند تھے۔ بڑے رئیس تھے۔ سید صاحب سفر حج میں الہ آباد سے گزرے تو انھوں نے پورے قافلہ کی دعوت کی تھی۔ سید صاحب کے ایسے عاشق اور مخلص تھے کہ صاحب وقائع احمدی لکھتے ہیں کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ایسے معتقد صادق اور مخلص بے ریا اور محب باوفا تھے کہ میں نے تو آج تک کسی کو نہیں دیکھا۔ (صفحہ ۶۳۳۔ تفصیل کے لئے دیکھئے تصنیف مذکور، صفحہ ۶۳۳ - ۶۳۹) نیز ان کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو جماعت مجاہدین صفحہ ۶۶۳۔ ۶۶۵، وکاروان ایمان وعزیمت صفحہ ۱۰۸۔ ۱۰۹۔

(۳) منظورۃ السعداء (قلمی) صفحہ ۱۲۵۹۔

(۴) سید احمد شہید اول صفحہ ۲۵۶۔ ۲۵۷۔

کے سلسلہ میں مرکزی حیثیت انگریزوں ہی کو حاصل تھی۔مومن سید صاحب کے مخلص مرید تھے۔فرماتے ہیں :

ایں عیسویاں بہ لب رسانند جان من وجان آفرینش
گلزار کہ پائمال گردیم زاں سیم سران آفرینش
نکوشد گرہ زکار وفرسود ناخن کہ بنان آفرینش
تاچند بہ خواب ناز باشی فارغ زفغاں آفرینش
مومن شدہ ہم زبان عرفی از بہر امان آفرینش
برخیز کہ شور کفر برخاست
اے فتنہ نشان آفرینش(۱)

یعنی ان عیسائیوں (انگریزوں) نے میری اور مخلوق خدا کی جان لبوں تک پہنچادی ہے اور جینا دوبھر کردیا ہے۔ان سفید فاموں کے شر اور فتنہ سے ہمیں ہلاک ہونے نہ دیجئے۔ناخن گھس چکے ہیں مگر ابھی گرہ نہیں کھلی۔کب تک خلقت کی آہ وفغاں پہ کان نہیں دھریں گے۔پھر اپنے بارے میں کہتے ہیں کہ مخلوق کے امن وامان کی خاطر مومن،عرفی کا ہم زباں ہوکر یہ اعلان کررہا ہے کہ اے فتنہ کے شکار لوگوں اٹھو کہ کفر کا غلغلہ بلند ہورہا ہے۔

۱۲۔مولانا ابوالحسن حسن بن مولانا مفتی الٰہی بخش کاندھلوی جو سید صاحب کے بڑے معتقدین میں سے تھے۔اور جنکے والد سید صاحب کے خلیفہ تھے۔انکے ایک قصیدہ سے بھی مقصد جہاد کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے،جس میں وہ ذکر کرتے ہیں کہ عیسائی مشنریاں برسرِعام دعوت کفر والحاد دے رہی ہیں اسلئے اب جہاد فرض ہوگیا ہے۔کہتے ہیں :

فرض شد برہمہ جہاد کنوں کہ زحد شد بروں فساد کنوں
کافراں را ببیں تو دربازار دعوت کفر مے کنند اظہار
بہر سامان او شتاب کنید عزدیں گر درون دل دارید(۲)

(۱) دیوان فارسی ازمومن خان مومن صفحہ ۲۰۔۲۱۔مطبوعہ مطبع سلطانی لال قلعہ دہلی ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۴ء)
(۲) رسالہ جہادیہ مشمولہ جماعت مجاہدین،صفحہ ۲۹۹۔

مطلب یہ ہے کہ اس وقت جہاد سب پر فرض ہو گیا ہے کیوں کہ فتنہ وفساد حد سے آگے بڑھ چکا ہے۔

کافروں کو برسر بازار دیکھو کہ کس طرح علانیہ کفر کی دعوت دے رہے ہیں اگر دین کی کوئی عزت ووقعت دل میں ہے تو اٹھو، اس کے لئے جلدی کرو۔

۱۳۔ حضرت مولانا ابوالحسن حسنؔ کاندھلوی ہی نے سید صاحب کی حج سے واپسی پر تہنیت میں ایک قصیدہ پیش کیا تھا۔ اگر چہ یہ قصیدہ شعری محاسن کا پوری طرح حامل نہیں مگر اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں بعض اشعار ایسے آئے ہیں جن سے سید صاحب کے مقصد جہاد پر روشنی پڑتی ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب سرزمین ہند کی حیثیت تبدیل کرنے اور دارالحرب سے دوبارہ دارالاسلام میں منتقل کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کا ابتدا ہی سے یہ مقصد تھا۔ علاوہ ازیں سید صاحب کے مریدین ومسترشدین آپ کے اس عزم سے واقف تھے۔ حسنؔ کہتے ہیں :

ہوں تری تیغ سے سب لشکر کفار خراب
لائیں اسلام ترے ہاتھ پر عاجز ہوکر
ہند ہوجا تری امداد سے دارالاسلام
نہ رہے نام کو کافر کا کوئی یہاں سے گھر
قتلی قتلی ہوں بدن ایسی لگیں تلواریں
ٹکڑے ٹکڑے ہوں جگر پار ہوں ان سے خنجر (۱)

۱۴۔ امروہہ کے مشہور بزرگ شاہ محمد امین غازی جو حضرت سید احمد شہید کے زمرۂ مجاہدین میں شامل تھے۔ ان کی ایک مثنوی جس میں انہوں نے اپنے اکلوتے بیٹے روح الامین کے لئے انگریزوں سے جہاد کی دعا مانگی ہے۔ اس سے بھی واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کے جہاد کا اصل مقصد ہندوستان سے انگریزوں کا انخلاء تھا۔

(۱) بیاض مولانا ابوالحسن حسنؔ کاندھلوی ورق ۱۱۴، ب (قلمی) مملوکہ مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی۔ نیز دیکھئے مجموعہ قصائد صفحہ ۷۔ اس مجموعہ قصائد کا تعارف مولانا ابوالحسن کاندھلوی کے حالات میں گزر چکا ہے۔ دیکھئے صفحہ ۲۸۱

چناں خواہم آں پاک پروردگار
کہ روح الامیں رائنی بختیار
مجاہد چنانش کن اندر غزا
کزو تا رسد بر نصاری سزا(۱)

۱۵۔سید صاحب کے جہاد کے انگریزوں کے خلاف ہونے کا ایک واضح ثبوت یہ بھی ہے کہ خود سید صاحب نے ایک دفعہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کو خط لکھا کہ انگریزوں کے مقابلہ میں ہمارا ساتھ دے۔ خط کا مضمون یہ تھا :

> ہم لوگ نہ تیرے ملک و مال کے طالب ہیں نہ تیری جان اور عزت کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ نہ لڑنے کے خواہاں ہیں۔ صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہمارا ساتھ دے اور ہمارا رفیق بن جا۔ دشمنوں کے خلاف جہاد کر کے ہم ملک تیرے حوالے کر دیں گے۔ اگر یہ دعوت منظور نہ کی تو لڑائی کے سوا چارہ نہ رہے گا۔(۲)

ہر صاحب نظر سمجھ سکتا ہے کہ انگریز کے سوا وہ کون دشمن ہو سکتا ہے جس کے خلاف جہاد میں تعاون کی سید صاحب رنجیت سنگھ سے اپیل کر رہے ہیں۔ رنجیت سنگھ سہا ہوا تھا انگریزوں سے مقابلہ کی اس میں تاب نہیں تھی۔ یہ خط سن کر اس نے جو کہا اس سے اس پر روشنی پڑتی ہے۔ اس نے کہا کہ ایسا صاحب ارادہ اور صاحب ہمت و جرأت ہم نے اپنے زمانے میں نہ کسی کو دیکھا نہ سنا۔

۱۶۔سید صاحب کی تحریک جہاد انگریزوں کے خلاف نہ ہوتی تو لوگ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمتیں چھوڑ چھوڑ کر ان کے ساتھ کیوں شامل ہو جاتے۔ مٹکاف نے لکھا ہے کہ دہلی میں یہ شوق جہاد اتنا بڑھ گیا تھا کہ بہت سے لوگوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجی اور شہری ملازمتوں سے استعفیٰ دے دیا۔ اور اپنے گھروں سے سر بکف نکل کھڑے ہوئے۔(۳)

---

(۱) شاہ محمد امین غازی کے جذبہ حریت کا مستقل بیان آگے آ رہا ہے اشعار کا ترجمہ وہیں ملاحظہ ہو دیکھیے صفحہ ۴۰۵
(۲) سرگزشت مجاہدین صفحہ ۱۳۰۔
(۳) ملاحظہ ہو مومن شخصیت اور فن مرتبہ ظہیر احمد صدیقی، از مقدمہ خواجہ احمد فاروقی صفحہ ۲۳۔

اور ہنٹر نے ذکر کیا ہے کہ مسلمان ملازمین اپنے مذہبی فریضہ کی ادائیگی کے بہانے چھٹی لے کر سید صاحب کی فوج میں شامل ہونے کے لئے سرحد پار جاتے تھے۔(۱)

۱۷۔سید صاحب کے جہاد کے انگریزوں کے خلاف ہونے کی ایک کھلی دلیل یہ بھی ہے کہ سید صاحب کی تعلیمات سے متاثر ہو کر خاص و عام نے مختلف جگہوں پر انگریزوں کے خلاف بغاوت کی تھی۔جیسے حیدر آباد میں مبارز الدولہ کی بغاوت (۲) اسی طرح اعظم گڈھ کے انصاریوں کی بغاوت کا حال ہے۔ E.N.KAMAROV نے ایک برطانی افسر کی رپورٹ کا ذکر کیا ہے جس میں اس نے اعظم گڈھ کے نور بافوں کے متعلق لکھا ہے کہ وہ سید احمد شہیدؒ کی تحریک سے متاثر ہو کر آمادۂ بغاوت ہوگئے ہیں۔(۳)

۱۸۔اس سلسلہ میں سید صاحب کی اہلیہ محترمہ کی شہادت بھی کافی اہمیت رکھتی ہے۔مولوی سید نصیر الدین دہلوی کے سندھ پہنچنے (۴) کے بعد سید صاحب کی اہلیہ محترمہ نے تمام مسلمانوں کے نام ایک مفصل اعلام نامہ جاری کیا تھا۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں کی عملداری کی وجہ سے وہ ہندوستان کو دار الحرب سمجھتی تھیں اور اسی بنیاد پر وہاں سے ہجرت ضروری قرار دیتی تھیں۔تحریر فرماتی ہیں افسوس کہ مسلمان اپنی تن آسانی کے باعث اپنی عمریں اسی سرزمین میں ضائع کر رہے ہیں جس پر غیر مسلم مسلط ہیں۔(۵)

۱۹۔سید صاحب کے جہاد کے انگریزوں کے خلاف ہونے کا ایک واضح ثبوت یہ بھی ہے کہ سید صاحب اہل و عیال کو ساتھ لے کر رائے بریلی سے نکلے تھے کہ انگریزوں

---

(۱) ہمارے ہندوستانی مسلمان، صفحہ ۳۳۔
مولانا کرامت علی جونپوری لکھتے ہیں کہ سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت جہاد کرنا اس وقت ضروریات دین میں داخل ہوگیا تھا۔اس وجہ سے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ان سے بیعت کرنے کی لوگوں کو ترغیب دلاتے تھے۔(تزکیۃ العقائد، مشمولہ ذخیرہ کرامت حصہ اول صفحہ ۷۲۔از مطبع مجیدی کانپور۔)

(۲) تفصیل آگے آرہی ہے۔ملاحظہ ہو صفحہ ۴۶۴ - ۴۷۵۔

(۳) پروفیسر خلیق احمد نظامی: حضرت سید احمد شہید اور ان کی تحریک اصلاح و جہاد صفحہ ۲۸۔

(۴) تفصیل کے لئے دیکھئے صفحہ ۳۶۴۔

(۵) سرگزشت مجاہدین، صفحہ ۱۷۶۔

کی عمل داری میں رہنا جائز نہیں۔ جب تک ان کے ناپاک تسلط سے ملک پاک نہ ہو جائے واپسی کو سوچ بھی نہ سکیں۔ اس لئے آخری وقت میں ان کے بارے میں بار بار تاکید کی تھی کہ ہم اس راستہ میں کام آجائیں تو یہ ہندوستان واپس نہ جائیں بلکہ حرمین شریفین کا رخ کریں۔ چوں کہ اہل وعیال کو سندھ پہنچانے کی وصیت کی تھی اس لئے سندھ کے پیر صبغۃ اللہ شاہ راشدی اور امیران سندھ وغیرہ سب کو تاکیدی خطوط لکھے تھے کہ ان کے حرمین پہنچانے کا انتظام کرنا۔ (۱)

نیز دونوں بیویوں کو الگ الگ خط لکھے تھے کہ ہمارا پیمانہ عمر اسی میں لبریز ہو جائے تو حرمین کا رخ کرنا کسی اور ملک میں توطن اختیار نہ کرنا۔ (۲)

۲۰۔ بعض اہل اللہ اور صاحب کشف بزرگوں پر اللہ تعالیٰ نے حضرت سید صاحب کی پیدائش سے پہلے ہی منکشف کر دیا تھا کہ رائے بریلی میں ایک سید احمد پیدا ہوں گے۔ ان کے ذریعہ ہندوستان میں دین اسلام کو تقویت ملے گی اور انگریزی اقتدار کا خاتمہ ہو جائے گا۔

ایک دن سید صاحب نے رائے بریلی میں مولوی محمد یوسف (غالباً خواہر زادہ) سے فرمایا تھا کہ میری پیدائش سے قبل اللہ نے چار شخص پیدا کیے ہیں وہ چاروں صاحب خدمت ہیں (۳) ایک دکن میں، دوسرا ولایت (۴) میں، تیسرا ہندوستان میں، اور چوتھا میرے ہمراہ۔

دین محمد خادم خاص سید صاحب نے ان سب کا حال تفصیل سے بیان کرنے کے بعد دکن کے ایک سپاہی کے حوالہ سے سید صاحب کے متعلق دکن کے ان بزرگ کی پیش

---

(۱) منظورۃ السعداء (قلمی) صفحہ ۱۰۵۱۔۱۰۵۲۔
(۲) ایضاً صفحہ ۱۰۵۲۔
(۳) تصوف کی اصطلاح میں ان اولیاء اللہ کو صاحب خدمت کہتے ہیں جو باذن حق تعالیٰ تکوین میں تصرف کرتے ہیں (ان امور میں جو باری تعالیٰ کے خواص میں سے نہ ہو) ایسے حضرات کو قطب التکوین بھی کہتے ہیں۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے حضرت موسیٰ وخضر کے واقعہ سے اس امر پر استدلال کیا ہے۔
(۴) انگریزی دور سے پہلے اور اس کے آغاز میں ولایت سے مراد افغانستان کا علاقہ ہوتا تھا۔ انگریزوں کے آخری دور میں ولایت سے انگلستان مراد لیا جانے لگا۔

گوئیاں بیان کی ہیں۔ان میں سے ایک یہ ہے کہ لاکھوں آدمی ان کے دست مبارک پر بیعت کریں گے اور ہدایت پائیں گے اور ان کے ذریعہ ہندوستان میں دین اسلام کی ترقی ہوگی اور اللہ تعالیٰ ان کے طفیل سے نصاریٰ (۱) کو بھی تباہ کرے گا۔(۲)

۲۱۔سید صاحب کی شہادت پر انگریزوں نے جو خوشی منائی، اس کو دیکھتے ہوئے انکار کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ سید صاحب کا جہاد انگریزوں سے تھا۔

حکومت ہند نے اپنے پولٹیکل اسسٹنٹ کو حکم دیا کہ گورنر جنرل کی طرف سے مہاراجہ رنجیت سنگھ کو اس فتنے کی آگ ٹھنڈی ہونے پر مبارک باد پیش کرے جو اس شخص (سید احمد) نے بھڑکا رکھی تھی۔(۳)

۲۲۔سید صاحب کے انگریزوں کے خلاف کھڑے ہونے کی ایک کھلی شہادت آپ کے جانشینوں کا طرز عمل ہے۔جیسے ہی سکھوں نے انگریزوں سے صلح کرلی تو مجاہدین کی ساری توجہ انگریزوں کی طرف مرکوز ہوگئی۔مجاہدین نے اس سلسلہ میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے اس کی بڑی تفصیل ہے۔(۴) ان کا ذکر آگے مستقل باب کے تحت آرہا ہے۔یہاں تک کہ بعض انگریزوں کے بقول اٹھارہ سو ستاون کی جنگ عظیم میں بھی سید صاحب کی تحریک کی چنگاریاں کام کررہی تھیں۔

---

(۱) اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان نصاریٰ کے تسلط سے اہل اللہ اور علماء کس طرح گھٹن محسوس کرتے تھے۔

(۲) وقائع احمدی (قلمی) صفحہ ۲۲۱۔

(۳) ملاحظہ ہو ہندوستان میں وہابی تحریک، صفحہ ۱۰۹۔۱۱۰۔

(۴) سب سے پہلے مولانا مسعود عالم ندوی نے اس پر قلم اٹھایا اور ایک مختصر کتاب ''ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک'' کے نام سے لکھی۔پھر مولانا غلام رسول نے بڑی تحقیق کے ساتھ ''سرگزشت مجاہدین'' کے نام سے مفصل روداد قلم بند کی۔اخیر میں ڈاکٹر قیام الدین نے اپنی کتاب Wahabi Movement in India میں مزید حقائق فراہم کئے۔

چوتھی فصل

سکھوں کے خلاف جہاد کے اسباب

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے اور جس کی سید صاحب کے مکتوبات پر نظر ہے اس کے لئے اس بات کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ سید صاحب نے جس درجہ خطرناک رنگ میں انگریزوں کو پیش کیا ہے کسی اور دشمن کو نہیں۔ وہ انگریزوں ہی کو اصل خطرہ سمجھتے تھے اور انھیں سے دراصل مقابلہ اور ملک کی آزادی چاہتے تھے۔ مگر اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سید صاحب نے انگریزوں سے عملی جہاد کیوں شروع نہیں کیا اور بجائے ان کے سکھوں کی طرف پھر گئے اور ان سے جہاد کیا۔ اس کے مختلف اسباب ہیں۔

۱۔ جب سے اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے دور اقتدار میں سکھوں کے نویں گرو تیغ بہادر کو قتل وقزاقی کے الزام میں تہ تیغ کیا تھا، اس وقت سے سکھ مسلمانوں کے خلاف کمر بستہ ہوگئے تھے۔ وہ ان کی عداوت ودشمنی میں جل مرتے تھے۔ جذبہ انتقام سے دانت چبائے رہتے تھے۔ ہر وقت اسی سوچ میں اور ہر لمحہ اسی تدبیر میں رہتے تھے۔ مگر ان کا کوئی اقتدار نہیں تھا، گھٹ گھٹ کر مرتے تھے، کر کچھ نہیں سکتے تھے۔ ایسے میں رنجیت سنگھ کو پنجاب میں کچھ تسلط حاصل ہوا تو اس نے وہاں کے مسلمانوں کی زندگی اجیرن کردی۔ ان کا جینا دوبھر کردیا۔ ہر طرح کا ظلم روا رکھا گیا۔ اذان بند تھی۔ ذبیحہ گاؤ ممنوع تھا۔ مساجد کی بے حرمتی ہو رہی تھی۔ ان میں جانور بندھے رہتے تھے۔ مقابر ومزارات کا بھی برا حال تھا۔ سکھوں کی بھیڑ بلا خوف وخطر مسلم قصبات ودیہات کو لوٹتی، جلاتی اور تباہ کرتی چلی جاتی تھی۔ اگر چہ انگریزوں کی کارستانیاں بھی کچھ کم خطرناک نہیں تھیں اور سید صاحب کو ان کا پورا احساس وادراک تھا۔ مگر سکھوں نے جو اودھم مچا رکھا تھا کوئی صاحب ایمان اس سے آنکھیں نہیں موندھ سکتا

تھا۔ ان کو نظر انداز کر کے کسی اور سے الجھنے کی اسلام بظاہر اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ (۱)

اسی وجہ سے پنجاب کے علاقے سے بڑی تعداد میں مسلمان نقل مکانی پر مجبور ہوئے۔ (۲) ان کے ظلم کا دائرہ پنجاب سے نکل کر سرحد اور بلوچستان تک پہنچ گیا۔ حتیٰ کہ حاکم بلوچستان میر نصیر خان نے علماء سے سکھوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ حاصل کر کے احمد شاہ ابدالی سے پنجاب پر حملہ کی درخواست کی تھی۔ (۳) اس لئے طبعاً عقلاً شرعاً ہر طرح صورت حال کا تقاضا تھا کہ پہلے سکھوں سے نمٹا جائے۔

۲۔ سکھ اس وقت اگرچہ بظاہر ایک آزاد طاقت تھے، مگر دراصل وہ انگریزوں کے ماتحت اور ان سے بے حد مرعوب تھے۔ چنانچہ ۱۲۲۱ھ (مطابق ۱۸۰۶ء) میں جب نواب امیر خاں اور ہلکر انگریزوں کے خلاف رنجیت سنگھ سے مدد حاصل کرنے کے لئے پنجاب گئے تھے تو انھیں مایوسی کے ساتھ لوٹنا پڑا تھا۔ اس لئے کہ رنجیت سنگھ نے صاف

(۱) مسلمانوں پر سکھوں کی زیادتیوں کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو سیرت احمد شہید حصہ اول صفحہ ۴۲۷۔۴۳۴، سید احمد شہید حصہ اول صفحہ ۳۳۰۔۳۳۸، ومقدمہ مکاتیب سید احمد شہید از ایوب قادری صفحہ ۲۳۔تا صفحہ ۲۶۔ نیز بلوچستان تاریخ کی روشنی میں صفحہ ۵۱۰ وبعد

(۲) تذکرہ وتراجم کی کتابوں کے مطالعہ کے دوران اس فہرست میں بعض مشہور علماء ومشائخ بھی نظر آتے ہیں مثلاً شاہ غلام علی مجددی دہلوی خلیفہ مرزا مظہر جان جاناں، مفتی شرف الدین رامپوری۔ مولانا مراد اللہ تھانیسری وغیرہ

(۱) بلوچستان تاریخ کی روشنی میں صفحہ ۵۱۲۔ پھر احمد شاہ نے میر نصیر خاں کی تائید اور معاونت سے سکھوں کے خلاف کئی حملے کئے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے کتاب مذکور صفحہ ۵۱۲ تا ۵۲۳۔

احمد شاہ ابدالی بڑا باضمیر اور صاحب غیرت مسلمان تھا۔ سکھوں کی اسلام دشمنی کی وجہ سے ان کے خلاف بہت سخت تھا۔ اس نے میر نصیر خاں کو ان کے خلاف آمادہ جہاد کرتے ہوئے جو فرمان بھیجا تھا اس کا حرف حرف اس کی غیرت ایمانی کا بین ثبوت ہے۔ لکھتا ہے:

"ان ملعون کتوں اور بدکردار کافروں نے مسلمانوں پر غلبہ پا کر ملتان اور ڈیرہ جات کے علاقوں تک کو تاخت وتاراج کر دیا ہے۔ انہوں نے مسجدیں گرادی ہیں، مسلمانوں کو قیدی بنالیا ہے۔ ان حالات میں آپ کیوں کر حج کے لئے مکہ مبارک جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس ذلیل فرقہ نے یہاں اودھم مچا رکھا ہے۔ آپ اس طرف سے اپنا لشکر لے کر چل پڑیں اور میں اس طرف سے اپنی فوج لے کر روانہ ہو جاتا ہوں تاکہ ہم دونوں مل کر ان کافروں کی بیخ کنی کریں۔ ان بت پرستوں کے خلاف جہاد حج پر فوقیت رکھتا ہے۔ میں تجھ کو اپنا بیٹا خیال کرتا ہوں اور تم بحیثیت مسلمان میرے بھائی ہو۔ فوراً نکل پڑو تاکہ ہم ان منکرین حق کو تباہ وبرباد کر کے ان کی عورتوں کو باندی اور ان کے بچوں کو بندی بنالیں۔" کتاب مذکور صفحہ ۵۱۱۔

معذرت کر دی تھی کہ اس معاملہ میں مجھ سے کچھ نہیں ہو سکتا میں انگریزوں سے صلح کر چکا ہوں۔(۱) اس لئے انگریزوں سے مقابلہ سے پہلے سکھوں کی اس ابھرتی ہوئی طاقت کو ٹھانے لگانا ضروری تھا۔ ورنہ بعد میں ان کی طرف سے خطرہ پیش آ سکتا تھا۔

۳۔ سکھ اور انگریز دونوں مسلمانوں کے دشمن تھے اور دونوں سے اسلامی سلطنت کو خطرات کا سامنا تھا۔ مگر سکھوں کا علاقہ محدود اور وہ عددی لحاظ سے کم تھے۔ اس کے برخلاف انگریز ہندوستان بھر پر قابض اور زیادہ وسائل کے مالک اور طاقت ور تھے۔ اسلئے ہر عقل مند کے نزدیک پہلے سکھوں سے نمٹنا ضروری تھا۔

۴۔ سید صاحب مختلف اسباب کی بناء پر (جنکی تفصیل آگے آ رہی ہے) چونکہ سرحد کو مرکز بنانا چاہتے تھے، اور سرحد سکھوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ سکھوں کا وقتاً فوقتاً اس سمت میں آنا وہاں کے باشندوں کے لئے بلائے جان بنا ہوا تھا۔ سکھوں

---

(۱) امیر نامہ صفحہ ۳۵۳۔ مارشمین نے ذکر کیا ہے کہ رنجیت سنگھ اور انگریزوں کے درمیان ۲۵ / اپریل ۱۸۰۸ء کو ایک معاہدہ پر دستخط ہوئے تھے۔ (تاریخ ہند عہد برطانیہ صفحہ ۲۷۷)

نیز منشی شام لعل دہلوی عاصی نے اس معاہدہ کو بجنسہ نقل کیا ہے جو ۱۲ / نومبر ۱۸۱۷ء کو انگریزوں اور رنجیت سنگھ کے درمیان ہوا تھا۔ یہ معاہدہ فارسی میں ہے اور پانچ دفعات پر مشتمل ہے۔

دفعہ ا۔ میں ہے کہ رنجیت سنگھ انگریزوں سے اتحاد کر کے اقرار کرتا ہے کہ وہ انگریزوں کے دوست و دشمن کو اپنا دوست و دشمن تصور کرے گا۔ ان کے دشمن کے ساتھ لڑے گا اور ان کو انگریزوں کے حوالے کرنے کی کوشش کرے گا۔

اور ایک دفعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ رنجیت سنگھ کے علاقہ پر اگر کوئی حملہ کرے گا تو انگریز اس کی مزاحمت کریں گے۔ رنجیت سنگھ انگریزوں کی صلاح کا پابند ہوگا۔ اور ان کے مشورہ کے مطابق عمل کرے گا۔ (تاریخ بوندیلکھنڈ حصہ سوم ضمیمہ نمبر ۴، صفحہ ۱۳)

اس پس منظر میں اگر انگریزوں نے سید صاحب کی مزاحمت نہیں کی تو صرف اس وجہ سے کہ ان کو سید صاحب سے زیادہ رنجیت سنگھ سے خطرہ تھا۔ وہ رنجیت سنگھ کو زیادہ طاقت ور سمجھتے تھے۔ اس لئے ایک طرف معاہدہ کی رو سے دوستی کا دم بھی بھرتے تھے تو دوسری طرف اس پر حملہ کو چپ چاپ برداشت کر رہے تھے بلکہ اس پر خوش تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح بہر حال رنجیت سنگھ کی طاقت کمزور ہوگی جس کا لازمی فائدہ ان کو ہوگا۔ اس لئے ان حالات میں اگر وہ سید صاحب کو مدد پہنچائیں تو کوئی تعجب یا اشکال نہیں بلکہ عین مصلحت اس میں معلوم ہوتی ہے۔ (اس لئے کہ ان کی غرض سید صاحب کا ہاتھ مضبوط کرنا نہیں تھا بلکہ رنجیت سنگھ کو نقصان پہنچانا ان کے پیش نظر تھا) اور ایسا ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے کہ انسان اپنے طاقت ور دشمن کے مقابلہ میں کمزور دشمن کا ساتھ دیتا ہے۔ اگرچہ اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ انگریزوں نے سید صاحب کو فوجی مدد پہنچائی ہو۔

نے وہاں کے مسلمانوں کی حالت بہت خستہ کر دی تھی۔ اس لئے یہ طبعی بات تھی کہ وہاں کے مسلمان اسی وقت سید صاحب کا ساتھ دے سکتے تھے جب ان کو سکھوں کے مظالم سے نجات دی جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ سکھوں سے تصادم محض ہنگامی حالات کا تقاضا تھا۔ مقصود اصلی نہیں تھا۔ حضرت مولانا علی میاں صاحب نے کتنا صحیح تجزیہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

"اگر یہ حالات کی بناء پر اس کا رخ ابتداء میں سکھوں کی طرف تھا۔ لیکن اس کے پورے پروگرام کا علم صرف جماعت کے مخصوص لوگوں کو تھا۔ جو اسلامی غیرت و فراست ایک صوبہ میں غیر اسلامی اقتدار گوارا نہ کر سکی، وہ اس کو پورے ملک میں کس طرح گوارا کر سکتی تھی۔ لیکن ہر صاحب بصیرت کہے گا کہ واقعات و اقدامات کی یہی طبعی اور مناسب ترتیب تھی جو ظہور میں آئی۔ (۱)

مولانا مہر تحریر فرماتے ہیں :

پنجاب میں سکھوں کی تعدیوں کے متعلق جو کچھ بیان کیا گیا ہے۔ وہ فی الجملہ درست ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر یہ ظلم نہ ہوتے تو کیا سید صاحب اپنی پیش کردہ اصل کی بناء پر سکھ حکومت سے تعاون کر لیتے۔ جب کہ وہ بلاد اسلامیہ پر غیر مسلموں کے تسلط ہی کو موجب جہاد مانتے تھے اور اس میں کوتاہی کو اثم و معصیت سے تعبیر کرتے تھے؟ نیز کیا وہ بلاد اسلامیہ پر انگریزوں کے قبضے کو گوارا کر سکتے تھے۔ ان سوالوں کا جواب قطعی طور پر نفی میں ہے۔ پھر یہ خیال کہاں سے پیدا ہوا کہ سید صاحب صرف سکھوں سے لڑنا چاہتے تھے۔ (۲)

سب سے پہلے سر سید احمد خان مرحوم نے سید صاحب کے جہاد کا رخ انگریزوں سے ہٹا کر سکھوں کی طرف پھیرا۔ (۳)

پھر مولوی محمد جعفر تھانیسری نے اپنی کتاب "سوانح احمدی" میں اسے خوب پھیلا

---

(۱) سیرت سید احمد شہید طبع اول صفحہ ۳۲۴-۳۲۵

(۲) سید احمد شہید اول صفحہ ۲۵۲۔

(۳) اس وقت جب ولیم ہنٹر کی کتاب ہمارے ہندوستانی مسلمان شائع ہوئی اس کے جواب میں سر سید نے ایک سلسلہ مضامین شروع کیا تھا۔ (ملاحظہ ہو سید احمد شہید صفحہ ۲۵۲-۲۵۳)

کر پیش کیا۔ اس کو ثابت کرنے کے لئے مکتوبات کی اصل عبارتوں میں تحریف تک کردی۔(۱)

پھر مرزا حیرت دہلوی کی ''حیات طیبہ'' نے اس افسانہ کو اور ہوا دی۔(۲)

---

(۱) حیرت ہوتی ہے کہ مولوی محمد جعفر تھانیسری سے یہ غلطی کیسے سرزد ہوئی۔ وہ سید صاحب کے خاص معتقدین میں سے تھے۔ اس تحریک سے وابستگی کے باعث ان پر طویل مقدمہ چلا، پھانسی کی سزا تجویز ہوئی، جسے انھوں نے ہنسی خوشی برداشت کیا، پھر یہ سزا حبس دوام بعبور دریائے شور میں تبدیل ہوئی، جہاں انھوں نے اٹھارہ سال گزارے، تو انھوں نے اس کی خاطر جو قربانیاں دیں اور جو مصیبتیں جھیلیں ہیں ان کے سامنے ہر شخص کی گردن احتراماً جھک جاتی ہے۔ مگر اس حقیقت سے انکار نہیں ہوسکتا کہ سید صاحب کے نصب العین کو سمجھنے میں ان سے سخت لغزش ہوئی۔ یہاں تک کہ اس کی توثیق کے لئے انھوں نے اصل عبارتوں تک کو بدلا۔ مولانا غلام رسول مہر نے سید صاحب کی اصل عبارتوں اور سوانح احمدی کی محرف شدہ عبارتوں سے مقابلہ کرکے دکھایا ہے۔ (ملاحظہ ہو سید احمد شہید حصہ اول صفحہ ۲۵۹۔۲۶۱)

ہم مولوی محمد جعفر کی طرف سے دفاع میں کہہ سکتے ہیں کہ جس وقت انھوں نے یہ کتاب لکھی سید صاحب کی جماعت مورد عتاب بنی ہوئی تھی۔ اور سب سے زیادہ شک کی نظر سے دیکھی جاتی تھی اس کی وجہ سے عموماً مسلمان مصائب و آلام کا شکار بنے ہوئے تھے۔ اس لئے انھوں نے صلح بین الفئتین کی خاطر اپنے فعل کو جائز سمجھا ہو۔ ممکن ہے کہ ان کا رجحان خود بعد میں بدل گیا ہو اور اب وہ انگریزوں سے مقابلہ صحیح نہ سمجھتے ہوں۔ اس لئے اس تحریف وتبدیل میں انہیں کوئی باک نہ ہوا ہو۔ مگر اس کا بڑا نقصان یہ ہوا کہ لوگوں نے اس کو حقیقت سمجھ کر قبول کیا۔ اس لئے کہ سید صاحب کے ایسے عقیدت کیش کی طرف سے کتاب تھی جس پر خود الزامات تھے، اس لئے قبول نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اصل قلمی چیزیں اور مکتوبات عام لوگوں کی دسترس سے باہر کی چیز تھی۔ لیکن تاریخ پر زیادہ مدت تک پردہ نہیں ڈالا جاسکتا تھا اس کو ایک نہ ایک دن واضح ہونا تھا اور ہو کر رہا۔

سرسید نے بھی مسلمانوں کو انگریزوں کے مظالم نے بچانے کے لئے یہ کام کیا ہو۔

(۲) مرزا حیرت کی کتاب پہلا ایڈیشن ۱۳۱۲ھ (سنہ ۱۸۹۴ء) میں سامنے آیا، اس لئے ان کو بھی ایک حد تک معذور قرار دیا جاسکتا تھا۔ مگر انھوں نے تو یہاں تک حد کردی ہے کہ انگریزوں اور امیر خان کے معاہدہ کو بھی سید صاحب کا کارنامہ قرار دیا ہے، اس کی آخر کونسی مجبوری تھی۔ مگر افسانہ تراشی پر ان کا دل انہیں برابر ملامت کرتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ اعتراف پر مجبور ہوئے۔ اپنی کتاب کے جدید ایڈیشن صفحہ ۲۸۵ میں اس امر کا اقرار کیا ہے کہ ہجرت انگریزوں ہی کی آمد کی وجہ سے ہوئی، صرف سیاسی مصلحت کی بناء پر انگریزوں سے مقابلہ نہ کرنے کا اعلان کیا۔

پانچویں فصل

سرحد کو مرکز کیوں بنایا

گزشتہ تفصیل سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ سید صاحب کے مقاصد کیا تھے۔ اس بات کے انکار کی بالکل گنجائش نہیں رہی کہ سید صاحب انگریزوں سے ملک کو آزاد کرنا چاہتے تھے۔ مگر اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر مرکز جہاد سرحد کو کیوں بنایا گیا؟ ہندوستان میں جہاں انگریز براہ راست حاکم تھے۔ جہاد شروع کرنا چاہیے۔ سید صاحب کے سوانح نگاروں نے کافی حد تک اس کا جواب دیا ہے مولانا غلام رسول مہر صاحب نے تو ایک باب اس کے لئے مخصوص کیا ہے۔ حضرت مولانا علی میاں صاحب نے بھی یہ عقدہ حل کرنے کی قابل قدر کوشش کی ہے۔

ہم کسی خیال اور قیاس سے پہلے سید صاحب کی تقریر کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں۔ جسمیں انھوں نے اہل سرحد کو خطاب کرتے ہوئے پنجتار میں ایک دفعہ فرمایا تھا:

> مجھ کو جناب باری سے ارشاد ہوا کہ تو دار الحرب ہند سے ہجرت کر کے دار الامن میں جا اور کفار سے جہاد فی سبیل اللہ کر۔ سو میں نے ہندوستان میں خیال کیا کہ کوئی جگہ ایسی مامون ہو کہ وہاں مسلمانوں کو لے کر جاؤں اور تدبیر جہاد کی کروں۔ باوجود اس وسعت کے کہ صدہا کوس میں ملک ہند واقع ہے، کوئی جگہ لائق ہجرت کے خیال میں نہ آئی۔ بلکہ کتنے لوگوں نے صلاح دی کہ اسی ملک میں جہاد کرو۔ جو کچھ مال وخزانہ سلاح وغیرہ درکار ہو ہم دیوینگے (دیں گے) مگر مجھ کو منظور نہ ہوا۔ اس لئے کہ جہاد موافق سنت کے چاہیے۔ بلوا کرنا منظور نہیں ہے۔ اور تمہارے ملک کے ولایتی بھائی بھی وہاں حاضر تھے۔ انھوں

نے کہا کہ ہمارا ملک اس امر کے واسطے بہت خوب ہے۔اگر وہاں چل کر کسی ملک میں قیام پکڑیں۔لاکھوں مسلمان وہاں کے جان و مال سے آپ کے شریک ہوں گے۔خصوصاً اس سبب سے کہ رنجیت سنگھ والی لاہور نے وہاں کے مسلمانوں کو تنگ کر رکھا ہے۔اور طرح طرح کی ایذا پہنچاتا ہے۔اور ہتک حرمت اسلام کی کرتا ہے۔جب اس کی فوج کے لوگ اس ملک میں آتے ہیں۔مسجدوں کو جلا دیتے ہیں۔کھیتی تباہ کر دیتے ہیں۔مال واسباب لوٹ لیتے ہیں۔بلکہ عورتوں اور بچوں کو پکڑ لے جاتے ہیں اور اپنے ملک پنجاب میں لے جا کر بیچ ڈالتے ہیں۔اور اپنے ملک پنجاب میں تو وہ کفار نابکار مسلمانوں کو اذان بھی نہیں کہنے دیتے اور مسجدوں میں گھوڑے باندھتے ہیں۔اور وہاں گاؤکشی کا تو کیا ذکر؟ جہاں سنتے ہیں کہ کسی مسلمان نے گائے ذبح کی، اس کو جان سے مار ڈالتے ہیں۔یہ گفتگو سن کر میرے خیال میں آیا کہ یہ سچ کہتے ہیں اور یہی مناسب ہے کہ ہندوستان سے ہجرت کر کے وہیں چل کر ٹھہریں اور سب مسلمانوں کو متفق کر کے کفار سے جہاد کریں۔اور ان کے ظلم سے مسلمانوں کو چھڑا دیں۔سو اسی ارادہ سے تمہارے اس ملک میں ہم آئے ہیں۔(۱)

اس سے ہم صاف نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ :

۱۔سید صاحب سرحد کی طرف اس لئے متوجہ ہوئے تھے کہ پورے ہندوستان میں انگریزوں کے ظلم وستم اور ان کے تسلط کی وجہ سے کوئی آزاد مامون مقام نظر نہیں آتا۔ جسے وہ مرکز بنا کر جہاد شروع کریں۔حالاں کہ ہر قسم کی مالی امداد کا یقین دلایا گیا۔ اس وقت کے ہندوستان کے نقشے کو سامنے رکھا جائے تو سید صاحب کے بیان کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔ہندوستان یا تو براہ راست انگریزوں کے ماتحت تھا یا ان ریاستوں پر مشتمل تھا جو سید صاحب کے ایام طفلی ہی میں اپنی آزادی کھو کر انگریزوں کی

---

(۱) وقائع احمدی (قلمی) صفحہ ۱۴۵۰-۱۴۵۱۔

دست نگر بن چکی تھیں۔ ان علاقوں میں سے کسی ایک کو مرکز بناتے تو اسلامی جہاد نہ رہتا بلکہ بلوا بن جاتا۔ نیز بیسیوں الجھنیں پیدا ہو سکتی تھیں۔ مثلاً انگریز اپنی عیاری سے مختلف طبقات میں تفرقہ پیدا کر کے سید صاحب کی تحریک کو ختم کرا سکتے تھے۔ ارد گرد کی قوتوں کو ابھار کر سید صاحب کے خلاف کھڑا کر دیتے۔ تو سید صاحب کا مرکز جہاد ہندوستان کے سمندر میں ایک بے حقیقت جزیرہ بن کر رہ جاتا۔ جسے باہر سے کوئی کمک نہ پہنچ سکتی۔ جن حکومتوں کو ایک حد تک آزاد سمجھا جاتا تھا، ان میں بھی انگریز اپنے عمل دخل کا دروازہ کھول چکے تھے۔ مثلاً امیران سندھ کی حکومت، اور ان میں سے کوئی شخص صاحب ہمت نہ تھا کہ بے باکانہ سید صاحب کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہو جاتا۔(۱)

۲۔ سرحد کو مرکز بنانے کی دوسری وجہ سکھوں کے مظالم تھے۔ ان کی تفصیل گزر چکی ہے۔

۳۔ افغانوں کی جواں مردی، سپہ گری، جنگی صلاحیت اور شجاعت و تہور کی ہندوستان میں بڑی شہرت تھی۔ جو افغانی ہندوستان کے مختلف حصوں میں عرصے سے سکونت پذیر ہو گئے تھے، وہ ان مردانہ اوصاف کے حامل اور سپہ گری میں ممتاز تھے۔ اودھ کی فوج کا بڑا حصہ ان پٹھانوں پر مشتمل تھا جو یا تو خود افغانستان و سرحد سے آئے تھے یا ان کے قریبی مورث منتقل ہوئے تھے۔ شاہ اودھ کی فوج انھیں پٹھان افسروں کی ماتحتی میں تھی۔ خود نواب امیر خان اور اس کے اکثر سردار اور رفقائے کار افغانی تھے۔ روہیلکھنڈ جو ہندوستان میں مسلمانوں کی فوجی طاقت اور دینی حمیت کا ایک بڑا مخزن تھا، جو وقتاً فوقتاً مرکز (دہلی) کو بھی تازہ خون اور نئی طاقت عطا کرتا رہا افغانوں سے آباد تھا۔ خود رائے بریلی جو سید صاحب کا وطن ہے، جہاں آباد کا محلہ پٹھانوں کا محلہ تھا۔ اور سید صاحب ان کی مردانگی اور جوانمردی سے خوب واقف تھے۔ ان میں سے کثیر التعداد لوگ سید صاحب سے ارادت اور بیعت کا تعلق رکھتے تھے۔ اور آپ کی رفاقت کے لئے کمر بستہ تھے۔ ان سب کے تعلقات اور رشتے دار افغانستان اور سرحد کے افغانی قبائل میں تھے۔ انھوں نے بھی سید صاحب کو اپنے وطن یعنی افغانستان و سرحد

(۱) سید احمد شہید اول صفحہ ۲۷۸۔

کو اپنی دعوت و جہاد کا مرکز بنانے کا مشورہ دیا ہوگا اور اپنے اعزا اور اہل تعلق کی مدد کی امید دلائی ہوگی۔ ان سب چیزوں نے آپ کو اس پر آمادہ کیا کہ آپ اس افغانی آزاد علاقے کو اپنی مجاہدانہ دعوت و تحریک کا مرکز بنائیں جس سے آپ کو اپنے مقصد کے لئے بہترین سپاہی اور جنگجو اور جنگ آزما رفیق بہت بڑی تعداد میں مل سکتے ہیں۔ (۱)

۴۔ وہ لوگ سکھوں کے ظلم و جور اور یلغار و یورش کا ہدف بنے ہوئے تھے۔ ان کے جذبات مجروح تھے۔ اور ایسے لوگوں کو بآسانی دفاع و ہجوم کے لئے منظم کیا جا سکتا تھا۔ (۲)

۵۔ ان کی آزادی چھنی نہ تھی چھن رہی تھی، لہذا انھیں غیروں کی دستبرد سے بچانا ان لوگوں کے مقابلے میں زیادہ ضروری تھا جن کی آزادی بہت پہلے چھن چکی تھی۔

۶۔ سرحد کے مرکز کی جغرافیائی حیثیت ایسی تھی کہ دشمن صرف اسی حصے سے حملہ کر سکتا تھا جسے سید صاحب نے محاذ جنگ بنایا تھا۔ اطراف و جوانب یا عقب سے حملے کا کوئی اندیشہ نہ تھا۔

۷۔ سید صاحب سرحد سے فارغ ہو کر پنجاب کی طرف پیش قدمی کرتے تو وہاں کے مسلمانوں کی اکثریت کے علاوہ وہ مظلوم ہندو آبادی بھی خیر مقدم کرتی۔ نیز دائیں جانب سے بھاول پور، سندھ اور بلوچستان کی حکومتیں معاون بن سکتی تھیں۔ (۳)

۸۔ سرحد کے شمال اور مغرب میں دور دور تک اسلامی آبادیاں تھیں۔ اور مسلمان حکومتوں کی ایک مسلسل زنجیر تھی۔ اس لئے یہ توقع بجا طور پر ہو سکتی تھی کہ مسلمانوں کی آزادی کے لئے جہاد کا اعلان اس علاقے میں مخاصمت کے بجائے ہمدردی کے جذبات پیدا کر دے گا۔ اس لئے کہ سکھوں کے مظالم کی داستانیں قرب و جوار کے ان مسلمان ممالک تک ضرور پہنچی ہوں گی اور اسلامی حمیت ان میں ضرور بیدار ہوئی ہوگی۔ اس لئے ان کی طرف سے مخالفت کا اندیشہ تو بالکل نہیں تھا۔ لہذا فوجی مصلحت اور سیاسی تدبر کا تقاضا یہی تھا کہ یہ مہم ہندوستان کی شمال مغربی سرحد سے شروع کی جائے۔ اس لئے کہ

(۱) سیرت سید احمد شہید صفحہ ۴۲۴۔ ۴۲۵۔

(۲) جب کہ یہ لوگ خود اپنے حدود کے اندر سکھوں کو آگے بڑھنے سے روک رہے تھے۔ وہ نہ صرف امداد کے ضرورت مند بلکہ اچھے اتحادی بننے کی ان سے پوری امید کی جا سکتی تھی۔

(۳) سید احمد شہید اول صفحہ ۲۷۹۔

اس قسم کی جنگ میں اس کا اطمینان حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے کہ پیچھے سے تو کوئی حملہ نہیں ہوگا۔(۱) نقشے پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ پنجاب کے مسلمانوں کی امداد، ہندوستان کی دوبارہ تسخیر اور ایک طاقتور اسلامی حکومت کے قیام کے لئے بظاہر اس سے زیادہ موزوں مقام نہیں ہوسکتا تھا۔(۲)

۹۔سید صاحب کی نگاہ کے سامنے ان لوگوں کا انجام تھا جنھوں نے ہندوستان کے کسی حصے کو اپنی تحریک اور جنگی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور بہت جلد ان کے گرد سازشوں، مخالفتوں اور ریشہ دوانیوں کا ایک جال پھیلا دیا گیا۔جس میں وہ جکڑتے چلے گئے۔اور ان کے ہاتھ پاؤں بندھ کر رہ گئے۔انگریزوں کی زیرک و پرفن حکومت ہر حوصلہ مند قائد اور اپنے ہر مخالف کے لئے ایسے حالات پیدا کر دیتی تھی کہ اس کی جنگی کارروائیوں اور آزادانہ سرگرمیوں کا میدان تنگ سے تنگ ہوتا چلا جاتا۔اور وہ بہت جلد محسوس کر لیتا کہ وہ ایک قفس میں محبوس ہے۔اور بالکل بے بال و پر اور بے دست و پارہ گیا ہے۔نواب امیر خاں کا سارا معاملہ سید صاحب کی نظر کے سامنے تھا کہ انگریزوں کے جوڑ توڑ سے وہ کس طرح اکیلا رہ گیا۔اور کس طرح انھوں نے اس کے مختلف سرداروں کو اس سے توڑ لیا۔اور ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ وہ اپنے کو معاہدہ اور مصالحت پر مجبور سمجھنے لگا۔اسی طرح ٹیپو سلطان جیسے پیکر عزم و شجاعت کا انجام بھی ان کی نظروں سے اوجھل نہیں تھا۔وہ انگریزوں کے داؤ پیچ سے پورے واقف تھے۔یہ ان کی بہت بڑی سیاسی بصیرت تھی کہ انھوں نے ہندوستان کے اندر اپنی مجاہدانہ سرگرمیوں کا مرکز نہیں بنایا۔جس کے لئے بہت جلد ایک جزیرہ بن جانے کے قوی امکانات تھے۔جس کے چاروں طرف مخالفتوں، مزاحمتوں اور سازشوں کا ایک سمندر پھیلا ہوا ہوتا۔اور جس کو کہیں سے کوئی کمک یا رسد ملنے کی کوئی توقع نہ رہتی۔(۳)

۱۰۔سب سے زیادہ اہم مسئلہ یہ زیر غور رہا ہوگا کہ مسلمان ابھی تک اس قابل نہیں

(۱) اسی مصلحت کے پیش نظر سید صاحب کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بعد میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی نے اپنی تحریک کا مرکز سرحد کو بنایا تھا۔

(۲) سیرت سید احمد شہید اول صفحہ ۴۲۳ و برصغیر پاک و ہند کی ملت اسلامیہ صفحہ ۲۵۷۔

(۳) سیرت سید احمد شہید اول صفحہ ۴۲۳-۴۲۴۔

ہیں کہ انگریزوں کے خلاف جنگ شروع کریں۔اور یہ کہ اگر سکھوں کی قلمرو پر مشرق کی طرف سے حملہ کیا گیا تو اگرچہ مجاہدین اپنے گھروں کے قریب ہوں گے اور رسد رسانی کا سلسلہ زیادہ حفاظت کے ساتھ جاری رہ سکے گا۔تاہم انگریز اس کی اجازت یقیناً نہیں دیں گے کہ ان کے اتحادی رنجیت سنگھ کے خلاف جنگ کا مرکز خود ان کے علاقے میں بنایا جائے۔اس کے علاوہ اس پر بھی غور کیا گیا ہوگا کہ انگریز اس کی بھی اجازت نہیں دیں گے کہ ان کی قلمرو کے اندر ایک فوج منظم کی جائے۔ان کے علاقہ میں کسی جگہ فوجی صدر مقام بنا کر وہاں سے جنگ شروع کرنا انتہائی غیر دانشمندانہ فعل ہوگا۔(۱)

۱۱۔سید صاحب کا سادات عظام میں سے ہونا بھی سرحد کو مرکز بنانے کا ایک سبب ہوسکتا ہے اس لئے کہ اہل سرحد سادات کا بے حد احترام کرتے تھے۔اور ان کو سر دل پر بٹھاتے تھے۔اس لئے کسی اور سمت سے مخالفت کا خطرہ ہو، اہل سرحد اور پٹھانوں کی طرف سے ایک سید مجاہد قائد کی مخالفت کا خطرہ کم سے کم تھا۔

(۱) برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ صفحہ ۲۵۷

بـاب هــفتــم

جماعت مجاہدین کا انگریزوں سے تصادم

انھوں نے ہندوستان میں ایک ایسا مذہبی انقلاب برپا کردیا، جس کی مثال اس کی گزشتہ تاریخ میں نہیں ملتی، یہی انقلاب ہے جس نے پچاس سال سے زیادہ انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کی روح کو دبنے نہیں دیا۔

ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر

سید احمد شہید کے بعد ان کی تحریک اسی راہ پر گامزن رہی۔ اور جب تک سکھ برسر اقتدار رہے(۱) سکھوں سے برسر پیکار رہی۔ جب ان کی طاقت نہیں رہی تو تحریک نے اپنے اصل نشانہ انگریزوں سے گلوخلاصی اور ہندوستان کی آزادی کی طرف قدم بڑھایا۔ تاہم اس سے پہلے بھی جب جب انگریزی حکومت کو نقصان پہنچانے کا موقع ملا مجاہدین نے اس سے دریغ نہیں کیا بلکہ ہر موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا اس سلسلہ میں امیر المجاہدین مولانا سید نصیر الدین دہلوی کے کارنامے ناقابل فراموش ہیں۔

پہلی فصل

مولانا سید نصیر الدین (۲) دہلوی اور انگریزوں سے جہاد

مولانا سید نصیر الدین دہلوی شاہ رفیع الدین محدث دہلوی کے نواسے اور شاہ محمد اسحاق (نواسۂ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی) کے داماد تھے۔ سید احمد شہید جب سرحد میں مصروف جہاد تھے تو آپ ان سرگرم لوگوں میں تھے جو ہندوستان میں رہ کر فراہمی

(۱) مولانا غلام رسول مہر نے سرگزشت مجاہدین میں سکھوں سے کشمکش کو مفصل بیان کیا ہے، ان کی تفصیلات ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنی قوت کے بل بوتے پر پنجاب میں تسلط حاصل کیا تھا اور بڑے دبدبہ سے حکومت کی تھی۔ ۲۷؍جون ۱۸۳۹ء کو جب اس کا انتقال ہوا تو اس کے جانشینوں اور ارکان سلطنت کے باہمی اختلاف نے ان کی طاقت کو بری طرح کمزور کر دیا۔ انگریزوں نے اس موقع سے خوب فائدہ اٹھایا۔ سکھوں کے ساتھ ان کی کئی جھڑپیں ہوئیں، معاہدے ہوئے بالآخر ۱۸۴۹ء میں انگریز پوری طرح پنجاب پر قابض ہو گئے اور سکھ حکومت کو ختم کر کے پنجاب کو اپنے مقبوضہ علاقوں میں شامل کر لیا۔

(۲) مولوی نصیر الدین نام کے دو بزرگ تھے، ایک مولوی سید نصیر الدین منگلوری (باشندہ منگلور ضلع سہارن پور) جو ابتدائی دور سے سید صاحب کے ساتھ رہے، جنگ بالاکوٹ کے وقت درہ بھوگڑ منگ کی حفاظت پر مامور تھے۔ شیخ ولی محمد پھلتی کے دور امارت میں امیر لشکر تھے۔ سید صاحب کے بعد جماعت کی مجاہدانہ سرگرمیوں کو قائم رکھنے کا سہرا انھیں کے سر تھا۔ ٹوپی میں (فتح خان پنجتاری کے ساتھ معرکہ میں) شہید ہوئے۔ سنہ غالباً ۱۸۳۸ء تھا۔ ==

زرمین تندہی سے لگے ہوئے تھے۔سید صاحب کی شہادت کے بعد شیخ ولی محمد پھلتی کو اتفاق آراء سے امیر المجاہدین بنایا گیا۔ وہ سید صاحب کی وصیت کے مطابق بی بی صاحبہ (اہلیہ محترمہ سید صاحب) کو سندھ پہنچانے کے لئے بے چین تھے تاکہ اس طرف سے اطمینان حاصل کر کے جہاد کے لئے یکسو ہو جائیں۔ چنانچہ چند مجاہدین کو اپنے ساتھ رکھ کر وہ اس تدبیر میں لگ گئے، اور بقیہ جماعت کو مولوی نصیر الدین منگلوری کی قیادت میں بھیج دیا۔انھوں نے جہادی سرگرمیاں جاری رکھیں۔سکھوں سے کئی جھڑپیں ہوئیں، مگر مقامی خوانین اور سرداروں کی سازشوں اور ہنگامہ آرائیوں کی وجہ سے بار بار مرکز جہاد تبدیل کرنا پڑا۔ اس لئے مجاہد کسی جگہ سکون ٹھہر نہ سکے۔آخر سید اکبر شاہ ستھانوی کی دعوت پر تقریباً ۱۸۳۵ء میں ستھانہ پہنچے اور اس کو مرکز بنالیا۔ان وجوہات کی بناء پر سرحد میں کوئی نمایاں کارنامہ انجام نہیں پاسکا، اگرچہ جانثاران حق کے چھوٹے چھوٹے گروہ وقتاً فوقتاً سرحد پہنچتے رہتے تھے، تاہم عام مسلمانوں کے جوش جہاد میں افسردگی پیدا ہو رہی تھی، لہٰذا ہندوستان میں موجود سید صاحب کے خلفاء اور تحریک جہاد کے کارفرما متفکر ہوئے کہ سید صاحب کا مقصد فوت ہوتا نظر آرہا ہے۔ اور انھیں ضرورت محسوس ہوئی کہ کسی سرگرم شخص کی قیادت میں ایک بڑی جماعت تیار کر کے سرحد کے آزاد علاقہ میں بھیج دی جائے تاکہ سید صاحب کے شروع کئے ہوئے کام میں نئی روح پیدا ہو جائے۔اس کے لئے سب نے بالاتفاق مولانا سید نصیر الدین دہلوی کو امیر منتخب کیا، اس کے بعد آپ نے ٹونک، اجمیر، میرٹھ، امروہہ، رام پور اور اطراف دہلی

== دوسرے مولوی سید نصیر الدین دہلوی تھے۔انہیں کا تذکرہ ہو رہا ہے۔انگریز مؤرخ اوکنلے نے دونوں میں خلط ملط کر دیا ہے۔مولانا مسعود عالم صاحب ندوی نے اس پر تنبیہ کی ہے (ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک صفحہ ۶۲) مگر عجیب بات ہے کہ ذرا آگے بڑھ کر مولانا نے خود خلط ملط کر دیا ہے۔مولوی نصیر الدین (دہلوی) کے سرحد پہنچنے کا ذکر کرتے ہوئے ایک انگریز کے حوالہ سے منارہ Munarah نامی گاؤں میں مجاہدین پر ہوئے حملے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس میں مولوی نصیر الدین شہید ہوئے (صفحہ ۶۴۔۶۵) حالاں کہ یہ واقعہ مولوی نصیر الدین منگلوری کے ساتھ پیش آیا تھا۔ (دیکھئے سرگزشت مجاہدین صفحہ ۱۲۵۔۱۲۶ نیز ہندوستان میں وہابی تحریک صفحہ ۱۱۴) اور مہر کی تحقیق کے مطابق منارہ پر شبخون کے بعد مجاہدین نے ٹوپی پر حملہ کیا اس میں مولوی نصیر الدین منگلوری شہید ہوئے۔

میں دعوت و تبلیغ کی غرض سے دورے کیے تا کہ مجاہدین کی ایک جماعت فراہم ہو جائے۔

انگریزوں کے خلاف جہاد کا جذبہ

چونکہ مولوی نصیرالدین ہندوستان کے قلب (دہلی) میں قیام پذیر تھے جو مغلیہ سلطنت کا پایۂ تخت تو تھا مگر انگریزوں کا اکھاڑا بنا ہوا تھا۔ انگریز ہر روز نت نئے ہتھکنڈے استعمال کر رہے تھے اور بادشاہ کو انھوں نے شطرنج کا مہرہ بنا رکھا تھا۔ بادشاہ کی بے وقعتی اور انگریزوں کے مقابلہ میں ہندوستانیوں کی بے بسی ان کے سامنے تھی۔ پھر اپنے دورہ میں بھی انھوں نے انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اثرات کا گہرائی سے جائزہ لیا ہوگا۔ اس لئے ان کی بے چین طبیعت نے یہ فیصلہ کیا کہ فوراً انگریزوں سے جہاد کا آغاز کیا جائے۔ چنانچہ سفر ہجرت سے پہلے ہی انھوں نے اس جانب قدم بڑھاتے ہوئے والی کابل دوست محمد خان کے پاس سفارت بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اگرچہ سید احمد شہید سے لڑ چکا تھا۔ مگر اب ایک طرف سکھوں سے برسرِ پیکار تھا تو دوسری طرف انگریزوں کے اقدامات کی روک تھام میں لگا ہوا تھا۔ اس لئے مولوی نصیرالدین نے اعلیٰ مقصد کے پیش نظر اس کے ساتھ شریک ہونے اور اس کا تعاون کرنے کا فیصلہ کیا، مگر کچھ ایسی بات پیش آئی کہ یہ سفارت روانہ نہ ہو سکی۔ (۱)

۳/ ذی الحجہ ۱۲۵۰ھ مطابق ۲/ اپریل ۱۸۳۵ء کو مولوی سید نصیرالدین کے سفر ہجرت کا آغاز ہوتا ہے۔ دہلی سے جے پور، ٹونک اور اجمیر ہوتے ہوئے ۱۸۳۷ء میں سندھ پہنچے، ان کی خواہش تو یہ تھی کہ سرحد پہنچ کر سید صاحب کے بقیۃ السیف رفقاء سے جا ملیں مگر متعدد وجوہات (۲) کی بناء پر سندھ کو مرکز جہاد بنانے کا فیصلہ ہندوستان ہی میں ہو چکا تھا۔ دوران سفر ہندوستان کے بہت سے رنگروٹوں کی ٹولیاں ان سے ملیں اور ٹونک میں بیش قرار مالی امداد بھی حاصل ہوئی کہ والی ٹونک نواب وزیرالدولہ کے اصرار ہی سے یہ راستہ اختیار کیا گیا تھا۔ پہلے پیر کوٹ میں ٹھہرے جو ''حروں'' کا مرکز تھا اور جہاں سید صاحب کے خاندان کے افراد مقیم تھے۔ وہاں سے

(۱) ملاحظہ ہو سرگزشت مجاہدین صفحہ ۱۳۷
(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے ایضاً ۱۴۹ تا صفحہ ۱۵۲

حیدرآباد سندھ کی طرف چلے اور وہاں کے امیروں سے ملے۔ انھوں نے ان کی ضیافت تو کی مگر امداد کا وعدہ نہیں کیا (۱)

یہ وہ زمانہ تھا کہ حیدرآباد میں انگریز ریذیڈنٹ مقرر ہو چکا تھا (۲) اسکی طرف سے ان مجاہدین کے قیام میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی گئی اور انھیں سندھ چھوڑنے کا حکم دیا گیا مگر کچھ بااثر اشخاص نے مداخلت کر کے اجازت دلوائی۔ (۳) سندھ میں مولانا نصیرالدین نے مزاری (۴) قبیلہ میں اقامت اختیار کی۔ اس لئے کہ مزاری نہ سکھوں

(۱) اس لئے کہ ۱۸۰۹ء میں امیران سندھ اور کمپنی کے درمیان دائمی رفاقت واتحاد کا معاہدہ ہوا تھا، جس کی پابندی امیران سندھ ضروری سمجھتے تھے۔ اور ۱۸۳۲ء میں بھی ایک نیا تجارتی معاہدہ ہوا تھا۔ ان معاہدوں کی وجہ سے امیران سندھ مولوی نصیرالدین سے امداد کا وعدہ کرتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کے حقیقی مقاصد سے وہ واقف ہوں جس سے ان کو لازماً انگریزوں کے خلاف صف آرا ہونا پڑتا جس کو وہ معاہدہ کی خلاف ورزی سمجھتے تھے۔ مگر اس کے باوجود سندھی، انگریزوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے، بلکہ ان کو اپنے ملک کے لئے بہت بڑا خطرہ تصور کرتے تھے، ایک واقعہ گزر چکا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ۱۸۳۰ء میں بمبئی فوج کے الیگزنڈر برنس کو شاہ انگلستان کے تحائف رنجیت سنگھ کو پہنچانے کے لئے مقرر کیا گیا تھا مگر راستہ پنجاب کے بجائے سندھ کا تجویز کیا گیا تھا تاکہ وہ گردوپیش کے حالات کا جائزہ لے کر دریائے سندھ کو برطانوی تجارت کے لئے کھولنے کا راستہ ہموار کرے۔ برنس کا یہ مشن امرائے سندھ کو بالکل پسند نہیں آیا۔ وہ اسے غیر ملکیوں کی اپنے ملک پر دست درازی سمجھتے تھے۔ ایک بلوچی افسر نے کہا: بلا تو آچکی، انگریزوں نے ہمارا ملک دیکھ لیا

اسی قسم کا ایک واقعہ باری علیگ نے بھی نقل کیا ہے لکھتے ہیں : جب برنز اپنے دریائی سفر میں مصروف تھا تو ایک سیدزادہ ساحل دریا پر وضو کر رہا تھا، سید نے جب آنکھ اٹھائی تو اسے برنز دکھائی دیا اس نے چلایا : سندھ کی آزادی ختم ہو گئی، انگریزوں نے دریائی راستہ معلوم کر لیا (کمپنی کی حکومت ۳۳۲)

ان جیسے واقعات کے پیش نظر مولانا نصیرالدین کو امیران سندھ کے انگریزوں سے معاہدوں کے باوجود بڑی امید تھی کہ وہاں ان کی دعوت بہت جلد بارآور ہو گی اور سندھی بڑی تعداد میں ان کا ساتھ دیں گے، جیسا کہ بعض خطوط میں انھوں نے یہ امید ظاہر کی ہے۔

(۲) تفصیلات گزر چکی ہیں دیکھئے صفحہ ۲۰۰

(۳) ملاحظہ ہو ہندوستان میں وہابی تحریک صفحہ ۱۱۵۔

(۴) مزاری، بلوچوں کی ایک بہت بڑی قوم ہے جو غالباً سترھویں صدی عیسوی کے اواخر یا اٹھارویں صدی عیسوی کے اوائل میں اپنے پہلے مقام سے اٹھ کر نئی چراگاہوں کی تلاش میں نکلے تھے۔ ان کا علاقہ خیرپور کے حدود سے متصل موجودہ ضلع ڈیرہ غازی خاں کے جنوبی حصے پر مشتمل تھا (تفصیل کے لئے دیکھئے مہر: سرگزشت مجاہدین صفحہ ۱۸۳)

سے ڈرتے تھے نہ انگریزوں کے زیراثر تھے۔ خود مولانا ایک مکتوب میں فرماتے ہیں :

> والیان خیر پور چونکہ فرنگیوں کے زیر اثر ہیں اور سکھوں سے انھوں نے صلح کررکھی ہے لہذا ان کے علاقے میں قیام میرے نزدیک خلاف مصلحت ہے۔ بایں ہمہ امید کی جاتی ہے کہ اس ملک کے مسلمان بہت زیادہ تعداد میں میرا ساتھ دیں گے۔ والیان خیر پور کے برخلاف مزاری نہ سکھوں سے ڈرتے ہیں نہ فرنگیوں سے۔ (۱)

یہ واضح دلیل ہے اس بات کی کہ سید صاحب کے متبعین ان طاقتوں کے ساتھ بھی اتحاد سے دور بھاگتے تھے جو انگریزوں کے زیراثر ہوں، چہ جائے کہ انگریزی اقتدار کو تسلیم کریں یا ان سے مصالحت پر تیار ہوں۔

مزاریوں سے عہد وپیمان ہوا۔ مزاری ایفائے عہد میں مشہور تھے۔ مولانا سید نصیر الدین نے اپنے بعض مکتوبات میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ مگر سکھوں کے ساتھ پہلے معرکہ ہی میں مزاری سازش کا شکار ہوئے اور انھوں نے نومبر ۱۸۳۷ء میں سکھوں سے صلح کرلی جب مجاہدین روجھان کا محاصرہ کیے ہوئے تھے جہاں سکھوں کا قبضہ تھا۔ عین معرکہ میں مزاریوں کے اس طرز عمل سے مجاہدین کو سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑا اور وہ محاصرہ اٹھانے پر مجبور ہوئے۔

اب مولانا کو سندھ کے قیام میں مشکلات پیش آنے لگیں اور سندھ کو مرکز جہاد کے طور پر باقی رکھنا بے سود نظر آنے لگا۔ ان کی خواہش تھی کہ موقع ملے تو بلوچستان چلے جائیں۔ قلات کے وزیر اعظم مختار الدولہ محمد حسن سے خط وکتابت کرچکے تھے۔ اسی اثناء میں انگریز افغان جنگ چھڑ گئی اور مولانا کو افغانستان جانا پڑا۔

انگریزوں سے دوبدو جنگ

دوست محمد خان کابل کا والی تھا۔ انگریز شاہ شجاع کو جو زماں شاہ کا ماں جایا بھائی تھا اور اب افغانستان کی خانہ جنگیوں میں شکست کھا کر لدھیانہ میں انگریزوں کی پناہ میں

---

(۱) سرگزشت مجاہدین صفحہ ۱۹۰۔

تھا، جنھوں نے اس کا وظیفہ بھی مقرر کر دیا تھا۔ شاہ شجاع انگریزوں کی ہر شرط ماننے کے لئے تیار تھا، جس سے افغانستان پر انگریزوں کے لئے قبضہ کی راہیں ہموار ہو جائیں۔ برخلاف دوست محمد خان کے جو ایک غیرت مند حکمراں تھا۔ وہ انگریزوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بننے کے لئے تیار نہیں تھا چنانچہ انگریزوں نے بلا کسی جواز کے دوست محمد خان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تاکہ اسے شکست دے کر شاہ شجاع کو کابل کا بادشاہ بنائیں (۱) دوست محمد خاں نے انگریزوں کے خلاف سخت جذبات کے حامل، تحریک مجاہدین کے تربیت یافتہ پر جوش مجاہدین کی خدمات سے فائدہ اٹھانا مناسب سمجھا، چنانچہ اس نے مولانا نصیرالدین کو دعوت دی۔ وہ ایک ہزار سپاہیوں کا دستہ لے کر کابل کی طرف روانہ ہوئے اور داور کے قریب خیمہ زن ہو کر تین سو منتخب سپاہیوں کو دوست محمد خان کی امداد کے لئے آگے بھیجا، جو غزنی کی حفاظت پر متعین کئے گئے۔ (۲) اسی اثناء میں دوست محمد خاں کا ایک عزیز انگریزوں سے مل گیا۔ اور اس نے قلعہ غزنی کے تمام اندرونی حالات انھیں بتادیے۔ انگریزوں نے رات کی تاریکی میں قلعے کے ایک دروازے کو بارود سے اڑا دیا۔ انگریزی فوج قلعے میں داخل ہوئی مولوی نصیرالدین کے اکثر ساتھیوں نے دست بدست لڑائی میں شہادت پائی۔ یہ واقعہ ۲۱ر جولائی ۱۸۳۹ء کا ہے۔ (۳)

ولیم ہنٹر اس جنگ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

انگریز کافروں پر ضرب لگانے کے لئے ہر موقع کے منتظر رہتے تھے، جنگ کابل میں ہمارے دشمنوں کی امداد کے لئے انھوں نے ایک بڑی فوج بھیجی، اس میں ایک ہزار آدمی آخر دم تک ہمارے مقابلے میں ڈٹے رہے۔ صرف فتح غزنی کے موقع پر تین سو مجاہدین نے انگریزی سنگینوں سے جام شہادت نوش کرنے کی سعادت حاصل کی۔ (۴)

اس جنگ کے بعد ۱۸۳۹ء کے اواخر یا ۱۸۴۰ء کے اوائل میں مولوی نصیرالدین اور ان کے بقیہ ساتھی سخت مصیبتوں سے گزرتے ہوئے ستھانہ پہنچے۔ جہاں مولوی

---

(۱) ملاحظہ ہو سرگزشت مجاہدین صفحہ ۲۰۲۔۲۰۳

(۲) ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک صفحہ ۶۳ و ہندوستان میں وہابی تحریک صفحہ ۱۲۱

(۳) سرگزشت مجاہدین صفحہ ۲۰۴۔۲۰۵

(۴) ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۳۵۔ غزنی کی مہم کی تفصیل کیلئے دیکھئے تاریخ ہند عہد برطانیہ، صفحہ ۴۵۰

نصیرالدین منگلوری کے زمانہ سے مجاہدین نے مرکز قائم کرر کھا تھا، اوران کی شہادت کے بعد صرف ستراسی مجاہدین باقی رہ گئے تھے، جس کا انتظام میراولاد علی سورج گڑھی نے سنبھال رکھا تھا۔ستھانہ پہنچتے ہی مجاہدین نے ان کواپنا امیر بنالیا، مگروہ کوئی کارنامہ انجام نہیں دے پائے تھے کہ خدا کی طرف سے بلاوا آگیااور ۱۸۴۰ء ہی میں انھوں نے وفات پائی (۱)

مولوی محمد قاسم پانی پتی

مولوی محمد قاسم پانی پتی، سید صاحب کے بہت سرگرم رفقاءاوران کے حقیقی مقاصد کوسمجھنے والے اصحاب میں سے تھے۔سید صاحب کی شہادت کے بعد بقیہ مجاہدین کوتسلی دینے اور جماعتی نظام کوقائم رکھنے کے لئے شیخ ولی محمد پھلتی کو باصرار امارت سونپنے میں ان کا کردارنا قابل فراموش ہے۔وہ انگریزوں کے معاملہ میں بہت سخت تھے۔۱۸۴۷ء میں میجرایبٹ سے ان کے مکالمہ کاذکرآچکاہے، جس میں انھوں نے اس سے صاف کہا تھا کہ سکھوں کی طاقت ختم ہوگئی تواب ہمارا مقابلہ آپ سے ہے۔

جیمس اوکنلے James Okinely کے بیان کے مطابق جنگ بالاکوٹ کے وقت ایک مہم کے سلسلہ میں مولوی محمد قاسم مظفرآباد گئے ہوئے تھے۔واپس آکر منتشر سپاہیوں کوانھوں نے جمع کیااورانھیں لےکرستھانہ روانہ ہوئے۔(۲)

جب سے مولانا نے میجر ایبٹ کو اصل حقیقت بتادی اور صاف کہہ دیا کہ وہ انگریزوں سے جہاد کریں گے۔میجرایبٹ ان سے بہت خطرہ محسوس کرنے لگا۔اورایک روایت کے مطابق ایک سال کے اندر ۱۸۴۸ء میں کسی سازش سے ان کومروادیا۔(۳)

ایک روایت کے مطابق مولانا سید نصیرالدین کے ہمراہ جہاد کرتے ہوئے شہادت پائی اور ایک بیان یہ ہے کہ ۱۸۵۳ء میں انگریزوں نے انہیں گرفتار کرکے سیالکوٹ جیل میں قید کردیا۔وہیں انھوں نے وفات پائی۔(۴)

(۱) سرگزشت مجاہدین صفحہ ۲۰۶- ۲۰۷۔اسی کتاب میں ان کے بارے میں تفصیلی معلومات ہیں۔
(۲) ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک صفحہ ۶۱
(۳) روداد مجاہدین ہند صفحہ ۲۵۰
(۴) سرگزشت مجاہدین صفحہ ۲۱۲۔۲۱۳

دوسری فصل

مولانا ولایت علی عظیم آبادی

مولانا ولایت علی عظیم آبادی سید صاحب کے کبار خلفاء میں تھے۔ عظیم آباد (پٹنہ) کے رئیس زادے تھے۔ لکھنؤ میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ جب سید صاحب تبلیغی سفر کے سلسلہ میں لکھنؤ وارد ہوئے تو آپ کے دامن کو تھام لیا اور مرتے دم تک اس سے چمٹے رہے، مولانا ولایت علی اور ان کے برادر خورد مولانا عنایت علی نے سید صاحب سے وابستہ ہوکر جو کارنامے انجام دیئے، وہ ہندوستان کی اصلاحی ودعوتی تاریخ پر نظر رکھنے والے کسی شخص سے مخفی نہیں۔ سید صاحب کی تحریک کو قائم رکھنے اور آپ کے مشن کو جاری رکھنے میں دونوں بھائیوں کو امتیاز خاص حاصل ہے۔ پھر ان کے بعد ان کے اہل خاندان نے انگریزوں کے ہاتھوں جو مصیبتیں جھیلیں، جو پریشانیاں اٹھائیں اور ملک کی آزادی کے لئے جو قربانیاں دیں۔ وہ تاریخ کے ناقابل فراموش حقائق ہیں۔

مولانا ولایت علی علم میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ تقریر وبیان کے لحاظ سے بھی ممتاز تھے۔ سید صاحب نے ہندوستان کے طول وعرض میں دعوت وتبلیغ اور اصلاح وتربیت کے لئے جن چند افراد کا انتخاب کیا تھا، ان میں مولانا ولایت علی بھی تھے، ان کا انتخاب حیدرآباد دکن کے لئے ہوا تھا۔ وہ بغرض جہاد ہجرت کرکے سید صاحب کے ساتھ سرحد گئے تھے۔ وہیں سے ان کو حیدرآباد بھیجا گیا تھا۔ (۱)

تحریک کی تنظیم نو

سید صاحب کی بالاکوٹ میں شہادت سے دفعتہً آپ پر بار عظیم پڑ گیا۔ اس لئے کہ سید صاحب کے خلفاء میں ہندوستان میں دو ہی بزرگ تھے جن پر سب کی نظریں

(۱) مولانا ولایت علی کے تفصیلی حالات، اور دعوت وتبلیغ کے میدان میں ان کے کارناموں کا بیان نیز جہاد سے متعلق واقعات الدر المنثور فی تراجم اہل صادقپور معروف بہ تذکرہ صادقہ ۱۴۸۔۱۸۴ میں موجود ہیں۔ مگر اس کتاب میں انگریزوں کے خلاف مولانا کی کوششوں کو ہلکا بنا کر پیش کیا گیا ہے۔

جاتی تھیں۔ایک مولانا سید محمد علی رامپوری جو اس وقت مدراس میں دعوت وارشاد میں مشغول تھے،اور ان کے اثر سے وہاں ایک انقلاب برپا ہورہا تھا۔دوسرے مولانا ولایت علی عظیم آبادی جو دکن میں تھے۔اسی زمانہ میں آپ کے والد مولانا فتح علی کا عظیم آباد میں انتقال ہوگیا تو آپ حیدرآباد سے برہان پور،جبل پور وغیرہ علاقوں سے ہوتے ہوئے دو سال کے عرصے میں عظیم آباد پہنچے اور سید صاحب کی شہادت کی وجہ سے جو ایک سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی اس کو دور کیا۔اور سید صاحب کی دعوت کے مطابق اصلاح عقائد اور مقصد جہاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے بہار،بنگال،اڑیسہ اور الہ آباد میں دعوت وتبلیغ کا منظم سلسلہ جاری کیا(۱) اور نیم جان تحریک میں نئی روح پھونک دی۔مولانا نے تحریک کی تنظیم نو کی خاطر پوری طرح سید صاحب کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی،خود مولانا اور ان کے مقرر کردہ داعی قریہ قریہ جاکر لوگوں کو دین وشریعت کا پابند بناتے اور سنت پر عمل پیرا کرنے کوشش کرتے اور جذبۂ جہاد کو فروغ دیتے۔پٹنہ واطراف میں تقریباً دو سال تک دعوت وارشاد میں مصروف رہنے کے بعد بنگال کا دورہ کیا اور سید صاحب کی پیروی میں حج کے لئے تشریف لے گئے۔

مولانا کی عزیمت اور انگریزوں کے خلاف جذبہ جہاد

ایک واقعہ سے مولانا کی عزیمت اور انگریزوں کے خلاف جذبہ جہاد پر روشنی پڑتی ہے۔وہ یہ کہ مولانا الٰہی بخش (والد مولانا یحییٰ علی) کو شروع میں مولانا ولایت علی سے شدید اختلاف تھا۔پھر یہ اختلاف ختم ہوا جس کی تفصیل تذکرہ صادقہ میں موجود ہے۔

---

(۱) شاہ محمد حسین کو جو پٹنہ میں سید صاحب کے اولین خلفاء میں سے تھے اور مولانا ولایت علی کے ماموں ہوتے تھے،محلہ تموہیہ کی جامع مسجد کا امام اور چھپرہ،مظفر پور،ترہٹ اور اطراف پٹنہ میں دعوت کی ذمہ داری سونپی۔مولانا عنایت علی کو بنگال روانہ کیا،جو والد صاحب کی وفات کی وجہ سے عظیم آباد آگئے تھے۔اور مولوی زین العابدین حیدرآبادی کو اڑیسہ،اور مولوی محمد عباس حیدرآبادی کو الہ آباد بھیجا۔اور خود شہر کے اندر نواب فخر الدولہ کی مسجد میں جمعہ قائم کرکے درس قرآن وحدیث کا سلسلہ جاری کیا۔(سوانح احمدی صفحہ ۱۶۰،وتذکرہ صادقہ صفحہ ۱۵۳)۔ڈاکٹر قیام الدین کی تحقیق کے مطابق موخر الذکر دونوں حضرات کی تقرری کا واقعہ ۱۸۳۹ء کا ہے(ہندستان میں وہابی تحریک صفحہ ۱۳۶)اور یہی صحیح ہے جیسا کہ آگے بیان ہوگا۔

اس موقع پر مولانا الٰہی بخش نے مولانا ولایت علی سے کہا اب ہم کو آپ سے صرف ایک بات کہنی ہے وہ یہ کہ جس روش پر آپ چل رہے ہیں اس کا نتیجہ ایک نہ ایک دن مصائب میں گرفتار ہونا ہے۔ اس کے جواب میں مولانا ولایت علی نے فرمایا کہ ایک طرف اللہ اور اس کے رسول کی مرضی ہے اور دوسری طرف انگریزوں کا ڈر۔ ایسی صورت میں کیا جائے۔ اس جواب پر مولانا الٰہی بخش نے مولانا ولایت علی کو دعائیں دیں اور فرمایا اب ہم کو آپ سے کوئی اختلاف نہیں۔(۱)

ہجرت اور آغاز جہاد

حج سے واپسی کے بعد وادیٔ کاغان کے سردار سید ضامن شاہ کاغانی (۲) کی طلب پر جو سکھوں سے برسر پیکار تھے، اپنے بھائی مولانا عنایت علی کو مقام جہاد کی طرف روانہ کیا۔ مولانا عنایت علی اس وقت بنگال میں مصروف تبلیغ تھے۔ بھائی کے بلانے پر دو ہزار مجاہدین کو ساتھ لے کر پٹنہ پہنچے۔

اس سے انگریز حکام میں تشویش پیدا ہوئی۔ مولانا ولایت علی نے مصلحت و دور اندیشی سے کام لے کر حکومت کے شبہ سے بچنے کے لئے پوری جمعیت کو چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بانٹ دیا۔ ہر ٹولی تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد پٹنہ سے کوچ کرتی رہی اور تقریباً پانچ مہینوں میں سب ٹولیاں روانہ ہو گئیں۔ روانگی کا یہ سلسلہ جولائی ۱۸۴۳ء میں شروع ہوا مگر خود مولانا عنایت علی نومبر میں روانہ ہوئے اور ۱۸۴۴ء کے اواخر میں سرحد پہنچے۔(۳) وہاں انہیں باقاعدہ امیر تسلیم کیا گیا۔ ان کے کارناموں کا مستقل بیان آگے آئے گا۔ دو سال بعد مولانا ولایت علی اپنے چھوٹے بھائی مولانا فرحت حسین (۴) کو

---

(۱) تذکرہ صادقہ، ص ۱۷۱۔

(۲) سید ضامن شاہ وادیٔ کاغان کے سردار اور مجاہدین کے حمایتی تھے۔ بالاکوٹ اور بالائی ہزارہ پر مجاہدین کا دوبارہ قبضہ دلانے میں ان کی کوششوں کا بڑا دخل ہے۔ ۱۸۷۱ء میں وفات پائی۔

(۳) ہندوستان میں وہابی تحریک صفحہ ۱۴۳۔ ہنٹر نے دونوں بھائیوں کے سرحد پہنچنے کا سنہ ۱۸۴۱ء بتایا ہے۔ (ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۴۴) جو صحیح نہیں ہے۔

(۴) آپ مولانا عبدالرحیم صادق پوری مصنف تذکرہ صادقہ کے والد تھے ۱۲۷۴ھ میں وفات پائی۔ (تفصیلی حالات کے لئے دیکھئے تذکرہ صادقہ صفحہ ۱۹۷ تا صفحہ ۲۰۱۔)

پٹنہ میں اپنا جانشین مقرر کر کے، مولانا فیاض علی، مولانا یحییٰ علی، مولانا اکبر علی (۱) اور اپنے بڑے صاحبزادہ مولانا عبداللہ کو ساتھ لے کر سید ضامن شاہ کی نصرت واعانت کی غرض سے بالاکوٹ کی طرف روانہ ہوئے (۲) اور ۱۷ر شوال ۱۲۶۲ھ مطابق ۹ر اکتوبر ۱۸۴۶ء کو مقام جہاد پر پہنچے۔ مولانا عنایت علی نے بھائی کا پرجوش استقبال کیا۔ سید ضامن شاہ اور بعض سرداروں کو پیشوائی کے لئے آگے بھیجا۔ مولانا ولایت علی کے پہنچنے پر مولانا عنایت علی نے امارت کی ذمہ داری ان کو سونپی۔ (۳)

اس وقت جموں و کشمیر اور بالائی ہزارہ کے والی گلاب سنگھ اور مجاہدین کے درمیان کشمکش جاری تھی۔ گلاب سنگھ کا انگریزوں سے معاہدہ تھا، اور وہ ان کا بڑا خیرخواہ تھا۔ یہ علاقے انگریزوں نے ہی گلاب سنگھ کو معاوضے میں دیئے تھے، جو ۱۸۴۵ء کی سکھ انگریز جنگ کے بعد ان کے قبضے میں آگئے تھے۔ مولانا نے پہنچتے ہی گلاب سنگھ سے معرکہ آرائی شروع کی۔ اس نے انگریزوں سے امداد طلب کی۔ انگریزوں نے مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی کو خط لکھ کر وارننگ دی کہ اب گلاب سنگھ پر حملہ کرنا اور اس سے جنگ جاری رکھنا انگریزوں سے لڑائی مول لینا ہے۔ (۴)

اور اسی کے ساتھ دیوان کرم چند کی کمان میں انگریزی فوج کا ایک دستہ بھیجا گیا۔ لاہور کے ریزیڈنٹ کی طرف سے مسٹر وینس ایگنو (Wans Agnew) اور لفٹننٹ لمسڈن (Lumsden) اس دستے کے ساتھ تعینات تھے۔ اس کے نتیجہ میں درہ دب کا معرکہ پیش آیا۔ جہاں مجاہدین اور انگریزوں کی کھلم کھلا جھڑپ ہوئی۔

درۂ دب کا معرکہ (۱)

مولانا ولایت علی اکتوبر ۱۸۴۶ء میں پہنچے تھے۔ یہ معرکہ تقریباً تین مہینے بعد

---

(۱) یہ تینوں بھائی تھے۔ مولانا یحییٰ علی کے مجاہدانہ کارناموں کا مفصل تذکرہ انشاءاللہ تیسری جلد میں آئیگا۔

(۲) سوانح احمدی صفحہ ۱۶۱ و تذکرہ صادقہ ۱۶۱۔

(۳) تفصیل کے لئے دیکھئے سرگزشت مجاہدین صفحہ ۲۵۲۔۲۵۶۔

(۴) سوانح احمدی صفحہ ۱۶۱، وتذکرہ صادقہ صفحہ ۱۶۱ ان دونوں کتابوں میں ذکر کیا گیا ہے کہ مولانا نے ڈیڑھ دو برس تک گلاب سنگھ سے جنگ جاری رکھی۔ یہ بات صحیح نہیں ہے اس لئے کہ جنگ درہ دب تین مہینے کے اندر پیش آئی تھی۔ جسکے بعد وہ واقعات پیش آئے جن کا ذکر متن میں آرہا ہے۔

(۱) درہ دب، گڑھی حبیب اللہ اور مظفر آباد کے درمیان پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک مشہور درہ ہے۔

جنوری ۱۸۴۷ء میں پیش آیا۔

سرحد کے فساد زدہ علاقوں پر اپنا اقتدار قائم کرنے کے لئے انگریز سرگرمی سے سکھ حکام اور گلاب سنگھ کی مدد کر رہے تھے۔ دربار لاہور کا انگریز ریزیڈنٹ ہنری لارنس اور اس کی ماتحتی میں ایبٹ، ایڈورڈز اور ٹیلر وغیرہ جوشیلے جوان افسر درحقیقت ان علاقوں میں انگریزی حکومت کی بنیاد ڈال رہے تھے (۱)

اسی مقصد کے پیش نظر انھوں نے مذکورہ فوج بھیجی تھی۔ اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اپنی فطرت سے مجبور ہو کر یہاں بھی سازشوں کا جال بچھا دیا۔ مقامی سردار جو مجاہدین کے ہمنوا بلکہ بعض تو ان کے داعی تھے تذبذب کا شکار ہو گئے۔ پھر جاگیروں کے لالچ میں انگریزوں سے مل گئے۔

تیسری طرف یہ افواہ پھیلا دی گئی کہ پکھلی کی طرف سے بھی ایک سکھ لشکر آ رہا ہے۔ دو طرفہ حملہ کے خطرہ سے مجاہدین کے بہت سے مقامی پیرو مرعوب ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ چنانچہ جب مزاحمت ہوئی تو نتیجہ ظاہر تھا کہ مجاہدین دس رجمنٹوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ ان کو پسپائی ہوئی اور سب نے ہتھیار ڈال دیئے۔ سوائے میر اولاد علی کے جو بچتے بچاتے ستھانہ پہنچ گئے۔ (۲)

مراجعت پٹنہ اور پابندی کی زندگی

ایک روایت کے مطابق مولانا ولایت علی نے سید اکبر شاہ کے پاس سوات جانا چاہا۔ اس کے لئے انگریزی عملداری سے گزرنا پڑتا تھا۔ سرکار انگریزی مزاحم ہوئی۔ (۳)

بہرحال ان سے ہتھیار لئے گئے۔ اور مولانا ولایت علی اور ان کے ساتھیوں کو جو اس وقت چار سو کی تعداد میں تھے، سرکاری نگرانی میں لاہور پہنچایا گیا۔ راستہ میں بیرکادوراہ کے مقام پر مسٹر ایبٹ (۴) ملا۔ وہ بالاکوٹ تک ان کے ساتھ گیا۔ وہاں

(۱) ہندوستان میں وہابی تحریک صفحہ ۱۴۹۔
(۲) ایضاً۔ صفحہ ۱۵۰۔ نیز سرگزشت مجاہدین صفحہ ۲۶۰-۲۶۲۔
(۳) سوانح احمدی صفحہ ۱۶۱-۱۶۲۔ و تذکرہ صادقہ صفحہ ۱۶۲۔
(۴) پروفیسر محمد مسلم نے ترجمہ میں ابوٹ لکھا ہے مگر اس کا صحیح املا ایبٹ ہے اسلئے ہم نے بدل دیا ہے۔

انگریزوں کی بارہ رجمنٹیں تھیں اور ہزارہ میں سپاہیوں کی بڑی تعداد تھی۔ مسٹر ایبٹ نے مولانا ولایت علی سے سوال کیا اب تم کدھر جاؤ گے؟ انھوں نے کہا ''ستھانہ'' اس پر ایبٹ بولا کہ بہتر ہے کہ تم ہزارہ چلو اور لاٹ صاحب (ہنری لارنس ریزیڈنٹ لاہور) سے ملو، وہ جو حکم دیں وہ کرو۔ اس وقت وہ بے بس تھے۔ اور ہزارہ جانے اور قلعہ کے نزدیک کیمپ لگانے پر مجبور تھے۔ چند دن کے بعد لاٹ صاحب نے مولانا ولایت علی، مولانا عنایت علی، مولوی میر مقصود علی، مولوی فیاض علی اور مولوی یحیٰ علی کو بلا بھیجا۔ وہ خیمے میں داخل ہوئے تو ان سے یہ سوال کئے گئے: کیا تم صادق پور عظیم آباد کے باشندہ نہیں؟ کیا تم انگریز کی رعایا نہیں؟ کیا تم گورنمنٹ کو مال گزاری ادا نہیں کرتے؟ تم اس ملک میں کیوں آتے ہو؟ انھوں نے جواب دیا اپنے دین کی رو سے ہم کو کافروں سے لڑنا ہے، سکھ (۱) ہمارے دشمن ہیں۔ اسلئے ہم ان سے لڑنے آئے ہیں۔ لاٹ صاحب نے جواب دیا کہ یہ ملک تو انگریزوں کا ہے اب تم کیا کرو گے؟ انھوں نے کہا ہم کابل چلے جائیں گے۔ لاٹ صاحب نے کہا اگر تم وہاں چلے جاؤ گے تو پھر سازش کرو گے اور انگریزوں سے لڑنے لگو گے۔ اس لئے میں تم کو وہاں جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ تب انھوں نے حکم صادر کیا کہ یہ سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس جائیں۔ (۲)

چنانچہ مولانا ولایت علی، مولانا عنایت علی، مولانا یحییٰ علی اور میر مقصود علی کو براہ لاہور عظیم آباد پٹنہ پہنچایا گیا۔ جہاں دونوں بھائیوں سے دو سال کیلئے مچلکے لئے گئے۔ (۳)

مچلکے کا مقصد کیا تھا؟ مہر صاحب کہتے ہیں:

---

(۱) یہ دراصل مقصد پر پردہ ڈالنے کے لئے ایک عذر تھا۔ مگر انگریز ان کے اصل مقصد (انگریزوں سے جنگ) کو خوب سمجھتے تھے۔ یہ حقیقت لاٹ صاحب کے جواب سے بھی ظاہر ہے۔

(۲) یہ واقعہ عبداللہ حاجی پوری کے بیان سے ماخوذ ہے جو مولانا ولایت علی ساتھ خود جنگ میں شریک تھا۔ (ملاحظہ ہو ہندوستان میں وہابی تحریک صفحہ ۱۵۴۔۱۵۵)

(۳) تذکرہ صادقہ اور سوانح احمدی میں مچلکہ کی مقدار دو دو سو روپے اور میعاد دو دو سال بتائی گئی ہے۔ اوکنلے نے مقدار دس دس ہزار روپے اور مدت چار سال بتائی ہے۔ عبداللہ کے بیان میں بھی مدت چار سال بتائی گئی ہے اور مقدار کا تذکرہ نہیں۔ مولانا مہر نے مقدار دس ہزار اور مدت دو سال کو راجح قرار دیا ہے (سرگزشت صفحہ ۲۶۷) مدت بہرحال دو سال ہے اس لئے کہ ستمبر ۱۸۴۹ء میں پابندیاں ختم ہو کر مولانا ولایت علی نے علی الاعلان ہجرت کی تھی۔ غالباً عبداللہ سے غلطی ہوئی ہے۔

اگر مچلکے کا مقصد یہ تھا کہ مولانا ولایت علی یا مولانا عنایت علی عظیم آباد سے باہر نہ جائیں۔ یا مختلف علاقوں میں دوروسیر سے محترز رہیں اور وعظ و نصیحت بھی نہ کریں، تو کم از کم مولانا صاحبان نے اس کا یہ مطلب نہ سمجھا۔ اغلب یہ ہے کہ مچلکے کا مقصد محض یہ ہو کہ وہ سرحد نہ جائیں، اور سکھوں سے رزم و پیکار کا سلسلہ دوبارہ شروع نہ کریں۔ (۱)

مگر عبداللہ حاجی پوری کے بیان کو سامنے رکھا جائے تو اس طرح کی قیاس آرائیوں کی ضرورت نہیں رہتی۔ ان کا کہنا ہے کہ مچلکہ سے ان کو پابند بنایا گیا تھا کہ پٹنہ سے باہر نہ جائیں۔

مگر اس کے باوجود دونوں بھائی پٹنہ سے نکلے۔ جیسا کہ تذکرہ صادقہ سے معلوم ہوتا ہے۔ تو سمجھنا چاہیئے کہ کار پردازان حکومت نے اس پابندی پر عمل کرانے کا کوئی خاص خیال نہ کیا۔ البتہ اس پر کڑی نظر رکھی گئی کہ سرحد کی طرف رخ نہ کریں۔

اوکنلے کا بھی یہی کہنا ہے کہ واقعی مچلکے کی شرطیں پوری کرانے کے لئے کوئی تدبیر اختیار نہ کی گئی۔ (۲)

اس دو سال کے عرصہ میں مچلکے کے باوجود ان کی عام مشغولیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ مگر ایسی کوئی حرکت ان سے سرزد نہیں ہوئی، جس سے حکام کو یقین ہو جائے کہ یہ سرحد کی طرف بھاگ جانا چاہتے ہیں۔ اسی وجہ سے اہل کاروں نے ان کی دوسری مشغولیات پر کوئی مزید پابندی نہیں لگائی۔ مگر مولانا اس دارالحرب میں بڑی گھٹن محسوس کرتے تھے اور نکلنے کے لئے بے چین تھے۔ مولانا عبدالرحیم صادق پوری لکھتے ہیں :

اس دو سال کے عرصہ میں بدستور سابق وعظ و نصائح اور مراقبہ و مشاہدہ میں مصروف ہو گئے اور صوبجات میں واسطے ہدایت کے دور و سیر کرنے لگے اور مبلغین کو مختلف اضلاع و صوبجات میں روانہ فرمایا کئے۔ چنانچہ چند ماہ کے بعد مولانا عنایت علی کو پھر ملک بنگالہ روانہ کیا۔ مگر جناب کو ہندوستان میں واپسی کا نہایت رنج و ملال تھا۔ اکثر دو پہروں اور راتوں کو زیر آسمان کھڑے ہو کر اور کبھی سجدہ میں سر رکھ کر نہایت بے قراری واضطراب کے ساتھ اس ملک سے نکلنے کی دعا کرتے رہتے۔ (۳)

(۱) سرگزشت مجاہدین صفحہ ۲۶۸۔
(۲) ایضاً صفحہ ۲۶۸۔ (۳) تذکرہ صادقہ صفحہ ۱۶۳۔

اسی پر بس نہیں کیا بلکہ جیسا کہ اوکنلے نے لکھا ہے ستھانہ میں بقیہ مجاہدین کے سردار میر اولاد علی سے مراسلت شروع کردی تھی اور پختہ ارادہ کرلیا تھا کہ شمال مغرب میں اپنی چھنی ہوئی طاقت کی بحالی کے لئے کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہ رکھیں گے۔(۱)

مستقل ہجرت

مچلکے کی میعاد پوری ہونے کو چند ماہ باقی تھے کہ مولانا ولایت علی نے اپنے دولت خانہ کو فرش و فروش جھاڑ فانوس و دیگر اشیائے زینت سے خوب آراستہ کیا اور اصطبل میں عمدہ عمدہ گھوڑے خرید کر باندھے اور عمدہ عمدہ رنگین کبوتروں سے کبوتر خانہ سجوا دیا تاکہ لوگوں کو یقین ہو جائے کہ آپ دنیا میں خوب پھنس گئے۔ اور اب ترک آرائش اور ترک وطن نہ کرسکیں گے۔(۲)

یہ مولانا عبدالرحیم کا بیان ہے۔ ڈاکٹر قیام الدین لکھتے ہیں :

جب نیک چلنی کی ضمانت کی مدت کے اختتام کو چند دن باقی رہ گئے تو انھوں نے اپنی تمام جائیداد منقولہ وغیرہ فروخت کردی اور ستمبر ۱۸۴۹ھ کو ہجرت کر گئے۔(۳)

مگر قیاس یہ کہتا ہے کہ مدت ختم ہونے سے پہلے مولانا نے مکان کی خوب سجاوٹ کی۔ سارے سازوسامان مہیا کئے۔ جس سے یہ ظاہر ہو کہ مولانا اب ترک وطن کا ارادہ نہیں رکھتے۔ یہ مولانا کی ایک تدبیر تھی تاکہ حکام کے پاس اس قسم کی کوئی شکایت نہ پہنچے کہ مولانا پھر سرحد جانا چاہتے ہیں، اس لئے کہ حکومت کے جاسوس ہر جگہ پھیلے ہوئے تھے۔ مگر جیسے ہی میعاد ختم ہوئی تو مولانا نے اپنی ساری جائداد منقولہ و غیر منقولہ سب فروخت کردی، اس لئے کہ اب مولانا مستقل ہجرت کا ارادہ کر چکے تھے۔(۴)

---

(۱) دیکھئے سرگزشت مجاہدین صفحہ ۲۶۹

(۲) تذکرہ صادقہ، صفحہ ۱۶۳

(۳) ہندوستان میں وہابی تحریک صفحہ ۱۵۷

(۴) اس سے دونوں بیانوں میں تطبیق ہوجاتی ہے اور مولانا عبدالرحیم کے بیان پر کوئی اشکال نہیں ہوتا۔ جیسا کہ مہر کو ہوا ہے۔ وہ کہتے ہیں: یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ دنیاداری کے اس اہتمام سے لوگوں کو یہ یقین دلانے کی کیا ضرورت تھی کہ اب ترک وطن نہ کرسکیں گے۔ حالانکہ ترک وطن علی الاعلان کیا (سرگزشت مجاہدین صفحہ ۲۷۰) اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ترک وطن علی الاعلان کیا تھا==

مولانا عنایت علی اس وقت بنگال میں تھے۔ ان کو لکھ بھیجا کہ وہاں کے معاملات ختم کر کے پٹنہ آ جاؤ (۱)۔ اور اپنے بڑے صاحبزادہ مولوی عبداللہ اور مولی فیاض علی (بن مولوی الٰہی بخش برادر مولانا یحییٰ علی) سے فرمایا کہ ایک ہفتہ کے اندر کل عیال واطفال اور اسباب سفر کے ساتھ موضع گڈھانہ (۲) میں آ کر ملو۔ اور خود ۱۳/شوال ۱۲۶۵ھ مطابق یکم ستمبر ۱۸۴۹ء کو چند مخلصین کو ساتھ لے کر سوات کی طرف روانہ ہوئے۔ اسی اثناء میں سوات کے سید اکبر شاہ کی طرف سے دعوت کے خطوط آئے تھے۔ گویا وہاں بھی لوگ منتظر تھے کہ جیسے ہی مچلکہ کی مدت ختم ہو مولانا پھر یہاں تشریف لائیں تاکہ ان کی سربراہی میں جلد سے جلد جہادی کاروائیاں شروع کی جائیں۔ مولانا ولایت علی نے اپنے سب سے چھوٹے بھائی مولانا فرحت حسین کو تنظیم کی سربراہی کے لئے پٹنہ میں چھوڑ دیا۔ خاندان کے تین ارکان مولوی یحییٰ علی (۳) مولوی فیاض علی اور مولوی عبداللہ ۲۵۰ مردوں اور عورتوں کے ساتھ بعد میں روانہ ہوئے، اور آرہ کے مقام پر مولانا ولایت علی سے مل گئے۔ (۴)

مکان میں جو لوگ رہ گئے تھے ان میں صرف پانچ مرد اور دو عورتیں تھیں۔ (۵) مولانا ولایت علی عظیم آباد سے نکلے اور گڈھانہ، کوئلور، آرہ، غازی پور، قنوج وغیرہ ہوتے

== جیسا کہ مولانا کے اہتمام وانتظام سے معلوم ہوتا ہے نہ کہ خفیہ طریقہ سے جیسا کہ مولانا مسعود عالم صاحب نے لکھا ہے۔ (ہندوستانی کی پہلی اسلامی تحریک صفحہ ۴۸)

(۱) آباد شاہ پوری لکھتے ہیں:
مولانا ولایت علی نے عظیم آباد چھوڑنے سے پہلے مولانا عنایت علی کو بنگال پیغام بھیجا کہ وہ بھی گھر ہوتے ہوئے سوات چلے آئیں کھنہ کے مقام پر ہم ان کا انتظار کریں گے۔ یہی وہ دن تھے جب راجشاہی کے مجسٹریٹ نے ان کی سرگرمیوں کی تحقیقات کا حکم دے دیا تھا، (اس کا ذکر آگے آرہا ہے) مولانا عظیم آباد چلے جانے کا فیصلہ کر چکے تھے کہ انہیں بڑے حضرت (مولانا ولایت علی) کا پیغام مل گیا۔ فوراً بنگال کا نظام قابل اعتماد کارکنوں کو سونپا اور وطن چلے آئے۔
(سید بادشاہ کا قافلہ صفحہ ۱۷۸)

(۲) عظیم آباد سے سات کوس جانب مغرب ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔

(۳) مولانا عبدالرحیم نے لکھا ہے کہ مولانا یحیی علی کو مولانا ولایت علی اپنے ساتھ لے کر روانہ ہوئے تھے۔ تذکرہ صادقہ صفحہ ۱۶۳۔

(۴) ہندوستان میں وہابی تحریک صفحہ ۱۵۹۔

(۵) تذکرہ صادقہ صفحہ ۱۶۳۔

ہوئے دہلی پہنچے۔ راستہ میں ہر جگہ گرم جوشی سے استقبال ہوا۔ لوگ چشم براہ تھے۔ ان مہاجرین و مجاہدین کو انھوں نے ہر طرح سے آرام پہنچانے کی کوشش کی۔ یہ وہ علاقے تھے جہاں سید صاحب کے کام اور آپ کی دعوت و پیغام کا پہلے سے تعارف تھا اور اکثر علاقوں میں سید صاحب خود جا چکے تھے۔ جگہ جگہ وعظ و نصیحت کرتے اور دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دیتے ہوئے آٹھ نو مہینوں کے بعد دہلی پہنچے۔ (۱) دہلی میں تقریباً دو مہینے ٹھہرے۔ تذکرہ صادقہ میں قیام دہلی کی تفصیل ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دہلی میں مسجد فتح پوری کے قریب ایک وسیع مکان میں فروکش ہوئے جو آسیب زدہ تھا، اور اس وجہ سے ویران پڑا ہوا تھا۔ مولانا کے روزانہ وعظ ہوتے۔ یہ جامع مسجد اور مختلف مقامات اور اطراف دہلی میں ہوتے تھے۔ ان مجالس وعظ میں مشہور شاعر حکیم مومن خان اور ملکہ زینت محل کے استاد مولوی امام الدین بھی شریک ہوتے تھے۔ دونوں نے مولانا ولایت علی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ مولوی امام الدین نے بیگم اور بادشاہ بہادر شاہ ظفر سے ان کے اعمال کا ذکر کیا۔ بادشاہ نے بھی ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ مولانا نے اول تو معذرت کی۔ پھر اصرار کی وجہ سے تشریف لے گئے۔ بادشاہ نے دیوان خاص میں اجلاس فرمایا۔ مولانا پچھتر آدمیوں کے ساتھ قلعہ میں تشریف لے گئے۔ بادشاہ نے تخت سے اتر کر لب فرش تک آپ کا استقبال کیا۔ اور معانقہ و مصافحہ کے بعد مسند پر گاؤ تکیہ کے ایک طرف اپنے ساتھ بٹھایا اور آپ کے ساتھیوں سے بھی مصافحہ کیا۔ مولانا نے آیت إنما الحياة الدنيا لعب ولهو وزينة وتفاخر بينكم. الآیہ تلاوت فرمائی اور دنیا کی بے ثباتی پر نہایت وضاحت کے ساتھ پر اثر طریقہ پر بیان فرمایا۔ وزیر اعظم نے آپ کے کان میں کہا کہ بادشاہ سلامت کے سامنے عذاب کے بیان کرنے کا دستور نہیں مگر آپ عذاب قبر، ہنگامہ حشر اور روح کا بیان نہایت شد و مد سے کرتے رہے جس سے بادشاہ، شہزادگان، ملکہ زینت محل اور تمام حاضرین متاثر ہو کر زار زار رونے لگے اور اس

(۱) تذکرہ صادقہ صفحہ ۱۶۴ میں ڈیڑھ برس کے بعد لکھا ہے۔ مگر وہ صحیح نہیں معلوم ہوتا اس لئے کہ شوال ۱۲۶۵ھ میں گھر سے نکلے تھے۔ رمضان کے قریب دہلی سے روانگی ہوئی تھی۔ اس کے بعد لدھیانہ میں (۷/محرم ۱۲۶۷ھ مطابق ۱۲/نومبر ۱۸۵۰ء) کو دونوں بھائیوں کی ملاقات کا ذکر آتا ہے۔ اس لئے دہلی سے نکلتے ہی جس رمضان کا چاند دیکھا گیا تھا وہ لامحالہ ۱۲۶۶ھ کا رمضان ہے۔

کے بعد بادشادہ کے ایماء پر ریزیڈنٹ نے مولانا اور ان کے ساتھیوں کو شاہی عمارات کی سیر کرائی۔ پھر جب قیام گاہ پر پہنچے تو کھانوں کے پچاس خوان مطبخ شاہی سے مولوی امام علی اور مشہور شاعر مولوی مومن خان لے کر حاضر ہوئے۔

رمضان کا مہینہ قریب آ گیا تھا بادشاہ نے خواہش ظاہر کی کہ مولانا رمضان مبارک قلعہ معلی میں گزاریں تاکہ قلعہ کے لوگ آپ کے ساتھ نماز تراویح ادا کریں اور مہینہ بھر وعظ سے مستفید ہوتے رہیں۔ لیکن ریزیڈینٹ نے مولانا کے متعلق ایسے انداز سے پرسش شروع کی تھی کہ سفر میں رکاوٹ کا اندیشہ لاحق ہو گیا۔ اس لئے مولانا نے زیادہ ٹھہرنا خلاف مصلحت سمجھا اور معذرت کر کے روانہ ہو گئے اور اسی دن شام کو جمنا پار پہنچے، وہیں رمضان کا چاند دیکھا۔(۱)

اس کے بعد تیز تیز کوچ کرتے ہوئے لدھیانہ پہنچے اور کھنہ کی سرائے میں ٹھہر کر اپنے بھائی مولانا ولایت علی کا انتظار کرنے لگے، اسی سرائے میں ۷ر محرم ۱۲۶۷ھ مطابق ۱۲ر نومبر ۱۸۵۰ء کو دونوں بھائیوں میں ملاقات ہوئی۔ پھر دونوں ایک ساتھ چل پڑے۔ اوکنلے کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی ستھانہ پہنچ گئے۔ اور ان کے بعض ساتھیوں کو کھبل (۲) میں روکا گیا۔ آدمی نکل گئے لیکن اونٹ روک لئے گئے۔ جن پر مال و اسباب لدا تھا۔ اور انہیں ڈپٹی کمشنر ہزارہ کے پاس پیش کر دیا گیا اس نے حکم دیا کہ انہیں بہ حفاظت مالکوں کو لوٹا دیا جائے۔(۳)

ستھانہ پہنچنے کی تاریخ ۸ر ربیع الآخر ۱۲۶۷ھ مطابق ۱۰ر فروری ۱۸۵۱ء ہے (۴)

مولانا عبدالرحیم صاحب صادق پوری نے لکھا ہے کہ مولانا ولایت علی اپنے فرزند مولانا عبداللہ سے فرما گئے تھے کہ ہمراہیوں کو چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں روانہ کرنا اور خود

---

(۱) تذکرہ صادقہ صفحہ ۱۶۴-۱۶۵۔ وسوانح احمدی صفحہ ۱۶۵-۱۶۶۔

(۲) کھبل، تربیلہ کے سامنے دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر واقع ہے، ستھانہ سے اس کا فاصلہ پانچ چھ میل ہوگا۔

(۳) انگریزوں نے مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی کے سفر کی رکاوٹ نہیں کی جس کی وجہ بقول آبادشاہ پوری غالباً یہ ہے کہ دونوں ہندوستان میں رہتے ہوئے انگریزوں کے لئے کہیں زیادہ خطرہ بن سکتے تھے۔ (سید بادشاہ کا قافلہ صفحہ ۱۸۲)

(۴) سرگزشت مجاہدین صفحہ ۲۷۳۔ یہ مہر کی تحقیق ہے۔ تاریخ میں کچھ اختلاف بھی ہے ملاحظہ ہو ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک صفحہ ۲۵۲-۲۵۳ حاشیہ)

جملہ اہل وعیال کے ساتھ جلد جلد منزلیں طے کر کے پہنچنا۔(۱)

مہر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے اہل وعیال آپ کے پہنچنے کے آٹھ روز بعد ۱۶ ربیع الآخر مطابق ۱۸ فروری کو پہنچے۔(۲)

سرحد کی مشغولیت اور انگریزوں کی مزاحمت

سرحد پہنچ کر آپ نے اپنے دعوت واصلاح کے مشاغل جاری کیے، قرآن وحدیث کا درس بھی شروع فرمایا۔ چونکہ ہجرت کا مقصد جہاد تھا۔ اس کے لئے فن حرب سے پوری واقفیت بہم پہنچانے کی ضرورت تھی، لہٰذا آپ نے سپہ گری کی طرف توجہ فرمائی۔(۳) چنانچہ قواعد کا بھی ایک وقت معین تھا جیسے درس کا متعین وقت تھا۔

جب آپ کی ہجرت کی خبر ہندوستان میں مشہور ہوئی تو اکثر مخلصین ہندوستان سے ہجرت کر کے آپ کے پاس پہنچ گئے۔(۴)

ان مجاہدین کی آمد سے اچھی خاصی جمعیت اکٹھی ہوگئی۔ مولانا ولایت علی کا یہ اجتماع انگریزوں کو سخت ناگوار تھا۔ انگریزی حکومت کی یہ کوشش رہی کہ ان کی جمعیت کو توڑ دیں۔ اس کے لئے انگریزی حکومت کی طرف سے بار بار حملے ہوتے رہے۔ مولانا ولایت علی ان حملوں کا دفاع کرتے رہے۔ اس دفاعی کاروائی میں مولانا ولایت علی ہمیشہ کامیاب رہے اور انگریزی فوج کو ہمیشہ شکست ہوتی رہی۔

دونوں بھائیوں کے نقطۂ نظر کا اختلاف

بہت سے مجاہدین کی رائے تھی کہ مولانا انگریزوں پر جارحانہ حملہ کریں۔ دفاع پر اکتفا نہ کریں۔ ان کے سرگروہ مولانا ولایت علی کے برادر خورد مولانا عنایت علی تھے۔ عام مجاہدین کو انگریزوں کے مقابلہ میں اپنی قلت تعداد کا احساس تھا، مگر مولانا

(۱) تذکرہ صادقہ صفحہ ۱۶۵

(۲) سرگزشت مجاہدین صفحہ ۲۷۴

(۳) مولانا عبدالرحیم نے (تذکرہ صادقہ صفحہ ۱۶۶) سپہ گری کا باعث مقامی حالات کی مجبوری اور باشندوں کی خودسری بتایا ہے۔ جو اصل نصب العین سے اعراض ہی نہیں بلکہ سراسر تحریف ہے۔ مہر نے خوب خبر لی ہے۔ (ملاحظہ ہو سرگزشت صفحہ ۲۷۴۔۲۷۵)

(۴) تذکرہ صادقہ صفحہ ۱۶۶۔

عنایت علی اور ان کے حامی قرآن مجید کی آیت۔ ”کم من فئة قلیلة غلبت فئة کثیرة باذن اللہ۔“
(بارہا چھوٹی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آ گئی ہیں) استدلال میں پیش کرتے تھے۔ مولانا ولایت علی نے فرمایا کہ جس جماعت کے غلبہ کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے ویسی ہی جماعت ہم بنانا چاہتے ہیں (۱) مولانا کا مطلب یہ تھا کہ پہلے اچھی طرح اسلامی تربیت کی جائے، بالفاظ دیگر پہلے ”استخلاف و تمکین فی الارض“ کا استحقاق پیدا کریں، پھر خدا کی مدد سے انگریزوں پر ایسا حملہ کریں کہ ان کے پاؤں اکھڑ جائیں اور ہماری فتح یقینی ہو جائے۔ اور اگر ایسی جماعت کے تیار ہونے میں زیادہ تاخیر ہو سکتی ہے تو کم سے کم تعداد ہی کچھ بڑھ جائے، اور سامان حرب و ضرب میں اضافہ ہو جائے۔ مولانا کی رائے تھی کہ پہلے مناسب تیاری کر لی جائے پھر انگریزوں پر حملہ کیا جائے، تاکہ قوت کے بل بوتے پر انگریز ہمیں شکست نہ دے سکیں۔ ان کے نزدیک، مناسب تیاری سے پہلے حملہ کرنا دانشمندی کے خلاف تھا۔ حالات ان کے سامنے تھے۔ اوکنلے کے بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ مولانا ولایت علی وسطی ہند، دکن، بمبئی اور سندھ میں پھر چکے تھے۔ حکومت برطانیہ کی طاقت و قوت کا بھر انداز کر چکے تھے۔ جو مرہٹوں، مسلمان پنڈاریوں، امیران سندھ اور سکھوں کو تباہ کر چکی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ ابھی ہماری طاقت انگریزوں کے مقابلے کے لئے کافی نہیں، اسی لئے بار بار کہتے تھے کہ مجاہدین کی جو چھوٹی سی جماعت جمع ہو گئی ہے اس سے ہندوستان کو فتح کر لینا غیر ممکن ہے۔ ناکافی طاقت کے ساتھ اقدامات کر بیٹھنا مجاہدین

---

(۱) یہ تفصیل مولانا حکیم عبدالخبیر صاحب کے بیان سے ماخوذ ہے۔ یہ تذکرہ صادقہ میں ان کے اضافات میں سے ہے۔ مولانا ولایت علی کی آخری سرحدی زندگی میں انگریزوں پر دفاعی حملوں کا ان کے علاوہ کسی نے ذکر نہیں کیا ہے۔ مولانا کے بیان کے مستند ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ مولانا عبدالخبیر صاحب، مولانا احمد اللہ صاحب (برادر مولانا یحییٰ علی صادق پوری) جو خود مولانا ولایت علی کے ساتھ سرحد میں موجود تھے کے پوتے اور مولانا عبدالرحیم صاحب ”تذکرہ صادقہ“ کے نواسے تھے۔ اور خاندان کے سب سے معمر شخص تھے۔ مولانا عبدالسمیع جعفری ندوی موجودہ امیر جماعت اہل حدیث پٹنہ آپ ہی کے صاحبزادے ہیں۔

کی ہمت شکنی کا باعث ہوگا۔ دوسری طرف قبل از وقت کسی کارروائی سے حکومت برطانیہ کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ ہمارے مقاصد کی حقیقی حیثیت کا اسے ایک مرتبہ پورا احساس ہو گیا تو ہندوستان سے روپے کی امداد روک لے گی، اور حکومت اپنی رعایا کو جہاد کی حمایت سے منع کر دے گی۔(۱)

مولانا عنایت علی زیادہ جوشیلے تھے ان کا اصرار تھا کہ فوری کارروائی شروع کر دی جائے اور انگریزوں کے خلاف بلا توقف جنگ کا بگل بجا دیا جائے۔ ان کے خیال میں مزید صبر و تامل سے ایمان کی کمی ثابت ہوتی تھی۔ نیز وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ جنگ شروع ہوتے ہی اسباب مہیا ہوتے جائیں گے اور باحمیت مسلمان خود بخود مجاہدین کے ساتھ شامل ہو جائیں گے اور جان و مال سے ان کی مدد کریں گے۔ غالباً ان کی نظر بنگال پر تھی جہاں انھوں نے طویل قیام کر کے ایک بڑی جماعت کو اپنا ہمنوا بنا لیا تھا۔(۲)

ایک واقعہ نے دونوں بھائیوں کے درمیان اختلاف کو اور نمایاں کیا۔ امب کا والی جہاں داد خاں دوسرے مقامی سرداروں کی طرح انگریزوں سے مل گیا تھا، اور مہر صاحب کی تحقیق کے مطابق مجاہدین کی نقل و حرکت میں بھی رکاوٹ ڈالتا تھا۔ مولانا عنایت علی اس کو مزہ چکھانا چاہتے تھے۔ انھوں نے اصرار شروع کیا کہ جہاں داد خاں کے خلاف فوراً تادیبی کارروائی کی جائے۔ مولانا ولایت علی کے پیش نظر یہ مصلحت تھی کہ نواب جہاں داد خاں کے خلاف کارروائی کا آغاز کیا گیا تو مجاہدین کی مشکلات بڑھ جائیں گی۔ اور تنظیم جس اطمینان کی متقاضی ہے، اس کا بھی کوئی موقع باقی نہ رہے گا۔ ممکن ہے اس سلسلے میں یہ امر بھی مولانا ولایت علی کے پیش نظر رہا ہو کہ جن سادات ستھانہ نے ان کو اپنے پاس ٹھہرایا ہے، وہ نواب جہاں داد خاں کے قریبی رشتہ دار ہیں اور اس وجہ سے پیچیدگیاں بڑھنے کا ہی اندیشہ ہو سکتا تھا(۳) نیز وہ مقامی سرداروں سے الجھ کر مزید مشکلات پیدا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان مقامی لڑائیوں کا نتیجہ

(۱) سرگزشت مجاہدین ۲۷۷۔ وہندوستان میں وہابی تحریک صفحہ ۱۶۲۔
(۲) مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی کے مابین اختلاف کی بنیاد سمجھنے کے لئے سید بادشاہ کا قافلہ صفحہ ۱۷۹-۱۸۱ (از آباد شاہ پوری) کا مطالعہ بھی مفید ہوگا۔
(۳) سرگزشت مجاہدین صفحہ ۲۷۶۔

یہ ہوگا کہ اس سرزمین میں کاروبار جہاد جاری رکھنا دشوار ہو جائے گا اور اصل مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔

بہرحال اختلاف بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچا کہ پوری جماعت دو گروہوں میں تقسیم ہوگئی۔ بنگال کے زیادہ تر مجاہدین مولانا عنایت علی کے ہم خیال تھے اور باقی اصحاب بشمول اکابر صادقپور مولانا ولایت علی کے طریقہ کار کو درست سمجھتے تھے اور یہی قرین مصلحت تھا۔ جب جماعت دو ٹکڑوں میں بٹ گئی تو آپس میں لڑائی کا خطرہ پیدا ہوگیا۔ اس وقت مولانا ولایت علی دونوں جماعتوں کے سامنے آئے اور امارت سے سبکدوش ہونے کا ارادہ ظاہر کیا اور دعا کی کہ خدا اس آڑے وقت میں ان کی حفاظت کرے اور بھائی بھائی کے درمیان جنگ سے بچائے۔ مولانا عنایت علی نے یہ نازک صورت حال دیکھی تو ستھانہ سے اٹھ کر منگل تھانہ چلے گئے (۱) یہ واقعہ ۲۷ ر شعبان ۱۲۶۸ھ (۱۶ ر جون ۱۸۵۲ء) کا ہے (۲) اس کے تقریباً پانچ ماہ بعد ۲۲/محرم ۱۲۶۹ھ (۵/نومبر ۱۸۵۲ء) کو مولانا ولایت علی نے بہ عارضہ خناق انتقال کیا اور اپنے مرکز کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

تیسری فصل

مولانا عنایت علی عظیم آبادی

مولانا عنایت علی اپنے بھائی مولانا ولایت علی سے دو تین سال چھوٹے تھے۔ مولانا ولایت علی ۱۲۰۵ھ میں پیدا ہوئے تھے اور مولانا عنایت علی کی پیدائش ۸-۱۲۰۷ھ کی ہے۔ (۳) سید صاحب کے سفر حج سے واپسی پر پٹنہ میں قیام کے دوران آپ سے بیعت

---

(۱) ہندوستان میں وہابی تحریک صفحہ ۱۶۲

(۲) یہ مہر صاحب کی تحقیق ہے اور یہی صحیح ہے۔ ڈاکٹر قیام الدین نے اس کی تاریخ محرم ۱۲۶۸ھ (غلطی سے اردو ترجمہ میں ۱۳۶۳ھ چھپا ہے) مطابق اکتوبر نومبر ۱۸۵۱ء بتائی ہے۔ دراصل اختلاف کا آغاز محرم ۱۲۶۸ سے ہوا تھا اور یہ خاص واقعہ مذکورہ تاریخ میں پیش آیا تھا۔

(۳) یہ تذکرہ صادقہ صفحہ ۱۸۵ کے مطابق ہے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے مولوی عبدالغفار صاحب صادق پوری کے حوالہ سے بالضبط ۱۲۰۷ھ لکھا ہے (کاروان ایمان وعزیمت صفحہ ۱۰۶)

ہوئے اور تا حین وفات سید صاحب کے مقاصد کو سینے سے لگائے رکھا۔ دعوت و تبلیغ کی خاطر بنگال کے لئے آپ کا انتخاب ہوا تھا۔ چنانچہ سید صاحب کے حکم پر معرکہ جہاد سے بنگال آئے اور جانفشانی کے ساتھ اصلاح و تربیت میں منہمک ہو گئے۔ معرکہ بالاکوٹ تک اس میں لگے رہے۔ اسی زمانہ میں اپنے والد صاحب کی بیماری کی وجہ سے پٹنہ لوٹ آئے۔

بنگال میں سرگرمیاں

مولانا ولایت علی نے دوبارہ دعاۃ و مبلغین کا تقرر کیا تو مولانا عنایت علی کو بنگال ہی بھیجا۔ اس لئے کہ وہ زمین ان کی تیار کی ہوئی تھی۔ مولانا عنایت علی نے بنگال کے مشرقی اضلاع میں وسیع پیمانے پر تبلیغی دورے کئے اور پورے مشرقی بنگال میں جہاد کی روح پھونک دی۔

سرکاری افسر کی مولانا کے خلاف شکایت اور رپورٹ

اس زمانہ کی پولس رپورٹوں سے بھی ان کے کاموں کے متعلق مستند اطلاعات دستیاب ہیں۔ مارچ ۱۸۴۳ھ میں زیریں صوبوں کے سپرنٹنڈنٹ پولس نے حکومت کو مسلمان ''ملاؤں'' کے ایک جتھے کی موجودگی کی رپورٹ دی تھی جو باراسٹیٹ، جیسور، پٹنہ اور راجشاہی وغیرہ اضلاع کا چکر لگاتے اور سکھوں اور حکومت انگریزی کے حلیفوں کے خلاف جہاد کا وعظ کرتے پھرتے ہیں۔ اس غرض سے رنگروٹ اور روپے فراہم کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اس گروہ کا سردار ایک پٹنہ کا باشندہ عنایت علی نامی ہے۔ رپورٹ میں یہ بھی درج ہے کہ رنگروٹ حاصل کرنے میں تو ان کو زیادہ کامیابی نہیں ہوئی مگر روپئے کی فراہمی زیادہ کامیابی سے جاری ہے۔

اسی افسر نے ایک اور رپورٹ دوسرے ملاؤں اور ان کے سربراہوں کے متعلق ارسال کی تھی۔ اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ عنایت علی کے علاوہ کرامت علی (۱) اور زین العابدین حیدرآبادی (۲) بھی اضلاع مذکورہ میں کام کر رہے ہیں۔ رنگروٹوں کے لئے ان کی اپیل کا حوصلہ افزا خیر مقدم ہوا۔ انھوں نے جنگی پور کے پاس ضلع مرشدآباد کے

(۱) مولانا کرامت علی جونپوری، ان کی سرگرمیوں کا بیان گزر چکا ہے دیکھئے صفحہ ۲۹۲

(۲) ان کے بارے میں تفصیل آگے آرہی ہے ملاحظہ ہو ص ۷-۴۶

ایک گاؤں نارائن پور کوتا کا ہے۔ جہاں یہ لوگ سرحد کی طرف روانہ ہونے سے پہلے جمع ہوتے ہیں۔

سپرنٹنڈنٹ پولس نے یہ بھی اطلاع دی کہ مشرقی اضلاع کی مسلمان آبادی زیادہ تر وہابیوں (۱) پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ نہایت جوشیلے مذہبی لوگ ہیں اور ہماری سرکار کے دشمن ہیں۔ ان پر نہایت مستعدی سے کڑی نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ ان صوبوں میں اگر کسی شورش کا خطرہ ہے تو اسی گروہ کے مذہبی جنون سے ہے۔

سپرنٹنڈنٹ پولس نے مزید لکھا کہ متعلقہ اضلاع کے مجسٹریٹ بالخصوص مرشد آباد کے مجسٹریٹ ان لوگوں کے اجتماع اور ان کی ایسی احمقانہ تبلیغی سرگرمیوں پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ اگر کسی تشدد کی ضرورت دیکھی گئی تو ان کو مرعوب کرنے کے لئے فوراً طاقت استعمال کی جائے گی۔

ایک اور خط میں سپرنٹنڈنٹ پولس نے یہ رپورٹ بھی دی ہے کہ عنایت علی کچھ عرصہ سے بنگال کے مختلف حصوں کا دورہ کر کے اپنے متبعین سے روپیہ جمع کر رہے ہیں اور میرے علم میں جہاد اور سید احمد شہیدؒ کے ظہور ثانی کے عقیدوں کو امداد کے حصول کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔

انگریزی حکومت کی پولس کو ہدایات

حکومت نے سپرنٹنڈنٹ پولس کی ان تمام رپورٹوں کے جواب میں وعظ و تبلیغ کو زیادہ اہمیت نہ دینے کا اظہار کرتے ہوئے اسے ہدایت کی کہ سربراہوں کو بالخصوص اور عوام کو بالعموم ترغیب و ترہیب پر مشتمل ایک محتاط ہدایت نامہ جاری کرے کہ اگر کوئی ایسا بے ہودہ فعل یا نقض امن کی حرکت صدور میں آئے جس میں وہ یا ان کے متبعین ملوث ہوں تو وہ ذمہ دار ٹھہرائے جائیں گے۔ مختلف اضلاع کے مجسٹریٹ اپنے اپنے ضلعوں میں ایسی کارروائی کریں اور مناسب موقعوں پر بلووں اور شورشوں کے نتیجے سے صحیح وقت پر متنبہ کر دیں۔ ان کو یہ فہمائش بھی کی گئی کہ وہ اپنے اضلاع میں ایسی کارروائیوں کی ہفتہ وار رپورٹیں بھیجتے رہیں اور سپرنٹنڈنٹ پولس کو ہدایت کی گئی کہ ایسے مقامات کا جائزہ لیتا

(۱) انگریزوں نے سید صاحب کی جماعت کو بدنام کرنے کے لئے وہابیوں سے مشہور کیا تھا۔

رہے جن پر شک وشبہ ہو۔عوام الناس کو بھی کسی غیر معمولی اجتماع سے متنبہ کردیا گیا۔سپرنٹنڈنٹ پولس کو یہ بھی ہدایت کردی گئی کہ اس معاملہ کی تحقیقات کے نتیجوں سے وقتاً فوقتاً حکومت کو مطلع کرتا رہے۔(۱)

سرکاری عدالتوں کا بائیکاٹ اور سول نافرمانی

مولانا عنایت علی نے اس زمانہ میں ایک اہم کام بنگال میں یہ بھی کیا کہ عام لوگوں میں اجتماعی روح کو فروغ دیا، اور حکومت کی سول نافرمانی اور عدالتوں کے بائیکاٹ کی پالیسی چلائی۔اوکنلے، مولانا عنایت علی کی تعلیم کے اس پہلو پر زور دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ جو لوگ اس ملک سے ہجرت کر کے جہاد میں شریک ہونا چاہتے تھے ان کو ہدایت کی جاتی تھی کہ مجہول مقاومت کریں اور اپنے کافر حاکموں سے تمام تعلقات منقطع کرلیں تاکہ حکومت کے اندر حکومت کے بالکل خلاف ایک طاقت قائم ہو۔کافروں اور ان کی عدالتوں سے جو سود کی ڈگری دیتی ہیں اجتناب کرنا چاہئے اور بھائی بھائی کے درمیان شکایات کا فیصلہ مقامی سردار کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔(۲)

حقیقت یہ ہے کہ انگریزی قانون پر مبنی عدالتیں تحریک کے نقطہ ونظر سے طاغوت کی عدالتیں تھیں جن میں جانا اور اپنے تنازعات کے فیصلے کرانا کسی مسلمان کے لئے جائز نہ تھا۔اس مقصد کے لئے مولانا عنایت علی نے اپنا عدالتی نظام قائم کیا۔اگر کبھی کوئی جھگڑا اٹھ کھڑا ہوتا تو فریقین اپنے گاؤں یا محلے کے امام مسجد کے پاس اپنا مقدمہ لیجاتے۔امام مسجد کتاب وسنت کے مطابق فیصلہ کرتا۔اگر مقامی سطح پر جھگڑے کا تصفیہ نہ ہو پاتا تو مقدمہ علاقے کی جامع مسجد کے امام کے پاس چلا جاتا۔یہ امام قضاءت کے معاملات سے پوری طرح واقف ہوتا اور سیشن جج کے فرائض انجام دیتا۔یہاں بھی قضیہ نہ چکتا تو اس کی اپیل مولانا عنایت علی بنفس نفیس ان مقامات پر پہنچ کر سنتے۔فیصلہ سنانے کے بعد وعظ وارشاد کے ذریعے مقدمے کے فریقین اور دوسرے حاضرین کا تزکیہ نفس کرتے، انہیں محبت واخوت کے ساتھ رہنے کی تلقین فرماتے اور پھٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے کی کوشش فرماتے۔ہر علاقے میں ایک کونسل تھی، جو تحریک سے وابستہ

(۱) ملاحظہ ہو ہندوستان میں وہابی تحریک صفحہ ۱۳۷ تا ۱۴۰۔

(۲) ایضاً صفحہ ۱۴۰۔۱۴۱۔

بستیوں اور علاقوں کے معاملات صلاح مشورے سے طے کرتی (۱)۔

اس طرح تمام لوگوں کو سرکاری عدالتوں سے رجوع کرنے سے ممانعت کردی گئی۔ ڈاکٹر قیام الدین نے مولانا عنایت علی کی ان سرگرمیوں کا تذکرہ کرنے کے بعد بالکل صحیح لکھا ہے کہ یہ زیادہ تر مولانا عنایت علی کی کامیاب تبلیغی کارروائی ہی نتیجہ تھا کہ بعد کے مراحل میں سرحد پر جنگ جاری رکھنے کے لئے بنگال سب سے آگے تھا۔ (۲)

سرحد کی طرف روانگی

یہ بات گزر چکی ہے کہ سید ضامن شاہ کاغانی کی طلب پر مولانا ولایت علی نے اپنے بھائی مولانا عنایت علی کو بنگال سے بلا کر سرحد روانہ کیا تھا۔ جہاں ۱۸۴۴ء میں وہ پہنچے تھے۔

مولانا عنایت علی نے سرحد پہنچ کر سکھوں کو بالاکوٹ سے نکال باہر کیا۔ ایک مکتوب سے جو ذی قعدہ ۱۲۶۲ھ (اکتوبر ۱۸۴۶ء) کا مرقومہ ہے، واضح ہوتا ہے کہ مولانا عنایت علی سادات کاغان اور دوسرے مقامی لوگوں کی امداد سے ذی حجہ ۱۲۶۱ھ (دسمبر ۱۸۴۵ء) میں بالاکوٹ پر قابض ہو چکے تھے۔ وہیں انھیں باقاعدہ امیر جہاد تسلیم کیا گیا۔ سید ضامن شاہ کاغانی نے بھی ان کی اطاعت قبول کی اور آس پاس کے علاقوں کو سکھوں کے قبضے سے آزاد کرانے کے لئے زبردست جہاد شروع کیا گیا۔ جس کی تفصیل سرگزشت مجاہدین میں موجود ہے۔ مولانا عنایت علی کی پے بہ پے کامیابیوں سے قریبی علاقوں میں ان کی دھاک بیٹھ گئی۔ اور مقامی سرداروں نے موافقت واعانت کے لئے نامہ و پیام شروع کیا۔

مولانا ولایت علی کی زندگی میں مولانا عنایت علی نے اس سلسلہ میں جو کارنامے انجام دیئے، ان کا بیان گزر چکا ہے۔ دونوں بھائیوں کے درمیان طریقۂ کار کے اختلاف کا ذکر بھی آچکا ہے۔ نیز یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ اس وقت مولانا عنایت علی ستھانہ سے منگل تھانہ چلے گئے تھے۔ بھائی کی وفات کے بعد وہ ستھانہ آئے اور بالاتفاق ان کو امیر تسلیم کیا گیا۔

---

(۱) سید بادشاہ کا قافلہ، ص ۱۳۸-۱۳۹

(۲) ہندوستان میں وہابی تحریک صفحہ ۱۴۱۔

انگریزوں کے خلاف حملوں کا آغاز

چونکہ وجہ اختلاف ہی انگریزوں پر فوری حملہ کرنا نہ کرنا تھا۔مولانا عنایت علی نے مستقل امارت کی ذمہ داری سنبھالتے ہی اس کا آغاز کر دیا۔ بظاہر اس کا سبب ایک واقعہ ہوا جس نے مولانا کے لئے انگریزوں پر حملہ کرنے کے مواقع فراہم کیے۔

ہزارہ وکاغان پر انگریزوں کا تسلط

پنجاب کے الحاق کے بعد ہزارہ کا علاقہ گلاب سنگھ سے علاقوں کے تبادلہ میں انگریزوں کے قبضہ میں آیا۔اور ۱۸۴۹ء میں جیمس ایبٹ اس کا پہلا ڈپٹی کمشنر مقرر ہوا۔اس نے وہابیوں کی نقل وحرکت پر توجہ دینی شروع کی اور ان کے خطرات کو بھانپ لیا۔

ہزارہ کے شمال میں وادی کاغان کے سادات اور بالخصوص ان کا سردار ضامن شاہ وہابیوں کے زبردست حامی تھے۔ان کے گوجر کاشتکاروں نے ایبٹ کے پاس ان کی شکایتیں کیں۔ایبٹ پہلے سے وہابیوں کی طاقت توڑنا چاہتا تھا اور اس کے لئے بے چین تھا۔اس کو اس سے بہانہ ہاتھ آیا۔اور اس نے زیادہ تحقیقات کی بھی ضرورت نہیں سمجھی۔(۱)اور تین طرف سے کاغان پر فوج کشی کی،سید اس فوج کا مقابلہ نہ کر سکے چنانچہ شکست ہوئی۔ضامن شاہ کو بےدخل کر دیا گیا۔اور کاغان پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔

دو انگریز افسروں کا قتل اور حکومت کا آزاد قبائل پر دباؤ

۱۸۵۱ء میں آزاد حسن زئی قبائلیوں نے محکمۂ نمک کے دو انگریز افسروں کو اپنے علاقہ میں دراندازی کی وجہ سے قتل کر دیا۔(۲) ڈپٹی کمشنر ہزارہ کا ابتدائی تاثر یہ تھا کہ اس قتل میں والی امب جہاں داد خاں کا ہاتھ ہے۔لیکن جب مطالبہ کیا گیا کہ جو حسن زئی اس کے علاقہ میں رہتے ہیں انھیں حکومت انگلشیہ کے حوالہ کر دیا جائے تاکہ حکومت

---

(۱) تحقیقات کے دوران مسٹر ایبٹ صرف سادات کے دشمنوں کی داستان پر کان دھرتا تھا،حملہ کا اصل سبب یہ شبہ تھا کہ سادات وہابیوں سے ساز باز رکھتے ہیں۔یہ وہابی دوسرے قبائل کو انگریزوں کے خلاف عام شورش برپا کرنے کے لئے اکسا رہے تھے۔(ہندوستان میں وہابی تحریک صفحہ ۲۱۶)

(۲) واقعہ کی تفصیل کیلئے دیکھیے سرگزشت مجاہدین صفحہ ۲۸۳۔نیز ہندوستان میں وہابی تحریک ۲۱۶۔۲۱۷۔

حسن زئی قبیلے پر تلافی کے لئے زور ڈال سکے۔تو والی امب نے ان کا یہ مطالبہ پورا کیا۔آزاد حسن زئیوں کے لئے یہ بات ناقابل برداشت تھی۔انھوں نے امب کے سرحدی دیہات تباہ کر ڈالے اور دو قلعوں چھمبری اور شنگلئی پر قبضہ کر لیا۔

والی امب کو یہ مصیبتیں انگریزوں کی حکم برادری کی وجہ سے اٹھانی پڑی تھیں۔اس لئے انگریزوں نے اپنے اس حلیف کی حمایت کے لئے مداخلت کی۔اس طرح کوہ سیاہ (۱) کی پہلی مہم کا آغاز ہوا۔

کوہ سیاہ کی مہم

لارڈ ڈلہوزی کو ان قبائل کے خلاف فوج کشی میں تامل تھا۔جنھیں مستقل طور پر قبضے میں رکھنا مشکل نظر آتا تھا۔لیکن اگر والی امب کی امداد میں کوئی موثر قدم نہ اٹھایا جاتا تو تمام سرحدی قبائلیوں کے انگریزوں کے مخالفین سے تعلقات جوڑنے کا خدشہ تھا اس لئے اس نے تامل کے باوجود دسمبر ۱۸۵۲ء میں ایک مہم بھیجی۔کرنل میکسن (Mackeson) اس کا سپہ سالار تھا۔اس مہم میں سکھوں اور ڈوگروں کی رجمنٹیں بھی شامل تھیں۔اور ان کے ساتھ پہاڑی توپیں بھی تھیں۔والی امب کا مشہور مقام سبز گڑھ فوج کا مرکز قرار پایا۔فوج کو تین کالموں میں تقسیم کر کے مختلف اطراف سے حسن زئیوں پر یورش کی گئی۔کوہ سیاہ پر چڑھ کر اس نے حسن زئیوں کو سزا دی اور ان کے دیہات کو آگ لگادی۔جس سے ان کے غلے کے ذخائر تباہ ہو گئے۔اگرچہ اس پر بھی وہ حوالگی پر آمادہ نہ ہوئے۔تاہم سمجھ لیا گیا کہ انہیں خاصی سزا مل چکی ہے،لہذا جو ریغمال انگریزوں کے قبضے میں تھے انہیں رہا کیا گیا۔

مولانا عنایت علی کا اقدام

حسن زئیوں پر انگریزوں کے حملہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مولانا عنایت علی نے دوسرے آزاد قبائل کی قومی نخوت بیدار کر کے انگریزوں کے خلاف اکسانا شروع

---

(۱) کوہ سیاہ (جس کا مقامی نام کالا ڈھاکہ ہے) کو برطانوی جنگوں کی تاریخ میں خاص اہمیت حاصل ہے کوہ سیاہ کا سلسلہ ضلع ہزارہ کی شمالی مغربی سرحد تک پھیلا ہوا ہے۔

کیا۔والی امب جس نے کھل کر انگریزوں کی حمایت کی تھی مولانا اس کو بھی سبق سکھانا چاہتے تھے۔نیز والی امب کے مقابلہ میں حسن زئیوں کی امداد سے آزاد قبائل میں مجاہدین کے لئے دلی ہمدردی کی فضا پیدا ہونے کی امید تھی۔اور ان سے آئندہ مجاہدانہ اقدامات میں امداد ملنے کے امکانات قوی ہوتے تھے۔چنانچہ مولانا نے مجاہدین کو اقدام کا حکم دیا۔اور ایک لشکر نے مرکز سے پیش قدمی کرتے ہوئے عشرہ وکوٹلہ پر قبضہ کرلیا جو ستھانہ اور امب کے درمیان والی امب کے نہایت مشہور و مستحکم قلعے تھے۔(۱)

انگریزوں نے وہابیوں کو حسن زئی قبیلہ کی امداد سے باز رکھنے کی کوشش کی۔مگر مولانا عنایت علی نے انکی پیش کش کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔اور صاف کہہ دیا "میں تو مرنے ہی کو آیا ہوں"۔ایک بار پھر حکومت وہابیوں کے خلاف فوج بھیجنے میں متامل ہوئی خود کرنل میکسن نے اپنی ایک رپورٹ مؤرخہ ۶ رجنوری ۱۸۵۳ء بنام مجلسہ منتظمہ پنجاب میں لکھا کہ "میں نے بہت تامل کیا،آیا کوٹلہ کے معاملہ میں کوئی مداخلت کروں صرف وہ علاقہ دیکھ کر جس کو بار بار بہ حفاظت مطیع کرنے کی طرف سے ہمیں اطمینان ہو جائے اور جہاں سے وہابی لشکر کو مجبور اور بے بس کر دیا جا سکے۔مجھے یہ ہمت ہوئی کہ ادھر اپنی فوج روانہ کروں۔(۲)

عشرہ وکوٹلہ پر انگریز کا قبضہ

چنانچہ ۶/جنوری ۱۸۵۳ء(۳) کو قلعہ کوٹلہ پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لئے میجر ایبٹ کے زیر کمان ایک فوج روانہ کی گئی۔اس سے ایک دن پہلے والی امب کی ایک فوج نے شمالی سمت سے پہاڑ پر چڑھ کر عشرہ وکوٹلہ کے شمال اور مغرب میں مورچے قائم کرلئے تھے۔انگریزی فوج دریائے سندھ پار کر کے اس درے کی طرف بڑھی جو عشرہ وکوٹلہ اور مرکز مجاہدین کے درمیان آمد و رفت کا راستہ تھا۔ایک انگریزی لشکر دریا کے بائیں کنارے پر ستھانہ کے عین سامنے مورچہ لگا کر بیٹھ گیا،تاکہ وہاں سے مجاہدین کے

(۱) سرگزشت مجاہدین صفحہ ۲۸۵۔

(۲) ہندوستان میں وہابی تحریک صفحہ ۲۱۹۔

(۳) یہ مہر کا بیان ہے۔ڈاکٹر قیام الدین نے ۱۸۵۲ء لکھا ہے نہ صرف یہاں بلکہ اس واقعہ کی تفصیل میں ہر جگہ مہر اور ان کے بیان میں ایک سال کا تاریخی فرق ہے۔اس سلسلہ میں جو ہجری تاریخیں کتابوں میں ملتی ہیں وہ مہر کی بیان کردہ تاریخ کے مطابق ہے۔اس لئے ہم نے اسی کو نقل کیا ہے۔

لئے کوئی کمک نہ پہنچ سکے۔ جب انگریزی فوج نے توپوں کے ساتھ پہاڑ پر چڑھائی شروع کی تو مجاہدین جن کی تعداد تین سو اور دو سو کے درمیان تھی قلعے چھوڑ گئے۔ والی امب کے لشکر نے تعاقب کیا اور تیس سے زائد مجاہدین نے شہادت پائی۔ (۱)

اور ایک روایت کے مطابق انگریزی فوج نے عبور دریا کے بعد عشرہ اور ستھانہ کے درمیانی درے پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ والی امب جہاں داد خاں نے شمالی سمت میں مجاہدین کے بچ نکلنے کا راستہ روک دیا۔ یہ حالت دیکھ کر مولانا عنایت علی مجاہدین کے بڑے حصے کو ساتھ لے کر ستھانہ پہنچ گئے۔ مگران کا عقبی دستہ مولانا کرم علی دانا پوری کی سالاری میں لڑتا ہوا پورے کا پورا خلعت شہادت سے سرفراز ہوا (۲)۔ جن کی کل تعداد ستر تھی۔ (۳)

مولانا عنایت علی اس واقعے کے بعد ناواگئی (علاقہ چملہ) چلے گئے۔ ان کا ارادہ تھا کہ سوات پہنچ کر سید اکبر شاہ ستھانوی اور ملا عبدالغفور اخوند سوات سے آئندہ اقدامات کے متعلق مشورے کریں۔ سید اکبر شاہ کو سوات کے باشندوں نے ۱۸۴۷ء میں اپنا بادشاہ بنالیا تھا۔ پنجاب ریکارڈ آفس کی بعض تحریرات سے مترشح ہوتا ہے کہ جنوری ۱۸۵۴ء میں حکومت انگلشیہ کو شاہ سوات کی طرف سے حملے کا خطرہ پیدا ہوگیا تھا۔ (۴) مگر غالباً اخوند صاحب (۵) نے اس سے زیادہ دلچسپی نہیں دکھائی اس لئے یہ حملہ نہ ہوسکا۔

مولانا عنایت علی نے خاصی لمبی مدت چملہ، بنیر اور سوات میں گزاری اور ۱۶/ رجب ۱۲۷۰ھ (۱۴/اپریل ۱۸۵۴ء) کو اس سفر سے واپس آئے۔ (۶)

مرکز جہاد کی ستھانہ سے منگل تھانہ منتقلی اور مولانا عنایت علی کی سرگرمیاں

مجاہدین کا مرکز ستھانہ اب غیر محفوظ اور انگریزی حملہ کی زد میں تھا۔ اسلئے اب

(۱) سرگزشت مجاہدین صفحہ ۲۸۶۔

(۲) ایضاً صفحہ ۲۸۶۔

(۳) ہندوستان میں وہابی تحریک صفحہ ۲۱۹۔

(۴) ملاحظہ ہو سرگزشت مجاہدین صفحہ ۲۸۷۔

(۵) اخوند صاحب نے بعد کے دور میں انگریزوں سے دو بدو جنگ لڑ کر اپنی حب الوطنی کا ثبوت دیا تفصیل موقع پر آئے گی۔

(۶) سرگزشت مجاہدین صفحہ ۲۸۸۔

ستھانہ میں بیٹھ کر مولانا کے لئے وسیع پیمانے پر مجاہدانہ سرگرمیاں جاری رکھنے کا کوئی امکان نہ تھا، اس لئے مولانا اس فکر میں تھے کہ ایسا کوئی مرکز مل جائے جہاں عملی اقدامات کے امکانات نظر آتے ہوں۔ منگل تھانہ اس کے لئے موزوں معلوم ہوا۔ جہاں سے مولانا کے قدیم روابط تھے۔ چنانچہ رئیس منگل تھانہ سید عباس سے عہد و پیمان کی توثیق کر کے اسی کو مستقل مرکز بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ ستھانہ کے مرکز میں مولانا یحییٰ علی کو اپنا جانشین بنایا۔ اور خود اپنے اہل و عیال کے ساتھ منگل تھانہ منتقل ہو گئے۔ چند دنوں کے بعد مولانا ولایت علی کے اہل و عیال کو بھی منگل تھانہ بلا لیا۔

جب تک ستھانہ مرکز رہا۔ مجاہدین کی یورشیں ضلع ہزارہ پر ہوتی تھیں۔ منگل تھانہ پہنچنے کے بعد مولانا نے مجاہدین کو ضلع پشاور اور ضلع مردان کے میدانی علاقے سمت پر یورشوں کے لئے تیار کیا۔ (۱)

مولانا عنایت علی نے اس نئے مرکز سے یوسف زئی قبائل میں کام کرنا شروع کیا۔ جو پشاور اور مردان سے متصل میدانی علاقہ میں رہتے تھے۔ مولانا ان کو انگریزوں کے خلاف منظم کرنے لگے۔ ہندوستانی فوج میں آمد و رفت اور ان میں کام کا آغاز اسی زمانہ میں ہوا۔ (۲)

اس زمانہ کی مولانا کی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے اوکنلے نے لکھا ہے کہ :

> انہوں نے اپنے ہمراہیوں کے دل میں انگریز کافروں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ مجاہدین روزانہ قواعد کرتے بلکہ بعض اوقات دن میں دو مرتبہ۔ قواعد میں فضائل جہاد سے متعلق نظمیں پڑھی جاتیں۔ جمعہ کی نماز کے بعد بہشت کی شادمانیوں کے بارے میں وعظ کہے جاتے اور انہیں تلقین کی جاتی کہ صبر و استقامت سے اس وقت کا انتظار کرو جب برطانوی ہند کی تسخیر کی موعودہ ساعت آ پہنچے گی۔ (۳)

---

(۱) سرگزشت مجاہدین، صفحہ ۲۸۹۔

(۲) ہندوستان میں وہابی تحریک صفحہ ۲۲۲۔

(۳) ملاحظہ ہو سرگزشت مجاہدین صفحہ ۲۸۹۔۲۹۰۔ ہندوستان میں وہابی تحریک میں اوکنلے کی یہی عبارت نقل کی ہے، مگر ترجمے پریڈ کے وقت فضائل جہاد سے متعلق آیتوں کا پڑھا جانا معلوم ہوتا ہے۔

انگریزوں کی دعوت مصالحت اور مجاہدین کا انکار

اسی زمانہ میں اور مہر کے خیال کے مطابق ۱۸۵۳ء میں انگریزوں نے ایک مکتوب مجاہدین کے نام بھیجا۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ جو شخص امن سے رہنا چاہے اس کو معافی مل سکتی ہے۔ بلکہ ہندوستان پہنچنے کے اخراجات بھی دیئے جائیں گے۔ اور خط پہنچنے کے ایک مہینہ بعد تک جو اس کو قبول نہ کرے اسے مفسد قرار دیا جائے گا، اور کم سے کم تین سال قید بامشقت کی سزا دی جائے گی۔(۱)

ظاہر ہے اس کے لئے کون تیار ہوتا مجاہدین نے سوچ سمجھ کر ہی یہ قدم اٹھایا تھا۔ چنانچہ یہ پیش کش حقارت سے ٹھکرا دی گئی۔

مولانا عنایت علی آزاد قبائل اور دیسی افواج میں برابر کام کرتے رہے۔ تا آں کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامۂ رستاخیز رونما ہوا۔ اس میں مولانا نے جو کارنامہ انجام دیا۔ اس کی تفصیلات انشاء اللہ دوسری جلد میں پیش کی جائیں گی۔

چوتھی فصل

بہار میں تحریک شہید کی کارگزاریاں

سید صاحب کے ان کے خلفاء و مسترشدین نے مقصد کو اسی طرح سینہ سے لگائے رکھا کہ اس سے روگردانی یا اس میں کسی طرح کی کوتاہی کے مقابلہ جان دینا ان کے لئے آسان تھا۔ ہنٹر نے کتنا صحیح تجزیہ کیا ہے کہ اب یہ تحریک کسی رہنما کی موت و حیات سے بالکل مستغنی ہو گئی تھی۔(۲)

خواجہ حسین علی اور انگریزوں کے خلاف ان کی کارروائیاں

خواجہ حسین علی خاں پٹنہ کے مشہور بزرگوں میں تھے۔ شاہ عطا حسین گیاوی نے بڑے آداب والقاب کے ساتھ آپ کا ذکر کیا ہے جس سے آپ کے مقام بلند کا اندازہ ہوتا ہے۔(۳) خواجہ عبید اللہ احرار سے نسبت فرزندی رکھتے تھے۔ خاندانی رئیس تھے۔

---

(۱) ملاحظہ ہو سرگزشت مجاہدین صفحہ ۲۹۰۔

(۲) ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۳۴ (۳) دیکھئے کیفیت العارفین صفحہ ۲۲۴۔۲۲۵

جس سے آپ نے تحریک کی توسیع میں بہت فائدہ اٹھایا۔ ساتھ ساتھ بڑے عارفین میں آپ کا شمار ہوتا تھا بقول شاہ عطا حسین موصوف آپ ''زبدۃ العرفاء'' تھے۔ سلسلہ ابوالعلائیہ نقشبندیہ کے مشہور شیخ سید شاہ ابوالبرکات (م ۱۲۵۶ھ) سے اجازت وخلافت حاصل تھی۔ دینی مقام اور دنیوی وجاہت کے باوجود ہر کسی کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آتے۔ اس لئے لوگ ان سے قریب آتے۔

خواجہ حسین علی خاں کا سید احمد شہید کی تحریک سے رابطہ کب ہوا؟ اس سلسلہ میں کوئی ریکارڈ دستیاب نہ ہوسکا۔ البتہ بعد میں ان کی سازش کے منکشف ہونے کے بعد جو سرکاری رپورٹیں سامنے آئیں۔ ان سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب تحریک کے بہت سرگرم رکن تھے۔

ان کا کام فوج کے اندر انگریزی حکومت کے خلاف جذبات بھڑکانا اور دیسی افسروں اور سپاہیوں کی وفاداری کو متاثر کرنا تھا۔ ان کے کارندے پٹنہ اور دانا پور کے علاوہ چمپارن، ہزاری باغ، اور بہار سے ہٹ کر بنارس، الہ آباد اور کانپور تک میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان کی سازش بہت گہری اور وسیع تھی۔ ٹونک کے نواب وزیر الدولہ تک سے انکے روابط تھے۔ یہاں تک کہ وزیر الدولہ کا ایک ماہر ایجنٹ سیف علی، خواجہ حسین علی (۱) کے یہاں رہتا تھا۔ وہ اچھا تعلیم یافتہ، شریف، باوقعت اور خوبصورت نوجوان تھا۔ اس نے تحریک کو کامیاب بنانے میں بڑا اہم پارٹ ادا کیا۔ فوجی افسروں کو خواجہ صاحب سے ملانے کا یہی ذمہ دار تھا۔ وہ بڑی حکمت اور لیاقت سے یہ نازک کام انجام دیتا تھا۔ وہ آخر تک ایک پراسرار شخصیت بنا رہا۔ پھر منظر نامہ سے بالکل غائب ہوگیا۔ اسی قسم کی ایک ملاقات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ اس سے خواجہ صاحب کے کام کی

---

(۱) ڈاکٹر قیام الدین نے اس سلسلہ میں جو تفصیلات درج کی ہیں ان میں ہر جگہ خواجہ حسن علی لکھا ہے۔ چونکہ ان کے بیان کا ماخذ سرکاری دستاویزیں ہیں۔ ممکن ہے کہ سرکاری کاغذات میں نام حسین کے بجائے حسن ہوگیا ہو۔ مگر اصل نام خواجہ حسین علی خان تھا۔ جیسا کہ ان کے سوانح نگار نے ذکر کیا ہے اور اس سازش کے اصل محرک یہی خواجہ حسین علی خان ہی تھے۔ جیسا کہ تاریخ مگدھ صفحہ ۴۲۵ سے قطعیت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ اس وقت ۶۵ سال تجاوز کر چکے تھے۔ خود ڈاکٹر قیام الدین کی نقل کردہ سرکاری دستاویز بھی ان کے اس وقت بوڑھا ہونے پر دلالت کرتی ہے اس میں ہے کہ وہ بوڑھا آدمی ہے بال سفید ہیں داڑھی رکھتا ہے۔

نوعیت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ سیف علی نے دانا پور میں متعین فرسٹ رجمنٹ .N.I کے رجمنسٹل (Regimenistal) منشی پیر بخش سے اولاً ستمبر ۱۸۴۵ء میں ملاقات کی، پھر اس کی کچھ ذہن سازی کر کے دسمبر میں خواجہ حسین علی خاں صاحب سے ملانے پٹنہ میں واقع ان کے مکان کی بالائی منزل پر لے گیا۔ خواجہ صاحب نے منشی سے ان کے تقرر کی شرائط اور تنخواہ وغیرہ کے متعلق سوالات کیے۔ اسکے بعد منشی پیر بخش کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''منشی جی! ہندوستان دار الحرب ہوگیا ہے۔ قید خانوں میں کیا کیا مظالم ڈھائے جارہے ہیں...... بمبئی کے مجسٹریٹ نے مسلمانوں کے مکہ (۱) جانے کا راستہ بند کر دیا ہے''۔

اس پر منشی نے خواجہ کے ارادے دریافت کیے۔ خواجہ صاحب نے جواب دیا کہ میں ان لوگوں سے تعارف چاہتا ہوں جو فوج میں بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ جیسے صوبہ دار، جمعدار۔ منشی نے خواجہ صاحب کو ایسے باغیانہ منصوبوں سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ اس موقع پر خواجہ نے ایک آدمی سے ایک سو روپئے ایک رومال میں باندھ کر لانے کو کہا اور منشی کو دیدیا۔ اس نے اسے سیف علی کے پاس جمع کر دیا۔ اس نے منشی سے کہا کہ رجمنٹ کے سرداروں کو راضی کرے کہ وہ ہم سے معاملہ رکھیں۔ اور ابھی کسی سپاہی کو خبر نہ کریں۔ اس نے اسے بھی ایک سو روپئے ایک کپڑے میں بندھے ہوئے دیئے۔ منشی کے سوال پر خواجہ صاحب نے اپنے مقامات کی تفصیل بتائی۔ جہاں ان کے کارندے کام کر رہے تھے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے کانپور، بنارس، الہ آباد، سگولی (ضلع چمپارن) اور ڈورنڈا (ضلع ہزاریباغ) کے نام لئے۔ پھر کہا کہ اگر رجمنٹ کے سردار یہ ''ضیافت'' قبول کریں تو میں ان کو ایک ماہ کی تنخواہ دوں گا۔ مجھ کو ایک کروڑ روپئے تک خرچ کرنے کا اختیار ہے۔ (۲)

میں سرداروں سے یہ نہیں چاہتا کہ ابھی ہماری طرف ہو جائیں اور جنگ کرنے لگیں

---

(۱) اس کے قریبی زمانہ میں حاجیوں ایک جہاز قرنطینہ میں روک لیا گیا تھا اس سے یہ بات مشہور ہوئی تھی کہ حکومت ارادۂ حج میں مزاحم ہے۔

(۲) اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تحریک کی جڑیں کتنی مضبوط تھیں۔ اور اس کے لئے کس قدر سرمایہ اکٹھا کیا گیا تھا۔ جب کہ صرف ایک منتظم ایک کروڑ خرچ کرنے کا اختیار رکھتا ہو۔ اور وہ بھی اس زمانہ کے ایک کروڑ۔

بلکہ یہ کہ جب بغاوت ہو جائے تو وہ ہماری طرف ہوں۔ خواجہ نے اپنے دائرہ عمل میں کانپور کا ذکر کیا تھا۔ ان سے پوچھا گیا کہ آیا آپ کانپور تک کے انتظامات کے ذمے دار ہیں یا اس سے آگے تک کے؟ انھوں نے جواب دیا کہ کانپور سے آگے کا انتظام کار کوئی اور ہے۔

افسوس کہ بعض فوجی افسروں نے منصوبہ کا افشا کر دیا۔ جس پر منشی پیر بخش کو گرفتار کیا گیا۔ پھر وہ سرکاری گواہ بن گیا جس پر اس کو رہائی ملی۔

خواجہ حسین علی قریب ایک سال تک روپوش رہے اور حکومت کی انتہائی کوشش کے باوجود ان کا پتہ چل نہ سکا۔ آخر اکتوبر ۱۸۴۶ء میں وہ حاضر عدالت ہوئے لیکن اہم گواہ استغاثہ پیر بخش نے ان کی شناخت سے انکار کر دیا۔ اس وجہ سے حکومت ان کو بری کرنے پر مجبور ہو گئی۔ سپرنٹنڈنٹ پولس کو یقین تھا کہ پیر بخش کو روپئے سے خرید لیا گیا ہے مگر اب گورنمنٹ کچھ نہ کر سکتی تھی اس طرح وہ پاک صاف بچ نکلے۔ (۱)

مگر اسکے بعد وہ زیادہ دن زندہ نہ رہ سکے۔ ۱۷/ جمادی الاولیٰ ۱۲۶۳ھ (مطابق مئی ۱۸۴۷ء) میں ان کا انتقال ہو جاتا ہے۔ اس وقت ان کی عمر ستر سال کی تھی۔ (۲)

تحریک سے متعلق دیگر سر برآوردہ حضرات

سیف علی (جن کا گزشتہ صفحات میں کچھ حال بیان ہو چکا ہے) کے علاوہ اس سازش کی دوسری سرکردہ شخصیت راحت علی کی تھی۔ سرکاری رپورٹوں میں ان کا بڑی اہمیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ وہ بڑے دولت مند زمیندار تھے۔ قرضہ دلانے کے بہانے سپاہیوں کو ان سے ملایا جاتا تھا اور وہ خواجہ حسین علی تک ان کو پہنچاتے۔

منصوبہ کو اس طرح خفیہ رکھنے کی کوشش کی گئی تھی کہ انکشاف کے بعد بہت کم لوگوں کے نام سامنے آئے۔ اور نہ حکومت قطعی طور پر یہ جان سکی کہ سب کا سرا کہاں سے ملتا ہے۔ البتہ بعض انگریزوں نے اپنے خدشات کا اظہار کیا ہے کہ یہ پوری سازش وہابی تحریک ہی کا نتیجہ ہے۔ اور یہی بات صحیح ہے۔ مختلف رپورٹیں اور بیانات سامنے رکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سب ایک ہی زنجیر کی کڑیاں تھیں۔

انہی سر برآوردہ لوگوں میں مولوی علی کریم بھی تھے۔ جنہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ

(۱) سازش کی تفصیل کے لئے دیکھئے۔ ہندوستان میں وہابی تحریک صفحہ ۲۰۰-۲۰۸۔

(۲) ملاحظہ ہو کیفیت العارفین صفحہ ۲۲۵۔

آزادی میں ناقابل فراموش نقوش چھوڑے ہیں (۱) تقی رحیم لکھتے ہیں :

پٹنہ میں ۱۸۴۵ء میں منصوبہ بند کوشش کی جا رہی تھی جس میں بابو کنور سنگھ اور مولوی علی کریم پوری مستقل مزاجی کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ (۲)

ان کے علاوہ مولوی نیاز علی، سرکاری وکیل برکت اللہ، اور پٹنہ سٹی کے داروغہ میر باقر علی کا نام بھی سرکردہ لوگوں میں آتا ہے۔ ان سرکاری ملازمین کی ملازمتیں تحقیقات کے بعد ختم کردی گئی تھیں۔

بہار کی صورت حال پر حکومت کا اضطراب

۱۸۴۵ء کے اواخر ہی میں حکومت کو اس منصوبہ کا سراغ لگ گیا تھا۔ اس وقت حکومت کو رپورٹ کی گئی تھی کہ داناپور (پٹنہ) میں متعینہ دیسی افسروں اور سپاہیوں کی وفاداری کو متاثر کرنے اور بگاڑنے کے لئے ایک عمومی وسیع سازش موجود ہے۔ (۳)

اس سازش کو انگریزوں نے بڑی اہمیت دی۔ جی بی مالیسن نے لکھا ہے :

۱۸۴۵ء میں سازشیوں کا ایک جتھا پٹنہ میں سازش کو جنم دے رہا تھا جب کہ سپاہیوں کو نقد رقمیں تقسیم کی جاتی تھیں۔ ایک کاغذ ہاتھ آیا تھا جس میں ایک سو خاص خاص خاندانوں کے نام درج تھے۔ ان میں ایک شہر پٹنہ تھا جو پیغمبر اعظم (سید احمد) کے دو نامور خلیفوں (یعنی ولایت علی اور عنایت علی) کا صدر مقام تھا۔ (۴)

اس وقت کا پٹنہ کا کمشنر ولیم ٹیلر لکھتا ہے :

پچھلے کئی برسوں سے شہر (پٹنہ) ناراضی اور سازشوں میں ڈوبا ہوا سمجھا جاتا تھا۔ ۱۸۴۶ء میں ایک خطرناک سازش پکڑی گئی تھی۔ جس میں پٹنہ اور مضافاتی اضلاع کے بہت سے مسلمان ملوث تھے اور جس میں سپاہیوں کو ورغلانے کی کوشش کی گئی تھی۔ ۱۸۴۶ء کی وہ سازش اس ملک سے واقفیت رکھنے والے بہت سے لوگوں کی نظروں میں بہت بڑی سازش کا ایک حصہ تھی۔ اور سازش کا مقصد انگریزوں کو برباد کرنا

(۱) ان کا تفصیلی تذکرہ دوسری جلد میں آئے گا انشاء اللہ۔
(۲) تحریک آزادی میں بہار کے مسلمانوں کا حصہ صفحہ ۸۷۔
(۳) ہندوستان میں وہابی تحریک صفحہ ۲۰۰۔
(۴) ہندوستان میں وہابی تحریک صفحہ ۲۰۸

برطانوی حکومت کو الٹ دینا اور پھر سے مسلم خاندان کی حکومت قائم کرنا تھا۔(۱)

ڈبلیو ہنٹر ۱۸۵۲ء کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے :

انہی دنوں پٹنہ کے مجسٹریٹ نے یہ رپورٹ دی کہ اس شہر میں باغی جماعت کے آدمیوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اور انگریزی صوبہ کے دارالخلافہ کے مجاہدین شہر میں بغاوت کی علانیہ تبلیغ کر رہے تھے۔ پولس بھی انہی دیوانوں کی طرفدار تھی۔ اور اس کے لیڈروں میں سے ایک (۲) نے اپنے مکان پر سات سو آدمی اس غرض کے لئے جمع کر لئے تھے کہ اگر اس سلسلہ میں کچھ تفتیش ہوئی تو اسکا مقابلہ ہتھیاروں سے کیا جائے۔(۳)

پانچویں فصل

پنجاب میں تحریک سید احمد شہیدؒ کے انقلابی کام

سکھوں کے عمل دخل کی وجہ سے سیّد صاحب کی حیات میں پنجاب میں کام زیادہ نہ ہو سکا تھا۔ مگر جب سکھوں کی حکومت ختم ہو گئی تو تحریک کے افراد و مبلغین اس پورے علاقہ میں پھیل گئے اور صرف چند برسوں میں تھانیسر، انبالہ، لاہور سے راولپنڈی اور ہزارہ تک حلقے قائم ہو گئے۔ اور اتنی تیزی سے کام ہوا اور ایسے مربوط و منظم حلقے قائم ہو گئے کہ مجاہدین کی ایک بڑی تعداد اسی راستہ سے ہجرت کر کے سرحد گئی مگر انگریزی حکومت کو اس کا پتہ نہ چل سکا۔ انیسویں صدی کی پانچویں دہائی کے ختم ہونے تک پورے پنجاب میں کام پھیل چکا تھا۔ ۱۸۵۲ء میں اس میں اور اُبال آیا۔ اس بار فوجوں کو ورغلانے کی خاص طور پر کوشش کی گئی۔ ان کوششوں کا مرکز راولپنڈی تھا۔ راولپنڈی میں تعینات چوتھی دیسی پیدل فوج کے ایک رجمنٹل منشی ولی محمد کے گھر سے متعدد خطوط ضبط کئے گئے۔ منشی نے اپنے تئیں سید احمد کا مرید ہونے کا اقرار کیا۔ خطوط کا یہ پلندہ جو اس سے برآمد کیا گیا وہابیوں کے عام طرز تحریر میں لکھا ہوا تھا۔ ان خطوط میں ہندوستان سے

(۱) ملاحظہ ہو تحریک آزادی میں بہار کے مسلمانوں کا حصہ صفحہ ۴۷۔

(۲) یہ مولانا احمد اللہ صادق پوری تھے جن کے کارناموں کا مفصل تذکرہ تیسری جلد میں آئے گا۔

(۳) ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۳۷۔

سوات میں رضا کاروں کی آمد کی خبر ہے۔اور آئندہ سرحد آنے والوں کی رہنمائی کے لئے مفصل ہدایات ہیں۔

ان ضبط شدہ خطوط سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آدمی اور اسلحہ میرٹھ اور لدھیانہ کے راستوں سے سوات بھیجے جاتے تھے۔اسلحہ میرٹھ میں قاضی محمد یا قاضی سرفراز کے پاس امانت رکھ دیئے جاتے تھے۔اور لدھیانہ کا ایجنٹ عباس علی تھا جو مقامی مسجد عبدالقادر کی مسجد کے قریب رہتا تھا۔

ڈپٹی کمشنر راولپنڈی نے پٹنہ اور میرٹھ کے مجسٹریٹوں اور ڈپٹی کمشنر لدھیانہ کو لکھا کہ ان اشخاص کی تلاشی لیں جن کے نام ان کے اپنے اپنے علاقوں کے تحت درج ہیں۔اور ان کے قبضے سے جو کاغذات برآمد ہوں وہ ضبط کر لئے جائیں۔لدھیانہ کے عباس علی کو گرفتار کر لیا گیا اور کچھ مزید خطوط ان کے قبضہ سے دستیاب ہوئے جن سے پٹنہ کے ایک شخص ابو عبدالرحیم (۱) کا ملوث ہونا ثابت ہوتا تھا۔ڈپٹی کمشنر لدھیانہ فلپ گولڈنی نے بھی پٹنہ کے مجسٹریٹ کو لکھا تھا کہ اس شخص کے بارے میں تفتیش کرے جو سوات کے قائدین سے تعلق رکھتا تھا۔(۲)

حکومت کا ردعمل

حکومت کو تفتیش میں تو وہ کامیابی نہیں ہوئی،مگر اس نے اس کے فوراً بعد ۱۸۵۲ء ہی میں وہابیوں کے خلاف کئی مہمیں بھیجیں۔ہنٹر اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے :

۱۸۵۲ء میں انھوں نے خیال کیا کہ اپنے طے شدہ پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کا مناسب وقت آ گیا ہے۔روپئے اور آدمی ہمارے علاقہ سے ستھانہ کیمپ کو متواتر جا رہے تھے۔اس سلسلہ میں حکومت پنجاب نے ہماری فوج کے ساتھ سازشی خط و کتابت بھی پکڑ لی تھی۔انھوں نے کمال عیاری کے ساتھ ہماری نمبر ۴ دیسی پیادہ فوج کے ساتھ

---

(۱) اس سے مراد غالباً مولانا ولایت علی کے چھوٹے بھائی مولانا فرحت حسین عظیم آبادی ہیں اس لئے کہ مولانا ولایت علی نے اپنی ہجرت کے وقت انہی کو پٹنہ میں اپنا جانشین اور تحریک کا قائد نامزد کیا تھا۔چونکہ وہ مولانا عبدالرحیم صادقپوری کے والد تھے،اس لئے انہوں نے رازداری کے لئے اپنا نام بدل کر ابو عبدالرحیم رکھا ہو،اس طرح ناموں کی تبدیلی اس تحریک میں ایک عام بات تھی۔

(۲) ہندوستان میں وہابی تحریک صفحہ ۲۱۱۔

سازش کی تھی جو اس وقت راولپنڈی میں مقیم تھی اور متعصب نو آبادی کے بہت ہی قریب تھی۔ اگر وہ ہمارے صوبہ پر چڑھائی کرتے تو یہی رجمنٹ تھی جو سب سے پہلے ان کے مقابلے کے لئے بھیجی جاتی۔ ان خطوط سے یہ بات ثبوت کو پہنچ گئی تھی کہ بنگال سے باغی کیمپ تک روپئے اور آدمی پہنچانے کے لئے ایک باقاعدہ نظام موجود ہے۔ (۱)

حکومت اس سے گھبرا اٹھی اور اس نے سخت اقدامات کئے۔ مگر مجاہدین کا منصوبہ اتنا منظم تھا کہ حکومت کو تحقیقات میں کامیابی نہیں ملی، مگر اس نے اپنی انتظامیہ کو پوری طرح چوکس کر دیا۔ حکومت ہند کے سکریٹری نے پنجاب کے بورڈ آف ایڈمنسٹریشن (مجلس انتظامیہ) کے نام ایک علاحدہ چٹھی میں صورت حال سے مطلع کرنے کے بعد لکھا کہ پٹنہ ہندوستان کے وہابیوں کا صدر مقام ہے۔ وہاں سے خطوط ملے ہیں۔ رضا کاروں کی ٹولیاں وہیں سے سرحد کی نو آبادی کی طرف روانہ ہوتی ہیں۔ (۲)

پٹنہ کے مجسٹریٹ نے لکھا تھا کہ ان لوگوں نے ہمارے گنجان آباد ضلعوں کے ہر ایک گاؤں میں خود حکومت کے زیر حفاظت اور زیر سایہ علانیہ بغاوت کی تبلیغ کی۔ مسلمان آبادی کے دلوں کو بے قرار کیا اور فتنہ وفساد کے لئے ایسا حیرت انگیز اقتدار حاصل کیا جو ظاہر ہے۔ (۳)

چھٹی فصل

وہابیوں کی عمومی سرگرمیاں اور حکومت کی بے تابیاں

مولانا عنایت علی نے بنگال کے اپنے حلقے میں شرعی عدالتوں کا جو نظام شروع کیا تھا وہ مولانا عنایت علی ہی سے مخصوص نہ تھا یہ اس دور میں تحریک کی عمومی پالیسی تھی، مولانا ولایت علی کے خلفاء نے اپنے حلقوں میں ایسا ہی عدالتی نظام قائم کر رکھا تھا۔ یہی کیفیت ان حلقوں کے جماعتی نظام کی بھی تھی۔ ضلع وار مرکز قائم تھے جن کا رابطہ اپنی ماتحت دیہاتی اور قصباتی جماعتوں سے تھا۔ یہ مراکز تبلیغی اجتماعات کا اہتمام بھی کرتے اور زکوٰۃ، صدقات، عمومی لگان اور ہنگامی عطیات کی وصولی کا انتظام بھی (۴) اسی کے

(۱) ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۴۷۔ (۲) دیکھئے ہندوستان میں وہابی تحریک صفحہ ۲۱۱۔
(۳) ہمارے ہندوستان مسلمان صفحہ ۷۵۔ (۴) سید بادشاہ کا قافلہ صفحہ ۱۳۹

ساتھ ساتھ جہادی سرگرمیاں بھی پورے جوش وخروش کے ساتھ جاری تھیں۔ ڈبلیو ہنٹر مجاہدین کی سرگرمیوں اور ان کے جوش وخروش کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے :

ایک دفعہ ان مجنونوں کی تحریک تباہی کے قریب معلوم ہوتی تھی۔ مگر پٹنہ کے خلیفوں کے تبلیغی جوش اور مال و دولت نے جو ان کے تصرف میں تھی، مقدس جھنڈے کو خاک سے اٹھا کر ایک بار پھر بلند کر دیا۔ انہوں نے تمام ہندوستان میں اپنے مبلغ دوڑا دیئے، اور مذہبیت کو اس حد تک زندہ کیا کہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ ان دونوں خلیفوں (۱) نے بذات خود بنگال اور جنوبی ہند کا دورہ کیا۔ چھوٹے چھوٹے مبلغین بے شمار تھے۔ اور مدبرانہ تنظیم نے ان کو اس قابل بنا دیا تھا کہ جہاں کہیں حالات اجازت دیتے، اپنے مریدوں میں اڈا جما لیتے۔ اس طرح ہر ہر ضلع میں مجاہدین کا ایک مبلغ ہوتا اور ان کے جذبات کو مشتعل رکھنے کے لئے وقتاً فوقتاً سفری واعظ بھی دورہ کرتے رہتے۔ پٹنہ کا مرکزی پراپیگنڈہ ان کے اقتدار کو پائیدار اور مستقل کرتا رہتا تھا۔ پھر جنوبی ہند میں ان کے جوش وخروش کا ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ شمال مغربی صوبوں سے انہوں نے رنگروٹوں کی کمپنیوں کی کمپنیاں مجاہدین کے کیمپ کی طرف روانہ کیں۔ ہر جگہ پر انہوں نے مسلمان آبادی کے جوش کو انتہا تک پہنچا دیا۔ اور اگرچہ بنگالیوں کی اعلیٰ دفاعی قوتیں آخر کار اس تحریک کو موجودہ درجہ تک لے آئیں۔ لیکن کچھ مدت کے لئے ہندوستان کے تمام صوبوں میں ایک ہی جیسے جوش وخروش کے ساتھ زندہ رہی۔ (۲)

سرحد پر مجنونوں کے کیمپ کو روپیہ اور آدمی پہنچانے کے لئے جو باغیانہ نظام قائم تھا اس کی طرف سے انگریزی حکومت زیادہ دیر آنکھیں بند نہ کر سکتی تھی۔ لارڈ ڈلہوزی نے ۱۸۵۲ء کے موسم خزاں میں اس موضوع پر دو اہم یادداشتیں تحریر کیں۔ پہلی یادداشت میں لارڈ موصوف نے یہ حکم فرما دیا تھا کہ اندرون ملک میں اس نظام کی پورے طور پر نگرانی کی جائے۔ اور دوسری یادداشت میں ان قبائل کے ساتھ ایک سرحدی جنگ کی موزونیت پر بحث کی گئی تھی، جن کی کافروں کے ساتھ توہم پرستانہ نفرت کی آگ کو

(۱) یعنی مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی پھر اس نے ان کے اور مولانا کرامت علی جون پوری اور مولانا زین العابدین حیدر آبادی کے دائرۂ عمل اور دعوت کے مقامات کا ذکر کیا ہے۔

(۲) ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۷۴۔ ۷۵۔

ہندوستانی دیوانوں نے ہوا دے کر خوب ہی بھڑکا دیا تھا۔اسی سال انھوں نے ہمارے حلیف، ریاست امب کے نواب پر حملہ کر دیا۔جس کی وجہ سے انگریزی فوج بھیجنے کی ضرورت محسوس ہوئی (۱)۔۱۸۵۳ء میں ہمارے بہت سے سپاہی غداروں کے ساتھ خط وکتابت کرنے کے جرم میں سزایاب ہوئے۔

میں ان بے عزتیوں، حملوں اور قتل وغارت کی تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا، جو ۱۸۵۶ء (۲) میں سرحدی جنگ کا باعث ہوئے۔اس دوران میں مذہبی دیوانوں نے سرحدی قبائل کو انگریزی حکومت کے خلاف متواتر اکسائے رکھا۔ایک ہی واقعہ تمام حالات کو واضح کر دے گا۔یعنی ۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۷ء تک ہم علاحدہ علاحدہ سولہ فوجی مہمیں بھیجنے پر مجبور ہوئے جس سے باقاعدہ فوج کی تعداد پینتیس ہزار ہوگئی تھی۔(۳)

اس دوران میں ستھانہ کی نوآبادی گو سرحد کے طول وعرض میں جہاد کی روح بھڑکاتی رہی پھر بھی ہماری فوج سے راست ٹکر نہ لے کر انھوں نے عقلمندی کا ثبوت دیا۔(۴)

اسکے بعد مجاہدین نے انگریزوں سے جو جنگیں لڑیں اور جو کشمکش جاری رکھی اسکی تفصیل اس جلد کی حد سے باہر ہے لہٰذا اگلی جلدوں میں اس کی تفصیلات انشاء اللہ نظر نواز ہوں گی۔

ساتویں فصل

نواب وزیرالدولہ اور جنگ آزادی میں ان کا کردار

نواب محمد وزیر خاں المعروف بہ نواب وزیرالدولہ۔نواب امیرالدولہ محمد امیر خان والی ٹونک کے فرزند ارجمند اور جانشین تھے۔برصغیر کے والیان ریاست میں ان جیسا صاحب علم، پابند شریعت، رمز آشنائے طریقت اور متبع سنت شاید ہی کوئی گزرا ہو۔وہ بہت جید عالم تھے۔اس کا اظہار ان کی کتاب وصایا (۵) کی ہر سطر سے ہوتا ہے۔

---

(۱) اس کی تفصیل گذر چکی ہے اسی کے نتیجہ میں کوہ سیاہ کی مشہور مہم پیش آئی تھی۔

(۲) مولانا مسعود عالم نے ہنٹر ہی کے حوالہ سے اس موقع پر ۱۸۵۸ء لکھا ہے نیز آگے فوج کی تعداد ۳۳۰۰۰ ہزار لکھی ہے۔(دیکھئے ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک صفحہ ۵۶۔۵۷)

(۳) ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۳۸۔ (۴) دیکھئے ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک صفحہ ۵۷۔

(۵) کتاب کا پورا نام وصایا الوزیر علی طریق البشیر والنذیر ہے۔جسکو اختصاراً وصایا وزیری ==

امیر خاں کی انگریزوں سے مصالحت کے بعد جب سید احمد شہیدؒ امیر خاں کی رفاقت ترک کر کے دہلی جانے لگے تو امیر خاں نے آپ کی معیت میں اپنے صاحبزادہ والا تبار وزیر الدولہ کو بھیجا تھا، جن کو بچپن ہی سے سید صاحب سے بہت مناسبت تھی۔ اس وقت وہ عنفوان شباب میں تھے اور تعلیم جاری تھی، چنانچہ انھوں نے دہلی میں رک کر خانوادۂ ولی اللہی میں تکمیل کی۔ تاریخ ٹونک میں لکھا ہے کہ نواب وزیر الدولہ زمانۂ ولیعہدی میں تقریباً دو سال بحیثیت طالب علم دہلی میں قیام پذیر رہے، اور شاہ عبدالعزیز سے علوم کی تکمیل کی۔ (۱) ایک جگہ لکھا ہے کہ شاہ عبدالقادر دہلوی کے مدرسہ میں آپکی تعلیم ہوئی۔ (۲) مولانا سید حیدر علی رامپوری بھی آپ کے اساتذہ میں تھے۔ (۳)

حضرت مولانا علی میاں تحریر فرماتے ہیں:

نواب وزیر الدولہ ریاست وامارت کے باوجود اس شان کے آدمی تھے جو خانقاہ نشین مشائخ اور عزلت گزیں صوفیوں میں نہیں ملتی۔ آپ پورے متشرع، متبع سنت، پابند مذہب، باخدا اور متواضع مسلمان تھے اور صرف روساء وامراء ہی کے طبقہ میں نہیں بلکہ علماء وصوفیہ اور دینداروں کے طبقہ میں بھی ممتاز تھے۔ سید صاحب اور آپ کی جماعت کے ساتھ تو آپ کو عشق تھا۔ ان کی خاک پا آپ کے سر کا تاج تھی۔ ان کی ہر خدمت کو اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ (۴)

نواب وزیر الدولہ نے زمانۂ ولیعہدی سے لے کر اپنا پیمانہ عمر لبریز ہونے تک ہر زمانہ میں سید صاحب اور آپکی جماعت کا پورا ساتھ دیا۔ ہر موڑ پر پشت پناہی کی اور ہر

== بھی کہتے ہیں۔ کتاب بڑی تقطیع کے ۵۱۲ صفحات میں آئی ہے۔ دو حصے ایک ساتھ مجلد ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ بعض فصلوں میں (جو نمبر وار وصایا کے عنوان سے ہیں) انھوں نے ایسی حدیثیں جمع کی ہیں جو پختہ عالم دین ہی کر سکتا ہے۔ چند وصایا پڑھ جایئے۔ نواب کی علمی شان اور بلندی مقام کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ نیز اس کتاب میں سید صاحب کے متعلق بعض ایسے واقعات اور حکایات ملتی ہیں جن کا کہیں اور ذکر نہیں ہے۔

(۱) تاریخ ٹونک از محمد اعجاز خان صفحہ ۷۹۔

(۲) ایضاً صفحہ ۷۴۔ نیز علمی شان کے لئے ملاحظہ ہو کتاب مذکور صفحہ ۷۸۔

(۳) تذکرہ کاملان رامپور صفحہ ۱۱۸۔

(۴) کاروان ایمان وعزیمت صفحہ ۱۲۸۔

طرح سے امداد بہم پہنچائی۔ سید صاحب جبتک حیات رہے آپکی مدد کرتے رہے۔ پھر جب مولانا سید نصیر الدین دہلوی سرحد جاتے ہوئے ٹونک پہنچے تو نواب نے بڑی پذیرائی کی، اور ساز و سامان سے بھرپور مدد کی اور اس کے بعد بھی آخر تک امداد کا سلسلہ جاری رکھا۔

نواب وزیر الدولہ انگریزوں کے خلاف بہت سخت جذبات رکھتے تھے۔ مگر اپنی ریاست سے مجبور تھے۔ اس لئے عملی رفاقت نہیں کر سکے۔ نواب صاحب کے جذبات کا اندازہ صرف ان کی ایک عبارت سے ہی ہو سکتا ہے جو انہوں نے ایک حکایت کے ضمن میں لکھی ہے۔ لکھتے ہیں :

انگریز کفر انگیز و شرک ریز۔ یار بار الہا! بخدائی تو کہ سر و پایش ریز ریز۔ آمین (۱)

انگریز جو کفر کو رواج دینے والے اور شرک کا پرچار کرنے والے ہیں۔ اے بار الہا! تجھے تیری خدائی کا واسطہ، تو انکی گردن مروڑ دے اور ہاتھ پاؤں توڑ توڑ کر رکھ دے آمین۔

یہی وجہ ہے کہ ہندوستان بھر میں جہاں کہیں انگریزوں کے خلاف کوئی تحریک اٹھی تو اس میں عموماً ہمیں نواب وزیر الدولہ کی حمایت و تعاون نظر آتا ہے۔ باب دہم میں اس کا ذکر آئے گا کہ حیدر آباد کی بغاوت میں مبارز الدولہ کی نواب صاحب سے مراسلت تھی۔ یہی نہیں بلکہ نواب مرحوم نے مبارز الدولہ کی اتنی ہمت افزائی کی تھی کہ اس کے لئے ''امیر المومنین حامی دین مبین عبدالعزیز مبارز الدولہ'' کا لقب تجویز کیا تھا۔ اور یہ بات قریب ہی گذر چکی ہے کہ پٹنہ میں خواجہ حسین علی خاں کے منصوبہ میں نواب صاحب کا ایجنٹ سیف علی کس طرح سرگرم عمل تھا۔

الغرض نواب صاحب نے انگریزوں کے خلاف جدوجہد کو بہت آگے بڑھایا اور اس سلسلہ میں ہر طرح کا تعاون پیش کیا۔

نواب کی تخت نشینی ۲۷ رجمادی الاخری ۱۲۵۰ھ (۳۱ اکتوبر ۱۸۳۴ء) کو ہوئی تھی اور تیس سال حکومت کر کے ۱۳ محرم ۱۲۸۱ھ (۱۸ جون ۱۸۶۴ء) کو انتقال کیا۔ (۲)

(۱) وصایا الوزیر حصہ دوم صفحہ ۱۲۹۔

(۲) مختصر حالات کیلئے دیکھئے کاروان ایمان و عزیمت صفحہ ۱۲۶۔۱۳۰۔ اور جماعت مجاہدین صفحہ ۱۸۹ تا ۱۹۲۔

آٹھویں فصل

مولانا شاہ محمد امین غازی امروہوی کا جذبۂ حریت

مولانا سید محمد امین بن سید غلام فرید حسینی۔ دسویں صدی ہجری کے مشہور بزرگ شاہ ابن چشتی کی اولاد سے تھے۔ آپ کا خاندان بلحاظ علم وفضل، مشیخت وارشاد اور عزت ووجاہت ہمیشہ ممتاز رہا۔ تقریباً ۱۱۹۵ھ میں پیدا ہوئے۔(۱) بقدر ضرورت عربی پڑھی مگر فارسی ادبیات میں دستگاہ حاصل کی۔ فن حرب اور شناخت اسلحہ کے ماہر تھے۔(۲)

جس زمانہ میں حضرت سید صاحب دورہ کرتے ہوئے رامپور پہنچے تھے (۱۲۳۱ھ میں) شاہ محمد امین مولانا شہید کے مواعظ سے متاثر ہوکر حاضر خدمت ہوئے اور بیعت کی۔ حج سے واپسی کے بعد جب سید صاحب نے جہاد کا ارادہ فرمایا اور ملک میں اپنے داعی روانہ فرمائے تو آپ نے بھی لبیک کہا۔ اور جماعت مجاہدین میں داخل ہوکر جہاد میں شریک رہے۔ اسی زمانہ میں خلعت وخلافت سے مشرف ہوئے۔ سید صاحب کی شہادت کے بعد باقی ماندہ قافلہ کے ساتھ ٹونک آئے۔ اور کچھ عرصہ نواب امیر خاں کی خدمت میں رہنے کے بعد وطن واپس آکر اصلاح وتبلیغ میں مصروف ہوگئے۔ ضلع مرادآباد، بجنور اور اس کے مضافات میں آپ کے بزرگوں کے ہزارہا مرید ومعتقد موجود تھے۔ از سرنو ان لوگوں سے سید صاحب کے طریقہ میں بیعت لی۔(۳)

سید صاحب سے آپ کو گہری عقیدت تھی۔ آپ کے طریقہ پر پوری طرح کاربند تھے۔ اسی کا اثر ہے کہ آپ نے سید صاحب اور آپ کے رفقاء ومجاہدین اور واقعات جہاد کا فارسی میں منظوم تذکرہ لکھا۔ جس کا نام مثنوی فیروز شاہ ہے۔ اس کے دیباچہ میں اپنے اکلوتے فرزند روح الامین کے لئے جو اس زمانہ میں صغیر السن تھے غازی ومجاہد بننے کی دعا وتمنا کرتے ہیں۔ نیز اس سے ان کی انگریزوں سے نفرت کا بھی پتہ چلتا

---

(۱) کاروان ایمان وعزیمت صفحہ ۸۵۔ تذکرۃ الکرام میں آپ کی نسبت عباسی لکھی ہے۔

(۲) تذکرۃ الکرام صفحہ ۱۹۹۔ از محمود احمد عباسی۔

(۳) کاروان ایمان وعزیمت صفحہ ۸۵

ہے۔فرماتے ہیں :

چناں خواہم آں پاک پروردگار — کہ روح الامیں راکنی بختیار
مجاہد چنانش کن اندر غزا — کزو تا رسد بر نصاری سزا

یعنی خدائے پاک سے میری دعا ہے کہ روح الامین کا نصیب جاگ جائے۔ جنگوں میں اس کو ایسا مجاہد بنا کہ اس کے ذریعہ نصاری پر مار پڑے۔

اس مثنوی میں انگریزی حکومت کی انتہائی مذمت اور اس سے نفرت واجتناب کی تعلیم دی ہے۔ بلکہ وہ مسلمانوں کی اخلاقی ومذہبی پستی کا ذمہ دار حکومت متسلطہ کی بے دینی کو قرار دیتے ہیں۔اور اس کے ظلم وجور سے پناہ مانگتے ہوئے اس کی تباہی اور زوال کے لئے دعا کرتے ہیں۔فرماتے ہیں :

ز بددینئی حاکمان زمن — نشان حیا نیست در مرد وزن
ز بددینئی حاکمان زمن — حیا روئے پوشید و رفت از جہاں
بجاں آمدیم از تعدی شاں — بسے الاماں المدد الاماں(۱)

یعنی حکام وقت کی بددینی کی وجہ سے مردوں اور عورتوں میں حیا کا نام ونشان نہیں رہا۔ حکمرانوں کی بددینی کے باعث حیا اپنا چہرہ چھپا کر دنیا سے رخصت ہوگئی۔ ان لوگوں کے ظلم وزیادتی سے ہم تنگ آگئے ہیں۔جان پر بن آئی ہے۔بس خدا ہی بچائے۔**الامان الحفیظ**.

ان کا ایک اور شعر ہے جس سے ان کی انگریزوں سے انتہائی نفرت کا پتہ چلتا ہے اس میں وہ ان کو کتا قرار دیتے ہوئے۔اللہ سے دعا کرتے ہیں :

بہ نیروئے اسلامیاں زوردہ — کہ شد از سگاں شہر ہا کوردہ

خدایا! مسلمانوں کی شوکت وطاقت میں اضافہ فرما کہ ان کتوں سے شہر بے رونق ہو کر دیہات کی طرح ہوگئے ہیں۔

(۱) یہ اشعار پروفیسر خلیق احمد نظامی نے نقل کئے ہیں (حضرت سید احمد شہید اور ان کی تحریک اصلاح وجہاد صفحہ ۲۷) انہوں نے لکھا ہے کہ مثنوی فیروز شاہ کا ایک نادر قلمی نسخہ ان کے ذخیرۂ کتب میں ہے۔میں علی گڑھ میں ان کے دولت کدہ پر حاضر ہوا۔اور اس کے دیکھنے کی ان کے صاحبزادہ گرامی قدر پروفیسر احتشام صاحب سے خواہش ظاہر کی۔انھوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ کتب خانہ کا نظام بھائی فرحان کے ہاتھ میں ہے اور وہ برطانیہ میں رہتے ہیں۔

باب ہشتم

روہیلکھنڈ میں علماء کا جہاد آزادی

پہلی فصل : جنگ دوجوڑہ اور علماء کرام

دوسری فصل : مفتی محمد عوض اور بریلی کا جہاد آزادی

پہلی فصل

جنگ دوجوڑہ اور علماء کرام

جنگ دوجوڑہ (۱) روہیلکھنڈ کی تحریک آزادی میں بڑی اہمیت رکھتی ہے اس جنگ نے انگریزوں کو بہت چوکنا کردیا تھا۔۲۸/ربیع الاول ۱۲۰۹ھ مطابق ۲۴/ اکتوبر ۱۷۹۴ء کو یہ جنگ پیش آئی۔اس وقت نواب غلام محمد خاں ریاست رامپور کے حاکم تھے۔

حافظ رحمت خان کا خون ابھی تازہ تھا۔اور روہیلوں کی جوش و جذبہ میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔انگریزوں سے انہیں اس درجہ عداوت تھی کہ ''لعنت برروئے فرنگی'' ان کا تکیہ کلام بن گیا تھا۔چنانچہ پھر منتظم ہوکر انگریزوں سے جنگ کی تیاریاں ہونے لگیں۔نواب صاحب رامپور نے اس پر پوری توجہ دی اور وہ کیوں توجہ نہ دیتے جب کہ حافظ شاہ جمال اللہ جیسے مجاہد شیخ طریقت نے ان کی تربیت کی تھی۔غرض نواب صاحب نے باختلاف روایت سرٹھ ہزار فوج تیار کرکے بریلی کی جانب کوچ کیا۔پٹھانوں کا جوش قابل دید تھا بقول نجم الغنی خان ہر ایک پٹھان اپنے زعم میں سورما بنا ہوا تھا۔

نواب صاحب کی فوج نے آگے بڑھ کر قریب ہی ایک جگہ پڑاؤ کیا تو خبر پہنچی کہ انگریزی لشکر بریلی کے متصل آپڑا ہے۔نواب صاحب نے حکم دیا کہ کل صبح کو تمام نشانوں کے آدمی جمع ہوکر ہمارے سامنے آئیں۔چنانچہ اس حکم کی تعمیل ہوئی۔نواب صاحب نے ہر ایک سپاہی کو پانچ پانچ روپئے دلوائے۔اور فرمایا کہ اگر کوئی سپاہی تلنگے (۲) کا سر کاٹ کر لائے گا اسے پچیس روپئے انعام دیئے جائیں گے۔اور جو انگریز کا سر کاٹ کر لائے گا اس کو پانچ سو روپئے عطا ہوں گے۔اس حکم کا اعلان ہوتے ہی سپاہ کے دلوں میں شجاعت جوش مارنے لگی،اور ہمت بڑھ گئی۔کچھ سپاہی انگریزوں

---

(۱) بریلی میں ایک مقام کا نام ہے۔

(۲) انگریزی فوج کے ہندوستانی سپاہی مراد ہیں اس لفظ کی تحقیق کے لئے دیکھئے نوراللغات۔

سے ساز باز رکھتے تھے جن میں نواب کے کچھ بھائی اور بعض سردار بھی شامل تھے۔ جن کی وجہ سے نواب کا دل ٹوٹ گیا۔ اور وہ قسمیں دے کر کہنے لگے کہ جس کی خوشی اس جنگ میں شریک ہونے کی نہ ہو وہ چلا جائے۔ میری طرف سے کسی پر جبر نہیں۔ غرض سپاہ آگے بڑھی، اور دوجوڑہ کو عبور کر کے پڑاؤ کیا۔ انگریزی فوج نے بھی بریلی سے آگے بڑھ کر سنکھا کے پل کے پاس قیام کیا۔ بریلی کا صوبہ دار شمبو ناتھ بھی پانچ ہزار سپاہ کے ساتھ انگریزی فوج کے ہمراہ تھا۔ انگریزی فوج کی کمان جنرل ابر کرمبی کے ہاتھ میں تھی۔ ۲۴ر اکتوبر ۱۷۹۴ء کو گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ روہیلے بڑی بے جگری سے لڑے۔ بقول مصنف عماد السعادت روہیلوں نے تلنگوں کے سر اڑانا شروع کئے ان کے جوش کا یہ عالم تھا کہ جس آدمی کے سر پر پٹھان کی تلوار پڑ گئی ککڑی کی طرح اس کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ اور اگر بندوق کی نال پر پڑی تو اس کے بھی دو حصے کر دیئے۔ تمام پٹھان سوار انگریزی فوج میں اس سرے سے اس سرے تک نکل گئے۔ اور خوب خوب دادِ شجاعت دی۔ ڈھائی سو کے قریب گورے اور پچاس سردار کھیت رہے۔ اور دو ہزار کے قریب تلنگے مارے گئے۔ مارے جانے والوں میں کرنل، میجر، کپتان، لفٹنٹ سمیت کئی بڑے بڑے سردار تھے۔ جن کے نام نجم الغنی خان نے نقل کئے ہیں (۱)

مگر شومیِ قسمت کہ وقت سے پہلے فتح کا نقارہ بجا۔ پٹھان مالِ غنیمت میں مصروف تھے کہ جنرل ابر کرمبی نے پلٹ کر سخت حملہ کیا۔ اور پٹھانوں کی توپوں پر قبضہ کر لیا۔ اور کئی توپ داغے اور اس کی پلٹن نے پٹھانوں پر گولیاں برسانی شروع کیں۔ جس سے افراتفری مچ گئی اور چڑھا ہوا زور ایک دم سیلاب کی طرح اتر گیا۔ غرض ایک ہزار پٹھان اس لڑائی میں مارے گئے۔ مؤرخین نے ان کی شجاعت کا تذکرہ کرتے اور خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ روہیلے بندوق اور توپ سے مارے گئے اور انگریزی فوج تلوار سے کٹی۔ (۲)

علمائے وقت اول سے اخیر تک شریک جنگ رہے۔ اور کئی علماء تو فوج کی قیادت

---

(۱) دیکھئے اخبار الصنادید اول صفحہ ۶۴۶۔

(۲) جنگ کی تفصیل کے لئے دیکھئے۔ اخبار الصنادید جلد اول صفحہ ۶۴۴-۶۵۴۔

کررہے تھے۔خود بھی جنگ آزادی میں حصہ لیا۔اور اپنے صاحبزادوں کو بھی شریک کیا۔محمد حسن خاں ابن ملا محسن خاں۔محمد نسیم خاں ابن ملا رحم داد خاں۔اور مولانا غلام جیلانی خان (۱) کے تمام صاحبزادے غلام حسین خاں، غلام حسن خاں، غلام محمد خان اور غلام حیدر خاں فوج کے سرداروں میں شمار ہوتے تھے۔اور جن بڑے علماء کے نام معلوم ہوسکے، وہ یہ ہیں :

ملا عبدالرحیم رامپوری

ملا عبدالرحیم رامپوری، رامپور کے علماء کبار اور مشہور مدرسین میں تھے۔آپکے والد مولانا حاجی محمد سعید خاں تیراہی، شاہ ولی اللہ کے خاص شاگرد تھے۔یہاں تک کہ سفر حج میں بھی شاہ صاحب کے ساتھ تھے۔اس سے ان کی شاہ صاحب سے گہری عقیدت اور ان سے قربت کا پتہ چلتا ہے۔

حافظ احمد علی خاں شوق لکھتے ہیں کہ ملا عبدالرحیم فاضل اجل اور بہت پرہیز گار تھے۔آپ کے شاگرد ہندوستان، افغانستان اور بخارا تک تھے۔مفتی سعد اللہ، مولانا عالم علی مرادآبادی مولانا فیض الحسن سہارن پوری جیسے سینکڑوں مستند علماء آپ کے شاگرد تھے۔مولوی عبدالقادر رامپوری کے بقول مفتی شرف الدین ان کی وجہ سے رامپور آئے۔کتب درسیہ کے گویا حافظ تھے۔ریاضی میں خاص درک تھا۔مشہور درسی کتاب غایۃ البیان کی فارسی میں شرح لکھی۔نیز مجمع الصیغ کے نام سے بھی ایک کتاب بزبان فارسی آپ کی تصنیف ہے۔بعمر ستر سال ۱۲۳۴ھ (۱۸۱۸ء) میں آپ نے انتقال کیا۔(۲)

چونکہ مولانا عبدالرحیم کے والد حاجی محمد سعید شاہ ولی اللہ کے بہت مقرب تھے۔اس لئے ان کی انقلابی تعلیمات کا ان پر اثر ہونا فطری بات ہے۔وہ شاہ صاحب کے پروگرام سے پورے واقف تھے۔اور کیا بعید کہ سفر حج کی رفاقت نے ان کو شاہ صاحب کا محرم اسرار بنادیا ہو۔اس لئے کہ شاہ صاحب نے سفر حج ہی میں غیبی اشاروں

(۱) ان کا تذکرہ حافظ رحمت خان کے ساتھ گزر چکا ہے۔

(۲) ملاحظہ ہو تذکرہ کاملاں رامپور صفحہ ۲۱۳۔

سے انقلاب کا فیصلہ کیا تھا۔ اور چونکہ شاہ صاحب کی روہیلوں پر خاص نظر تھی اور ان سے امیدیں وابستہ تھیں۔ اس لئے حاجی محمد سعید نے شاہ صاحب کی رحلت کے بعد روہیلکھنڈ کے دارالسلطنت بریلی کا قصد کیا اور یہیں مقیم ہوگئے۔ حافظ الملک حافظ رحمت خاں نے آپ کی بڑی قدر کی اور اپنے لڑکے عنایت خاں کا اتالیق مقرر کیا۔ حاجی محمد سعید نے باختلاف روایت ۱۱۸۹ھ میں بریلی میں انتقال کیا۔ (۱)

ملا عبدالرحیم اور حاجی محمد سعید کے دوسرے صاحبزادے بالخصوص مولوی عبدالرحمٰن، شاہ صاحب کی تعلیمات سے متاثر اور ان کے پیغام کے حامل تھے۔ بلکہ ایک طرح سے روہیلکھنڈ میں تعلیمات ولی اللہی کے نمائندے سمجھے جاتے تھے۔ اس وجہ سے شاہ عبدالعزیز اور آپ کے برادران ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز کے مولوی عبدالرحمٰن اور ان کے بھائیوں کے نام کئی خطوط ہیں۔ عموماً مولوی عبدالرحمٰن و دیگر فرزندان (۲) حاجی محمد سعید کے نام سے یہ خطوط ہوتے تھے۔

نیز شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے بھی ان کے نام خطوط ملتے ہیں۔ بعض خطوط میں ملا عبدالرحیم کے نام کی صراحت بھی ہے۔

خانوادہ ولی اللہی سے اس قوی تعلق کی بناء پر مولانا عبدالرحیم نے حریت پسندی اور جذبہ جہاد کا حصہ وافر پایا تھا۔ جنگ دوجوڑہ میں آپ بنفس نفیس شریک تھے (۳)

---

(۱) حکیم محمد حسین خاں شفاء رامپوری، ملا عبدالرحیم رامپوری : کردار ساز حریت پسند و مثالی استاذ۔ (مضمون غیر مطبوعہ) یہ مضمون میں نے حکیم صاحب سے رامپور میں حاصل کیا۔ ان کا یہ مضمون درحقیقت پہلے الحسنات رامپور میں شائع ہوا تھا، مگر حکیم صاحب نے ہمیں جو مضمون عنایت فرمایا وہ حکیم صاحب کے بقول اضافہ شدہ ہے، کہیں شائع نہیں ہوا۔

(۲) حکیم محمد حسین شفاء صاحب لکھتے ہیں کہ حاجی محمد سعید کے پانچ لڑکے تھے مولوی حاجی عبداللہ خاں، مولوی احمد خاں، مولوی محمد جان خان، مولوی عبدالرحمٰن اور مولوی عبدالرحیم۔ شاہ عبدالعزیز کے فتوی دارالحرب کے ضمن میں مولوی عبدالرحمٰن کا ذکر گزر چکا ہے۔ تذکرہ کاملان رامپور میں لکھا ہے کہ مولوی عبدالرحمٰن مولوی حاجی عبداللہ خاں کے فرزند تھے۔ جس سے ان کا حاجی محمد سعید کا پوتا ہونا معلوم ہوتا ہے، ہم نے حکیم شفاء صاحب سے صحیح بات معلوم کرنی چاہی تو انہوں نے تذکرہ کاملان رامپور کے بیان کو غلطی پر محمول کیا۔ نیز صاحب تذکرہ کاملان رامپور نے شاہ عبدالعزیز کے ان کے نام جو خطوط نقل کئے ہیں ان سے بھی ان کا حاجی محمد سعید کا فرزند ہونا معلوم ہوتا ہے۔

(۳) حکیم محمد حسین شفاء، مضمون مذکور

آپ انگریزوں کی ملازمت ایمان کے منافی سمجھتے تھے۔ گورنر جنرل ہسٹنگو نے ۱۸۱۴ء میں رامپور کے سفر کے موقع پر آپ پر ڈیرہ ڈالنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا مگر آپ کسی طرح آمادہ نہیں ہوئے۔ اور اسے مسلمان عالم کا مقام بتایا۔ آخر اس کو مایوس ہونا پڑا۔ (۱)

مولانا عبدالرحیم نے مسند درس بچھا کر خاموش طریقہ سے جذبہ آزادی کو خوب فروغ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں آپ کے بعض شاگردوں کو ہم بہت نمایاں پاتے ہیں۔ جن میں مولانا عالم علی، مولوی جمال احمد، اور مولوی سید فضل حق قابل ذکر ہیں۔ ان کا تذکرہ انشاء اللہ دوسری جلد میں آئے گا۔

مولانا غلام جیلانی رفعت

مولوی غلام جیلانی بنگش پٹھان تھے۔ ملا بحر العلوم اور شاہ عبدالعزیز دہلوی کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ شعر گوئی میں کامل دستگاہ تھی۔ رفعت تخلص تھا۔ مولوی عبدالقادر خاں لکھتے ہیں: فاضل عارف اور نظم و نثر کے ماہر تھے۔ خود بھی اردو فارسی میں شعر کہتے تھے۔ ایک عربی غزل جس کو مفتی امیر اللہ نے اپنی طرف منسوب کر لیا ہے اور شیخ احمد یمنی نے بھی انہی کے نام سے لکھ دیا ہے۔ ان کے زور طبع کی دلیل ہے۔ (۲)

انکے شاگردوں میں مفتی شرف الدین رامپوری، مولوی احمد علی عباسی چڑیا کوٹی، مولوی غیاث الدین عزت (مصنف غیاث اللغات) اور مولانا سید حیدر علی رامپوری مشہور ہیں۔ آخر الذکر ان کے داماد بھی تھے۔ قوت حافظہ کا یہ حال تھا کہ مشاعرہ ختم ہونے کے بعد اکثر شعراء کی غزلیں اول سے آخر تک پڑھ دیتے تھے۔ اسی برس کی عمر پائی۔ ۲۷ ذی الحجہ ۱۲۳۴ھ (۱۸۱۹ء) کو رامپور میں انتقال کیا۔ (۳)

مولانا غلام جیلانی رفعت میں جذبہ جہاد بدرجہ اتم موجود تھا۔ انگریز دشمنی میں وہ

(۱) یہ واقعہ خودداری اور غیرت ایمانی کی نادر مثال ہے۔ اور ایک مسلمان عالم کی سچی تصویر ہے۔ دیکھئے الاعلام (نزھۃ الخواطر) ۷/۲۸۷۔ تذکرہ کاملان رامپور میں بھی مختصر اً مذکور ہے۔ حکیم شفاء نے اپنے مذکورہ مضمون میں دلچسپ اور موثر انداز میں اس کو بیان کیا ہے۔ حضرت مولانا علی میاں طلبہ کے سامنے اکثر اس کو بیان کرتے تھے۔ نیز انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر میں بھی اس کو نقل کیا ہے۔

(۲) علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی) جلد اول صفحہ ۶۸-۶۹، مرتبہ محمد ایوب قادری۔

(۲) تذکرہ کاملان رامپور ۲۸۴-۲۸۶۔

کسی روہیلہ سردار سے کم نہیں تھے۔ چنانچہ جنگ دوجوڑہ کے موقع پر انہوں نے اپنی قربانیاں پیش کیں۔ اور نہ صرف جنگ میں پوری طرح شریک رہے(۱)۔ بلکہ ''درمنظوم'' کے نام سے اس کے حالات وکوائف میں ایک منظوم کتاب بھی لکھی، جو اپنی تاثیر میں بے نظیر ہے۔ اس کے علاوہ ان کا فارسی دیوان مجموعہ رفعت ہے۔ نیز ہشت خلد (فارسی) کے نام سے مختلف شعراء کے اشعار جمع کیے ہیں۔ بعض تذکرہ نگاروں نے بیان کیا ہے کہ اردو دیوان اور متعدد مثنویاں بھی ہیں۔(۲)

بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ نجو خان (جو جنگ دوجوڑہ کا ہیرو تھا یہاں تک کہ بعض مؤرخین نے اس جنگ کو جنگ نجو خانی کے نام سے موسوم کیا ہے) سے ان کے گہرے روابط تھے اور نجو خان ان کی بڑی عزت کرتا تھا۔

ملا رحیم خان (۳)

مشاہیر میں تھے۔ بڑے بہادر سپاہی تھے۔ جنگی قابلیت مسلم تھی۔ جنگ دوجوڑہ میں خوب جوہر دکھائے۔ ان کا بیٹا محمد نسیم خاں بھی ان کے ساتھ تھا۔ باپ بیٹے نے کئی انگریزوں کو تہ تیغ کیا۔(۴)

ملا ملوک

ملا ملوک ان لوگوں میں بہت ممتاز مقام رکھتے تھے جو حافظ الملک کے زمانہ میں افغانستان سے روہیلکھنڈ میں آکر بس گئے تھے۔ رامپور میں آپ کی بڑی شہرت تھی۔ رامپور میں اب تک ایک احاطہ ''گھیر ملا ملوک'' کے نام سے مشہور ہے۔ وہاں اب سونے کی دکانیں ہیں۔ علم وفضل کے ساتھ جذبۂ آزادی اور جوش جہاد سے بھی سرشار تھے۔ چنانچہ آپ جنگ دوجوڑہ میں شریک رہے۔(۵)

(۱) حکیم محمد حسین شفاء، مضمون مذکور

(۲) دیکھئے تذکرہ کاملان رامپور، صفحہ ۲۸۴۔

(۳) بعض جگہوں پر ملا رحم داد خاں لکھا ہے۔

(۴) اخبار الصنادید، جلد اول صفحہ ۶۴۴۔

(۵) حکیم محمد حسین شفاء، مضمون مذکور

دوسری فصل

مفتی محمد عوض اور بریلی کا جہاد آزادی

مفتی محمد عوض

مفتی محمد عوض کا تعلق بدایون کے مشہور عثمانی خاندان سے تھا۔آپ کے والد مفتی درویش محمد، حافظ الملک حافظ رحمت خاں کے زمانہ میں بریلی میں خدمت افتاء پر مامور تھے۔(۱)

مفتی محمد عوض کی ننہال بریلی میں تھی۔ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی۔پھر اپنے بڑے بھائی مولانا عبدالغنی مفتی آنولہ (متوفی ۱۲۰۹ھ مطابق ۱۷۹۵ء) سے علوم منقول و معقول کی تکمیل کی۔نیز مولانا محمد علی بدایونی سے بھی بعض علوم میں استفاضہ فرمایا۔(۲)

نواب سید صدیق حسن خاں صاحب (جو آپ کے حقیقی نواسے ہیں) لکھتے ہیں آپ کو علوم دینیہ،فقہ،حدیث و تفسیر اور بالخصوص علوم قرآن اور قرأت سبعہ میں مہارت تامہ حاصل تھی۔نیز لکھتے ہیں کہ چند رسائل قرأت وغیرہ جن کو انھوں نے ۱۱۸۸ھ میں اپنے قلم خاص سے لکھا تھا،میرے کتب خانہ میں موجود ہیں۔(۳)

۱۱۸۳ھ مطابق ۱۷۶۹ء میں آپ کے والد ماجد مفتی درویش محمد کے انتقال کے

---

(۱) عہد بنگش کی سیاسی علمی اور ثقافتی تاریخ،مؤلفہ مفتی ولی اللہ فرخ آبادی مترجمہ حکیم شریف الزماں اکبر آبادی،مرتبہ محمد ایوب قاری صفحہ ۲۰۹۔

(۲) اکمل التاریخ جلد اول صفحہ ۴۶۔

(۳) تاریخ قنوج (مخطوطہ) صفحہ ۲۷۰۔۲۷۱،(مخزونہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری)۔نواب صاحب کی اکثر کتابیں ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔مگر ان میں مفتی صاحب کا لکھا ہوا کوئی رسالہ نہیں۔نواب علی حسن خان (خلف نواب صدیق حسن خان) نے لکھا ہے کہ یہ رسائل سید علامہ مغفور کے کتب خانہ میں موجود تھے۔(مآثر صدیقی حصہ اول صفحہ ۶۷) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں ان کے کتب خانہ میں موجود نہیں رہے تھے۔

بعد حافظ الملک نے آپ کو بریلی کا مفتی شرع مقرر کیا۔(۱)

نواب علی حسن خاں کے بقول آپ بریلی کے مفتی اسلام مشہور تھے۔(۲)

محکمہ افتاء پر فائز ہونے کے باوجود درس و تدریس کا سلسلہ برابر جاری رہا۔اور روہیلکھنڈ و اودھ کے مشاہیر نے آپ کے خوان فیض سے استفاضہ کیا۔آپ کے خاص شاگردوں میں مولانا سید اولاد حسن قنوجی (والد نواب سید صدیق حسن خان) اور مولانا فضل امام تھے۔(۳)

نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں کہ حضرت اپنے زمانہ میں علم و فضل اور ظاہری و باطنی فضائل و کمالات میں یگانہ تھے۔احکام شریعت کے نفاذ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے معاملہ میں بہت سخت تھے۔اسی طرح نواب صاحب نے آپ کے زہد و توکل اور صبر و قناعت کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔نیز تحریر فرماتے ہیں کہ آپ کے زیادہ تر اوقات علوم دینیہ کی نشر و اشاعت اور قرآن پاک کی تلاوت میں بسر ہوتے تھے۔(۴)

اللہ تعالیٰ نے حسن ظاہری کی دولت سے بھی سرفراز فرمایا تھا۔نواب علی حسن خان کے مطابق لوگ ان کو یوسف ثانی کہا کرتے تھے۔(۵)

ان سب کمالات کے ساتھ شجاعت و بہادری میں بھی ممتاز تھے۔مولانا حکیم سید عبدالحئی صاحب رقم طراز ہیں :

وکان شدید التعبد ذا جرأة ونجدة۔

آپ بڑے عبادت گزار، دلیر اور شجاع تھے۔(۶)

---

(۱) عہد بنگش صفحہ ۲۰۹۔

(۲) مآثر صدیقی حصہ اول صفحہ ۶۷۔

(۳) اکمل التاریخ حصہ اول صفحہ ۵۶۔ یہاں مولانا فضل امام سے مشہور معقولی عالم مولانا فضل امام خیرآبادی (والد علامہ فضل حق خیرآبادی) مراد نہیں ہیں، بلکہ یہ مولانا فضل امام رائے بریلی کے رہنے والے اور اچھے میاں مارہروی کے خلیفہ تھے۔

(۴) تاریخ قنوج (قلمی) صفحہ ۲۶۶ و صفحہ ۲۷۰۔

(۵) مآثر صدیقی حصہ اول صفحہ ۶۷۔

(۶) الاعلام (نزھۃ الخواطر) ج ۷/ صفحہ ۵۰۱۔

مجاہدانہ جذبات اور مجاہدین آزادی سے ربط و تعلق

مفتی صاحب شروع ہی سے انگریزی اقتدار سے بیزار و بے تاب اور مجاہدین آزادی کے ہم رکاب رہے تھے۔ ابتدا ہی سے ان کے دل میں آزادی کا جذبہ موجزن تھا۔ حافظ الملک حافظ رحمت خان کی شہادت کا دلگیر حادثہ اسی زمانہ میں پیش آیا تھا، جب وہ حافظ الملک کے دارالحکومت بریلی میں اہم عہدہ منصب افتاء پر فائز تھے۔ اس لئے اس حادثہ کا ان پر کیسا اثر پڑا ہوگا اور انگریزوں کے خلاف ان کے جذبات میں کتنی شدت آئی ہوگی اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں انگریزوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے جو چند معدودے لوگ کوشش میں لگے ہوئے تھے ان سے آپ نے برابر روابط رکھے۔ امیر الدولہ نواب امیر خان (بانی ریاست ٹونک) سے آپ کی خط و کتابت بھی تھی۔ چنانچہ امیر نامہ کے بیان کے مطابق ۱۲۲۱ھ مطابق ۱۸۰۵ء میں امیر خان نے جنرل اسکاٹ اور جنرل لیکی سے مقابلہ کے دوران جب مراد آباد میں لیکی کو شکست دی اور اس کے بعد بعض مقامات پر پڑاؤ ڈالتے ہوئے بریلی کا قصد کیا تو پہلے مفتی صاحب کو اطلاع کروائی کہ منتظر رہو ہم بریلی آتے ہیں۔ (۱)

جنرل اسکاٹ کو امیر خان کے اس پروگرام کا علم ہوا تو وہ گھبرا گیا۔ اور اس نے مراد آباد سے کوچ کر کے چندوسی اور بریلی کے درمیان اپنی فوج حائل کر دی۔ تا کہ امیر خان بریلی نہ پہنچ سکیں۔

روہیلوں کا جذبۂ آزادی اور جنگ آزادی کا پس منظر

حافظ الملک حافظ رحمت خان (جو روہیلکھنڈ کے حاکم اور روہیلوں کے مقبول ترین سردار تھے) ۱۷۷۴ء میں انگریزوں سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے تو روہیلوں کو بہت سخت جھٹکا لگا۔ اور وہ موقع تلاش کرتے رہے کہ کسی طرح انگریزوں سے آزادی حاصل کریں۔ ۱۷۹۴ء میں موقع ملتے ہی انہوں نے پیش قدمی کر کے خوب خوب بہادری کے جوہر دکھائے۔ اور تحریک آزادی کے نقشہ پر جنگ دو جوڑہ کو ہمیشہ کے لئے ثبت کر دیا۔

۱۸۰۱ء میں انگریزوں نے والیٔ اودھ نواب سعادت علی خان سے جو علاقے

(۱) امیر نامہ صفحہ ۳۴۴۔

حاصل کئے۔ ان میں روہیلکھنڈ بھی شامل تھا۔ اب اس علاقہ پر پوری طرح انگریزوں کا تسلط قائم ہو گیا۔ اس وقت روہیلہ پٹھانوں کی رگ حمیت اور بھڑکی اور ان میں بے چینی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اب وہ انگریزوں سے لڑنے کے لئے کسی بھی موقع کے انتظار میں تھے۔

انگریز بھی ان کے ان جذبات سے واقف تھے۔ چنانچہ ہنری بیورتج (Henry Beveridge) ان کے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ لوگ کسی بھی حقیقی یا فرضی شکایت کو پکڑے رہنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ جو ان کو آسانی سے اپنی بے اطمینانی کے اظہار کا موقع فراہم کرے۔ فوجی نوعیت کی یا شورش پسندانہ کوئی بھی عوامی تحریک ان کو آسانی سے کسی بھی ہنگامہ میں حصہ لینے کے لئے آمادہ کر سکتی تھی۔ (۱)

ان کے اضطراب اور بے چینی کی یہی حالت تھی دفعۃً موقع ہاتھ آ گیا۔ ہوا یہ کہ ۱۸۱۴ء کے ریگولیشن ایکٹ (Regulation Act) دفعہ ۱۶ کی رو سے انگریزوں نے ہاؤس ٹیکس کا قانون جاری کیا۔ ۱۸۱۶ء میں بریلی میں اس پر عمل درآمد شروع ہوا۔ اور جن مکانات کے وہ سینکڑوں سال سے مالک تھے ان پر ٹیکس لیا جانے لگا۔ اس سے بریلی میں ایک آگ سی لگ گئی۔ اور ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ (۲)

---

(۱) A comprehensive History of India Vol III P-30

(۲) مشہور مؤرخ مارشمین (John Clark Marshman) اس ٹیکس کی حقیقت اور اس پر ہونے والے ہنگامہ کی بابت لکھتا ہے کہ دالیانہ کو بار سے بچانے کے لئے یہ طے پایا کہ بلدیاتی پولس کا نظام قائم رکھنے کے واسطے بعض بڑے شہروں میں ہاؤس ٹیکس لگایا جائے۔ ان شہروں میں روہیلکھنڈ کا صدر مقام بریلی بھی تھا، ٹیکس کے اخراجات کی نگرانی اہل شہر کے ذمہ تھی، مقدار کے لحاظ سے یہ ٹیکس کسی بھی طرح نا قابل برداشت نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ اس کی رقم سالانہ چار روپے تھی اور کم حیثیت کے لوگ اس سے کلیتاً مستثنیٰ تھے۔ لیکن ہاؤس ٹیکس ایک جدت تھی جس کو قدیم دستور یا روایت کی سند حاصل نہیں تھی۔ چنانچہ ان لوگوں میں اس کی مخالفت کی لہر پیدا ہوئی جو برضا و رغبت غیر معمولی قسم کے لیکن قدیم شہری محاصل ادا کر رہے تھے۔ روہیلے جو ہندوستان میں آباد افغانیوں میں سب سے زیادہ شورش پسند تھے اس کی مخالفت پر آمادہ ہوئے۔ The History of India Vol II P. 301, London, 1867

سر جان میلکم لکھتا ہے: پولس کے مصارف کے لئے وہاں ایک معمولی محصول عائد کرنے کا جب خیال کیا گیا تو اس بناء پر ایک زبردست بغاوت ہو گئی۔ سلطنت کے دوسرے علاقوں میں اس قسم کی کاروائی ہو چکی تھی۔ اور ابتداء میں جو مشکلات پیش آئی تھیں وہ رفع کر دی گئی تھیں۔ لیکن روہیلکھنڈ کی آبادی اس قسم کی تھی کہ وہاں بہت سخت مخالفت کا اندیشہ تھا۔ ==

لوگوں نے عام ہڑتال کی اور احتجاجاً اپنے تمام کاروبار بند کر دیئے۔اس میں ہندو مسلمان سب شریک تھے۔لوگ گروہ در گروہ احتجاج کرنے کیلئے کچہری میں جمع ہوگئے۔(۱)

نواب صدیق حسن خان صاحب لکھتے ہیں :

دروقت ایشاں حکام وقت یعنی نصاری در بلدۂ بریلی کہ وطن آنجناب بود، بر ہر یک خانہ شہر مقداری زر چوکیداری مقرر نمودند کہ ہر ماہ می گرفتند۔حضرت ایشاں ایں اخذ وجر را در حق مسلمیں جزیہ فہمیدہ، وموجب ہتک حرمت اسلام دانستہ، ادایش غیر لازم شمردند۔ حاکم ایں حرکت را از مسلماناں نہ پسندیدہ درامضائش شدت نمود۔اسلامیان بلدۂ بریلی آمادۂ پیکار شدند(۲)

نواب علی حسن خان کا بیان ملاحظہ ہو۔لکھتے ہیں :

ان کے (مفتی صاحب کے) وقت میں انگریزی عملداری کا ابتدائی زمانہ تھا اور انگریزی حکومت کے اصول وقوانین سے بہت کم آدمی واقف تھے۔اس زمانہ میں حکام بریلی نے شہر کے تمام مکانوں پر چوکیداری کا حق عائد کر کے باشندگان شہر پر ٹیکس جاری کیا تھا۔جو ہر مہینہ وصول کیا جاتا تھا۔مفتی صاحب اوران کے ساتھ عام رعایا نے جن میں زیادہ تر افغانان بریلی تھے۔اس ٹیکس کو جزیہ کا مترادف سمجھ کر اور ہتک حرمت اسلام

ــــ اور جس دن سے کہ اس محصول کے اجراء کی کوشش کی گئی بریلی میں جو اس علاقے کا مستقر تھا شورش برپا ہوگئی۔اوراس کی وجہ سے پورے شہر میں بدامنی پھیل گئی۔(سیاسی تاریخ ہند جلد اول صفحہ ۴۵۵)

(۱) حیات حافظ رحمت خان صفحہ ۳۶۰۔

(۲) تاریخ قنوج (قلمی) صفحہ ۲۶۶۔نواب صاحب کی یہ کتاب مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے حبیب گلشن میں موجود ہے۔دوسری کسی جگہ اس کی موجودگی کا علم نہ ہوسکا۔اس کتاب کا نواب صاحب کی کتابوں کی فہرست میں کہیں ذکر بھی نہیں ملتا حتی کہ ان کے صاحبزادہ گرامی قدر نواب علی حسن خان جنہوں نے مآثر صدیقی کے اخیر میں ان کی کتابوں کی مکمل فہرست درج کی ہے نے بھی اس کتاب کا ذکر نہیں کیا۔حالاں کہ وہ اس سے یقیناً واقف ہوں گے اس لئے کہ انہوں نے مآثر صدیقی میں مفتی صاحب کی انگریزوں کے ساتھ کشمکش کی جو تفصیل بیان کی ہے وہ تاریخ قنوج ہی سے ماخوذ ہے۔بلکہ بالکل معمولی تبدیلی کے ساتھ ہو بہو اس کا ترجمہ معلوم ہوتی ہے۔اس لئے ہم نے نواب صاحب کی عبارت کا ترجمہ کرنے کے بجائے مآثر صدیقی کی عبارت ہی آگے نقل کی ہے۔

جان کر اس کے ادا کرنے سے انکار کیا۔ حکام کو یہ حرکت سخت ناگوار گزری۔ اور انہوں نے تشدد کرنا شروع کیا۔ یہ دیکھ کر مسلمانان بریلی برہم ہو کر آمادہ فساد ہو گئے۔ (۱)

تمام مشتعل لوگوں نے مولانا مفتی محمد عوض صاحب کو اس تحریک کی قیادت کے لئے منتخب کیا۔ مفتی صاحب اس وقت کافی معمر تھے۔ مگر انتہائی دلیر اور بہادر شخص تھے۔ اور ان کے تقدس کا بھی ایک شہرہ تھا۔ اس لئے لوگوں نے بالاتفاق ان کو امیر متعین کیا۔ مفتی صاحب نے پہلے اتمام حجت کے طور پر کلکٹر ضلع مسٹر ڈمبلٹن (Dumblaton) کے سامنے لوگوں کی شکایتیں پیش کیں۔ سر جان میلکم لکھتا ہے :

بریلی میں ہنگامہ آرا جلسوں کے منعقد ہونے کے کئی روز بعد مفتی (محمد عوض) نے رعایا کی طرف سے حاکم ضلع کی خدمت میں ایک عرضداشت پیش کی۔ لیکن اس کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ (۲)

اثر کیا ہوتا، اس نے اپنی طاقت کے غرور میں نہ صرف اپنا یہ غیر منصفانہ حکم واپس لینے سے صاف انکار کر دیا بلکہ ٹیکس کی وصولیابی کا کام ایک ہندو کوتوال شہر کرند سنگھ کے سپرد کر دیا جو بہت سخت گیر اور ظالم تھا۔ ہندو مسلم اہالیانِ شہر یکساں طور پر اس سے سخت نالاں تھے۔ اس سے اور غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ (۳)

جنگ کا آغاز

جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ ۱۵/اپریل ۱۸۱۶ء کو جب کہ پولیس کے چند آدمی

(۱) مآثر صدیقی حصہ اول صفحہ ۶۸۔

(۲) سیاسی تاریخ ہند جلد اول صفحہ ۴۵۸۔

(۳) ملاحظہ ہو حیات حافظ رحمت خان صفحہ ۳۶۰۔ ہنری بیوریج نے کسی قدر وضاحت کے ساتھ کوتوال کی سخت گیری کو بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے :

رضاکارانہ طور پر کمیٹیوں کے ذریعہ محصول کی وصولیابی کی جو کوشش کی گئی تھی وہ بریلی میں پوری طرح ناکام ثابت ہوئی تو مجسٹریٹ نے کوتوال کو حکم دیا کہ وہ اپنے اختیار سے کام لے کر جبری وصول کرے۔ اس کام کی انجام دہی میں جو ہر طرح دقت طلب ثابت ہو چکا تھا۔ اس نے بے انتہا سختی کا رویہ اختیار کیا۔ ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کو سامان قرق کرنے کی اور اعلیٰ طبقہ کے افراد کو زنجیر و سلاسل اور قید و بند کی دھمکی دی۔

(A Comprehensive History of India vol. III P. 31)

محصول وصول کرنے کی غرض سے ایک معمولی چیز جس کی مالیت مطلوبہ رقم کے مساوی تھی، قرق کر رہے تھے، ان کی مزاحمت کی گئی تو پولس کے ایک سپاہی نے ایک عورت کو زخمی کر دیا۔ اس کو لوگوں نے ایک چارپائی پر ڈالا اور فوراً مفتی صاحب کے پاس لے گئے۔ انہوں نے فوری طور پر اس کو مجسٹریٹ کے پاس لے جانے کی صلاح دی۔ مجسٹریٹ نے باضابطہ متعلقہ عدالت میں مقدمہ دائر کرنے کی ہدایت کی۔ مفتی صاحب نے یہ سن کر کہا اگر حاکم ضلع کا یہی انصاف ہے تو کسی شخص کی جان محفوظ رہ سکتی ہے اور نہ عزت برقرار رہ سکتی ہے۔ یہ کہہ کر وہ گھر سے نکلے کہ جج سے انصاف حاصل کریں جو قریب ہی رہتا تھا۔ لوگ جو غصہ سے بے قابو ہو رہے تھے، سڑک پر جمع ہونے شروع ہو گئے۔ اور مفتی صاحب کے مکان کے نزدیک ایسی خطرناک صورتحال ہو گئی کہ مجمع کو منتشر کرنا ضروری سمجھا گیا۔ شورش دبانے کی غرض سے مجسٹریٹ چند پیدل اور سوار فوجی سپاہیوں کو لے کر موقع واردات پر پہنچا۔ مفتی صاحب یہ افواہ سن چکے تھے کہ مجسٹریٹ انہیں گرفتار کرانے والا ہے۔ لہٰذا اس وقت مسلح سپاہیوں کے ساتھ اسے دیکھ کر اس بات کا یقین ہو گیا کہ وہ اسی ارادہ سے آ رہا ہے۔ سڑک پر جو مجمع تھا اسے بھی یہی خیال ہوا۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ اسے کسی طرح برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ ان لوگوں کی سپاہیوں سے جھڑپ ہو گئی۔ جس میں کئی جانیں تلف ہوئیں (۱)۔ مفتی صاحب کو بھی چوٹ آئی۔ مگر وہ بچ کر نکل گئے۔ لیکن دو افراد جن کا ان سے قریبی تعلق تھا اور جو خاص ان کی حفاظت میں تھے مارے گئے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ان میں سے ایک نے سب سے پہلے حملہ کیا تھا۔ اور اس خیال کی بناء پر کہ مجسٹریٹ ان کے شیخ کو گرفتار کرنے کی غرض سے آیا ہے۔ اس نے دو سواروں کو ہلاک کر دیا تھا۔ (۲)

---

(۱) مارشمین کے بقول اس تصادم میں تین آدمی مجسٹریٹ کی طرف کے اور چھ یا سات شہری ہلاک یا زخمی ہوئے۔ لوگوں نے ان کو شہدا کا درجہ دیا۔

The History of India Vol II P. 301

(۲) دیکھئے سیاسی تاریخ ہند جلد اول صفحہ ۴۵۸-۴۵۹۔ اور

(A Comprehensive History of India 111 P 31.)

میدان جہاد میں

اب با قاعدہ جنگ شروع ہونے میں دیر نہیں تھی۔ چنانچہ مفتی صاحب نے شہر سے بجانب مغرب حسین باغ میں پڑاؤ ڈالا اور انگریزوں کے خلاف جہاد کا علم سبز بلند کیا۔ ہنری بیورتج لکھتا ہے :

اس وقت ایک عام بغاوت کا پھوٹ پڑنا لازمی تھا۔ مفتی صاحب نے جس روضہ میں پناہ لی تھی وہاں سبز اسلامی پرچم لہرایا گیا۔ اور معتقدین میں یہ اعلان کر دیا گیا کہ دین خطرہ میں ہے۔ (۱) دیکھتے ہی دیکھتے بکثرت ہتھیار بند مسلمان ان کے ارگرد اکٹھے ہو گئے۔ اور نہ صرف شہر کے لوگ بلکہ قریب کے شہروں اور قصبوں سے بھی پروانہ وار مجاہدین ٹوٹ پڑے اور دو روز کے قلیل عرصہ میں پیلی بھیت، رامپور اور شاہجہاں پور وغیرہ سے ہزاروں آدمی آ آ کر شریک جہاد ہو گئے۔ یہاں تک کہ پانچ چھ ہزار مسلح اشخاص کی ایک باقاعدہ فوج تیار ہو گئی۔ مفتی صاحب اور ان کے رفقاء نے اس گروہ مجاہدین میں وعظ جہاد سے ایک زبردست روح پھونک دی۔

نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں کہ بریلی کے صاحب حیثیت لوگوں نے جہاد کے مصارف برداشت کئے۔ اور مال اور ہتھیار سے امداد و اعانت کی۔ (۲)

انگریز افسران بھی غافل نہ تھے۔ مسٹر ڈمبلٹن مجسٹریٹ نے گردونواح سے ایک معقول فوج جمع کی۔ مراد آباد سے کمک نہایت تیزی سے آ رہی تھی کہ اسی دوران صلح کی بات چیت شروع ہوئی۔

مصالحت کی کوشش

اہالیان شہر نے ٹیکس کی منسوخی، کوتوال کی حوالگی (تاکہ اس نے جو خون کیا ہے اس کا بدلہ لیا جا سکے) مقتولین کے خون بہا اور عام معافی کے اعلان کے شرائط رکھے۔ حکیم وحید اللہ بدایونی اس مصالحانہ گفت و شنید کی تفصیل اس طرح سناتے ہیں:

(۱) ہنری بیورتج محولہ بالا جلد ۳، صفحہ ۳۱۔

(۲) تاریخ قنوج (قلمی) صفحہ ۲۶۷۔ اس سلسلہ میں حکیم وحید اللہ بدایونی نے کماؤ ساہوکار کا خاص طور پر ذکر کیا ہے (دیکھئے تذکرہ حکومت المسلمین (مخطوطہ) صفحہ ۳۴ مخزونہ رضا لائبریری رامپور)

جب صاحب کلاں بہادر ضلع بریلی نے یہ ماجرا دیکھا تو اپنے بعض معتمدین کو پاس مفتی محمد عوض کے بھیجا۔ اور فہمائش کی کہ انجام اس بلوہ کا اچھا نہ ہوگا۔ جو لوگ کہ سرغنہ بلوہ کے ہیں۔ ان کو فہمائش کرنا چاہیئے اور ممانعت کیجئے۔ مفتی محمد عوض نے انسداد بلوہ کا اقرار کیا۔ لیکن چند شروط پیش کیں۔

اول یہ کہ مسمی کرند سنگھ کوتوال شہر بریلی کا موقوف کیا جائے

دوم ایں کہ جو لوگ جنگ اول میں مارے گئے ہیں ان کے وارثوں کے واسطے سرکار کمپنی انگریز بہادر سے کچھ معاش مقرر ہو جائے۔

سوم ایں کہ سررشتہ ٹیکس کا یک قلم ہمیشہ کو موقوف ہو جائے۔

البتہ اس صورت مین لوگ بلوہ کرنے سے باز رہیں گے۔ صاحب کلاں بہادر نے کرند سنگھ کوتوال کو موقوف کرنے کا اقبال فرمایا اور واسطے موقوفی ٹیکس اور تقرر معاش ورثائے مقتولوں کے مفتی محمد عوض سے کہلا بھیجا کہ ہم ان کے باب میں کلکتہ کو لکھتے ہیں اغلب کہ صاحبان بہادر صدر کونسل سے حسب درخواست تمہارے عنقریب حکم آ جائے گا۔ مناسب ہے کہ اب اس بلوہ کو یک لخت موقوف کرا دو۔ (۱)

معرکہ کارزار

چونکہ ان کے شرائط کو فوری طور پر تسلیم نہیں کیا گیا تو لوگ سمجھے کہ معاملہ کو لیت و لعل میں ڈالا جا رہا ہے۔ اس بناء پر مجاہدین نے عام جنگ شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۲۱ / اپریل ۱۸۱۶ء کو گشتی عدالت کے جج مسٹر لیسٹر (Leicester) کے بڑے لڑکے کو مجاہدین نے گولی کا نشانہ بنایا۔ جو تنہا فوج کی ایک چوکی سے دوسری چوکی پر جا رہا تھا۔ (۲) اور انگریزی فوج پر دھاوا بول کر کفن بر دوش دشمنوں کی صفوں میں گھس گئے اور خوب خوب داد شجاعت دی۔ یہاں تک کہ انگریز فوج کو شکست فاش دی۔ مگر اسی وقت کیپٹن کننگھم کی سرکردگی میں مراد آباد سے انگریزوں کو کمک پہنچ گئی۔ مجاہدین اس تازہ دم فوج کے مقابلہ میں کامیاب نہ ہو سکے۔ شہر کے قدیم علاقہ میں شاہ دانا ولی کے مزار کے پاس زبردست لڑائی ہوئی۔ طرفین کا بہت کشت و خون ہوا۔ اور انجام کار

---

(۱) تذکرہ حکومت المسلمین (قلمی) صفحہ ۳۴۔ ۳۵۔

(۲) حکیم وحید اللہ کے بقول تماشا دیکھنے کے لئے بطور ہواخوری نکلا تھا کہ مجاہدین کی گولی کا نشانہ بنا۔

مجاہدین کو پسپائی اختیار کرنی پڑی۔(۱)

جان میلکم موقع جنگ کی نزاکت پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے لکھتا ہے :

کپتان باسکیون کی فوج پر ایک نہایت زبردست حملہ کیا گیا اور استقلال کے ساتھ اسے جاری رکھا گیا۔ اگرچہ کپتان مذکور کو تھوڑی سی کمک مل گئی تھی تاہم یہ خیال تھا کہ اس قدر کثیر مجمع کے حملے اگر اسی طرح جسارت کے ساتھ جاری رہے تو یہ فوج زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکے گی۔ خوش قسمتی سے سپہ دار اور اس کے معاون افسروں کے طرز عمل اور قلیل التعداد مگر بہادر ہندوستانی سپاہیوں کے استقلال اور نڈری اور چند بے قاعدہ سواروں کی وفاداری، مستعدی اور جسارت کی بدولت (اگرچہ ان میں سے اکثر کے عزیز و اقارب ان کے مقابلے پر موجود تھے) فوج غالب آ گئی اور بدحواس مجمع منتشر ہو گیا۔ لڑائی کئی گھنٹے جاری رہی تھی اور اس میں رعایا کے تقریباً دو ہزار آدمی مجروح اور ہلاک ہوئے۔(۲)

ہنری بیوریج فتح کی اہمیت اور اس کے بعد کی صورت حال واضح کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ شکست نہایت بروقت ہوئی تھی کیوں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر عوام کو پہلے معرکہ میں کامیابی ہو جاتی تو عام شورش پھیل جاتی (۳) لیکن اس کے بعد دوبارہ جنگ شروع کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔

مفتی صاحب اور دیگر سرغنے جو کمپنی کی عمل داری سے نکل گئے تھے ان کا تعاقب

---

(۱) دیکھئے حیات حافظ رحمت خان صفحہ ۳۶۱۔ (یہ بیان گزیٹر ضلع بریلی کا ترجمہ ہے) نیز A comprehensive History of India vol.III P. 32) نواب صدیق حسن خان لکھتے ہیں: بنام نہاد جہاد جنگ عظیم شد واز ہر دو طرف کساں بسیار بکار آمدند (تاریخ قنوج (قلمی) صفحہ ۲۶۷)

(۲) سیاسی تاریخ ہند حصہ اول صفحہ ۴۶۰-۴۶۱۔ ہنری بیوریج اور مارشمین نے صراحت کی ہے کہ ان میں مقتولین کی تعداد چار سو یا اس کے قریب تھی۔

(۳) انگریز حد درجہ بوکھلائے ہوئے تھے۔ انکی بوکھلاہٹ کا اندازہ سر جان میلکم کے اس اقتباس سے ہو سکتا ہے:

اگر اس لڑائی کا نتیجہ کچھ اور ہوتا تو نہایت دردناک منظر پیش آ جاتا۔ اس بات کے لئے کافی ثبوت موجود ہے کہ روہیلکھنڈ کے پورے علاقے میں ایک خاص قسم کے خیالات پیدا ہو گئے تھے۔ جن کی وجہ سے اس صوبے کا ہر فرد بریلی والوں کا ساتھ دینے کے لئے تیار تھا۔ ان خیالات اور خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ رعایا کو اپنی حکومت سے کوئی خاص وابستگی نہیں تھی۔ مفتی صاحب کی حمایت میں جو صدا اٹھی اس پر ہر ایک نے بے ساختہ لبیک کہا۔ جس جگہ بھی یہ صدا پہنچ سکی ==

نہیں کیا گیا۔اور جو چند مقدمات چلے وہ بھی بغیر کسی سزا کے ختم ہو گئے۔اس کی وجہ یا تو یہ ہوئی کہ کافی شہادت نہ مل سکی۔یا پھر نرمی کو سختی پر ترجیح دینا مناسب سمجھا گیا۔(۱)

مفتی صاحب کی تلاش، ورود ٹونک اور انتقال

مفتی محمد عوض چونکہ امیر المجاہدین تھے۔اسلئے نرمی کی اس پالیسی کے باوجود انہیں ہر طرف تلاش کیا گیا۔مگر وہ ہاتھ نہیں آئے۔اور چھپتے چھپاتے نواب محمد امیر خان کے پاس ٹونک پہنچ گئے۔نواب سید صدیق حسن خان صاحب تحریر فرماتے ہیں :

چوں مفتی صاحب دریں معرکہ جانب حق بودند۔بعد شکست حق تعالیٰ حمایت وحراست ذات ایشاں نمود، واز دست ظلم کفرہ فجرہ نگاہداشت فرمود۔یعنی چوں بعد غلبہ نصاریٰ تجسس ایشاں کہ نام نہاد امیر الاسلام ومبدء جہاد بودند، بسیار شد۔وسرہنگاں حاکم وقت بطلب ایشاں برشوارع وطرق متعین شدند، حضرت ایشاں درعین آں حالت از بلدۂ بریلی برآمدند وبجانب مصطفیٰ آباد رامپور رفتند واز شرآں مفسداں نجات یافتند، ودریں برآمدن بمشیت تعالیٰ ہیچ کس ایشاں راشناخت وسراغ نیافت، اما حضرت ایشاں آنجا مقیم نشدہ ریاست ٹونک آمدند، نواب امیر خان

چوں کہ مفتی صاحب اس معرکہ میں حق پر تھے۔اس لئے حق تعالیٰ نے شکست کے بعد آپ کی پوری طرح حفاظت فرمائی، اور کافروں اور فاجروں کے ظلم اور دست درازیوں سے آپ کو محفوظ رکھا۔آپ کو چونکہ امیر الاسلام اور بانی جہاد سمجھا جاتا تھا، اس لئے نصاریٰ کے غلبہ کے بعد آپ کو بہت تلاش کیا گیا۔حاکم وقت نے آپ کی تلاش میں سڑکوں اور راستوں میں فوجی سردار تعینات کئے۔حضرت عین اس حالت میں بریلی سے نکلے اور مصطفیٰ آباد رامپور کا رخ کیا۔اور ان مفسدوں کے شر سے نجات پائی۔بریلی سے نکل کر رامپور پہنچنے میں کسی نے اللہ کے فضل سے آپ کو نہیں پہچانا اور نہ کوئی آپ کا

== اسکا یکساں اثر ہوا۔(سیاسی تاریخ ہند جلد اول صفحہ ۴۶۱)
مارشمین نے بھی برعکس نتیجہ کی صورت میں اپنے سخت خدشات کا اظہار کیا ہے۔اس کا کہنا ہے کہ امیر خان (والی ریاست ٹونک) ضرور اس موقع سے فائدہ اٹھاتا۔

(۱) ہنری بیورتج، تصنیف مذکور، جلد ۳، صفحہ ۳۲۔

رئیس ٹونک لوازم قدر شناسی بجا آوردہ استقبال نمود۔ و باحترام تمام در ٹونک جاداد۔ درہمین قرب زمان وردو، تقدیر الٰہی ایشاں را بجانب خود کشید و باجل مسمی و موت طبیعی داعی حق را لبیک اجابت گفتہ بحظائرُ القدس خرامیدند۔

موت التقى حياة لا انقطاع لها
وقد مات قوم وهم فى الناس أحياء(۱)

سراغ لگا پایا۔ مگر حضرت رامپور میں قیام کیے بغیر ریاست ٹونک تشریف لے گئے۔ والی ٹونک نواب امیر خان نے قدر شناسی کے تمام لوازم کے ساتھ آپ کا استقبال کیا۔ اور باحترام تمام ٹونک میں آپ کو جگہ دی۔ ٹونک میں آئے ہوئے زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا کہ اجل موعود کا وقت آ پہنچا۔ اور تقدیر الٰہی نے انہیں اپنی طرف کھینچ لیا اور داعی حق کو لبیک کہتے ہوئے باطمینان بارگاہ الٰہی میں حاضر ہوئے۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

۱۲۳۶ھ (مطابق ۱۸۲۱ء) میں مفتی صاحب نے انتقال کیا۔ (۲)

مولانا محمد عثمان بریلوی کی جہاد میں شرکت اور شہادت

علماء نے اس وقت جہاد کا متفقہ فتویٰ دیا تھا۔ بلکہ بنفس نفیس شریک جہاد ہوئے تھے۔ ان میں مولانا محمد عثمان بریلوی کا نام سب سے زیادہ روشن ہے۔ وہ بریلی کے نامور عالم تھے۔ رضوی سادات سے ان کا تعلق تھا۔ ان کے والد مولانا محمد عمر صاحب بڑے فاضل اور مقدس بزرگ تھے۔ مولانا محمد عمر صاحب ملا نظام الدین لکھنوی کے خلیفہ و مجاز تھے۔ نواب فرخ آباد نواب احمد خان بنگش ان کا بڑا معتقد تھا۔ پھر وہ بریلی چلے آئے تھے اور یہیں قیام اختیار کیا تھا اور مسجد اور خانقاہ کی بنیاد رکھی تھی۔ (۳)

---

(۱) تاریخ قنوج (قلمی) صفحہ ۲۶۸-۲۶۹۔

(۲) بیاض مولانا ابوالحسن حسنی کاندھلوی ورق ۱۳۳، الف۔ مملوکہ مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی۔ مولانا حکیم سید عبدالحیٔ نے نزہۃ الخواطر میں تاریخ فرخ آباد کے حوالہ سے لکھا ہے کہ مفتی صاحب کا ۱۲۲۰ھ میں انتقال ہوا۔ یہ کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ یہ جنگ خود اس کے گیارہ سال بعد ۱۲۳۱ھ میں پیش آئی تھی۔

(۳) عہد بنگش کی سیاسی علمی اور ثقافتی تاریخ صفحہ ۳۲۰۔

ان کے صاحبزادہ مولانا محمد عثمان صاحب بریلی کے مشہور علماء میں سے تھے۔ ان کا ایک مدرسہ تھا، جس میں وہ درس دیا کرتے تھے۔ انہوں نے مفتی صاحب کی حمایت میں آواز اٹھائی اور انگریزوں کے خلاف جہاد کی ترغیب دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اپنے بارہ شاگردوں کو لے کر میدان جنگ میں اترے۔ شہادت مقدر تھی۔ انگریزی توپ کا نشانہ بنے۔ اور اپنے ان تمام شاگردوں کے ساتھ جام شہادت نوش کیا۔ (۱)

(۱) ملاحظہ ہو تذکرہ حکومت المسلمین (قلمی) صفحہ ۳۶۔

ایک ضروری تنبیہ : ہندوستانی مؤرخین کی انگریزوں کے زمانہ میں لکھی ہوئی عام تاریخوں میں جس طرح جنگ آزادی کی تاریخ کی صورت مسخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی طرح کا ظلم اس عظیم جہاد کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ چنانچہ مولوی یعقوب حسین ضیاء قادری بدایونی اپنی کتاب اکمل التاریخ میں (جو انہوں نے انگریزوں کی ملازمت کے دوران لکھی) لکھتے ہیں "مفتی صاحب کے زمانہ میں ۱۲۳۱ھ میں بریلی میں بلوہ عظیم برپا ہوا۔ وائے دریغ جس کی تاریخ ہے۔ آپ اس کشمکش سے بچ کر ریاست ٹونک کی جانب چلے گئے۔ اور وہیں انتقال کیا" (حصہ اول صفحہ ۴۷)

ایک تو انگریزوں کی دہشت، اس پر ان کی ملازمت۔ پھر وہ مفتی صاحب کو کیوں کر جنگ آزادی کے ہیرو کی حیثیت سے پیش کرتے۔ وہ مفتی صاحب کی عزت اور اپنے جان و مال کی ضمانت اسی میں سمجھتے تھے کہ اس جہاد آزادی کو بلوہ قرار دے کر مفتی صاحب کو اس سے صاف بچالے جائیں۔ اس لئے ان پر کوئی حیرت نہیں۔ حکیم وحید اللہ بدایونی نے بھی اس کو بلوہ سے تعبیر کیا ہے ان پر بھی افسوس نہیں۔ مگر تعجب نواب صدیق حسن خان سے ہوتا ہے کہ ایک طرف تو وہ انگریزوں کو ظالم کافر فاجر اور مفسد کہتے ہوئے مفتی صاحب کو برسر حق قرار دیتے ہیں اور اس جنگ کو جہاد سے تعبیر کرتے ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ نواب صاحب کے حقیقی جذبات یہی تھے مگر جہاں انہوں نے صلح کا تذکرہ کیا ہے وہاں لکھتے ہیں :

حضرت ایشاں ہم رضا بصلح دادند کہ "الصلح خیر" اما افغانان رامپور و بریلی کہ تودہ جہالت بودند ہیچ نشنیدند، و با سرکار دست و گریباں شدند...... چوں حضرت ایشاں دیدند کہ الحال مفراز جدال نیست ناچار بمسلمانان گفتند کہ شاباوے محاربہ میشود و ظالم نمیرید و مظلوم میرید۔

اس میں وہ انگریزوں سے برسر پیکار لوگوں کو "تودۂ جہالت" کہہ رہے ہیں اور یہ تاثر دے رہے ہیں کہ مجبور ہو کر حضرت مفتی صاحب نے ان لوگوں کا ساتھ دیا تھا اور جنگ میں شرکت کی تھی۔ شاید انکے قلم سے یہ الفاظ اس لئے نکلے ہیں کہ ان پر ترغیب جہاد کا الزام تھا اور اسی کی پاداش میں انتزاع خطاب اور معزولی منصب تک نوبت پہنچی تھی۔ (دیکھئے مآثر صدیقی حصہ سوم، صفحہ ۱۶۸)

اور زیادہ تعجب ان کے صاحب زادہ نواب علی حسن خان پر ہے انہوں نے مجاہدین کو "مجسم تودہ جہالت" اور مفتی صاحب کو مجبور قرار دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس جہاد کو فساد اور بغاوت بھی کہا ہے۔ (مآثر صدیقی اول صفحہ ۶۸) ان کو اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ نہ ان کے لئے بظاہر کوئی خطرہ تھا۔ ان کی کتاب ۱۹۲۴ میں شائع ہوئی۔ جب کہ تحریک آزادی عام ہو چکی تھی۔

باب نہم

بنگال میں
علماء کے زیر قیادت آزادی کی تحریکیں

پہلی فصل : فرائضی تحریک

دوسری فصل : تیتو میر اور ان کی تحریک

پس منظر

بنگال برعظیم ہندوستان کا وہ صوبہ ہے جس کا انگریزوں نے سب سے زیادہ استحصال کیا۔ وہ روز اول ہی سے انگریزوں کے ظلم وتشدد کا نشانہ بنا۔ اسی بناء پر انگریزوں سے پہلی باقاعدہ جنگ اسی سرزمین پر لڑی گئی۔ جس میں سراج الدولہ کی شکست کے نتیجہ میں انگریزوں کا بنگال پر تسلط ہوا۔ اب وہ آزادانہ دندناتے اور طنطنہ دکھاتے پھرتے تھے۔ اور کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں تھا۔ نہ برائے نام نوابی میں وہ دم خم تھا کہ ان سے مقابلہ کرتی اور نہ مرکزی مغلیہ سلطنت میں وہ روح کہ کوئی حکم امتناعی نافذ کرتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورا بنگال انگریزوں کا تختۂ مشق بن گیا۔ وہ بنگال جو صرف آٹھ دس سال پہلے سونے کی کان اور ہندوستانی معیشت کی جان تھا۔ اب خاک کے ڈھیر میں تبدیل ہو گیا تھا۔

معاشی استحصال

انگریزوں نے اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لئے ایک طرف زمین داروں کی مشکیں کسیں تو دوسری طرف نوربافوں اور صنعت کاروں کے انگوٹھے کاٹ ڈالے۔ (۱)

انگریزوں نے حصول دولت کے لئے جو مجرمانہ، ظالمانہ اور سنگدلانہ طریقے اختیار کئے، اور مختصری مدت میں جبر وتشدد سے جو منافع حاصل کئے۔ سید طفیل احمد منگلوری نے (۲) اور پھر عبداللہ ملک نے اپنی کتاب ''بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہد آزادی'' میں اس کا کسی قدر تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ (۳) نیز باری علیگ نے انگلستان

(۱) یہ کوئی ادبی تعبیر یا افسانہ نہیں بلکہ ایک حقیقت اور واقعہ ہے۔ خود برطانوی مفکر ولیم بولڈس نے اس کا ذکر کیا ہے (دیکھئے باری علیگ، کمپنی کی حکومت، صفحہ ۳۷۷)

(۲) دیکھئے مسلمانوں کا روشن مستقبل صفحہ ۷۷ تا صفحہ ۹۸

(۳) ملاحظہ ہو کتاب مذکور صفحہ ۱۹ تا صفحہ ۵۷۔

کے نامور مدبروں اور مفکروں کے افکار و خیالات اور صریح بیانات کے حوالہ سے اس کو آشکارا کرنے کی کچھ کوشش کی ہے۔(۱) مگر ہم طوالت سے بچتے ہوئے یہاں صرف مشہور مؤرخ ڈاکٹر تارا چند کا ایک اقتباس پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جس سے بنگال کی تحریکات آزادی کا پس منظر سمجھنے میں مدد ملے گی۔ لکھتے ہیں :

دولت جمع کرنے میں کوئی اخلاقی اصول کمپنی کے ان لالچی افسران کے راستہ میں رکاوٹ نہیں ڈالتا تھا۔ ہندوستان کے باشندوں کو کبھی ایسے ظلم کا سامنا نہیں ہوا تھا جو پوری فنی مہارت اور پوری سوجھ بوجھ پر مبنی اور اتنا زوردار ہو۔ کمپنی کے مسودہ ساز عمال اور تجار اچانک بہت بڑی طاقت رکھنے والے افسر بن گئے تھے۔ ان کو بہت معمولی تنخواہ دی جاتی تھی۔ اور ان کو اجازت تھی کہ اس کمی کو وہ اپنی پرائیویٹ تجارت کے منافع سے پورا کرلیں۔ بنگال کی فتح نے ان کو سنہرا موقع دیا تھا۔ انہوں نے اپنے اختیارات اپنے ہندوستانی اور دوسرے رقیبوں کو تجارت کے میدان سے بھگا دینے کے لئے استعمال کئے۔ وہ کسٹم ڈیوٹی اور چنگی دینے سے انکار کرتے تھے۔ وہ اپنی اشیاء ہندوستانیون کے ہاتھ بڑی رقوم کے عوض بیچتے تھے۔ ہندوستانی کام کرنے والوں کو دھمکاتے تھے۔ اور جو اشیاء وہ بیچتے تھے، اسے بیچنے کے لئے دوسرے تجار کو منع کرتے تھے۔ وہ گاؤں والوں پر تشدد آمیز دباؤ ڈال کر انہیں مجبور کرتے تھے کہ وہ ان کی چیزیں ناقابل برداشت قیمتوں پر خریدیں۔ اور اپنی چیزیں ان کے ہاتھ سستے داموں پر بیچیں۔ زندگی کی ابتدائی ضروریات کے لئے جو چیزیں درکار ہیں ان پر ان کی اجارہ داری تھی۔ وہ دوسرے ذرائع بھی اپنی آمدنی کو بہت زیادہ بڑھانے کے لئے اختیار کرتے تھے۔ وہ جرمانے عائد کرتے۔ ٹیکس وصول کرتے۔ اور ہندوستان کے مفلس قلاش اور دیوالیہ راجاؤں اور حکمرانوں کو انتہا سے زیادہ شرح سود پر قرض دیتے تھے۔ استحصال بالجبر، بددیانتی اور رشوت پر ان کا عمل تھا۔ میر قاسم نے انگریز گورنر اور ان کی کونسل سے ۱۷۶۲ء میں شکایت کی کہ "یہ ہے آپ کے شریف آدمیوں کے برتاؤ کا طریقہ۔ وہ تمام ممالک میں فساد اور بدامنی پھیلاتے ہیں۔ لوگوں کو لوٹتے اور میرے ملازمین کو مارتے اور ذلیل کرتے ہیں۔ اپنے عہدوں کی نمائش کرکے اور کمپنی کا پاس دکھلا کر وہ اپنی انتہائی کوشش کسانوں

(۱) کمپنی کی حکومت۔ صفحہ ۳۷۳۔۳۸۰۔

تاجروں اور ملک کے دوسرے لوگوں کے ستانے پر صرف کرتے ہیں...... یہ لوگ کسانوں اور تاجروں کا مال اور ان کی تیار کی ہوئی چیزیں اصل قیمت کی چوتھائی پر زبردستی اٹھالے جاتے ہیں۔ اور تشدد اور ظلم ڈھا کر کسانوں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ ان کی روپیہ کی چیز پانچ روپیہ میں خریدیں اور صرف پانچ روپیہ کے لئے ایک آدمی کو جو سو روپیہ مال گزاری ادا کرتا ہے اندھا دھند ذلیل کرتے ہیں اور یہ لوگ میرے ملازمان کو کوئی اختیار برتنے کی اجازت نہیں دیتے۔ (۱)

اس کے ساتھ ساتھ کمپنی کے ملازمین کھلم کھلا چوری، ڈکیتی اور قزاقی کی راہوں پر چل نکلے تھے۔ (۲)

جنگ پلاسی (۱۷۵۷ء) کے بعد ہی بنگال کی لوٹ شروع ہوئی تھی۔ (۳)

اور جب ۱۷۶۴ء میں میر قاسم کو بھی راستہ سے ہٹا دیا گیا۔ اور ۱۷۶۵ء میں سرزمین بنگال، بہار اور اڑیسہ کا پٹہ انگریزوں کے نام لکھ دیا گیا پھر تو انہوں نے جن طریقوں سے استحصال کیا ان کی تفصیل کہاں تک لکھی جائے۔

عوام کا مال ہتھیانے کے لئے ان کو مقامی گماشتوں اور ایجنٹوں کی ضرورت پڑی جو مقامی زبان جانتے ہوں۔ اس غرض کے لئے ہندو بنئے ان کے کام آئے۔ ان گماشتوں نے لوگوں کی زندگی اجیرن کردی تھی۔ کمپنی کے سہارے بلا کسی خوف وغیرت

---

(۱) تاریخ تحریک آزادی ہند جلد اول صفحہ ۳۴۰-۳۴۱۔

(۲) بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہد آزادی صفحہ ۱۷۔

(۳) اسی کے ساتھ ہی انگلستان میں ترقی کے آثار نظر آنے لگے۔ خود انگریزوں نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ بروک ایڈم لکھتا ہے:

جنگ پلاسی کے بعد ہی بنگال کی لوٹ انگلستان پہنچنے لگی اور اس کا فوری اثر نمودار ہوا۔ تمام مؤرخ متفق ہیں کہ انگلستان میں جس صنعتی انقلاب نے انیسویں صدی کو تمام پچھلے زمانوں سے ممتاز کردیا، اس کی بنیاد اسی جنگ کے بعد ۱۷۶۰ء میں پڑی تھی۔

میجر وینگیٹ ۱۷۵۷ء سے ۱۸۱۵ء کے درمیانی عرصہ کی لوٹ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

سرسری اندازہ کے ساتھ بڑی آسانی سے دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ جنگ پلاسی اور جنگ واٹرلو کے درمیانی زمانہ میں ہندوستان سے انگلستان کو پندرہ ارب روپیہ جا چکا تھا۔

اور ڈیگبی لکھتا ہے: اکثر موجودہ یورپی قوموں کی خوشحالی مشرقی قوموں کی لوٹ پر قائم ہوئی۔ انگلستان کی صنعتی برتری سراسر بنگال کے کسانوں کی لوٹ سے شروع ہوئی۔ جنگ پلاسی سے پہلے انگلستان کی صنعت نہایت پست تھی۔ (دیکھئے کمپنی کی حکومت صفحہ ۳۸۲-۳۸۳۔)

کے وہ آخری درجہ کا تشدد کرتے۔ جب ان کا یہ حال تھا تو خود انگریز بہادر کی زیادتیوں کی کیا کیفیت رہی ہوگی۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ان گماشتوں کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک انگریز افسر لکھتا ہے:

صرف ایک طبقہ ایسا ہے جس کو ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کا قانون پوری پناہ دیتا ہے۔ اور اس کی حفاظت کے لئے ہر وقت کمر بستہ رہتا ہے۔ یہ طبقہ بنگالی گماشتوں کا ہے حالاں کہ یہ حقیقت ہے کہ ان گماشتوں نے عوام کے دلوں میں نفرت کا جو بیج بویا ہے اس کا شاید کبھی بھی مداوا نہ ہو سکے۔ اور یہ گماشتے پورے معاشرے میں ایک ناسور کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ (۱)

یہ انگریزوں ہی کے کھڑے کئے ہوئے تھے وہ کاہے کو انہیں روکتے؟ بلکہ اور بڑھاوادے رہے تھے۔ جب انگریز تاجر مسٹر لیوک کے گماشتے کالی چرن کے خلاف آواز بلند ہوئی تو اس کو وہاں سے ہٹا کر چٹا گانگ کا دیوان مقرر کر دیا گیا۔ اس عہدہ پر فائز ہونے کے بعد اس نے ایک سال کے اندر زمینداروں کو مجبور کر کے تیس ہزار روپئے ہتھیا لئے۔ (۲)

غرض پورا بنگال اس جبر و تشدد سے کنگال ہو گیا۔ زراعت برباد اور صنعت حرفت بالکل تباہ ہو کر رہ گئی۔ کسان ہل کیا چلاتے انہیں پر ہل چل گیا۔ پارچہ باف کپڑا کیا بُنتے انہیں کو بھون دیا گیا۔ ہر طرف چیخ و پکار تھی۔ نتیجۃً روز بروز آبادی گھٹنے لگی (۳) اور بھرا پرا

(۱) دیکھئے بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہد آزادی صفحہ ۲۵۔

(۲) ایضاً صفحہ ۲۴۔

(۳) جیمس ٹیلر نے ۱۸۳۸ء میں لکھا تھا کہ "صنعت و حرفت اور تجارت کے تنزل کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ ڈھاکہ کی آبادی تقریباً برباد ہو گئی۔ ۱۸۰۰ھ میں آبادی دو لاکھ تھی اب صرف ستر ہزار رہ گئی ہے۔ جتنی تیزی سے آبادی گھٹی ہے اس سے کہیں زیادہ سرعت سے افلاس بڑھ گیا ہے۔ (دیکھئے کمپنی کی حکومت صفحہ ۳۷۸)

اللہ ابن خلدون کی تربت ٹھنڈی رکھے۔ انہوں نے کتنی وضاحت سے اسباب معیشت پر اجارہ داری کے اس منطقی نتیجہ پر روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں:

"اعلم أن العدوان على الناس في أموالهم ذاهب بآمالهم في تحصيلها واكتسابها، لما يرونه حينئذ من أن غايتها ومصيرها انتهابها من أيديهم. وإذا ذهبت آمالهم في اكتسابها وتحصيلها انقبضت أيديهم عن السعي في ==

صوبہ ویرانہ میں تبدیل ہوگیا۔اس بے کسی و بے بسی کی فضا میں مذہب کے نام پر ہمدردی کی ایک صدا بلند ہوئی جس کو بلند کرنے والے مولانا حاجی شریعت اللہ فرید پوری تھے۔(۱)

== ذلک. وعلی قدر الاعتداء ونسبته یکون انقباض الرعایا عن السعی فی الاکتساب. فإذا کان الاعتداء کثیراً عاماً فی جمیع أبواب المعاش کان القعود عن الکسب کذلک لذهابه بالآمال جملة بدخوله من جمیع أبوابها وإذا کان الاعتداء یسیرا کان الانقباض عن الکسب علی نسبته. والعمران ووفوره ونفاق أسواقه إنما هو بالأعمال وسعی الناس فی المصالح والمکاسب ذاهبین وجائین، فإذا قعد الناس عن المعاش وانقبضت أیدیهم عن المکاسب کسدت أسواق العمران وانتقضت الأحوال وابذعر الناس فی الآفاق من غیر تلک الإیالة فی طلب الرزق فیما خرج عن نطاقها. فخف ساکن القطر وخلت دیاره وخربت أمصاره واختل باختلاله حال الدولة والسلطان، لما أنها صورة للعمران تفسد بفساد مادتها ضرورة"

(مقدمة ابن خلدون، الباب الثالث، فصل الظلم موذن بخراب العمران ٢/٧٤١-٧٤٢، بتحقیق الدکتور علی عبدالواحد وافی، دار نهضة مصر للطبع والنشر، القاهرة)

اس پوری عبارت کا خلاصہ دو لفظوں میں یہ ہے کہ ذرائع معاش پر جیسی اجارہ داری اور جبر و تشدد ہوگا اسی تناسب سے لوگ اسباب معیشت سے ہاتھ اٹھالیں گے اور روزی کی تلاش میں اس دیار سے نکل جائیں گے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ علاقہ ویران ہوجائے گا۔

(۱) یہاں اس بات ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بنگال میں فقیروں کا بھی ایک گروہ تھا۔ جس نے انگریزوں کے خلاف اودھم مچا رکھا تھا۔ مگر وہ ہمارے موضوع سے خارج ہیں کیوں کہ وہ غیر شرعی فقراء تھے۔ جن کو دین و شریعت، علم صحیح اور اخلاق اسلامی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں کہ ضلع دیناج پور کا موضع بلیا دیکھی (تھانہ ہمت آباد) میں عہد شاہ جہانی سے آزاد قلندروں اور غیر شرعی فقیروں کا ایک مرکز ہے۔ جنھوں نے ہندو یوگ، اسلامی تصوف، اور اخلاقی آزادی کی ایک عجیب کھچڑی بنا رکھی ہے۔ یہ لوگ سوائے ایک لنگوٹی کے کوئی کپڑا نہیں پہنتے۔ برہنہ کہلاتے ہیں۔ سر کے بال نہیں کٹواتے۔ پاؤں میں بعض سادھوؤں کی طرح بیڑیاں پہنتے ہیں۔ ان کے عقائد و اعمال کئی امور میں غیر اسلامی ہیں۔ ان کے مورث اعلی شاہ سلطان حسن ماریہ برہنہ تھے۔ جنھوں نے ایک ہندو راجا بلیا کو بھگا کر اس کی جگہ پر قبضہ کرلیا تھا۔ (رود کوثر صفحہ ۵۱۷) یہ تو ان کی مذہبی زندگی کا حال تھا اور جہاں تک ان کی یورشوں اور سیاسی سرگرمیوں کا تعلق ہے ان کے پیچھے ملک سے ہمدردی کا کوئی جذبہ کارفرما نہیں تھا، اور نہ ہی انگریزوں سے آزادی ان کا مقصود تھا۔ شیخ محمد اکرام اس سلسلہ میں رقم طراز ہیں :

اٹھارویں صدی میں جب حکومت کا نظم و نسق کمزور ہوگیا تو ملک میں نیم برہنہ قلندروں اور ہندو بیراگیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ پھرتے تھے۔ ==

....

== جو دیہات اور قصبات سے بظاہر خیرات کے طور پر، لیکن فی الحقیقت جبر اور دباؤ سے نذرانے وصول کرتے تھے۔ بعض دفعہ تو ان کی تعداد ہزار بارہ سو تک جا پہنچتی۔ کمپنی کے افسروں کو بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی حاصل کرنے کے بعد کئی دفعہ ان کے خلاف فوج کشی کرنی پڑی۔ لیکن برسوں تک یہ سلسلہ ختم نہ ہوا۔ مثلاً اکتوبر ۱۷۷۰ء میں پانسو فقیروں کا ایک لشکر بنگال سے بہار میں داخل ہوا۔ وہ کہتے تھے کہ ہم مداریہ فرقہ سے متعلق ہیں اور مالدہ کے قریب ایک درگاہ (غالباً شاہ مدار کے خلیفہ شاہ لاڈ کا مزار ہوگا) اور ضلع بوگرہ میں مہستان (جہاں حضرت ماہی سوار بلخی کا مزار ہے) کی زیارت کے لئے آئے ہیں۔ کئی مہینے وہ شمالی بنگال کے مختلف اضلاع اور ڈھاکہ میں چکر لگاتے رہے۔ ان کا سرگروہ شاہ مجنون مجذوب تھا، جو مداریوں کے مرکزی مقام مکن پور (یوپی) کا رہنے والا تھا۔ بعض رپورٹوں میں اسے مداری اور بعض رپورٹوں میں (سلطان حسن کے سلسلہ کا) برہنہ فقیر لکھا ہے۔ برہنہ فقیروں کے مرکز بلیادگی (شیخ محمد اکرام نے یہاں اسی طرح لکھا ہے۔ جب کہ اوپر اسی کو بلیادیکھی لکھا ہے) میں بھی اس کا مکان تھا۔ وہ خوش خرام گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے ہمراہیوں کی قیادت کرتا تھا۔ انگریز افسروں نے فوج کے کئی دستے ان کے خلاف بھیجے، لیکن وہ دیہات میں بکھر جاتے تھے اور عوام ان کی سرپرستی کرتے تھے اس لئے کوئی فیصلہ کن معرکہ نہ ہوا۔ اور مجنون شاہ اور ان کے ساتھی اپنی وصولیاں کر کے واپس چلے گئے۔ ۱۷۷۲ء میں وہ پھر آئے اور ناٹور کی رانی بھوانی کو ایک عرضداشت پیش کی کہ انگریز ان کی قدیمی مسلمہ مراعات میں مخل ہو رہے ہیں۔ انھیں بچایا جائے۔ اس کے بعد وہ ہر دوسرے سال آتے رہے۔ کمپنی نے کئی چھاؤنیاں ان مسلح فقیروں اور سنیاسیوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے قائم کیں۔ لیکن ان کا سلسلہ برقرار رہا۔ حتی کہ ۱۷۸۷ء میں مجنون شاہ مکن پور میں وفات پا گیا۔ اس کے بعد بھی مجنون شاہ کے بھائی موسیٰ شاہ اور متبنیٰ چراغ علی اور دوسرے چیلوں نے کئی سال تک یہ سلسلہ برقرار رکھا۔ (ایضاً صفحہ ۵۱۷-۵۱۸)

عبداللہ ملک نے مجنون شاہ اور اس کے چیلوں کی کارستانیوں کا اپنی کتاب میں کسی قدر تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو (بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہد آزادی صفحہ ۹۱-۹۸)

پہلی فصل
فرائضی تحریک

مولانا حاجی شریعت اللہ فرید پوری

مولانا حاجی شریعت اللہ کی پیدائش ۱۷۸۱ء (۱) میں شامیل (۲) نامی گاؤں میں ہوئی جو مشرقی بنگال کے مشہور ضلع فرید پور کے مداری پور سب ڈویژن میں واقع ہے۔ ان کے والد عبدالجلیل ایک معمولی تعلقہ دار تھے۔ حاجی شریعت اللہ بمشکل آٹھ سال کے تھے کہ ان کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد چچا عظیم الدین نے بڑے ناز سے آپ کی پرورش کی۔ تقریباً بارہ برس کی عمر میں آپ چچا کے ساتھ کلکتہ گئے۔ جہاں قرآن کی تعلیم کے لئے آپ کو مولانا بشارت علی کی خدمت میں دے دیا گیا جو بچوں کی قرآن پڑھاتے تھے۔ قرآن کی تکمیل کے بعد استاد کی ہدایت سے عربی اور فارسی کی تعلیم کے لئے ضلع ہُگلی کے ایک گاؤں پر پورا گئے جہاں دو سال کے عرصہ میں کافی حد تک انھوں نے دونوں زبانیں سیکھ لیں۔ اس کے بعد دوسرے چچا عاشق میاں سے ملاقات کے لئے

---

(۱) یہ معین الدین احمد خان کی تحقیق ہے دیکھئے۔
A History of the Faraidi Movement in Bengal Part.11. P.2۔ جب کہ عبداللہ ملک نے ۱۷۸۰ء میں لکھا ہے۔ ڈاکٹر قیام الدین نے پتہ نہیں کس بنیاد پر لکھا ہے کہ وہ ۱۷۶۴ء میں پیدا ہوئے۔ (ہندوستان میں وہابی تحریک، صفحہ ۱۲۳)

(۲) یہ بھی معین الدین احمد خان کے بیان کے مطابق ہے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں جائے پیدائش بندر کھولہ لکھا ہے اور بندر کھولہ کو پرگنہ کہا ہے (جلد ۲ ص ۷۸۳)
عبداللہ ملک نے بھی اسی کے مطابق لکھا ہے مگر ان کا کہنا ہے کہ ضلع فرید پور کے ایک گاؤں بندر کھولہ میں پیدا ہوئے ان سب کے برخلاف غلام رسول مہر نے ضلع فرید پور کے ایک گاؤں بہادر پور کو ان کا مرز بوم قرار دیا ہے۔ (سرگزشت مجاہدین صفحہ ۲۱۴) اور سید طفیل احمد منگلوری نے بھی یہی لکھا ہے کہ وہ بہادر پور کے رہنے والے تھے (مسلمانوں کا روشن مستقبل صفحہ ۱۲۶)
ہندوستان میں وہابی تحریک میں بہاولپور لکھا ہے جو کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔

مرشد آباد گئے جو مرشد آباد کورٹ سے منسلک تھے۔ وہاں بھی چچا کی نگرانی میں عربی اور فارسی کی تعلیم جاری رکھی۔ پھر وہ کلکتہ چلے آئے۔ جہاں ان کے ابتدائی استاد مولانا بشارت علی رہتے تھے۔ مولانا بشارت علی انگریزی حکومت سے سخت نفرت کرتے تھے۔ اور انگریزوں سے لڑ کر آزادی حاصل کرنے کی طاقت نہ ہونے کی بنیاد پر ہجرت ضروری سمجھتے تھے۔ اس وجہ سے انہوں نے ہندوستان سے ہجرت کر کے مکہ جانے کا فیصلہ کیا۔ نوجوان شریعت اللہ نے بھی ان کے ساتھ چلنے کی خواہش ظاہر کی۔ (۱) چنانچہ ۱۷۹۹ء میں وہ اپنے استاد کے ہمراہ مکہ مکرمہ روانہ ہو گئے۔ یہ اللہ کی طرف سے انتظام تھا کہ مستقبل میں بنگال میں احیاء اسلام کی تحریک چلانے کے لئے مرکز اسلام میں پوری طرح تیار ہوں۔ مکہ پہنچنے کے بعد ابتدائی دو سال انھوں نے مولانا مراد بنگالی کے گھر میں گزارے جنھوں نے مکہ میں بود و باش اختیار کی تھی۔ اور ان کی نگرانی میں عربی زبان وادب اور فقہ و اصول کی تعلیم حاصل کی۔ پھر چودہ سال مسلسل شیخ طاہر سنبل مکی (۲) کی خدمت میں رہ کر پوری طرح تعلیم و تربیت میں مشغول رہے اور ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے باضابطہ سلسلہ قادریہ میں داخل ہوئے۔ اس کے بعد وہ شیخ کی اجازت سے علوم اسلامیہ میں مزید مہارت اور پختگی پیدا کرنے کے لئے جامع ازہر (مصر) گئے۔ اور دو سال وہاں رہے۔ اس عرصہ میں وہاں کی لائبریری سے بھی کافی استفادہ کیا۔ پھر حرمین شریفین کی زیارت کرتے ہوئے اپنے استاد اور مرشد کی اجازت سے ۱۸۱۸ء میں وطن لوٹے۔

کچھ عرصہ بعد دوبارہ مکہ گئے۔ مگر جلد ہی ۲۱-۱۸۲۰ء میں واپس آ گئے۔ اس دوسرے سفر میں وہابیوں کے درمیان ان کا قیام رہا۔ جس سے ان کی تعلیمات کو قریب

---

(۱) اس سے ان سب قیاس آرائیوں کی تردید ہوتی ہے کہ وہ مکہ حج کے لئے گئے تھے یا مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے جیسا کہ بہت سے مصنفین نے قیاس کیا ہے۔

(۲) شیخ طاہر سنبل بہت بڑے عالم اور مکہ کے مشہور حنفی فقیہ تھے۔ فقہ حنفی میں ان کو وہ کمال تھا کہ بقول معین الدین احمد خان انہیں چھوٹا ابو حنیفہ کہا جاتا تھا۔ اس کے برخلاف انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مطابق شیخ طاہر بہت بڑے شافعی عالم وفقیہ تھے۔ سید طفیل منگلوری نے بھی ان کو شافعیوں کا پیشوا لکھا ہے (مسلمانوں کا روشن کا مستقبل صفحہ ۱۲۶) معین الدین احمد خان نے اس کی سخت تردید کی ہے (دیکھئے تصنیف مذکور صفحہ ۵-۶)

سے دیکھنے اور ان سے استفادہ کرنے موقع ملا۔(۱)

فرائضی تحریک کا آغاز

فرائضی تحریک درحقیقت احیاء اسلام کی ایک تحریک تھی۔ بنگال میں ہندوانہ رسوم مسلمانوں کی زندگی کا جز بن گئے تھے بلکہ بہت سے مسلمان اپنے رسم ورواج میں پورے ہندو بن گئے تھے۔ اور ایسے لوگوں کی بھی ایک بڑی تعداد تھی جنہوں نے عقیدۃً بھی ہندو مذہب اختیار کرلیا تھا(۲)۔ فرائضی تحریک اسی کا ردعمل تھا۔ مولانا شریعت اللہ انہی امور کی اصلاح اور خالص اسلامی عقیدہ واعمال کی دعوت واشاعت کے لئے اٹھے تھے۔ حجاز سے پہلی دفعہ واپسی کے بعد ۱۸۱۸ء ہی میں انھوں نے تحریک شروع کی تھی۔(۳) اور ۱۸۲۱ء سے تو یہی دعوت ان کا اوڑھنا بچھونا بن گئی۔ انھوں نے ابتداءً اپنے گاؤں ہی میں درس دینا شروع کیا۔(۴) پھر معاشرہ میں اتر کر مروجہ ماحول سے بغاوت کی۔ ہندوانہ رسوم سے سختی کے ساتھ منع کیا، بدعات کی شدومد سے مخالفت کی، تصحیح عقائد کی پرزور دعوت دی اور اصلاح اعمال پر پوری قوت سے ابھارا۔ جیمس ٹیلر کے بقول غیر معمولی سرعت کے ساتھ حاجی شریعت اللہ کی تحریک پھیلنے لگی۔ لوگوں کی اصلاح میں انہیں کامیابی ملنے لگی۔ اور اندازاً ڈھاکہ، فرید پور، باقر گنج، اور میمن سنگھ کی مسلم آبادی میں ہر چھٹا شخص ان کی تعلیمات سے متاثر تھا۔(۵)

---

(۱) یہ پوری تفصیل معین الدین احمد خان کی کتاب فرائضی مومنٹ ان بنگال صفحہ ۱-۱۲ سے ماخوذ ہے۔ دوسری کتابوں میں ان کے سفر وغیرہ کی تاریخوں میں کافی اختلاف بلکہ اضطراب ہے۔ معین الدین احمد خان نے بڑی جانفشانی سے اس موضوع پر پہلی دفعہ باقاعدہ تحقیق کی ہے۔ اسلئے ان کا بیان زیادہ قابل اعتماد ہے۔

(۲) شیخ محمد اکرام نے بنگال میں ہندو احیائیت کی تحریکوں کا کافی تفصیل سے جائزلیا ہے۔ اسکے مطالعہ سے فرائضی تحریک کی مذہبی اہمیت وعظمت سمجھنے میں مدد ملے گی نیز اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت سید احمد شہید نے بنگال پر اتنی توجہ کیوں دی تھی۔(ملاحظہ ہو رود کوثر صفحہ ۴۹۳-۵۲۷)

(۳) تحریک شروع کرنے کے فوری اسباب کیا ہوئے اس سلسلہ میں کئی واقعات بیان کئے جاتے ہیں ملاحظہ ہو فرائضی مومنٹ ان بنگال، صفحہ ۹-۱۰

(۴) بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہد آزادی صفحہ ۱۴۳

(۵) دیکھئے فرائضی مومنٹ ص ۱۲۔ معین الدین احمد خان نے کافی وضاحت سے فرائضی تحریک کی وسعت کو بیان کیا ہے۔

مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں کہ گردو پیش کے علماء نے سخت مخالفت کی۔(۱) لیکن مولوی شریعت اللہ اطمینان و دلجمعی سے اپنے کام میں لگے رہے اور تھوڑی ہی مدت میں ان کا اثر دور دور تک پھیل گیا۔غریب مزدور اور کسان انکی تحریک اصلاح سے حد درجہ متاثر ہوئے اور سب مولوی صاحب پر جانیں چھڑکنے لگے۔(۲)

چونکہ ان کے یہاں شرعی فرائض کی بجا آوری پر بہت زور دیا جاتا تھا۔اس لئے ان کی دعوت ''فرائضی تحریک'' کے نام سے مشہور ہوئی۔اور تحریک میں شامل ہوتے وقت سابقہ زندگی سے خاص طور پر توبہ کرائی جاتی تھی اس لئے ان کے پیروکاروں کو توبار کہا جاتا تھا۔(۳)

انگریزوں کی مخالفت اور ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا اعلان

بچپن ہی سے حاجی شریعت اللہ انگریزوں سے سخت نفرت کرتے تھے۔ان کے اولین استاد مولانا بشارت علی انگریزوں کے شدید مخالف تھے اور ان پر نکتہ چینی کرتے رہتے تھے اور اسی بناء پر انھوں نے ہندوستان سے ہجرت بھی کی۔انھوں نے اپنے اس ہونہار اور محبوب شاگرد جس کی تعلیم و تربیت کی انہیں بے حد فکر تھی کے رگ و پے میں کس طرح انگریز دشمنی جاگزیں کی ہوگی؟ یہاں تک کہ جب مولانا بشارت علی نے ہندوستان سے ہجرت کر جانے کا فیصلہ کیا تو حاجی شریعت اللہ نے بھی انکے ساتھ ترک وطن کر کے

---

(۱) سب سے زیادہ مخالفت مولانا کرامت علی جون پوری نے کی۔وہ بھی اس علاقہ میں دعوت و اصلاح کے کام میں مشغول تھے۔یہ اختلافات زیادہ تر مذہبی تھے۔مذہبی نوعیت سے مولانا کرامت علی ان کے بعض خیالات کو دین کے لئے نہایت ضرر رساں سمجھتے تھے۔اسی وجہ سے انہوں نے کتابوں میں مولانا شریعت اللہ کے خلاف بہت سخت زبان استعمال کی ہے۔نمونہ کے لئے مولانا عبدالحئی حسنی نے مولانا شریعت اللہ کے حالات میں، مولانا کرامت علی کے حوالہ سے جو باتیں نقل کی ہیں ملاحظہ ہو (الاعلام (نزہۃ الخواطر) ۷/۲۳۲-۲۳۴) دونوں کے دوالگ الگ محاذ تھے۔تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو فرائضی مومنٹ صفحہ ۸۹ تا ۱۰۳۔

(۲) سرگزشت مجاہدین صفحہ ۲۱۵۔

(۳) ملاحظہ ہو فرائضی مومنٹ صفحہ ۶۲۔نیز موج کوثر صفحہ ۵۸۔معین الدین احمد خان نے وہ توبہ نامہ یا عہد نامہ بھی نقل کیا ہے جو مرید سے لیا جاتا تھا۔نیز یہ بھی لکھا ہے کہ وہ مرشد کو بجائے پیر کے استاد اور دست گرفتہ کو بجائے مرید کے شاگرد کہتے تھے۔

حجاز کی پرامن سرزمین پر جابسنے کا ارادہ کیا اور استاد کے ہمراہ چلے بھی گئے۔ پھر جب سالہا سال کی تعلیم وتربیت کے بعد انھوں نے اپنے اندر یہ صلاحیت محسوس کی کہ ہندوستان جاکر نقشہ بدلا جاسکتا ہے اور دین کے نام پر لوگوں کو متحد کرکے ان کے عقائد واعمال کی اصلاح کے بعد ان کے اندر بآسانی جذبہ جہاد پیدا کیا جاسکتا ہے۔ پھر انگریزوں کا تختہ الٹنے میں کیا دیر۔ چنانچہ وہ ہندوستان واپس آگئے اور اپنا کام شروع کیا۔ اپنے پروگرام کی ترتیب میں انہوں نے وہابیوں کے مرحلہ وار طریقہ کار (یعنی تصحیح عقائد، اصلاح اعمال اور پھر ترغیب جہاد) کو ضرور پیش نظر رکھا ہوگا۔ وہابیوں کی صحبت کے نتیجہ میں ان کو یقین تھا کہ عوام کو صحیح اسلامی تعلیمات کی طرف راغب کرنے کے بعد سیاسی اقتدار کے لئے جدوجہد آسان ہوجائے گی۔ وہابیوں کو انہوں نے بہت قریب سے دیکھا تھا ان کے مکہ کے زمانہ قیام ہی میں وہابیوں کا مکہ پر قبضہ ہوا تھا۔ پھر ہندوستان واپسی کے بعد بہت جلد دوبارہ مکہ جاکر وہابیوں کے درمیان رہنا واضح طور پر بتاتا ہے کہ اب کے وہ خاص پروگرام کو مدنظر رکھ کر گئے تھے ورنہ اتنے طویل قیام کے بعد پھر دوبارہ جانے کی کیا توجیہ ہوگی۔ غرض انھوں نے مجوزہ پروگرام کے تحت کام کا آغاز کیا۔ مسلمان کاشتکاران کے پیغام سے متاثر ہونا شروع ہوئے۔ وہ انگریز اور ہندو زمیندار دونوں کے مظالم کا شکار تھے۔ گویا وہ چکی کے دونوں پاٹ کے درمیان تھے۔ اور بری طرح پسے جارہے تھے۔ مولانا شریعت اللہ ان کے مسیحا کے طور پر ابھرے تھے۔ اس لئے بہت جلد ان کے گرد ایک وسیع حلقہ قائم ہوگیا۔ بقول عبداللہ ملک وہ تو پہلے ہی کسی ایسے پیغام کے منتظر تھے جو ان کے ظلم کے خلاف اور ان میں خوداعتمادی پیدا کرنے کا باعث ہو۔ آگے لکھتے ہیں :

دیہات میں مسلمانوں کی حالت پہلے ہی ابتر تھی لیکن جب ہندو زمینداروں نے اپنے تیوہاروں کے لئے بھی ٹیکس عائد کرنا شروع کردیا(۱) تو ان کی حالت اور بھی بگڑ

(۱) ہندو زمیندار دُرگا (پوجا) اور دوسرے مشرکانہ رسوم کے لئے مسلمانوں پر جبراً ٹیکس عائد کرتے یہاں تک کہ مسلمانوں کو رسوا کرنے کے لئے ایک ہندو زمیندار کشن رائے پورنا نے اس کو داڑھی ٹیکس Beard Tax کا نام دیا۔ ان تمام زیادتیوں کو انگریزوں کی پشت پناہی حاصل تھی۔ (سید میر بادشاہ بخاری، تحریک مجاہدین جنگ بالاکوٹ کے بعد از ماہنامہ میثاق لاہور ==

گئی۔ ایسے میں مسلمان کاشتکاروں سے یہ کہا گیا کہ وہ ہندوانہ رسم ورواج ترک کر دیں اور وحدہ لاشریک کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں۔ تمام مسلمانوں کو اپنا بھائی سمجھیں، نماز روزے کی پابندی کریں، تو ظاہر ہے کہ اس کا اچھا اثر ہوا۔ حاجی شریعت اللہ براہ راست اور شعوری طور پر اس قسم کے ٹیکسوں کی عدم ادائیگی کی تلقین کرتے یا نہ کرتے ہوں، یہ ایک فطری بات تھی کہ ایسی فضا پیدا ہوگئی جس میں مسلمان کاشتکار ذہنی طور پر ہندو زمیندار کے غلبہ کو ختم کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ حاجی شریعت اللہ کی مہم ہی کا اثر تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے بنگال کے اکثر علاقوں میں ان کی تعلیمات کا چرچا ہونے لگا۔ (۱)

جب انہوں نے دیکھا کہ بنگال کا اکثر حصہ ان کی آواز پر لبیک کہنے کے لئے تیار ہے۔ تو انہوں نے قدم آگے بڑھاتے ہوئے اعلان کر دیا کہ ہندوستان دار الحرب ہے اب یہاں مسلمانوں کی حکومت اور اقتدار نہیں ہے بلکہ ایسی حکومت قائم ہے جو یہاں کے لوگوں پر شدید مظالم کر رہی ہے اس لئے ایسے ملک میں مسلمانوں کے لئے عیدین اور جمعہ پڑھنا جائز نہیں۔ (۲) سید میر بادشاہ بخاری اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

مولانا شریعت اللہ نے مسلمانان بنگال کے عقیدے اور عمل کی اصلاح کے ساتھ

== جون ۲۰۰۲ء، صفحہ ۴۹)

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں بھی اس کا اعتراف کیا گیا ہے کہ ہندوؤں کو انگریزوں کا تعاون حاصل تھا۔ (جلد ۲ ص ۷۸۳)

اس سلسلہ میں انگریزوں کی پالیسی اور ہندو زمینداروں کے ساتھ ان کی ہمدردی اور مسلمان کاشتکاروں پر زیادتیوں کا معین الدین احمد خان نے تفصیل سے ذکر کیا ہے دیکھئے (Faraidi Movement part 1 p xcvi.cvi.

(۱) بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہد آزادی صفحہ ۱۴۴۔

(۲) اقامت جمعہ وعیدین کا مسئلہ ان میں اور ان کے مخالفین میں سب سے زیادہ زیر بحث رہا۔ مناظروں تک نوبت پہنچی۔ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں کہ زیادہ اختلاف جمعہ اور عیدین کی نمازوں سے متعلق تھا۔ فرائضی کہتے تھے کہ ہندوستان دار الحرب ہو گیا ہے۔ اس لئے یہاں نماز جمعہ جائز نہیں۔ عام مسلمانوں جمعہ اور عیدین کی نمازیں پڑھتے تھے۔ اس اختلاف نے بسا اوقات ہنگاموں اور فسادات کی صورت اختیار کر لی۔ فرائضیوں نے عام مسجدوں کو چھوڑ کر اپنے جماعت گھر قائم کئے۔ اور دونوں جماعتوں میں کثرت سے تلخ مباحثے ہوئے (موج کوثر صفحہ ۵۸۔۵۹) مگر اسکے باوجود فرائضیوں کا اثر اتنا پائیدار تھا کہ ان کے زیر اثر علاقوں میں ۱۹۴۷ء کی آزادی تک جمعہ اور عیدین کی نمازیں نہیں ہوتی تھیں۔ (دیکھئے Faraidi Movement Part II, P.67.)

ساتھ ان میں انگریزوں کے خلاف جذبہ جہاد کو ابھارنے کی بھرپور کوشش کی۔ اس عظیم مقصد کو حاصل کرنے اور تحریک کو مزید جاندار بنانے کے لئے انھوں نے انگریزوں کی حکومت کو اسلام دشمن قرار دے کر ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا۔ (۱)

جمعہ وعیدین کے عدم جواز کے اعلان سے حاجی شریعت اللہ کا مقصد برطانوی حکومت کے خلاف شدید نفرت پیدا کرنا تھا کہ جس ملک میں ایک مسلمان جمعہ وعیدین ادا نہ کر سکے، وہاں رہنا جائز نہیں۔ ہجرت ضروری ہے۔ یا پھر اسے دارالاسلام میں تبدیل کرنے کیلئے علم جہاد ہاتھ میں لے کر سر دھڑ کی بازی لگا ئے۔

پیش قدمی

یہ اعلان انگریزوں کے خلاف خطرہ کا سائرن تھا۔ جس سے ان کے کان کھڑے ہو گئے۔ پھر ہندو زمینداروں کے مقابلہ میں فرائضیوں کی جرأت نے ان کو اور چونکا دیا۔ یہاں تک کہ وہ فرائضیوں کے مقابلہ میں کھڑے ہوئے۔ عبداللہ ملک اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

مسلمانوں کے درمیان مساوات اور اخوت پر ان کے یہاں بڑا زور تھا۔ امیر غریب دونوں برابر تھے۔ اس درس مساوات سے کاشتکاروں کو جرأت حاصل ہوئی۔ کاشتکار بیگار دینے سے انکار کرنے لگے۔ ناجائز ٹیکسوں کی ادائیگی سے بھی گریز ہونے لگا۔ زمیندار کے گھر کام کاج کے لئے کسانوں کی بہو بیٹیاں جایا کرتی تھیں یہ سلسلہ بھی بند ہو گیا۔ کسانوں میں اس جرأت انکار کے پیدا ہو جانے سے زمیندار پریشان ہو گئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے کئی ایک انگریز بھی پریشان حال زمینداروں کے حلقے میں شامل ہو گئے۔ ایک طرف ان زمینداروں کی مخالفت، دوسری طرف پرانے خیال کے مسلمانوں کی مزاحمت نے مشرقی بنگال کے اکثر دیہاتوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک گروہ فرائضی تحریک کا اور ایک گروہ پرانے خیال کے مسلمانوں کا۔ فرائضی تحریک کی اخوت نے انگریز اور ہندو زمینداروں کو ہراساں کر دیا۔ کیوں کہ اب

(۱) تحریک مجاہدین جنگ بالاکوٹ کے بعد از ماہنامہ میثاق لاہور، جون ۲۰۰۲ء، صفحہ ۴۹۔

زمینداروں کی زیادتیاں ناممکن ہوگئی تھیں۔ان زمینداروں نے دوسرے گروہ کے کسانوں کوشہ دے کرفرائضی تحریک کے خلاف بھڑکا دیا۔جس سے مختلف دیہاتوں میں دنگے فساد تک نوبت پہنچی۔بالآخر ۱۸۳۱ء میں دونوں پارٹیوں کونقض امن عامہ کے تحت گرفتار کرلیا گیا۔زمینداروں کی شہادت پر حاجی شریعت اللہ کے گروہ کے افراد کودودوسو روپیہ جرمانہ اور ایک سال قید کی سزادی گئی۔خود حاجی صاحب کے خلاف بھی کارروائی ہوئی۔لیکن عدم ثبوت کی بناء پر انہیں رہا کردیا گیا۔تاہم ان سے ۵۰۰روپیہ کے ساتھ ایک سال کے لئے ضمانت نیک چلنی لے لی گئی۔

ڈاکٹر ٹیلر کا کہنا ہے کہ حاجی شریعت اللہ کی سرگرمیاں پولس کی کڑی نگرانی کا محور بن گئیں۔پولس کے پاس اس قسم کی اطلاعات تھیں کہ حاجی شریعت اللہ نے اپنے معتقدین کوہدایت کی ہے کہ وہ زمین داروں کوٹیکس نہ دیں۔

بہاری لال سرکار نے لکھا ہے کہ ۱۸۳۱ء میں مشرقی بنگال میں بڑااشتعال تھا۔وہ یہ الزام لگاتا ہے کہ اسی سال اپریل میں حاجی شریعت اللہ نے دیہات پر حملہ کر کے اسے لوٹا۔کیوں کہ کسی نے وہاں ان کی تعلیمات کوقبول نہیں کیا تھا۔

ان باتوں کی وجہ سے حاجی شریعت اللہ نے ڈھاکہ کے گاؤں نیاباری کی سکونت ترک کردی جوان کی سرگرمیوں کا شروع سے مرکز تھا۔اوراپنے آبائی گاؤں ضلع فرید پور منتقل ہوگئے۔یہاں ان کی تحریک نے بہت تیزی سے ترقی کی۔ایشیاٹک سوسائٹی کارسالہ اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ حاجی شریعت اللہ کے اردگرد جاہل مسلمان کاشتکاروں کاایک ہجوم جمع ہوگیا تھا جوکسی وقت بھی مشتعل ہوسکتا تھا۔مسلمان آبادی کی بہت بڑی تعداد فرائضی تحریک سے متاثر تھی۔اور حاجی صاحب اپنے معتقدین سے اپنے حکم پرعمل کروانے کی پوری قدرت رکھتے تھے۔

غرض حاجی شریعت اللہ نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ان کے پیروکاروں کو مختلف الزامات میں کئی بار کورٹ میں حاضری دینی پڑی۔بالآخر حاجی صاحب نے ۱۸۴۰ء میں اپنے پیدائشی گاؤں شامیل میں انتقال کیااس وقت ان کی عمرانسٹھ برس کی تھی۔(۱)

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہد آزادی صفحہ ۱۴۶ تا صفحہ ۱۴۹۔نیز
(A History of Fraidi Movement in Bengal P15-22.)

حاجی شریعت اللہ بڑی دلآویز شخصیت کے مالک تھے۔ وہ معتدل قد و قامت کے طاقتور آدمی تھے۔ بنگال کی آزادی کی تاریخ میں ان کی کوششیں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

دودھو میاں

آپ کا پورا نام مولوی حاجی محسن الدین احمد تھا۔ دودھو میاں عرف تھا۔ اسی سے مشہور ہوئے۔ آپ حاجی شریعت اللہ کے اکلوتے فرزند تھے۔ ۱۸۱۹ء میں پیدا ہوئے۔ والد صاحب کی خاص نگرانی اور تربیت میں بچپن گزرا۔ انہوں نے فارسی اور عربی تعلیم کے لئے گھر ہی میں انتظام کیا تھا۔ ابتدائی تعلیم کے حصول اور بنیادی استعداد بہم پہنچانے کے بعد بارہ سال کی عمر میں والد صاحب نے اعلیٰ تعلیم کے لئے مکہ بھیجا۔ مکہ مکرمہ جاتے وقت چند دنوں کے لئے کلکتہ رکے۔ اور ضلع چوبیس پرگنہ میں تیتو میر (جن کا مفصل تذکرہ آگے آرہا ہے) سے ملاقات کے لئے گئے جو وہاں رکے ہوئے تھے۔ مکہ میں ان کی کیا مشغولیات رہیں اور کن کن سے تعلیم حاصل کی؟ اس سلسلہ میں کوئی قابل اعتماد تاریخی روایت نہیں البتہ اتنا معلوم ہے کہ وہ پانچ سال بعد بنگال لوٹے۔ اور سرکاری ریکارڈ میں ان کا نام پہلی دفعہ فرید پور کے امن عامہ میں خلل ڈالنے کے سلسلہ میں آیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس واقعہ سے کچھ ہی پہلے لوٹے ہوں۔ (یعنی ۱۸۳۷ء کے آس پاس) اس کے بعد حاجی شریعت اللہ نے انہیں اپنے ساتھ رکھ کر اعلیٰ تعلیم دلائی۔ اس کے علاوہ ان کی تعلیم کے سلسلہ میں تفصیل دستیاب نہیں۔ (۱)

فرائضی تحریک کی قیادت اور اقدامات

دودھو میاں جب مکہ سے واپس آئے۔ اسی وقت سے انہوں نے سرگرمی کے ساتھ تحریک میں حصہ لینا شروع کیا۔ جس کی انہیں قیادت کرنی تھی۔ اور اسی وقت سے حکومت کی نگاہ میں کھٹکنے لگے تھے۔ ۱۸۳۸ء میں جب حجاز سے لوٹے چند مہینے بھی نہیں گزرے تھے ان کے خلاف لوگوں میں اشتعال پھیلانے اور لوٹ مار کے لئے اکسانے

---

(۱) (A History of the Faraidi Movement in Bengal .p 23-25.)

کے الزام میں ایک مقدمہ قائم کیا گیا تھا۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کیسی پر جوش طبیعت کے مالک تھے۔ اس لئے آئندہ قیادت کے لئے انہیں پر نظریں اٹھتی تھیں۔ چنانچہ ۱۸۴۰ء میں حاجی صاحب کے انتقال کے بعد تحریک کی قیادت کی ذمہ داری انھیں نے سنبھالی۔ اس وقت ان کی عمر اکیس سال کی تھی۔ عین جوانی کے عالم میں اتنی بڑی تحریک کی قیادت سنبھالنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ لیکن انھوں نے جس کمال اور خوبی سے اپنی قائدانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا اس نے انہیں اپنے عظیم باپ سے زیادہ مقبول و عظیم بنا دیا۔ یہ انہی کے صلاحیتوں کا نتیجہ تھا کہ جو تحریک صرف چند اضلاع تک محدود تھی اس نے پورے بنگال کو اپنے احاطہ میں لے لیا۔

انھوں نے اس تحریک کو با قاعدہ تنظیم، سرگرم اور فعال سیاسی طاقت اور سماجی تبدیلیوں کی محرک و آئینہ دار بنانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

انھوں نے تحریک کی تنظیم کی خاطر بنیادی طور پر پانچ اقدامات کئے :

۱۔ پہلا کام یہ کیا کہ بنگال کو چند حلقوں میں تقسیم کر کے ہر حلقہ میں اپنا خلیفہ متعین کیا۔ جو وہاں کے سارے حالات سے ان کو آگاہ کرے۔ اور وہاں کا دینی، سماجی، سیاسی ہر طرح کا انتظام سنبھالے۔(۱) بڑے مراکز ڈھاکہ، باراسیٹ، مالدہ، جیسور اور پٹنہ تھے۔

۲۔ ہر حلقہ میں پنچایتیں قائم کیں۔ جن کے ذمہ ہر قسم کے تنازعات کا فیصلہ کرنا تھا۔ ساتھ ہی برطانوی عدالتوں میں جانے کی ممانعت تھی۔ آخری صورت میں اگر فریقین چاہتے تو تنازعہ کو دودھومیاں کے پاس لے جاسکتے تھے۔(۲)

۳۔ ہر مرید کے لئے ضروری قرار دیا کہ آمدنی کا ایک حصہ جنس کی شکل میں بیت المال کے سرمایہ کے لئے جمع کرے۔ خلیفہ اس کو وصول کر کے

---

(۱) معین الدین احمد خان نے نظام خلافت اور خلیفہ کے کام کی نوعیت کو مفصل بیان کیا ہے۔ دیکھئے۔A History of the Fraidi Movement p.107-113.

(۲) ملاحظہ ہو علماء ہند ان سیاست میں صفحہ ۲۱۷۔

مرکز بھیجا تھا۔(۱)

۴۔ مذہبی پہلو کو مستحکم کرنے کے لئے ان کو پیر اور ماننے والوں کو مرید کہلایا جانے لگا۔حالاں کہ حاجی شریعت اللہ پیر و مرید کی اصطلاح کے بجائے استاد و شاگرد کی اصطلاح پر عمل پیرا تھے۔(۲)اس سے ان کا مقصد جذباتی رشتہ میں اضافہ کرنا تھا۔

۵۔ انیسویں صدی کے وسط میں دودھومیاں نے الارض للہ کا نعرہ بلند کیا۔اور اعلان کر دیا کہ زمین اللہ کی ملکیت ہے۔ اس پر انفرادی ملکیت اسلامی تعلیمات کے منافی ہے۔کسی کو حق نہیں کہ بطور وراثت اس پر قابض ہو۔ جو لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں وہی اس کے مالک ہیں۔نام نہاد مالکان آراضی ان سے کوئی لگان وصول کرنے کے حقدار نہیں۔اس اعلان نے ایک نئی صورت حال پیدا کر دی۔اس پر جہاں کاشتکار ان پر دل و جان سے فدا ہونے لگے۔وہیں بڑے بڑے زمینداران کے جانی دشمن بن گئے۔(۳)

حکومت کا ردعمل

دودھومیاں کے ان اقدامات سے اسلامی اخوت اور بھائی چارہ میں اور پختگی پیدا ہوئی۔جس سے ہندو زمیندار اور انگریز تاجر بوکھلا گئے۔اور حکومت قلابیں کھانے لگی۔الارض للہ کے نعرہ نے زمینداروں کی آتش غضب کو اور بھڑکا دیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے دودھومیاں، ان کے خلفاء اور سرگرم کارکنوں کے خلاف فوجداری مقدمات کا ایک سلسلہ شروع کر دیا۔

۱۸۴۱ء میں ان کے خلاف قتل کا ایک مقدمہ دائر کیا گیا۔۱۸۴۲ء کے ایک واقعہ

(۱) بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہد آزادی صفحہ ۱۵۵۔۱۵۶۔
(۲) ایضاً۔
(۳) سرگزشت مجاہدین صفحہ ۲۱۵۔نیز بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہد آزادی صفحہ ۱۵۸۔انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں بھی اس کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

میں فرائضی تحریک کے ایک سوسترہ کارکنوں کو گرفتار کیا گیا۔ جن میں سے ایک سو چھ افراد پر مقدمہ چلایا گیا۔ اور بائیس افراد کو سات سال قید با مشقت کی سزا دی گئی۔ دودھو میاں بھی ملزمین میں سے تھے۔ مگر ان کے خلاف کافی شہادت نہ ملنے کی وجہ سے انہیں چھوڑ دیا گیا۔ ۱۸۴۴ء میں قفل شکنی اور بلا اجازت کسی کے مکان اور آراضی میں مداخلت کے الزام میں مقدمہ قائم ہوا۔ اس میں پولس اور زمینداروں کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر انگریز تاجروں اور زمینداروں نے انتقام کی ٹھانی، اور تقریباً آٹھ سو آدمیوں کی مدد سے دودھو میاں کے گھر پر دھاوا بول دیا۔ ان کی املاک کو نقصان پہنچایا۔ کئی ایک مکانوں کو آگ لگادی۔ مال واسباب لوٹ لیا۔ (۱) اور انکے خلاف مقدمہ قائم کردیا مگر عدالت میں ثابت ہوا کہ یہ انگریز تاجروں اور زمینداروں کے سازباز کا نتیجہ ہے۔

پنج چیر میں ایک انگریز تاجر ڈنلوب کا نیل کا کارخانہ تھا۔ ۱۸۴۶ء میں دودھو میاں نے اس پر حملہ کر کے نذر آتش کردیا اور اس کے منیجر کو قتل کردیا۔ اس پر دودھو میاں اور ان کے ترسٹھ ساتھی گرفتار کرلئے گئے۔ کافی دنوں تک ان کے خلاف مقدمہ چلتا رہا۔ اور ماتحت عدالت نے انہیں سزائیں دیں۔ لیکن بالآخر صدر عدالت نے انہیں رہا کردیا۔

۱۸۵۷ء کے قریب زمینداروں کی نالش پر پھر ان کے خلاف مقدمات قائم ہونا شروع ہوگئے۔ ایک مقدمے میں دودھو میاں نے مجسٹریٹ کے سوال کے جواب میں کہا

"ان کے نام جو سمن جاری ہوں گے ان کی تعمیل ایک دودھو میاں نہیں
کرے گا بلکہ پچاس ہزار دودھو میاں اس آواز پر لبیک کہیں گے"

کہا جاتا ہے کہ حکومت نے اس دھمکی کو محسوس کیا اور جب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی شروع ہوئی تو دودھو میاں کی نظر بندی کے احکام جاری کردیئے گئے۔ پہلے انہیں علی پور جیل میں رکھا گیا۔ بعد میں انہیں فرید پور میں جیل میں منتقل کیا گیا۔ یہاں سے وہ بیماری کی حالت میں ۱۸۵۹ء میں رہا ہوئے۔ (۲) رہائی کے بعد صرف دو یا تین سال

---

(۱) دودھو میاں کو بڑا بھاری نقصان ہوا تھا۔ اس میں ایک کروڑ پچاس لاکھ نقد روپئے بھی ہتھیا لئے گئے۔ دیکھئے A History of the Faraidi Movement .P 34.

(۲) بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہد آزادی صفحہ ۱۶۰۔ اور معین الدین خان نے لکھا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی شروع ہونے پر انہیں گرفتار کر کے کلکتہ لیجایا گیا، جہاں انہیں ۱۸۵۹ء ==

زندہ رہے۔ اور ۱۸۶۲ء (۱) میں انتقال کیا اس وقت ان کی عمر ۴۳ سال کی تھی۔

فرائضی تحریک کو مؤثر بنانے اور اس کے حلقہ کو وسیع کرنے میں انھوں نے بڑا کارنامہ انجام دیا۔ ڈیمپئر (Dampier) نے لکھا ہے کہ :

دودھومیاں نے کم از کم اسی ہزار سرگرم کارکن اپنے گرد جمع کر لئے تھے اور اس وقت عام تاثر یہی تھا کہ اس تحریک کا مقصد انگریزوں کو بنگال سے نکالنا اور مسلمانوں کی حکومت کو بحال کرنا ہے۔ (۲)

غرض بنگال میں مسلمانوں کی آزادی اور سماجی انصاف کی تحریک میں دودھومیاں کا حصہ ناقابل فراموش ہے۔

فرائضی تحریک پر ایک نظر

صحیح عقائد، اصلاح اعمال اور رد شرک وبدعت اور سیاسی مقصد کی یگانگت میں فرائضی تحریک اور تحریک سید احمد شہیدؒ (جس کو انگریزوں نے وہابی تحریک کا نام دیا تھا) میں کافی حد تک اتحاد نظر آتا ہے۔ اسی وجہ سے خواجہ احمد فاروقی نے فرائضی تحریک کو وہابی تحریک کی شاخ قرار دیا ہے۔ (۳) مگر حقیقت میں تحریک سید احمد شہیدؒ سے اس کا کوئی علاقہ نہیں تھا۔ جیسے تحریک سید احمد شہیدؒ اور نجد کی وہابی تحریک میں کوئی علاقہ نہیں۔ غلام رسول مہر نے بھی فرائضی تحریک کے سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے ساتھ علاقہ کا قطعی انکار کیا

== تک زیر حراست رکھا گیا۔ اور دودھومیاں کا مذکورہ جرأت مندانہ جواب اسی کے تحت نقل کیا ہے۔ (فرائضی مومنٹ صفحہ ۴۲) نیز ان پر چلائے گئے مقدمات کو معین الدین احمد خان نے بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ (تصنیف مذکور صفحہ ۲۶۔۴۲)

(۱) یہ عبد اللہ ملک اور معین الدین احمد خان کی تحقیق ہے جب کہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں ۱۸۶۰ء لکھا ہے اور غالباً یہیں سے غلام رسول مہر، شیخ محمد اکرام اور ڈاکٹر قیام الدین احمد نے نقل کیا ہے۔ نیز مہر نے فضلی صاحب سکریٹری حکومت پاکستان کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ دودھومیاں کو زہر دلوایا گیا تھا۔ (سرگزشت مجاہدین۔ صفحہ ۲۱۵)

(۲) بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہد آزادی صفحہ ۱۵۹۔ ڈیمپئر نے ۱۸۴۳ء میں یہ تعداد بیان کی تھی دیکھئے فرائضی مومنٹ، صفحہ ۴۲۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بعد میں ان کی تعداد میں کتنا اضافہ ہوا ہوگا۔

(۳) دیکھئے چراغ رہ گزر صفحہ ۱۲۶۔

ہے۔ مگر اس میں دو رائے نہیں کہ وہ ایک بہت مؤثر تحریک تھی۔ اور جس نے بنگال میں ایک مدت تک کافی ہلچل پیدا کر دی تھی۔

سید میر بادشاہ تحریک کی تنظیم وتاثیر پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

یہ پہلی عوامی اسلامی تحریک اور جدوجہد تھی جو ایک غیر ملکی کافر حکومت کے خلاف عوامی سطح پر برپا کی گئی تھی۔ یہ تحریک اتنی فعال تھی اور اس کا تنظیمی ڈھانچہ اتنی مضبوط بنیادوں پر استوار ہوا تھا اور اپنے اثرات کے لحاظ سے اتنی ہمہ گیر تھی کہ اس تحریک نے ایک متبادل حکومت قائم کی۔ اور چوں کہ وہ برٹش حکومت کو ناجائز تصور کرتے تھے اسلئے اپنے مقدمات کے فیصلوں کے لئے انگریزی عدالتوں کا بائیکاٹ کیا۔ یہ امر واقع ہے اور اس زمانہ کا ریکارڈ اس پر شاہد ہے کہ جہاں جہاں بھی یہ تحریک زیادہ قوی اور باا ثر تھی وہاں پر مسلمانوں کا ایک معاملہ بھی تصفیہ کے لئے برٹش عدالت میں نہیں گیا۔ فی الحقیقت اس تحریک نے مسلمانوں میں احیائے اسلام کے لئے ایک زبردست جذبہ پروان چڑھایا۔(۱)

غلام رسول مہر صاحب لکھتے ہیں "بے خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ مشرقی بنگال کے بڑے حصہ میں انہوں نے ایک نوع کی متوازی حکومت قائم کر دی تھی۔ اور ان کی جماعت کے لوگوں کو حکومت سے اس کے سوا کوئی واسطہ نہ رہا تھا کہ وہ زمین کا مالیہ باقاعدہ ادا کرتے تھے۔ کسانوں کی تنظیم اور زیادہ سے زیادہ لاتعاون کی یہ پہلی کامیاب تحریک تھی جو مشرقی بنگال میں جاری ہوئی۔ افسوس کہ دودھو میاں کی وفات کے بعد اس کی سرپرستی کرنے والا کوئی نہ رہا۔(۲)

---

(۱) ماہنامہ میثاق لاہور، جون ۲۰۰۲، صفحہ ۵۰

(۲) سرگزشت مجاہدین صفحہ ۲۱۵_۲۱۶

دوسری فصل

تیتو میر اور ان کی تحریک

تیتو میر کی شخصیت

جس زمانہ میں فرائضی تحریک کا عروج تھا اسی زمانہ میں تیتو میر کی اصلاحی سرگرمیاں بھی زوروں پر تھیں۔ تیتو میر یا تیتو میاں عرف تھا۔ اصل نام میر نثار علی تھا۔ تیتو میاں سید احمد شہیدؒ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ جیسا کہ مولانا غلام رسول مہر نے تصریح کی ہے۔(۱) اس کے برخلاف معین الدین احمد خان لکھتے ہیں اس بات پر تو عمومی اتفاق ہے کہ تیتو میر سید احمد شہیدؒ کی تعلیمات کے داعی تھے۔ مگر یہ بات ابھی قطعی طور پر معلوم نہیں کہ وہ سید احمد شہیدؒ کے نامزد خلیفہ تھے۔(۲) عبداللہ ملک نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔(۳)

وہ چاند پور کے ایک خوشحال زمیندار گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ اور شادی بھی امیر گھرانے میں ہوئی تھی۔ ابتدا میں پہلوانی کرتے تھے۔ پھر ندیا میں ملازمت اختیار کی تھی۔ اس زمانے میں بھی مظلوموں کی حمایت کے لئے پیش پیش رہتے تھے۔ اتفاق سے ایک زمیندار کے ساتھ ان کا جھگڑا ہو گیا جس نے مقدمہ دائر کیا، جس میں تیتو میاں کو قید کی سزا ہوئی۔ قید سے رہا ہوتے ہی وہ دہلی کے ایک شہزادے کے ساتھ حج کو چلے

---

(۱) سرگزشت مجاہدین صفحہ ۲۱۴۔

(۲) A History of the Faradi Movement Part 1, p 1xi

(۳) دیکھئے بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہد آزادی صفحہ ۱۶۷۔

بھاری لال سرکار کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ضلع پبنہ Pabna. میں سید صاحب کے ایک خلیفہ مولوی محمد حسین رہتے تھے۔ تیتو میر کا ان سے گہرا تعلق تھا۔ سید صاحب نے سند خلافت میں مولوی محمد حسین کو جن تعلیمات کی اشاعت کی تاکید کی تھی۔ تیتو میر نے پوری قوت سے مغربی بنگال میں اس کا پرچار کیا (دیکھئے فرائضی موومنٹ حصہ اول lxii)۔

گئے۔ یہ ۱۸۲۲ء کی بات ہے۔ سید احمد شہیدؒ اسی سال کلکتہ سے ایک بڑی جماعت کے ساتھ حج کے لئے گئے تھے۔ مکہ معظمہ ہی میں سید صاحب سے ملاقات ہوئی۔(۱) وہیں بیعت کی۔ پھر ان کی زندگی میں ایک انقلاب آ گیا۔ ۱۸۲۷ء میں ایک زبردست مبلغ اسلام کی حیثیت سے اپنے وطن لوٹے۔ اور اپنے پرانے مسکن کے قریب حیدر پور میں سکونت اختیار کی اور ایک مذہبی عالم اور مصلح کی حیثیت سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ اور کامیابی کے ساتھ کلکتہ کے شمالی اور مشرقی اضلاع کے دورے کئے اور کثیر تعداد میں لوگوں کو اپنا مرید بنالیا۔ اور خفیہ طور پر کافروں کے خلاف جہاد کی تیاریاں کرتے رہے(۲)۔ ان کے ان دوروں کی وجہ سے تین اضلاع چوبیس پرگنہ، ندیا اور فرید پوران کے زیر اثر آ گئے۔ نرکل بریا ان کا مرکزی مقام تھا۔

اصلاحی سرگرمیاں

حاجی شریعت اللہ کی طرح تیتو میر نے بھی اپنی تحریک کا آغاز اصلاح عقائد واعمال سے کیا۔ شرک و بدعت اور مروجہ ہندوانہ رسوم کے خلاف شدومد سے آواز اٹھائی۔ سید جعفر علی نقوی منظورۃ السعداء میں فرماتے ہیں کہ پورنا کے ایک زمیندار کشن رائے کے علاقے میں بہت سے چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے۔ جن کے باشندے سید صاحب کے مرید تھے۔ تہمد کے سوا ان کے بدن پر کوئی کپڑا نہ تھا۔ نماز روزے کے سوا عبادت نہ جانتے تھے۔ تیتو میر وہاں پہنچے تو ان لوگوں کو دینی مسائل کی تعلیم دی۔ مرکزی مقام میں نماز جمعہ کا انتظام کیا۔ اور وہاں کثرت سے مسلمان جمع ہونے لگے۔ تیتو میاں غیر شرعی رسموں سے روکتا تھا مثلاً قبروں کی پوجا نذر و نیاز وغیرہ۔ تاکید کرتا تھا کہ مسلمان داڑھیاں رکھیں۔ غیر مسلموں کے رسوم و رواج چھوڑ دیں۔ اور ایسا لباس پہنیں جس میں وہ غیر مسلموں سے ممتاز معلوم ہوں۔

جمعہ کا اجتماع کشن رائے کے لڑکے کو بے وجہ ناگوار معلوم ہوا۔ اور اس نے اس

(۱) اس بات کا قوی احتمال ہے کہ کلکتہ ہی میں سید صاحب سے ملنا ہوا ہو اس لئے کہ ہنٹر کے بیان کے مطابق وہ ان دنوں کلکتہ میں رہتے تھے۔ (ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۶۷)

(۲) ہنٹر، ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۶۸۔

اجتماع کا تمسخر اڑانا شروع کیا۔ تیتو میاں نے بڑے تحمل سے اسے سمجھایا کہ کسی کے دین کا تمسخر اڑانا بہت نازیبا ہے۔ تمہیں یہ اجتماع برا معلوم ہوتا ہے ذرا اپنے دین کی حالت پر نظر ڈالو۔ تمہارے یہاں عبادت کے وقت سنکھ بجتا ہے جس کی آواز گدھے کی آواز کے مشابہ ہوتی ہے۔ کشن رائے کا بیٹا یہ سنتے ہی ایک دم غصے میں آ گیا اور بولا کہ پھر ایسا اجتماع ہوا تو تمہیں مزہ چکھاؤں گا۔

بہرحال اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ جب مسلمان جمعہ کی نماز کے لئے جمع ہوں تو ان کے اردگرد خوب سنکھ بجاؤ۔ اس پر عمل ہوا۔ تاہم تیتو میاں نے مسلمانوں کو اشتعال سے باز رکھا۔ البتہ جماعت کا سلسلہ بدستور قائم رہا۔ (۱)

غرض تیتو میاں جہاں بھی گئے انھوں نے مسلمانوں کو دین پر آمادہ کیا۔ مگر ان سادہ لوح کاشتکاروں پر زمینداروں نے بہت ظلم ڈھایا۔ حتی کہ داڑھی ٹیکس بھی عائد کیا۔ حالات دگرگوں ہوتے گئے۔ کسانوں نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ لیکن ایک پیش نہ گئی۔ تیتو میاں نے اب کھلم کھلا جہاد کا اعلان کر دیا۔ اور زمینداروں سے کئی مقابلے ہوئے۔ (۲)

انگریزوں سے کامیاب لڑائیاں

تیتو میاں اور ان کے رفقاء کا جوش جہاد روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ بقول ڈاکٹر قیام الدین ۱۸۲۹ء میں سرحد پر سید احمد کی فتوحات نے تحریک کے شرکاء کو ایک نئی طاقت اور حوصلہ بخشا۔ اور ان کی دلیری میں نیا اضافہ ہوا۔ بے نتیجہ اور تکلیف دہ عدالتی کارروائیوں کے لامتناہی سلسلہ نے ان کے صبر کا پیمانہ لبریز کر دیا۔ اور اب وہ بلا واسطہ اور براہ راست کارروائی پر تل گئے۔ (۳)

---

(۱) سرگزشت مجاہدین صفحہ ۲۱۶۔ ۲۱۷۔ یہ واقعہ ہم نے اس لئے نقل کیا ہے تاکہ تیتو میاں کی دعوت کی نوعیت اور راستہ کی مشکلات کا اندازہ ہو جائے۔ قصہ یہاں پر ختم نہیں ہوتا بلکہ اس کے بعد حالات بہت خراب ہوئے اور جنگ تک نوبت پہنچی۔

(۲) عبداللہ ملک نے ان جنگوں کو تفصیل سے بیان کیا ہے دیکھئے ان کی کتاب صفحہ ۱۷۵-۱۸۰

(۳) ہندوستان میں وہابی تحریک صفحہ ۱۲۵۔

ہنٹر انہی حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے :

۱۸۳۰ء میں جب مجاہدین سرحد نے پشاور پر قبضہ کر لیا تو تیتو میاں اس قدر بے دھڑک ہو گیا تھا کہ اس نے اپنا نقاب اتار پھینکا اور ان معمولی معمولی سختیوں کی وجہ سے جو ہندو زمیندار اس کے مریدوں پر کیا کرتے تھے، یہ کسانوں کی پر جوش بغاوت کا سرغنہ بن بیٹھا۔ اس کے بعد کسانوں کی بہت سی بغاوتیں ہوئیں۔ جس کے نتیجہ پر باغیوں نے اپنے آپ کو ایک مورچہ بند کیمپ میں محفوظ کر لیا۔ انگریزی حکام کی نافرمانی کی اور کچھ قتل وغارت کے بعد ان کو پسپا کر دیا۔ کلکتہ سے شمال اور مشرق کی طرف کا علاقہ مع اس ضلع کے تمام کا تمام باغیوں کے رحم و کرم پر تھا۔ جن کی تعداد تین چار ہزار کے قریب تھی۔ (۱)

اوکنلے نے لکھا ہے کہ پنجاب کے ایک درویش مسکین شاہ نے تیتو میاں اور ان کے ساتھیوں کو جہاد پر آمادہ کیا تھا اور مسکین شاہ ہی آخری دم تک اس تحریک کی روح رواں بنا رہا۔ جہاد شروع کرنے سے پیشتر رسد اور روپیہ فراہم کیا گیا۔ چاول کی بہت بڑی مقدار نرکل بریا میں معزالدین بسواس کے پاس جمع کر دی گئی۔ (۲)

۱۸۳۱ء کی کسی تاریخ میں تیتو میاں کے نائب غلام معصوم شاہ عدالت عالیہ سے انصاف حاصل کرنے کے لئے کلکتہ گئے مگر وہاں ناکامی ہوئی۔ واپس آتے ہی اکتوبر کے پہلے ہفتے میں اگلے اقدام کے سلسلہ میں مشورہ کے لئے ایک اجتماع کا اعلان کیا گیا۔ ۲۳ر اکتوبر کو حملے کی تاریخ طے کی گئی۔ ۲۳ر اکتوبر کو تیتو میاں نے گردونواح کے مسلمانوں کو دعوت دے کر جمع کیا۔ انھوں نے نرکل بریا کے اردگرد بانس کا ایک حصار بنا لیا۔ کشن رائے زمیندار نے درخواستیں دیں کہ حکومت کو اس حرکت کے خلاف قدم اٹھانا چاہئے۔ درخواستوں کا نتیجہ نکلنے سے پہلے ہی پانچ سو مسلمانوں نے ۶ر نومبر کو پورنا پر حملہ کر دیا۔ اس حملہ میں عیسائیوں، ہندوؤں اور مسلمانوں ان سب کو ہدف بنایا گیا جو ان کے مخالف تھے۔ اور سب کو قرار واقعی سزا دی گئی۔ اس کامیابی سے ان کے حوصلے بہت بڑھ گئے اور انہوں نے ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کر دیا کہ انگریزوں کی حکومت ختم

---

(۱) ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۶۸

(۲) دیکھئے سرگزشت مجاہدین صفحہ ۲۱۹۔

ہوگئی ہے اور مسلمانوں نے جن سے انگریزوں نے حکومت چھینی تھی واپس لے لی ہے۔اور عبداللہ ملک (۱) کے بیان کے مطابق اس فتح کے بعد ایک قسم کا مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔اور اب تیتو میاں کے خلیفہ غلام معصوم شاہ کو سالاری کا منصب دے دیا گیا۔

ظاہر ہے کہ اس واقعہ سے ان کے مخالفین کس طرح بوکھلا گئے ہوں گے۔حکومت کو شکایت پر شکایت پہنچنے لگی۔بھڑ ریا (یا بگوریہ) میں نیل کے کارخانے کے ایک کار پرداز پائرن نے کلکتہ جا کر اپنے آقا کو اوائل نومبر میں ان فسادات کی اطلاع دی۔اور زور دیا کہ اگر جبری انسدادی کارروائی نہ کی جائے گی تو حکومت ایک سخت خطرے میں مبتلا ہو جائے گی۔اس کے مالک مسٹر سٹارم نے باراسٹیٹ اور ندیا کے مجسٹریٹوں کو اس کی اطلاع دی۔باراسٹیٹ کے مجسٹریٹ کی رپورٹ پر کلکتہ سے ۱۴/نومبر ۱۸۳۱ء کو ایک دستہ بھیجا گیا۔مسٹر الیگزینڈر میر لشکر تھا۔مجاہدین غلام معصوم شاہ کی کمان میں نکلے جن کی تعداد چھ سو تھی۔انہوں نے انگریزی دستہ کو شکست فاش دی۔کلکتہ کے محافظ دستے کا جمعدار، دس سپاہی اور تیرہ برقنداز مارے گئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔الیگزینڈر بمشکل جان بچا کر بھاگا۔اس شکست سے انگریزی فوج میں دہشت پھیل گئی۔اس اثناء میں ضلع ندیا میں دوسرے کارخانوں پر حملے کئے گئے اور پولس نے صورت حال کا مقابلہ کرنے سے معذوری ظاہر کی۔ایک انگریز زمیندار نے جو نیل کی کاشت کراتا تھا۔تین سو سپاہیوں کے ساتھ حملہ کیا لیکن اس نے بھی شکست کھائی۔۱۷/نومبر کو مجسٹریٹ نے ادھر ادھر سے کمک مہیا کی اور فرنگیوں کو ہاتھیوں پر سوار کر کے مجاہدین کے مقابلے کے لئے بھیجا۔وہ نرکل بریا پہنچے تو مجاہدین ایک ہزار کی تعداد میں تیتو میر کے ماتحت باقاعدہ صفوں میں تیار نظر آئے۔انگریزی دستہ کو مقابلہ کی ہمت نہیں ہوئی۔اس نے مراجعت کا فیصلہ کیا۔مگر پیٹھ پھیرتے ہی ان پر حملہ کیا گیا جس میں چند برقنداز مارے گئے۔ انگریزی دستہ اپنی کشتیوں کی طرف دوڑا مگر وہاں بھی ان کا تعاقب کیا گیا۔انگریز کشتیاں چھوڑ کر اپنے ہاتھیوں کی طرف بھاگے جو ایک میل دور کھڑے تھے۔اور تقریباً چھبیس میل دور مولناتھ کے کارخانہ کی طرف لوٹے۔ایک ہاتھی، کئی کشتیاں اور دوسرے

(۱) بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہد آزادی، صفحہ ۱۸۸۔

سازوسامان غنیمت میں مجاہدین کے ہاتھ آئے۔ اس کے بعد وہ ہگلی کے کارخانہ پر حملہ کرنے چلے۔ اس کے منیجر کو گرفتار کر کے تیتومیر کے سامنے لائے۔ انھوں نے کامل اطاعت اور غیر مشروط تسلیم ورضا کا مطالبہ کیا۔ وہ راضی ہو گیا اور آئندہ انہیں کو حاکم ہندوستان مان کر نیل کے بیج لگانے کو تیار ہو گیا۔ اس وقت تک متاثرہ اضلاع میں کمپنی کے حکام کامل طور پر شکست کھا چکے تھے۔ کچھ دنوں کے لئے ان اضلاع میں مجاہدین ہی کا اقتدار رہا۔ (۱)

تیتومیر نے اپنی حکومت کے قیام کے اعلان کے ساتھ عملی کاروائیوں کا بھی آغاز کر دیا۔ اور باقاعدہ ٹیکس وصول کرنا شروع کیا۔ انگریز کارخانہ داروں نے بھی ٹیکس ادا کیا۔ (۲)

معرکہ کارزار اور شہادت

بالآخر ۱۹ر نومبر ۱۸۳۱ء کو ایک باقاعدہ منظم تازہ دم فوج کلکتہ سے بھیجی گئی۔ جس میں دیسی پیدل فوج کی دس رجمنٹیں شامل تھیں۔ انکے علاوہ گھڑسواروں کا دستہ، توپخانہ اور کچھ محافظ سپاہ بھی تھی۔ اس فوج کو ہدایت کی گئی کہ باراسٹیٹ میں الیگزینڈر رستے جا ملیں۔ یہ سب مل کر نرکل بریا پہنچے۔ میجر اسکاٹ فوج کی کمان کر رہا تھا۔ یہ فوج بانس کے حصار کی طرف بڑھی اور ایک زبردست دلیرانہ مدافعت کے بعد اس پر قبضہ کر لیا۔ ولیم ہنٹر مجاہدین کی شجاعت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ باغیوں نے اپنے مورچے کی حفاظت دہی کو نفرت کی نظر سے دیکھتے ہوئے فوج کا مقابلہ کھلے میدان میں کیا۔ (۳)

پہلے دن کی جھڑپ میں ایک انگریز مارا گیا۔ دوسرے دن انگریزی فوج نے بھرپور حملہ کیا اور توپ داغے۔ اسکے سامنے مجاہدین جم نہ سکے۔ کاشتکار بھاگ کھڑے ہوئے۔ (۴) اوکنلے نے لکھا ہے کہ فوج کے ابتدائی حملے میں ساٹھ ستر شہید ہوئے۔ باقی لوگ بانس

(۱) مختلف کتابوں کو سامنے رکھ کر جنگوں کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہد آزادی صفحہ ۱۸۸ تا صفحہ ۱۹۱۔ ہندوستان میں وہابی تحریک صفحہ ۱۲۶ تا ۱۲۸۔ نیز مہر اور ہنٹر نے بھی مختصراً ان کا ذکر کیا ہے۔

(۲) بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہد آزادی صفحہ ۱۹۱۔

(۳) ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۷۰۔

(۴) بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہد آزادی صفحہ ۱۹۱

کی فصیل کے پیچھے چلے گئے اور مقابلہ کرتے رہے۔ آخر ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ (۱)

سید جعفر علی نقوی فرماتے ہیں کہ تیتو میاں نے فوج کو دیکھتے ہی ساتھیوں سے کہہ دیا کہ صبر و استقامت سے شہادت قبول کرنے کا درجہ بہت بلند ہے۔ ہتھیار پھینک دو۔ صفیں باندھ کر قبلہ رو ہو جاؤ۔ اور نماز پڑھو۔ اکثر مجاہدین نے ایسا ہی کیا۔ بعض ایک مکان میں جا بیٹھے۔ بعض درختوں پر چڑھ گئے۔ تیتو میاں نے سب سے پہلے شہادت پائی۔ ان کے ساتھی بھی یکے بعد دیگرے شہید ہوتے گئے۔ فوج نے اس مکان کو آگ لگا دی۔ جس میں مجاہدین نے پناہ لی تھی۔ کچھ اندر جل گئے۔ جو باہر نکلے وہ شہید ہوئے یا گرفتار کر لئے گئے۔ (۲)

تیتو میاں کے لڑکے کی ایک ٹانگ گولی لگنے کی وجہ سے ناکارہ ہو گئی۔ اس لڑائی میں تقریباً پچاس مجاہدین زخمی ہوئے اور ساڑھے تین سو گرفتار۔ تیتو میاں اور دیگر شہداء کی نعشوں کو نذر آتش کر دیا گیا۔ اور ان کے حامیوں کے مکانات لوٹ لئے گئے۔ ان ساڑھے تین سو گرفتار شدگان میں ۱۹۷ کے خلاف مقدمات دائر کئے گئے۔ اور ان میں سے ۴۶ کو مختلف سزائیں دی گئیں۔ ان میں تیتو میاں کے نائب غلام معصوم شاہ بھی تھے۔ ان کو سزائے موت کا حکم سنایا گیا۔ اور اس حکم کے ساتھ ہی تختہ دار پر لٹکایا گیا۔ گیارہ کو عمر قید بعبور دریائے شور کی سزا دی گئی۔ ۱۲۸ کو مختلف میعاد کی قید کا حکم ہوا۔ ۵۳ کو رہا کر دیا گیا۔ تیتو میاں کے ایک لڑکے کو دو سال قید کی سزا دی گئی۔ دوسرے لڑکے کو ٹانگ کھو دینے کی بناء پر رہا کر دیا گیا۔ (۳)

تیتو میر واقعی بڑی جرأت و بہادری کا انسان تھا۔ یہ انہی کا کارنامہ ہے کہ نہتے عوام، مفلوک الحال کسان اور کمزور بساط کے مسلمانوں نے جس دلیری و بہادری سے انگریزوں کے صدر مقام کلکتہ کے قریب دیہاتوں میں ظالم و جابر زمینداروں کو (جن کی پشت پر انگریز تھے) للکارا۔ اور پھر جس جرأت اور پامردی کے ساتھ انگریزی فوج سے

(۱) دیکھئے سرگزشت مجاہدین صفحہ ۲۲۰۔

(۲) ایضاً۔ مولانا سیّد جعفر علی نقوی صاحب نے تیتو میر کی دعوت اور واقعہ شہادت کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ دیکھئے منظورۃ السعداء (مخطوطہ) ص ۱۲۴۲-۱۲۴۷۔

(۳) بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہد آزادی صفحہ ۱۹۱-۱۹۲۔

دو دو ہاتھ کیے اس کی مثال بہت کم ملے گی۔ خود انگریزوں نے بھی ان کی بے باکانہ سرفروشی پر حیرت و تعجب کا اظہار کیا ہے۔ اوکنلے نے کچھ عرصہ کے بعد مجاہدین کی سرفروشی اور حکومت کی بے بسی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا: اب بھی چالیس سال کی مدت گزرنے کے بعد کوئی آدمی اس ہنگامے کی تاریخ پڑھ کر حکومت کی بے بسی پر تعجب کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ۱۸۲۲ء میں سید احمد نے ہندوستان کے غیر مسلم حکمرانوں کے خلاف بلا روک ٹوک جہاد کی تبلیغ کی تھی۔ آدمیوں اور روپیوں کی کثیر تعداد و مقدار بنگال سے اس (سید احمد) کو کھلم کھلا مہیا ہوتی رہی۔ خفیہ رکھنے کی بھی کوئی کوشش نہیں کی جاتی تھی۔ حکومت کو پنجاب میں اس کی (سید احمد کی) فتوحات کی پوری واقفیت ہوگی۔ پھر بھی اس کے پیرو اپنی طاقت پر اعتماد کر کے کلکتہ سے صرف تیس میل پر کھلم کھلا بغاوت کر بیٹھے تو یہ شورش ناقابل تشریح ظاہر کی گئی۔ اور باغیوں کو معصوم اور کسی منصوبہ بندی کے ناقابل بتایا گیا۔(۱)

یاد کرنا چاہیے کہ ۱۸۳۱ء وہی سنہ ہے جب سرحد میں سید احمد شہید نے شہادت پائی تھی۔ اس واقعہ کا تیتو میاں پر کتنا اثر پڑا ہوگا اور ان کی غیرت و حمیت اور جوش و خروش میں کتنا اضافہ ہوا ہوگا؟

---

(۱) دیکھیے ہندوستان میں وہابی تحریک صفحہ ۱۲۹۔

نوٹ: ڈاکٹر قیام الدین نے اپنی کتاب میں فرائضیوں اور تیتو میر کے واقعات کو بالکل خلط ملط کر دیا ہے حالاں کہ دونوں کی تفصیلات الگ الگ ہیں۔

باب دھم

حیدر آباد دکن میں علماء کی جدوجہد آزادی

پہلی فصل : دکن میں مولانا سیّد محمد علی رامپوری کی سیاسی سرگرمیاں

دوسری فصل : انگریزوں کے خلاف مبارز الدولہ کی سازش

پس منظر

سید احمد شہید کی تحریک کی وسعت

سید احمد شہید کوئی معمولی فکر کے ایک عام داعی نہیں تھے۔ وہ پورے برصغیر میں زبردست دینی وسیاسی انقلاب لا کر اس کی کایا پلٹ دینا چاہتے تھے۔ اس لئے جہاں وہ خود نہیں پہنچ سکے اپنے معتمد خلفاء کو بھیج کر یہ کمی پوری کی۔ اور پورے برعظیم میں دینی وسیاسی بیداری کی ایک لہر دوڑا دی۔ لوگ شرک وبدعت سے متنفر ہو کر شریعت وسنت کے پابند ہونے لگے۔ اور غیر ملکی حکمرانوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے جذبات فروغ پانے لگے۔ اور ان کے خلاف نفرت کی آگ بھڑ کنے لگی۔ ان خلفاء میں مولانا ولایت علی عظیم آبادی، مولانا کرامت علی جونپوری اور مولانا سید محمد علی رامپوری کے کارنامے سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ اول الذکر کو حیدر آباد دکن اور مولانا کرامت علی کو بنگال اور مولانا محمد علی کو مدراس بھیجا گیا تھا۔ مولانا ولایت علی اور مولانا کرامت علی کا حال مفصل گزر چکا ہے۔ اب یہاں ہم مولانا سید محمد علی کی سیاسی سرگرمیوں پر کچھ روشنی ڈالتے ہیں۔ جن کا تعلق ہمارے اس باب سے ہے۔

پہلی فصل

دکن میں مولانا سید محمد علی رامپوری کی سیاسی سرگرمیاں

مولانا سید محمد علی رامپوری کا شمار سید احمد شہیدؒ کے چند ممتاز ترین خلفاء میں ہوتا ہے۔ بڑے غضب کے داعی تھے۔ سید صاحب نے انہیں دعوت کے لئے پہلے حیدر آباد دکن بھیجا تھا۔ پھر جب مولانا ولایت علی عظیم آبادی کو وہاں بھیجا گیا تو مولانا محمد علی کو مدراس جانے کا حکم ہوا۔

مولانا محمد علی رامپوری کی مقناطیسی شخصیت اور پُر تاثیر دعوت کا حال ان کے خلیفہ

مولانا خان عالم مدراسی نے تنبیہ الضالین میں اور افسر الدولہ جان جہاں خان مدراسی نے اپنی کتاب الذکر الجلی فی کرامات السید محمد علی میں کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے۔(۱)

نیز سید صاحب پر لکھی ہوئی کتابوں میں بھی اس کے کچھ اشارے مل جاتے ہیں۔

مگر جہاں تک آپ کی سیاسی سرگرمیوں اور انگریز مخالف پالیسیوں کا تعلق ہے اس پر کسی نے خاص طور پر توجہ ہی نہیں دی۔ اگر سرکاری دستاویزیں نہ ہوتیں تو ہمیں ان کا سراغ بھی نہ لگتا۔

اس میں شک نہیں کہ حیدر آباد دکن کے اندر جذبۂ حریت کو بھڑکانے میں مولانا سید محمد علی رامپوری کا بڑا اہم رول ہے۔ انہوں نے ہی مولانا ولایت علی کے لئے زمین ہموار کی تھی۔ پھر وہ مدراس گئے تو قرب و جوار کے علاقوں کرنول، کڈپا، اودگیر اور نیلور وغیرہ میں آزادی کی آگ لگاتے ہوئے گئے تھے۔(۲) بعد میں ان علاقوں میں جو آزادی کی چنگاریاں سلگتی رہیں ان کا سہرا انہی کے سر بندھتا ہے۔ تاریخ میں اس کی صراحت ہے کہ کرنول اس زمانہ میں یعنی انیسویں صدی کے تیسرے اور چوتھے دہے میں وہابی تحریک کے زیر اثر شروع کی گئی بغاوتوں کا اہم مرکز تھا۔ اور ہمیں نہیں معلوم کہ مولانا محمد علی سے پہلے کوئی وہابی مبلغ یہاں پہنچا ہو۔ اس سے بآسانی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مولانا محمد علی نے یہاں کے بااثر لوگوں سے ملاقات کر کے ان کو بغاوت پر آمادہ کیا تھا۔ اور اس کا بھی قوی احتمال ہے کہ خود نواب کرنول غلام (؟) خان سے بھی اس سلسلہ میں ملاقات کی ہو اور یہ ان کے لئے کچھ مشکل بھی نہیں تھا۔ اس لئے کہ وہ حیدر آباد سے یہاں پہنچے تھے۔ اور حیدر آباد میں بہت سے امراء و رؤساء ان کی تعلیمات سے متاثر ہو کر حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے تھے۔ اور نواب کرنول کے حیدر آباد کے بعض امراء

---

(۱) اول الذکر کتاب کے قلمی نسخہ کا ذکر مہر نے کیا ہے نیز مولانا کرامت علی کے بعض رسائل میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔ اور دوسری کتاب چھپی ہوئی ہے، راقم الحروف کی نظر سے گذر چکی ہے۔ مولانا محمد علی کے کسی قدر حالات کے لئے ملاحظہ ہو الإعلام (نزہۃ الخواطر) ۷/۴۹۵۔ جماعت مجاہدین ۱۸۲ تا ۱۸۵۔ مولانا موصوف کا انتقال ۱۲۵۸ھ (۱۸۴۲ء) میں ہوا۔

(۲) مولانا محمد علی محرم ۱۲۴۵ھ مطابق جولائی ۱۸۲۹ء میں مدراس پہنچے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سے پہلے کم از کم تین چار سال حیدر آباد اور مذکورہ بالا علاقوں میں کام کرتے رہے تھے۔

سے قریبی روابط تھے۔ یہی وجہ ہے کہ نواب کرنول نے مبارز الدولہ کی بغاوت میں سرگرم حصہ لیا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی پاداش میں نہ صرف یہ کہ ان کی خاندانی نوابیت ختم کردی گئی بلکہ ان کو جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ اور اسی سال ۱۸۳۹ء میں کرنول ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضہ علاقے میں شامل کرلیا گیا۔ (۱)

ڈاکٹر قیام الدین نے اہم سرکاری دستاویزیں فراہم کی ہیں۔ (۲) جنھیں دیکھ کر مولانا سید محمد علی کی سیاسی سرگرمیوں کے متعلق کچھ انکشافات ہوتے ہیں۔ ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہابیوں کے ہندوستانی فوج میں عمل دخل کا پہلا عملی تجربہ اسی زمانہ میں مدراس اور دکن کے علاقہ میں کیا گیا اور کامیاب رہا۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس میں مولانا سید محمد علی کا دماغ کام کررہا تھا۔

۱۸۳۹ء میں حیدرآباد کی سازش کے دوران یہ انکشاف ہوا تھا کہ مدراس میں اور آگے دکن تک مختلف فوجی چھاؤنیوں میں وہابی کارندوں کا ایک وسیع جال بچھا ہوا تھا۔ ویلور کے کمان افسر نے ان کی کارروائیوں کے سلسلہ میں حکومت کو جو رپورٹ بھیجی تھی۔ اس کی ایک اطلاع کے مطابق عدالت ضلع کے مفتی ولی محمد اور عدالت کلکٹر کے صدر ہوب اللہ؟ (۳) ایک فارسی اخبار ستارہ جس کو کلکتہ کا ایک شخص رجب علی طبع کرتا تھا، وصول کیا کرتے تھے۔ آخر الذکر شخص محمد علی رامپوری کا خلیفہ ہے جو اب سے پیشتر کرناٹک میں اپنی باغیانہ جدوجہد کے سبب سے مدراس سے نکال دیا گیا تھا۔

اسی کی رپورٹ کے مطابق مولوی مبین، قلعہ کی قریبی مسجد کا بڑا مولوی (بظاہر پیش امام مراد ہے) اور مولوی محمد علی رامپوری کے دوسرے معتقدین مغرب کی نماز کے بعد مجمع میں وعظ کہتے اور جہاد کی تبلیغ کرتے ہیں۔ شہر کی دوسری مساجد، مسجد قلعہ، سنی اسٹریٹ مسجد اور پیران صاحب کی مسجد میں اسی قسم کی تقریریں ہوتی ہیں۔ آخر الذکر مسجد کا پیش امام فوج سے نکالا ہوا سپاہی ہے۔

افسر موصوف نے ایک چھٹی مورخہ ۱۰؍جون ۱۸۳۹ء میں حکومت مدراس کو مولانا

---

(۱) کرنول کی بغاوت کے لیے دیکھیے ریاست حیدرآباد میں جدوجہد آزادی صفحہ ۶۷۔۶۸

(۲) ملاحظہ ہو ہندوستان میں وہابی تحریک۔ صفحہ ۱۹۸۔۱۹۹

(۳) ہوب اللہ اسی طرح لکھ کر اس پر سوالیہ نشان؟ لگادیا ہے۔ پتہ نہیں صحیح نام کیا تھا۔

محمد علی کے حلیفوں اور ایجنٹوں کی فہرست بھیجی جو دکن میں مختلف فوجی چھاؤنیوں میں کام کرتے تھے۔ جنوبی ہند میں مولانا سید محمد علی اور ان کے اصحاب و مریدین نے ایسی سرگرمی سے تحریک چلائی تھی اور انگریزی حکومت کے خلاف نفرت کا وہ ماحول پیدا کیا تھا کہ ہر جگہ بغاوت کے آثار نظر آرہے تھے۔ عورتوں تک میں یہ جذبہ بڑی قوت سے کارفرما تھا یہاں تک کہ ڈبلیو ہنٹر لکھتا ہے :

جنوبی ہند میں انھوں نے جوش وخروش کی وہ آندھی چلائی کہ عورتوں نے اپنے ہیرے جواہرات تک بیت المال میں دے دیئے۔(۱)

دوسری فصل

انگریزوں کے خلاف مبارز الدولہ کی سازش

قبل اس کے کہ ہم مبارز الدولہ (جو نظام شاہی خاندان کے اہم رکن تھے) کی سازش کا ذکر کریں، اس کا سراغ لگانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ چنگاریاں کہاں سے پیدا ہوئیں اور یہ جذبات کہاں سے ابھرے؟ اس کے لئے ہمیں دیکھنا پڑے گا کہ سید احمد شہیدؒ کا اس شاہی خاندان سے کیسا رابطہ تھا اور وہ اس کو کتنی اہمیت دیتے تھے۔

نظام حیدر آباد سکندر جاہ بہادر سے سید صاحب کی مراسلت

کرنل میڈوز ٹیلر نے اپنی کتاب The History of My Life میں سید احمد شہید کے ایک خط (۲) کا ذکر کیا ہے جو سید صاحب نے آصف جاہ سوم میر اکبر علی خان سکندر جاہ بہادر (۱۸۰۳ء-۱۸۲۹ء) کو لکھا تھا۔ جس میں انھوں نے نواب صاحب کی خاندانی روایات کو سراہتے اور ان کی مذہبی عقیدت مندی کی تعریف کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا تھا کہ اس فانی دنیا میں بادشاہوں اور حکمرانوں کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ

(۱) ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۷۵۔

(۲) اس مراسلت کا ذکر اس کے علاوہ کہیں نظر سے نہیں گذرا۔ نہ ہمارے پیش نظر کسی مجموعہ مکاتیب میں یہ خط موجود ہے۔ اسی وجہ سے جہاں ہم نے سید صاحبؒ کے انگریزوں سے جہاد کا ان کے مکتوبات کی روشنی میں جائزہ لیا ہے وہاں اس خط کا حوالہ نہیں دیا حالاں کہ مضمون کے لحاظ سے یہ خط بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

اپنے مذہب اور عقائد کی حفاظت کریں اور ان غیر ملکی کافروں اور غاصبوں کے خلاف اعلان جہاد کریں جو ہمیں غلام بنائے ہوئے ہیں۔ یہی ہمارے اسلاف کی روایات ہیں۔ آخر میں سکندر جاہ سے اپیل کی گئی کہ وہ بھی اس کار خیر میں ان کا ساتھ دیں۔ اگر وہ بعض مجبوریوں کی وجہ سے حصہ نہیں لے سکتے تو اپنی ریاست کے دانشوروں، نوابوں اور فوجیوں کو اس جہاد میں شریک ہونے کی ترغیب دیں۔ اور اس تحریک کی ممکنہ مدد کریں۔(۱)

حیدر آباد میں وہابی تحریک کی سرگرمیاں

سید صاحب کی براہ راست آصف جاہ سے خط وکتابت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو لیکن اس میں کوئی شک نہیں کو مولانا ولایت علی کی کوششوں کی وجہ سے حیدر آباد وہابی تحریک کا گڑھ بن گیا تھا(۲)۔ یہاں تحریک کی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے جواد رضوی صاحب رقمطراز ہیں:

وہابی تحریک کے سب سے اہم مراکز مساجد تھے۔ جہاں مولوی وعظ کے دوران عوام کو اس تحریک کے اغراض و مقاصد سے واقف کراتے اور انہیں یہ سمجھایا جاتا کہ عالم دین شاہ عبدالعزیز کے فتوی کے مطابق ہندوستان انگریزوں کی حکمرانی کے بعد دارالاسلام باقی نہیں رہا بلکہ دارالحرب بن گیا ہے۔ اس لئے ہر مسلمان کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ یا تو انگریزوں کے خلاف جہاد کریں یا کسی آزاد مسلم ملک کو ہجرت کریں۔ اس طرح نماز کے بعد مسلمانوں سے اپیل کی جاتی کہ وہ انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کریں۔ جمعہ کی نماز کے لئے فوجی بھی بڑی تعداد میں مسجدوں میں جمع ہوتے۔ ان سے بھی فوج میں بغاوت برپا کرنے کی تلقین کی جاتی۔ اس تحریک کے پرچار کا ایک خفیہ طریقہ یہ تھا کہ فقیروں کے بھیس میں اپنے کارندوں کو بھیجا جاتا۔ وہ مسجدوں، فوجی چھاؤنیوں کے آس پاس اور ہر اس مقام پر جہاں عوام جمع ہوتے ہیں پہنچ جاتے اور بہت ہی ہوشیاری اور چالاکی سے اس تحریک کا پیغام عوام تک پہنچاتے۔ اور انہیں رفتہ رفتہ بغاوت پر آمادہ کرتے۔(۳)

(۱) نیا دور، اگست ۱۹۸۵، یوم آزادی نمبر ص ۱ انیز ریاست حیدر آباد میں جدوجہد آزادی، صفحہ ۵۸-۵۹

(۲) ۱۲۵۵ھ (۱۸۳۹ء) تک وہابیت تمام دکن میں پھیل گئی تھی (تاریخ گلزار آصفیہ صفحہ ۱۴۷)

(۳) ریاست حیدر آباد میں جدوجہد آزادی، صفحہ ۵۹۔

مبارز الدولہ پر تحریک کا اثر اور اس میں شمولیت

نواب مبارز الدولہ، آصف جاہ سوم سکندر جاہ بہادر کے فرزند تھے۔ ۱۸۰۰ء میں حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت نہایت معقول طریقے پر ہوئی۔ وہ فارسی اور عربی میں اعلیٰ درجہ کی مہارت رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ مذہبی تعلیم بھی مستند طور پر ہوئی تھی (۱)۔ وہ بڑے بہادر، فنون سپہ گری کے ماہر اور آزاد منش تھے۔ انگریز دشمنی اور حریت پسندی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ کمپنی کے بڑھتے ہوئے تسلط اور ریذیڈنٹ کی امور سلطنت میں مداخلت سے گھٹن محسوس کرتے تھے۔ انگریزوں کو ان سے بہت خطرہ محسوس ہوتا تھا، ۱۸۳۰ء تک انہیں دو مرتبہ نظر بند کیا جا چکا تھا (۲) پھر بھی ان کے حوصلے پست نہیں ہوئے۔ مولانا ولایت علی کی حیدر آباد تشریف آوری ان کے لئے ایک نعمت ثابت ہوئی۔ ان کو ایک رہنما مل گیا۔ جس کے زیر ہدایت انھوں نے اپنی سرگرمیاں شروع کیں۔ مولانا ولایت علی نے حیدر آباد پہنچ کر پوری سرگرمی اور تندہی کے ساتھ اپنا دعوتی و تبلیغی کام شروع کیا۔ اور بہت جلد ایک حلقہ بنا لیا۔ کچھ عرصہ کے بعد مبلغ اور واعظ کی حیثیت سے ان کی شہرت مبارز الدولہ تک پہنچی تو انہوں نے اپنے دو علماء مولوی زین العابدین اور مولوی محمد عباس کو مولانا ولایت علی سے ملنے کے لئے متعین کیا۔ ان دونوں علماء نے مولانا ولایت علی کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اور بہت جلد خلافت سے بھی سرفراز ہوئے۔ مبارز الدولہ نے جب ان کی زبانی مولانا ولایت علی کا حال سنا تو انھوں نے بھی بیعت کر لی۔ اور تحریک کے ایک سرگرم کارکن بن گئے۔ (۳) اور اس کے بعد تو ان کی ڈیوڑھی وہابی تحریک کا مرکز بن گئی۔ اور بقول مصنف تاریخ حیدر آباد اس وقت سے مبارز الدولہ اور ان کے رفقاء نے اسلامی احکام کی پابندی بالا تمام شروع کر دی۔ (۴)

---

(۱) نیا دور، اگست، ۱۹۸۵ء صفحہ ۱۱

(۲) پہلی دفعہ ۱۸۱۵ء میں تفصیل کے لئے دیکھئے تاریخ گلزار آصفیہ صفحہ ۱۰۷-۱۰۹ دوسری دفعہ ۱۸۲۹ء میں دیکھئے ایضاً صفحہ ۱۲۹

(۳) ہندوستان میں وہابی تحریک صفحہ ۱۶۵۔

(۴) دیکھئے علماء ہند کا شاندار ماضی جلد سوم صفحہ ۲۱۔ مبارز الدولہ میں بیعت کے بعد کیا تبدیلیاں آئیں اس کے لئے ملاحظہ ہو سرگزشت مجاہدین صفحہ ۱۸۱۔

مبارز الدولہ کے زیر قیادت تحریک کی وسعت

مبارز الدولہ کے زیر قیادت وہابی تحریک صرف حیدر آباد کے حدود اربعہ تک محدود نہ تھی بلکہ اس کا پھیلاؤ جنوب میں مدراس اور کرنول تک۔ تو ان کے نمائندے اور ایلچی لاہور، سندھ، گوالیار، بمبئی اور شولا پور وغیرہ میں سرگرم عمل تھے۔ اس کے علاوہ ان کا ربط اور مراسلت ٹونک، رام پور، ادوگیر اور کرنول کے کے نوابوں اور جودھپور، ستارا، پٹیالہ، میسور کے راجاؤں اور رنجیت سنگھ سے بھی تھی۔ نواب غلام رسول خان والی کرنول نہ صرف اس تحریک کے اہم رہنما تھے بلکہ انھوں نے اپنی ریاست میں توپ سازی کا ایک کارخانہ بھی قائم کیا تھا تا کہ انگریزی فوج کا کامیابی سے مقابلہ کیا جا سکے (۱)۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شاہ ایران اور دوست محمد خان (سندھ) کو بھی بغاوت کی تائید کرنے کے لئے آمادہ کر لیا گیا تھا۔ مذکورہ بالا نوابوں اور راجاؤں سے ربط قائم رکھنے اور خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھنے کا کام مولوی لعل خان اور منشی فقیر صاحب کے ذمہ تھا۔ جب اس تحریک کا کوئی نمائندہ خفیہ طور پر دوسرے مقامات پر جاتا تو اس کی شناخت کے لئے لوہے کی انگوٹھی دی جاتی، جس پر چند حروف کندہ ہوتے۔ (۲)

مرکز سندھ سے رابطہ

سید صاحب کی تحریک کا اصل مرکز سندھ میں تھا۔ مولانا سید نصیر الدین دہلوی جس کا نظام سنبھالے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجاہدین میں نئی روح ڈالنے کے لئے بڑی سرگری سے تیاریاں شروع کی تھیں۔ اور ہر طرف سے لوگوں کو جہاد پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ مبارز الدولہ جیسے غیور نواب سے کیسے چشم پوشی کر سکتے تھے؟ چنانچہ اسی ضمن میں ایک اعلام نامہ نواب مبارز الدولہ کے پاس بھی بھیجا گیا۔

مولانا نصیر الدین صاحب کا اعلام نامہ نواب مبارز الدولہ کے ملاحظے میں پیش ہوا تو نواب موصوف نے مولوی محمد آصف، مولوی سید عباس، مولوی سید قاسم، حافظ سید محمود اور مولوی پیر محمد کو بلا کر حکم دیا کہ آپ حضرات پچاس مجاہدین کو ساتھ لے کر سندھ چلے جائیں اور تمام حالات خود ملاحظہ کریں۔ یہ دیکھیں کہ حاکمان سندھ کس حد تک حمایت کے لئے

(۱) دیکھئے تاریخ گلزار آصفیہ صفحہ ۱۴۹

(۲) ریاست حیدر آباد میں جدو جہد آزادی صفحہ ۵۹۔۶۰۔

تیار ہیں۔ مجاہدین کی قیام گاہ کیسی ہے اور وہاں اخراجات و مصارف کا کیا حال ہے؟ یہ سب کچھ دریافت کر کے قابل اعتماد وکیل ہمارے پاس بھیج کر اطلاع دیں۔ ہم حتی الامکان مجاہدین کی تائید کریں گے۔ بہت سا مال اسباب اور بہت سے آدمی بھیجیں گے۔

یہ تمام حضرات مولانا سید محمد علی رامپوری اور مولانا ولایت علی عظیم آبادی کے معتقد تھے۔ ان سے استصواب کی خاطر کلکتہ (۱) خطوط بھیجے۔ جب وہاں سے جواب باصواب آ گیا تو ۱۴ رشعبان ۱۲۵۳ھ (۱۳ رنومبر ۱۸۳۷ء) کو حیدر آباد سے روانہ ہوئے۔ شولاپور اور پونہ ہوتے ہوئے بمبئی سے بذریعہ جہاز کراچی پہنچے۔ وہاں سے ایک ہفتے میں حیدر آباد (سندھ) چلے گئے۔ وہاں سے اواخر ذی قعدہ میں یہ لوگ کشتی پر سوار ہو کر مولوی نصیر الدین کے پاس گئے جو اس وقت شکار پور میں تھے۔ جو معلومات حاصل کرنے کی غرض سے وہ آئے تھے، وہ ایک مفصل مکتوب کی صورت میں مولوی نصیر الدین نے دو قاصدوں کے ذریعے سے حیدر آباد بھیج دیں۔ (۲)

مبارز الدولہ کا منصوبہ اور بغاوت کی تیاریاں

انگریزی افواج اس وقت جنگ افغانستان میں مشغول تھیں۔ اس سے فائدہ اٹھا کر مبارز الدولہ اور ان کے رفقاء نے عملی کارروائی کا منصوبہ بنایا۔ پہلا قدم یوں اٹھایا گیا کہ حیدر آباد اور دکن کے دوسرے مقامات پر جو دیسی پلٹنیں مقیم تھیں ان کو بلا لینے کوشش کی گئی۔ اس سازش میں ہندوستان کی مختلف ریاستوں کے نوابوں اور راجاؤں کی معقول تعداد شریک تھی۔

---

(۱) اسی طرح مولانا غلام رسول مہر نے ذکر کیا ہے۔ جب کہ مولانا محمد علی کے کلکتہ میں قیام یا تبلیغ کی کہیں صراحت نہیں ملتی۔ ممکن ہے مدراس جاتے ہوئے کچھ دنوں کے لئے قیام کیا ہو۔ اس کے برخلاف آباد شاہ پوری کا بیان ہے کہ ان حضرات نے مولانا بدیع الزماں بردوانی (کلکتہ) سے ایک خط کے ذریعے مولانا سید نصیر الدین کے متعلق دریافت کیا اور اعلام نامے کے سلسلہ میں رہنمائی چاہی (سید بادشاہ کا قافلہ صفحہ ۱۳۵-۱۳۶)

یہ روایت زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ وہ مولانا ولایت علی کے خلیفہ کی حیثیت سے کلکتہ میں مقیم تھے اور وہاں تحریک کی رہنمائی کر رہے تھے، انہوں نے تحریک کو بہت فائدہ پہنچایا۔ تحریک کے لٹریچر کو عام کرنے اور دوسری دینی کتابوں کی اشاعت کے لئے انہوں نے کلکتہ میں دس ہزار روپئے میں ایک ٹائپ پریس خرید اتھا۔ (دیکھئے تذکرہ صادقہ صفحہ ۱۵۴)

(۲) سرگزشت مجاہدین صفحہ ۱۸۲۔۱۸۳۔

یہی نہیں بلکہ حیدر آباد کے ریزیڈنٹ جے ایس فریزر (۱۸۳۸ء-۱۸۵۲ء) نے مبارز الدولہ اور ان کے رفقاء کار کی کارروائیوں پر رپورٹ کرتے ہوئے مبارز الدولہ کے ایک برطرف کردہ ملازم کا جو بیان نقل کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود مبارز الدولہ اور ان کے رفقاء بہت سخت فوجی تربیت حاصل کر رہے تھے۔ نیز اس میں مبارز الدولہ کے اس پیغام کا بھی ذکر ہے کہ نکل کھڑے ہوں۔ وہابی ساتھیوں کو جمع کریں اور انگریزوں کو قتل کر کے ملک اور حکومت پر خود قبضہ کر لیں۔

ان کے پیرو، فقیروں کے بھیس میں افسروں اور سپاہیوں تک پہنچ جاتے اور سپاہیوں کو وہابیت میں شامل ہونے کے لئے آمادہ کرتے۔ ساتھ ہی ساتھ ان ایجنٹوں سے خبروں کا ایک لامتناہی سلسلہ مبارز الدولہ کے لئے فراہم ہو گیا۔ چنانچہ انھوں نے رپورٹ کی کہ رجمنٹ کے تمام سپاہی متحد الخیال ہیں اور سب مبارز کے خروج کے منتظر ہیں، تا کہ ان سے جا ملیں۔

مبارز الدولہ کو اپنے منصوبہ کی کامیابی کو پورا یقین تھا۔ یہاں تک کہ اپنے اقتدار کی تیاری میں دو مہریں بنوا رکھی تھیں۔ جن میں ایک پر ''محافظ دین متین حامی دین و مسلمین'' اور دوسری پر ''مبارز نائب سید احمد شہیدؒ'' کندہ کروائے تھے۔ (۱)

منصوبہ کا انکشاف اور مبارز الدولہ کو حبس دوام کی سزا

انگریزی تختہ الٹنے کے لئے مبارز الدولہ کا ساتھ دینے کی خاطر جگہ جگہ سے لوگ آ آ کر جمع ہونے لگے۔ شمالی ہند، کابل اور ایران سے صوبہ مدراس میں آنے والوں کے غیر معمولی ہجوم سے شک پیدا ہوا اور اس سے سازش کا انکشاف ہوا۔ پھر ایک سکھ نے جو شک پر گرفتار ہوا تھا، سازش کے متعلق اطلاع دی۔ سب سے پہلے نیلور کے مجسٹریٹ اسٹون ہاؤس نے حکومت مدراس کو رپورٹ دی۔ حکومت مدراس نے اسے حکومت ہند کے سکریٹری کے پاس بھیجتے ہوئے صورت حال کی یوں تلخیص کی کہ :

(۱) ملاحظہ ہو ہندوستان میں وہابی تحریک صفحہ ۱۶۶-۱۶۷۔ اور سید جواد علی رضوی کے بیان کے مطابق والی ٹونک کے مصاحب نے مبارز الدولہ کے لئے امیر المؤمنین حامی دین مبین عبدالعزیز مبارز الدولہ'' کا لقب نقش نگین تجویز کیا اور اس لقب کی مہر بھی تیار کر لی گئی تھی جو اہم کاغذات پر ثبت کی جارہی تھی۔ (ریاست حیدر آباد میں جدو جہد آزادی صفحہ ۶۰)

''ہندوستان کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کی ایک معتد بہ تعداد نے وہابیت قبول کرلی ہے۔ ان میں ایسے اشخاص بھی ہیں جو اپنے عہدہ اور مرتبہ سے اپنے ہم مذہبوں پر کافی اثر کا استعمال کرتے ہیں۔ کچھ عرصہ سے وہ سرگرمی سے لوگوں کو اپنا ہم عقیدہ بنانے اور کفار کے خلاف جنگ چھیڑنے کے لئے آدمی اور روپئے فراہم کرنے میں مصروف رہے ہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں ہوسکتا کہ انکے مقصد کی غایت ہندوستان میں برطانوی طاقت کا اختتام ہے۔ اور اس غرض سے دیسی فوج میں سپاہیوں کو اپنا ہم عقیدہ بنانے کی جدوجہد کررہے ہیں۔'' (۱)

نیز اس دوران مبارز الدولہ کی نواب صاحب کرنول اور دوسرے امراء سے اس سلسلہ میں جو خط و کتابت ہورہی تھی، وہ حیدرآباد کے ریزیڈنٹ جے۔ ایس فریزر کے ہاتھ لگ گئی۔ اور اس نے فوراً نظام کو اس کی اطلاع دی۔ (۲)

اس وقت نظام حیدرآباد مبارز الدولہ کے بھائی میر فرخندہ علی خان ناصر الدولہ آصف جاہ چہارم (۱۸۲۹ء-۱۸۵۷ء) تھے۔ وہ اب تک اپنے بھائی کی کارروائیوں کو صرف مذہبی روشنی میں دیکھ رہے تھے۔ اب ان کو یقین دلایا گیا کہ ان کا بھائی ان کے خلاف بھی ارادہ رکھتا ہے اور نتیجۃً ان کی حکومت کا خاتمہ ہے۔ چنانچہ مبارز الدولہ کو گرفتار کرکے قلعہ گولکنڈہ کے موتی محل میں نظر بند کردیا گیا۔ اور ان کے دس وہابی ساتھیوں مولانا سلیم، عبدالہادی، (لعل خان) سید عباس، قاضی محمد آصف، الٰہی بخش (افضل علی خان)، عبدالرزاق، پیر محمد مولانا، محمد فیض اللہ، منشی فخرالدین (عبدالرحمٰن) اور سید قاسم کو گرفتار کرکے حوالات میں رکھا گیا۔ یہ ۱۳/ربیع الاول ۱۲۵۵ھ مطابق ۲۸/مئی ۱۸۳۹ء کا واقعہ ہے (۳)۔ ان پر مقدمہ چلانے کے لئے ۲۰/جون ۱۸۳۹ء کو ایک کمیشن تشکیل دیا گیا۔ اس کمیشن نے مارچ ۱۸۴۰ء تک اپنی کارروائی مکمل کی اور مبارز الدولہ پر یہ الزامات لگائے گئے کہ :

---

(۱) ہندوستان میں وہابی تحریک صفحہ ۱۶۷۔

(۲) ریاست حیدرآباد میں جدوجہد آزادی صفحہ ۶۰۔

(۳) تاریخ گلزار آصفیہ (صفحہ ۱۴۹) میں ہے کہ پوری ریاست میں وہابیوں کو گرفتار کیا گیا اور ایک مدت تک انگریز وہابیوں کی تلاش میں رہے۔

۱۔ برطانوی حکومت کا خاتمہ کرنے کے لئے مبارز الدولہ نے کرنول کے نواب سے مل کر سازش کی اور اس مقصد کے حصول کے لئے ٹونک اور رامپور کے نواب اور دوسرے امراء سے خفیہ خط و کتابت کی۔

۲۔ باغی یہ بھی چاہتے تھے کہ آصف جاہ چہارم کو تخت سے اتار کر مبارز الدولہ کو تخت نشین کر دیا جائے اور انہیں سید احمد شہیدؒ کا جانشین بنایا جائے۔

۳۔ مبارز الدولہ اور ان کے ساتھیوں نے ان انگریزی فوج کے مسلمان سپاہیوں میں بغاوت کے جذبات پیدا کئے جو مدراس اور سکندر آباد کی چھاؤنیوں میں رہتے تھے۔

مبارز الدولہ کو حبس دوام کی سزا دی گئی وہ پندرہ سال تک قلعہ گولکنڈہ میں رہے اور وہیں ان کا ۲۲ر جون ۱۸۵۴ء میں انتقال ہوا اور انہیں برہنہ شاہ صاحب کی درگاہ میں دفن کیا گیا۔(۱)

مبارز الدولہ کے انتقال پر اس وقت کا ریزیڈنٹ جی۔ اے بشی ۲۶ر جون ۱۸۵۴ء کو بڑی مسرت کے ساتھ معتمد امور خارجہ حکومت ہند کو اطلاع دیتے ہوئے لکھتا ہے:

> یہ شخص سابق نظام سکندر جاہ کا تیسرا ناجائز بیٹا اور موجودہ نظام ناصر الدولہ کا بھائی تھا۔ اس کو سرکاری قیدی کے طور پر ۱۸۴۰ء میں قلعہ گول کنڈہ میں نظر بند رکھا گیا تھا کیونکہ وہاں وہابیوں کی مدد سے برطانوی حکومت اور سرکار نظام کا تختہ الٹنے کے منصوبے پر عمل درآمد کر رہا تھا۔(۲)

قابل غور بات یہ ہے کہ خط میں مبارز الدولہ کو ناجائز بیٹا لکھا ہے جس سے انگریز ریزیڈنٹ کی کمینگی اور بغض و عداوت کا پتہ چلتا ہے جو اس کو مبارز الدولہ سے تھی۔ ریزیڈنٹ کا یہ خاصا تھا کہ جب کسی شخص کو نظروں سے گرانا مقصود ہوتا تھا۔ تو اس کے خلاف مذکورہ گالی باضابطہ طور پر سرکاری کاغذات میں درج ہونے لگتی تھی۔

---

(۱) ریاست حیدر آباد میں جدو جہد آزادی صفحہ ۶۰-۶۱۔ کتاب میں گرفتار شدگان کی فہرست میں قاضی محمد آصف کے بجائے غلطی سے قاضی محمد عارف چھپا ہے۔

(۲) نیا دور اگست ۱۹۸۵ء صفحہ ۱۴۔

مبارز الدولہ کے شریک کار چند سر کردہ علماء (۱)

یوں تو مبارز الدولہ کے ساتھ علماء کی بہت بڑی تعداد تھی جن میں سے اکثر مولانا ولایت علی اور مولانا محمد علی رامپوری سے بیعت وارادت کا تعلق رکھتے تھے۔اور انہی کے رنگ میں رنگے ہوئے، ان کے پیغام کے حامل اور ان کے منصوبوں کو تکمیل تک پہنچانے والے تھے۔یہاں چند سر کردہ علماء کا ذکر کیا جاتا ہے جو تحریک کے بہت بڑے داعی اور منصوبوں کا اصل دماغ تھے۔

مولوی محمد سلیم

وہ ۱۸۳۸ء میں تبلیغ کے لئے حیدر آباد آئے تھے مبارز الدولہ کے بہت ہی قابل اعتماد مشیر اور خاص ساتھی تھے۔وہ بہت ہی ذکی ہوشیار اور بڑے عالم شخص تھے۔وہابی تحریک کو وسعت دینے اور پھیلانے میں انہوں نے اہم رول ادا کیا۔مبارز الدولہ پر ان کا بے حد اثر تھا۔ بلکہ وہ ان کے مزاج میں دخیل تھے (۲) وہ ہر روز کوٹلہ جاہ سے متصل مسجد میں ظہر بعد وعظ کہتے ان کے وعظ میں بلا کی تاثیر تھی۔وہ تحریک سے متعلق لٹریچر تقسیم کرتے اور جابجا خطوط روانہ کرتے کہ فلاں تاریخ کو تمام وہابی جمع ہو کر اپنا کام کریں اور شمشیر کی ضرورت پڑے تو دریغ نہ کریں۔ان کا حلقہ پیشاور اور لاہور تک وسیع تھا۔وہاں ان کے خلفاء موجود تھے۔ ہرجگہ پیغام بھیجا کہ فلاں دن سب اکٹھے حملہ کریں۔(۳)

برٹش فوج کے سپاہیوں کو انگریز سرکار کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرنے میں ان کا بڑا حصہ تھا۔انہیں یہ ذمہ داری بھی سونپی گئی تھی کہ حیدر آباد کے باہر رہنے والے وہابی تحریک کے رہنماؤں سے رابطہ رکھیں،اور ان سے خط وکتابت کا سلسلہ جاری رکھیں۔ان کی باغیانہ سرگرمیوں کی بناء پر انہیں کئی مرتبہ گرفتار کیا گیا۔اور بالآخر انھیں اٹھارہ سال قید کی سزا دی گئی اور سزا کی مدت ختم ہونے کے بعد انہیں شہر بدر کر دیا گیا۔

(۱) اس عنوان کے تحت ذکر کئے گئے اکثر علماء کے حالات ریاست حیدر آباد میں جدوجہد آزادی صفحہ ۶۲ تا صفحہ ۶۵ سے لئے گئے ہیں۔دوسری کتابوں کا حوالہ دیا گیا ہے۔

(۲) دیکھئے تاریخ گلزار آصفیہ صفحہ ۱۴۷-۱۴۸

(۳) تاریخ گلزار آصفیہ صفحہ ۱۴۸

مولوی قاضی محمد آصف

یہ وہابی تحریک کے بہت سرگرم داعی اور رہنما تھے۔ وہ پہلے اندور کے قاضی تھے۔ جہاں انہوں نے وہابی تحریک کا زبردست پرچار کیا۔ جس کی وجہ سے وہاں کافی ہلچل پیدا ہوگئی۔ اس بناء پر انہیں قاضی کے عہدہ سے علاحدہ کردیا گیا۔ اس کے بعد وہ حیدرآباد آئے اور مبارز الدولہ کے یہاں ملازمت اختیار کی۔ انہیں مبارز الدولہ نے اپنا قاصد بنا کر سندھ بھیجا۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد وہ سکندرآباد کی چھاؤنی میں رہنے لگے۔ ان کی بااثر شخصیت کی وجہ سے مبارز الدولہ کے دربار میں وہابی تحریک کا بڑا گہرا اثر تھا۔ ان کی کوششوں سے ایک لاکھ کے قریب مسلمان تحریک سے وابستہ ہوگئے تھے۔ اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، ان میں امیر کبیر نواب شمس الامراء بھی شامل تھے۔ (۱) چوں کہ بہت عمر رسیدہ تھے اس لئے رعایتاً بارہ سال قید کی سزا دی گئی۔

مولوی لعل محمد عرف عبدالہادی

مبارز الدولہ کے بہت قریبی ساتھیوں میں تھے۔ وہ ان کی طرف سے سندھ کے سفیر تھے، جہاں سے وہ مبارز الدولہ کے لئے خطوط لایا اور لے جایا کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں میسور کے راجہ اور چنا پٹنم کے نواب سے بھی ملاقات ہوا کرتی تھی۔ وہ ان مقامات پر اپنی تحریک کا پرچار کرتے تھے وہ پہلے احتیاط کے ساتھ فوج کے قریب رہا کرتے تھے۔ جب فوج کو اس کا پتہ چلا تو وہ وہاں سے منتقل ہوگئے۔ اور مبارز الدولہ کی ڈیوڑھی میں رہنے لگے۔ ان کی حیثیت بہت اونچی تھی۔ یہاں تک کہ ان کے خطوط مسجدوں میں پڑھ کر سنائے جاتے تھے۔ انہیں چودہ سال کی سزا دی گئی۔

مولوی سید محمد عباس

مولوی محمد آصف کے بھانجے تھے۔ اور مبارز الدولہ کے استاذ زادے تھے۔ (۲) باپ کے بعد یہ بھی بحیثیت استاد مبارز الدولہ کے یہاں تھے۔ وہ مبارز الدولہ

---

(۱) سرگزشت مجاہدین صفحہ ۱۷۹۔
(۲) ایضاً صفحہ ۱۷۹۔

کے با اعتماد ساتھی اور تحریک کے سرگرم رکن تھے۔ انہیں بھی چودہ سال کی سزا دی گئی۔

مولوی پیر محمد

حیدرآباد کے اکابر و مشاہیر میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ مبارز الدولہ کے یہاں ملازم تھے۔ بڑے راسخ الخیال تھے۔ قوت جسمانی میں بھی امتیاز خاص رکھتے تھے۔ جب پولس انہیں گرفتار کرنے آئی تو انہوں نے کئی پولس والوں کو زخمی کر دیا۔ وہ قاضی آصف کے ساتھ سندھ گئے تھے۔ جہاں سے مبارز الدولہ کے خطوط لایا کرتے تھے۔ انہیں بھی چودہ سال کی سزا ہوئی۔

مولوی عبدالرزاق

ان کا مکان جو کوٹلہ عالی جاہ میں واقع تھا تحریک کا خاص مرکز تھا۔(۱) مبارز الدولہ کے قدیم ملازم تھے اور مولوی کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ان کی اہم ذمہ داری یہ تھی کہ سپاہیوں میں وہابی تحریک کو عام کریں۔ وہ یہ کام عام طور پر مسجدوں میں انجام دیتے تھے۔ دوسرے علاقوں میں بھی ان کی دعوت کا اثر تھا۔ چنانچہ ان کے ایک خط سے جو تحقیقاتی کمیشن کے سامنے پیش ہوا ظاہر ہوتا ہے کہ برار سے تین ہزار لوگ وہابی تحریک میں شریک ہونے کے لئے حیدرآباد آئے تھے۔ انہیں بھی چودہ سال قید کی سزا ہوئی۔

مولوی سید قاسم حکیم

ان کا شمار بھی اکابر میں ہوتا تھا۔ مبارز الدولہ کے ملازم تھے۔ قاضی آصف کے ساتھ سندھ کی سفارت پر جانے والوں میں تھے۔ وہاں سے واپس ہو رہے تھے تو انہیں شولاپور میں گرفتار کر لیا گیا۔ بعد میں ضمانت پر چھوڑ دیا گیا۔

مولوی منشی فخرالدین

عرف عبدالرحمٰن تھا۔ نیلور کے رہنے والے تھے۔ مختصر مدت کے لئے مبارز الدولہ کے یہاں ملازمت اختیار کی۔ مولوی عبدالہادی کے ساتھ تحریک کی اشاعت کے سلسلہ

(۱) سرگزشت مجاہدین۔ صفحہ ۱۸۰۔

میں بمبئی گئے تھے اور وہاں سے کچھ خطوط لائے تھے۔ وہ ایک مولوی کے بھیس میں مبارز الدولہ کے ایجنٹ کے فرائض انجام دیتے تھے۔ اس لئے انہیں فوراً گرفتار کرلیا گیا۔ اور بعد میں چودہ سال کی سزا سنائی گئی۔

گرفتار شدہ دس افراد میں سے بقیہ دو (۱) یہ ہیں ایک محمد فیض اللہ۔ وہ مبارز الدولہ کے مہر بردار کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ان پر مبارز الدولہ کی مہر کندہ کرنے کا سنگین الزام تھا۔ یہ حیدر آباد ہی کے باشندہ تھے۔

دوسرے الٰہی بخش عرف افضل علی خان۔ تھانہ (مہاراشٹر) کے رہنے والے تھے۔ بہت تیز اور ہوشیار آدمی تھے۔ اس لئے محکمہ راز ان کے تحت تھا۔ دونوں کو چودہ سال کی سزا دی گئی۔

مولوی شجاع الدین

وہ تحریک کے بہت ہی قابل اعتماد رکن تھے۔ پہلے نواب صاحب کرنول کے ساتھ تھے۔ وہ نواب صاحب کے بڑے مداح تھے۔ پھر انہوں نے مبارز الدولہ کی رفاقت اختیار کی تھی۔ کمیشن کے سامنے اپنے بیان میں انہوں نے بڑی جرأت کا مظاہرہ کیا تھا۔

دیگر سرگرم علماء

حیدر آباد میں اس تحریک سے متعلق سربرآوردہ حضرات میں مولوی سید محمد مغربی کا نام بھی آتا ہے۔ نیز حلقہ ارادت کی توسیع اور تحریک کی اشاعت کے لئے جابجا مراکز قائم کئے گئے تھے۔ چند علماء نے اپنے گھروں کو اس کام کے لئے وقف کر دیا تھا۔ ان میں مولوی محمد ولی الدین، مولوی محمد کرامت علی، مولوی محمد عماد الدین، (فرزند مولوی قاضی محمد آصف) مولوی محمد فرید الدین، مولوی محمد جعفر، مولوی سید عبدالواحد عرف واحد علی، (برادر خورد مولوی سید قاسم) مولوی حسن محمد، حافظ عبدالسمیع، حافظ حسن خان رامپوری، سید جلال الدین، میاں محمد شرف الدین کے نام نمایاں ہیں۔ مولانا غلام رسول مہر نے ان مرکزوں کا ذکر کر کے ان کا محل وقوع بھی بتایا ہے۔ (۲)

(۱) ان کے طبقہ علماء میں ہونے کا علم نہ ہوسکا اس لئے مستقل عنوان کے تحت ان کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔
(۲) دیکھئے سرگزشت مجاہدین صفحہ ۱۷۹۔۱۸۰۔ تحریک کے چند دیگر قائدین کے لئے ملاحظہ ہو (ریاست حیدر آباد میں جدوجہد آزادی صفحہ ۶۴۔۶۷

گردو پیش کے مسلمان وقتاً فوقتاً یہاں جمع ہوتے تھے اور سید صاحب کی تعلیمات وہدایات حاصل کر کے اپنی زندگیاں سنوارتے اور انگریزوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کی تیاریاں کرتے تھے جن کا روز بروز حیدر آباد میں اثر ورسوخ بڑھ رہا تھا۔

اس کے علاوہ دو اور علماء مولوی زین العابدین اور مولوی محمد عباس مبارز الدولہ کے قریبی ساتھیوں میں تھے۔ اور ان کے منصوبہ میں پورے شریک تھے۔ منصوبہ کے انکشاف کے بعد وہ بھاگ کر مولانا ولایت علی کے پاس پٹنہ چلے گئے تھے۔ مولانا ولایت علی نے ان کی بڑی قدر کی اور ان کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اول الذکر کو اڑیسہ اور ثانی الذکر کو الٰہ آباد دعوت کے لئے بھیجا تھا۔ (۱)

مولانا عنایت علی نے ۱۸۴۳ء میں جب پہلی دفعہ سرحد کی طرف ہجرت کی تھی اس وقت چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں لوگ گئے تھے تا کہ حکومت کے لئے کسی قسم کی تشویش کا باعث نہ بنیں۔ ہر ٹولی کا ایک امیر ہوتا تھا۔ مولوی زین العابدین حیدر آبادی بھی ایک جماعت کے امیر تھے۔ (۲)

---

(۱) مہر نے سرگزشت مجاہدین (صفحہ ۲۲۸) میں ترتیب الٹ دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مولوی زین العابدین الٰہ آباد اور مولوی محمد عباس اڑیسہ بھیجے گئے تھے۔ اس کا اصل ماخذ سوانح احمدی ہے۔ اور اسی کے مطابق اوپر نقل کیا گیا ہے۔ مگر سوانح میں ۱۸۳۱ء کے واقعات کے ساتھ اس کو خلط ملط کر دیا گیا ہے۔ حالاں کہ یہ ۱۸۳۹ء کا واقعہ ہے۔
معلوم ہوتا ہے کہ مولوی زین العابدین نے اڑیسہ کے بعد بنگال کا رخ کیا۔ سرکاری رپورٹوں سے بنگال میں ان کی سرگرمیوں پر روشنی پڑتی ہے جس کا ذکر مولانا عنایت علی کے تذکرہ میں آچکا ہے۔ نیز ہنٹر لکھتا ہے کہ زین العابدین نے اپنی کوششوں کا مرکز شمال مشرقی بنگال کو بنایا تھا۔ اور سلہٹ اور شمالی پتریا کے کسانوں کو اپنا ہمنوا بنا لیا تھا۔ (ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۴۷)

(۲) دیکھئے سید بادشاہ کا قافلہ صفحہ ۱۵۱

بـــاب یــازدھـــم

کیرلا کی تحریک آزادی اور علماء

کیرلا کی جنگ آزادی پر ایک نظر

جس کیرلا کے مسلمانوں نے پرتگالیوں سے پے بہ پے لڑکر سامراجی طاقتوں کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کیا تھا اور وطن کی آزادی کے لئے پہلے پہل جان کی بازی لگا کر بعد میں آنے والوں کے لئے مثال قائم کی تھی۔ وہاں کے مسلمان انگریزوں سے ٹکر لینے میں کیوں کر پیچھے رہ سکتے تھے؟ چنانچہ جیسے جیسے کیرلا میں انگریزوں کا اثر ورسوخ بڑھنے لگا مسلمانوں اور بالخصوص علماء کی تگ وتاز میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ ابتداءً اس جنگ کو انگریزوں نے ہندو مسلم منافرت کا رنگ دیا۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ جنگ پلاسی کے بعد جو دولت انگریزوں کے ہاتھ آئی، اس سے ان کی حرص وآز بہت بڑھ گئی تھی۔ پھر سقوط سرنگا پٹنم نے ان کی جھولی اتنی بھر دی تھی کہ سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ اسی چیز نے انہیں مالابار (کیرالا) پر دست درازی پر ابھارا۔ چونکہ مالابار انتہائی زرخیز خطہ ہے۔ اسلئے انگریز اس کو ہڑپ کرنے کی تدبیریں کرنے لگے۔ مگر براہ راست حملہ کرنے کے بجائے ہندوؤں اور مسلمانوں کو لڑانے کی پالیسی پر عمل کرنا شروع کیا۔ مگر سلطان ٹیپو کی زندگی میں وہ اس میں کامیاب نہ ہوسکے۔ چونکہ مالابار کا کافی حصہ سلطنت میسور کے ماتحت تھا اس لئے ٹیپو سلطان اس طرح کی شورشوں کو اپنی قوت اور حکمت سے پنپنے نہیں دیتا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو لڑانے کے لئے انھوں نے یہ تدبیر اختیار کی کہ ہندو جو بڑی بڑی زمینوں کے مالک تھے ان کو اس پر آمادہ کیا کہ مسلمان کاشتکاروں سے بھاری لگان Land Revenue وصول کریں، اور ان کو معاشی طور پر کمزور سے کمزور کریں۔ نہ صرف یہ کہ انگریزوں نے ہندوؤں کو اس کی ترغیب دی بلکہ اس معاملہ میں صاف ان کی پشت پناہی کرنے لگے۔ اس وجہ سے مسلمانوں اور انگریزوں میں ٹھن گئی۔ ہندو زمیندار فطرۃً انگریزوں کے ساتھ تھے۔

جب انگریز مالابار پر پوری طرح قابض ہو گئے۔ تو انھوں نے مسلمانوں کو زک پہنچانے کے لئے نائروں (۱) سے معاہدہ کیا۔ اور انہیں جاگیریں عطا کیں اور مسلمانوں سے ٹیکس وصول کرنے کی انھیں ذمہ داری دی اور اس سلسلہ میں انہیں پوری آزادی بخشی۔ اس سے مسلمانوں کی زمینوں کو خطرہ لاحق ہونے لگا۔ کسی بھی وقت ان کو قرق کیا جاسکتا تھا۔ یا اتنے لگان کا مطالبہ کیا جاتا کہ بسا اوقات مال گزاری کی مقدار آمدنی سے زیادہ ہو جاتی۔ مسلمانوں نے اس لگان کی شدید مخالفت کی تو انگریزی حکومت نے ان کو مالابار سے اکھاڑ پھینکنے پر کمر کس لی۔ انگریزوں نے اپنی ظالمانہ کارروائیوں کا آغاز اس طرح کیا کہ سربرآوردہ مسلمانوں پر الزامات عائد کر کے جھوٹے مقدمات میں انھیں پھانسنا شروع کیا۔ چنانچہ حسن گُر کل جو وہاں کے مشہور عالم اور ریاضی کے مدرس تھے، اور موسیٰ موبن کے ساتھ ایسا ہی کیا۔ اور ۱۷۹۹ء میں اسی طرح کے ایک جھوٹے قضیہ میں حسن کرکل کے بھائی کو تختہ دار پر چڑھایا۔ ان سب کارروائیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی غیرت قومی میں اور ابال آیا۔ اور انہوں نے سرکردہ انگریزوں کے قتل کا منصوبہ بنایا۔ چنانچہ ۱۸۰۰ء میں جارج واڈل (George Wadel) کے قتل کی سازش کی جس نے سینکڑوں معصوم مسلمانوں کو دردناک تکلیفیں پہنچائی تھیں۔ مگر قسمت نے یاوری نہیں کی اور یہ سازش پکڑی گئی۔ جس کا سخت ردعمل ہوا اور منجیری میں جو کالیکٹ سے تقریباً پچاس کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے شورشوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ مگر انگریزوں نے نائروں کی فوج (۲) سے جس کو کولکار (Kolkar) کہا جاتا تھا ان کا قلع قمع کیا۔ اور مسلمانوں کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ یہ نائر انگریزوں کے لئے جاسوسی کا کام کرتے تھے۔ (۳)

اس پورے عرصہ میں ہنگاموں کی وجہ سے کیرالا میں بدامنی کی فضا چھائی رہی۔

---

(۱) کیرلا میں ہندوں کا متوسط طبقہ نائر کے نام سے مشہور ہے مذہبی لحاظ سے برہمنوں کے بعد ان کا مقام ہے۔

(۲) یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ یہاں انگریزوں کے مقابلہ میں مسلمان تنہا تھے اور انگریز تنہا انھیں کو اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ البتہ شمالی کیرالا میں برشی راجا کے انگریزوں سے مقابلہ کرنے اور مارے جانے کا ذکر آتا ہے۔

(۳) المسلمون فی کیرالا صفحہ ۸۷-۸۹

مولانا آزاد سبحانی لکھتے ہیں :

۱۷۹۵ء سے ۱۸۰۵ء تک یعنی پوری دہائی بھر مالا بار میں ہلچلوں کا تانتا بندھا رہا اور انگریزی تسلط جم نہ سکا۔(۱)

انگریزوں نے مسلمانوں کو مٹانے پر کمر باندھ لی تھی۔ مرہٹوں کی اسلام دشمنی اور شمالی ہند میں ان کی کارستانی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریزوں نے ان کو کیرالا میں خوب ترقی دی اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز کیا۔(۲)

مرہٹوں نے خوب بھڑاس نکالی۔ انگریزوں نے ان کو ساتھ لے کر مسلمانوں کی معیشت کو تباہ و برباد کر دیا۔ ان کا فقر و فاقہ آخری حد کو پہنچ گیا۔ کڈتناد (Kadathanad) کے مسلمانوں نے ۱۸۱۹ء میں حکام کے سامنے جو شکایت پیش کی اس سے ان کی فاقہ کشی اور زبوں حالی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس کا مضمون یہ ہے :

> بہت سے لوگ شدت بھوک کی وجہ سے گھروں میں، راستوں پر اور گلی کوچوں میں مر گئے ہیں۔ عورتیں سڑکوں پر بھیک مانگ رہی ہیں۔ کچھ عورتوں نے تو اپنے بچوں کو جان سے مار دیا ہے یا راستوں میں ڈال دیا ہے اور کچھ عورتوں نے معمولی قیمت پر بچوں کو بیچ دیا ہے۔ اور بعض لوگوں نے ٹیکس ادا نہ کر سکنے اور بچوں کی روزی روٹی کا انتظام نہ کر سکنے کی وجہ سے خودکشی کر لی ہے۔ راجاؤں کے دور میں یا حکومت میسور کے زمانہ میں ہمیں اور نہ ہمارے باپ دادوں کو اس طرح کی مصیبتوں کا شکار ہونا پڑا۔

اس خستگی اور درماندگی پر بھی سنگ دل انگریزوں کے دل میں ذرا نرمی پیدا نہ ہوئی بلکہ اس کا الٹا اثر پڑا۔ اس کو انھوں نے اپنی کامیابی گردانا۔ ۱۸۲۲ء کی ایک رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس شکایت کو رفع کرنے اور مصیبت کو دور کرنے کے بجائے ہر شہر میں ایک نائر سردار متعین کیا اور شہر کے نظم و نسق کا اسے پورا اختیار دیا۔

(۱) ملابار و موپلا، صفحہ ۱۰ (مطبوعہ کانپور)

(۲) ۱۷۹۹ء میں کیرالا میں ایک سو سات مرہٹے کسی نہ کسی عہدہ پر فائز تھے، جب کہ یہ انگریزی تسلط کا ابتدائی زمانہ تھا۔ انگریزوں کی پالیسی کا اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

۱۸۲۲ء ہی میں پنڈلور (Pandallur) کے باشندوں نے ایک میمورنڈم جاری کیا جس میں حکام کی مطلق العنانی اور ظلم و زیادتی کی کھل کر مذمت کی۔(۱)

اس کے باوجود مسلمانوں نے علماء اور مقامی سرداروں کی قیادت میں آزادی کی جنگ اخیر تک جاری رکھی۔ ۱۸۳۶ء اور ۱۹۳۱ء کی درمیانی مدت میں مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان بتیس معرکے ہوئے، جس میں بہت سے لوگ مارے گئے۔

۱۸۵۲ء میں ایک بڑا ہنگامہ ہوا جس کا نام ۱۸۵۲ء کی موپلا شورش ہے۔ اس کی جانچ کے لئے ایک تحقیقاتی کمیشن بٹھایا گیا۔ جس کے کمشنر ایک انگریز مسٹر اسٹرنج تھے۔ اس موقع پر انھوں نے یہ بیان جاری کیا :

''اس شورش کا باعث مذہبی جنون ہے۔ ٹیپو کے زمانہ میں بھی یہی عالم تھا۔ ملاؤں کی تحریک جہاد کا اثر ان لوگوں پر بہت جلد پڑتا ہے۔ ہندو لرزتے ہیں۔ کمتر درجہ کے موپلا (۲) کے دل میں قرآن کی تعلیم جہاد کے متعلق عجیب و غریب خیالات ہیں''۔(۳)

مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ مذہبی جنگ نہیں تھی بلکہ آزادی کی لڑائی تھی۔ چونکہ مسلمانوں کے مقابلہ میں انگریزوں کے ساتھ نائر اور برہمن بڑی تعداد میں رہتے تھے۔ اس لئے انگریزوں نے اس جنگ کو مذہبی رنگ دے کر ہندوؤں کو مسلمانوں سے بھڑانے کی کوشش کی اور رپورٹ میں ایسے چبھتے ہوئے فقرے درج کئے جس سے ہندوؤں کے مذہبی جوش کو اور ہوا ملے اور وہ انگریزوں کو اپنا مسیحا سمجھ کر مسلمانوں کے خلاف انکا ساتھ دینے پر بجان و دل آمادہ ہوں۔ عبدالغفور عبداللہ القاسمی نے بھی اس حقیقت کو واشگاف کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ چوں کہ ہندو، انگریزوں کے خلاف ہونے والی ان جنگوں میں مسلمانوں کے ساتھ بہت کم شریک ہوتے تھے۔ اس لئے مشہور ہے کہ یہ فرقہ وارانہ فسادات تھے۔ جب کہ حقیقت اس کے خلاف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ نچلے طبقے کے ہندو احساس کمتری کی وجہ سے ان جنگوں میں حصہ نہیں لیتے تھے اس لئے

---

(۱) ملاحظہ ہو المسلمون فی کیرالا صفحہ ۹۰۔

(۲) موپلا یا ماپلا کیرلا کی عربی النسل مسلم آبادی کو کہتے ہیں۔ موا ور ما، مہا کا بگڑا ہوا ہے، جس کے معنی بڑے اور محترم کے ہوتے ہیں اور پلا یعنی بچہ۔ عربوں کو بہت محترم سمجھا جاتا تھا ان کی اولاد کو ماپلا یا موپلا کہا گیا۔

(۳) ملابار و موپلا صفحہ ۲۷۔

کہ معاشرہ میں ان کی کوئی وقعت اور عزت نہیں تھی۔ نیز یہ کہ یہ ہریجن، برہمنوں اور نائروں کے مقام اوران کی شوکت وعظمت سے ڈرتے تھے۔ اس لئے کہ ان کا عقیدہ تھا کہ برہمن غصہ ہوکر لعنت کریں تو نکبت وہلاکت یقینی ہے۔(۱)

ایک قابل لحاظ بات یہ ہے کہ ۱۸۲۰ء سے ۱۸۷۰ء کے درمیان کیرالا میں مسلمانوں کی طرف سے پیش آنے والی بغاوتوں اور رونما ہونے والے معرکوں کو انگریزوں نے وہابی تحریک (تحریک سید احمد شہیدؒ) سے جوڑنے کی کوشش کی ہے اس لئے کہ اس پورے عرصہ میں شمالی ہند میں وہابی تحریک زوروں پر تھی۔ اسی وجہ سے کیرالا میں بھی حکومت نے مجاہدین آزادی کے ساتھ وہی سنگدلانہ رویہ اختیار کیا جو شمال میں روا رکھا گیا تھا۔(۲)

علماء کی قیادت

اس طویل عرصہ میں کیرالا میں آزادی کی جو جنگیں لڑی گئیں۔ شروع ہی سے ان کو علماء کی حمایت حاصل رہی۔ بلکہ انہوں نے ہی قیادت کے فرائض انجام دیئے۔ معاشرہ پر علماء کی گرفت مضبوط تھی۔ ان کی تحریک جہاد کا عوام پر بہت جلد اثر پڑتا تھا۔ ان کی مسلسل ترغیب وتشویق ہی کا نتیجہ تھا کہ عوام کا جوش کسی زمانہ میں سرد نہ ہونے پایا اور جہاں بھی موقع ملا انھوں نے انگریزی حکومت کے خلاف سخت لڑائی کی۔ ان مجاہد علماء کی بہت بڑی تعداد ہے۔ مگر تاریخ نے اکثر کے نام بھی محفوظ نہیں رکھے۔ چہ جائے کہ ان کی قربانیوں کی تفصیلات مہیا ہوتیں۔ جن کے کارناموں کا کچھ علم ہوسکا ان میں شیخ حسن کُرکل، قاضی عمر بلنکوٹی، سید علوی منفرمی، ان کے صاحبزادہ سید فضل، حسن میدین کرکل اور سید کنج کویا کے نام زیادہ روشن ہیں۔

شیخ حسن کُرکل، انگریزوں کے خلاف جنگیں اور شہادت

شیخ حسن کرکل بن احمد، ویناڈ Wayanad (منجیری کے قریب ایک قصبہ ہے) کے ایک علمی خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۱۶۳ھ مطابق ۱۷۵۹ء میں یہیں پیدا

(۱) المسلمون فی کیرالا صفحہ ۹۵۔
(۲) ایضاً صفحہ ۹۱۔

ہوئے۔ ضروری علوم ویناڈ کی جامع مسجد میں حاصل کیے۔ پھر کامل دو سال فنون جنگ کی تحصیل میں صرف کیے۔ تیر اندازی اور نیزہ بازی میں کمال پیدا کیا۔ تلوار چلانے اور فائر کرنے میں مہارت کے ساتھ جملہ ہتھیار استعمال کرنے کی مشق بہم پہنچائی۔ آپ بڑے شجاع اور دلیر تھے، انگریزی حکومت سے سخت نفرت کرتے تھے، اس کے ساتھ ساتھ بڑے دولتمند اور زمیندار بھی تھے۔ سلطان ٹیپو سے آپ کے قریبی روابط تھے۔ سلطان نے انگریزوں سے جو جنگیں لڑیں، بعض جنگوں میں آپ بھی سلطان کے ساتھ شریک رہے اور انگریزوں سے دو بدو مقابلہ کیا۔

شیخ حسن کُرکل نے بہادر مسلمان نوجوانوں کی ایک فوج تیار کی تھی جو سب کے سب فنون حرب سے واقف تھے۔ سلطان ٹیپو کی شہادت کے بعد انگریزوں کے خلاف ان کے غصہ کی آگ روز بروز بھڑکتی رہی اور انہوں نے ان کے خلاف کارروائیوں میں بڑی تیزی پیدا کی۔ یہاں تک کہ حکومت نے ان کو بہت بڑا سیاسی مجرم اور باغی قرار دیا اور ان کی جماعت پر مظالم کا سلسلہ شرع کیا۔ یہ دیکھ کر وہاں کے راجا ورما نے بھی شیخ حسن کرکل کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف جنگ کا عہد کیا۔ شیخ نے اپنا سارا لشکر جمع کیا اور اپنے امراء کے پاس بھی پیغام بھیجا کہ اپنا اپنا لشکر تیار کریں۔ چنانچہ کل تین ہزار اٹھیاسی سپاہیوں پر مشتمل ایک لشکر تیار ہو گیا۔ ان سب کو لے کر شیخ حسن کُرکل نے ناڈوکانی NADUKANI کا رخ کیا جو میسور کی سمت میں پہاڑ پر واقع ہے۔ وہاں کچھ دیر ستا کر جب چلنے کی تیاری کرنے لگے تو شمال کی جانب سے کچھ لوگ آتے نظر آئے۔ قریب آنے پر معلوم ہوا کہ انگریز حکومت کے سپاہی ہیں۔ پہنچتے ہی انگریزی فوج نے فائرنگ شروع کی۔ مسلمان کفن بردوش نکلے ہی تھے۔ بڑی بے جگری سے لڑے۔ سخت معرکہ ہوا۔ آٹھ مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا جن میں دو کمانڈر پوکر موبن اور شیخ موبن بھی شامل تھے۔ جبکہ انگریزی فوج کے تیئیس سپاہی کھیت رہے۔ یہ معرکہ ۱۲۲۴ھ مطابق ۱۸۱۰ء میں پیش آیا۔ شیخ حسن کرکل اپنے تین لڑکوں احمد کرکل، محی الدین کڈی کرکل اور محمد کرکل سمیت جنگ میں شریک تھے۔ جنگ کے بعد انگریزی حکومت نے ان کی گرفتاری کا وارنٹ جاری کیا۔ کافی تلاش کے بعد حکومت کو پتہ چلا کہ شیخ حسن کرکل اپنے ساتھیوں کے ساتھ پالگاٹ میں موجود ہیں۔ جب شیخ کو معلوم ہوا کہ حکومت

کے کا رندے ان کی تلاش میں یہاں پہنچ چکے ہیں، تو انہوں نے مپاڈکر (MAPPATTUKARA) نامی گاؤں میں پناہ لی اور ایک گھر میں چھپ گئے۔ گھر والوں کو بتا دیا تھا کہ انگریز ان کی تلاش میں ہیں، اس لئے وہ یہاں پناہ لے رہے ہیں۔ گھر والوں نے اجازت تو دے دی اور بظاہر ہمدردی کا اظہار کیا مگر وہ انگریزوں کی طرف میلان رکھتے تھے۔ انہوں نے پناہ دینے کے باوجود بے وفائی کی اور حکومت کے کارندوں کو جو ان کی تلاش میں آئے تھے بتا دیا کہ شیخ حسن کرکل یہاں چھپے ہوئے ہیں۔ سپاہیوں نے گھر کا محاصرہ کیا تا کہ شیخ حسن اور ان کے ساتھی نکل نہ پائیں، اور گھر کی تلاش شروع کی۔ شیخ حسن باہر نکل آئے۔ دیکھا کہ حکومت کے کارندے گھر کے صحن میں ہیں۔ ان میں کچھ برطانوی فوج کے سپاہی بھی ہیں جن کے ہاتھوں میں پستول اور دوسرے ہتھیار ہیں۔ شیخ حسن کرکل کے ساتھ اس وقت ان کے تینوں لڑکے اور دیگر بیس آدمی تھے۔ شیخ حسن نے اس نازک موقع پر بھی ہتھیار نہیں ڈالے ان کی غیرت نے اس کو گوارا نہیں کیا۔ بلکہ جب تک دم میں دم ہے انہوں نے مقابلہ کی ٹھانی۔ چنانچہ جنگ شروع ہوئی اور سخت جنگ ہوئی اور شیخ حسن اور ان کے دو لڑکوں احمد کرکل اور محی الدین کڈی کرکل نے لڑتے ہوئے جان جان آفریں کے سپرد کی اور شہادت سے سرفراز ہوئے۔ مگر انگریزوں کے سامنے جھکنا گوارا نہیں کیا۔ یہ واقعہ ۱۸۱۰ء کا ہے۔ شیخ حسن کرکل اور ان کے دونوں لڑکوں کو مپاڈکر کی جامع مسجد کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ (۱)

شیخ سید علوی منفرمی اور انگریزوں سے ان کا جہاد

شیخ علوی بن محمد بن سھل، حسینی سادات میں سے تھے۔ جنوبی یمن کے مشہور شہر تریم میں ۱۱۶۶ھ (مطابق ۵۳-۱۷۵۲ء) میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی۔ سترہ سال کی عمر میں اپنے ماموں شیخ حسن بن علوی الجفری کی دعوت پر ہندوستان کا سفر کیا۔ کالیکٹ میں اپنے ماموں کے پاس پہنچے جو پہلے سے وہاں مقیم تھے۔ انہی کی صاحبزادی سے شادی بھی ہوئی (۱) کیرلا کے مختلف علاقوں کی سیاحت کرتے ہوئے اخیر میں منفرم (Manpuram) (ضلع ملپرم) پہنچ کر طرح اقامت ڈال دی اور تعلیم وتربیت کا

(۱) شیخ محمد علی موسلیار، تحفۃ الاخیار فی تاریخ علماء ملیبار (مخطوطہ مصنف)

(۲) سید محمد ضیاء شہاب فی تعلیقاته علی شمس الظهيرة ۳۰۸/۱

سلسلہ جاری کیا۔ لوگوں نے آپ سے بہت فائدہ اٹھایا۔ ہندوؤں کے ساتھ بھی آپ کے اچھے روابط تھے۔(۱)

• علم وفضل کے ساتھ صلاح وتقوی میں بھی آپکا شہرہ تھا، صاحب "شمس الظهيرة" لکھتے ہیں "كان من كبار الصالحين"(۲) یعنی آپ بہت بڑے بزرگ تھے۔

کیرالا میں شیخ نے دیکھا کہ مسلمان بڑی آزمائش سے دوچار ہیں اور انگریزوں کے ظلم وستم سے پسے جارہے ہیں، تو ان سے نہیں رہا گیا۔ وہ میدان جہاد میں کود پڑے۔ لوگوں کو انگریزوں سے جہاد کی ترغیب دی۔ شریعت کی روشنی میں آزادی کی اہمیت جتائی۔ ان کی ترغیب ودعوت سے ایک آگ سی لگی اور انگریزوں کے خلاف ایک فضا بن گئی۔ انگریز اس سے بہت بے چین ہوگئے۔ اور انہوں نے طے کیا کہ نہ صرف شیخ علوی کو بلکہ ان کے ساتھ دوسرے علماء کو بھی نظر بند کیا جائے تاکہ علماء کی تحریک جہاد کی وجہ سے ان کے خلاف جو رجحان بڑھتا جارہا تھا، اس کو روکا جاسکے۔ چنانچہ ۱۷۹۹ء میں چند علماء کو گرفتار کرکے تختہ دار پر چڑھایا۔ جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے۔ ۱۸۰۱ء میں شیخ سید علوی کے خلاف بھی وارنٹ جاری کیا۔ لیکن چونکہ شیخ کا معاشرہ میں بڑا علمی وروحانی اثر تھا۔ ان کی گرفتاری پر عوام کے بھڑک اٹھنے کا خدشہ تھا، اس لئے انگریز اپنے پروگرام کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ مگر ان کی دعوت جہاد کا روز بروز اثر بڑھتا جارہا تھا اور وہ برابر انگریزوں کی آنکھوں میں خار بن کر کھٹک رہے تھے۔ اس لئے دوبارہ ۱۸۱۷ء میں ان کے خلاف وارنٹ جاری کیا۔ مجسٹریٹ کے حکم سے شیخ کو کالیکٹ لیجایا گیا۔ ان کے ساتھ بہت لوگ تھے، جو ان سے جدا نہیں ہورہے تھے۔ اس لئے اس مرتبہ بھی بدامنی پھیلنے کے خدشہ سے حکومت ان کو نظر بند نہ کرسکی۔

۱۸۳۶ء سے ۱۸۴۰ء کے دوران چار سالہ عرصہ میں مسلمانان کیرالا نے انگریزوں کے ساتھ کئی معرکہ سر کیے جن میں دونوں طرف کے بہت سے لوگ کام آئے۔ مسلمانوں کو جہاد پر آمادہ کرنے میں سید موصوف نے بڑا اہم رول ادا کیا۔(۳)

۱۸۴۳ء میں چیرور (Cherur) ضلع ملپرم میں مسلمانوں اور انگریزوں کے

---

(۱) المسلمون في كيرلا، صفحه ۹۲

(۲) شمس الظهيرة ۳۰۸/۱

(۳) المسلمون في كيرالا، صفحہ ۹۲-۹۳

درمیان ایک زبردست جنگ ہوئی اس میں شیخ علوی نے براہ راست شرکت کی اور بہادری کے جوہر دکھائے۔ اس میں انگریزی فوج کے پانچ سربرآوردہ سپاہی مارے گئے اور آٹھ زخمی ہوئے۔ اور دوسری طرف ساٹھ مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا (۱)

۱۸۴۹ء میں انگریزوں نے نئی پالیسی بنائی۔ وہ یہ کہ علماء کو جلاوطن کیا جائے۔ شیخ علوی ان میں سرفہرست تھے۔ ان کی عمر اس وقت نوے سال سے متجاوز تھی، اس تجویز پر بھی وہ عمل نہ کرسکے۔

سید موصوف نے ۱۲۷۰ھ (۵۴-۱۸۵۳ء) میں منفرم ہی میں وفات پائی۔

قاضی عمر بلنکوٹی

کیرلا کے مشہور عالم، باکمال شاعر اور صاحب کرامات بزرگ تھے۔ ولینکوڈ (Veliyankode) (۲) (ضلع ملپرم) کے رہنے والے تھے۔ ۱۱۷۹ھ (۶۶-۱۷۶۵ء) میں یہیں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے شہر میں حاصل کرنے کے بعد پونانی (Ponnani) تشریف لے گئے جو اس وقت علم کا مرکز تھا۔ اور وہاں کے علماء سے تحصیل کی اور اکثر علوم میں کمال پیدا کیا۔ اس کے بعد مختلف مقامات ولینکوڈ، پونانی اور تانور (Tanur) میں قاضی اور مدرس کی حیثیت سے خدمت انجام دی۔ ان کی حیثیت قاضی القضاۃ کی تھی۔ لوگوں میں بڑا رعب داب تھا۔ تصوف وسلوک کی تعلیم شیخ علوی منفرمی سے لی اور ان سے طریقہ قادریہ حاصل کیا۔ کئی حج کئے اور حرمین کے علماء سے استفادہ کیا۔ (۳) انہوں نے کئی کتابیں لکھیں۔ مقاصد النکاح، کتاب الذبح والاصطیاد اور قصیدۃ النفائس الدرر وغیرہ، موخر الذکر کتاب کیرلا کے مدارس میں داخل نصاب ہے۔ ان کے علاوہ کئی قصائد لکھے (۴) جن میں قصیدہ "صلی

(۱) شیخ محمد علی موسلیار، تحفۃ الاخیار فی تاریخ علماء ملیبار، (مخطوطہ مصنف)

(۲) عربی میں بلنکوت کہتے ہیں اسی کی طرف نسبت کرتے ہوئے بلنکوٹی ہے۔

(۳) شیخ محمد علی موسلیار نے ان کے مفصل حالات اپنی کتاب تحفۃ الاخیار میں لکھے ہیں۔ اساتذہ اور شاگردوں کی تفصیل بھی دی ہے۔ ملیالم زبان میں ان کے حالات وکرامات پر مستقل کتاب ہے۔ نیز مختصر حالات کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ الأبرار ممن تدرس کتبھم فی ولایۃ ملیبار، صفحہ ۲۶۱-۲۶۳

(۴) تحفۃ الاخیار (مخطوطہ) نیز دیکھئے المسلمون فی کیرالا۔ صفحہ ۱۸۷-۱۸۸

الالہ" بہت مشہور اور متداول ہے۔

آپ انگریزی کے حکومت کے سخت مخالف تھے اور کسی کی پروا کئے بغیر اس کی برائیاں بیان کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے انگریزی حکومت کا ٹیکس ادا کرنے سے انکار کردیا اور لوگوں کو بھی اس کی تاکید کی کہ حکومت کو کسی قسم کا ٹیکس نہ دیں۔ وہ بانگ دہل کہتے تھے کہ زمین اللہ کی ہے، ہم اس کی زمین میں کسی کو ٹیکس دینے کے پابند نہیں (۱)

عوام میں ان کی وہ مقبولیت تھی کہ حکومت کو ان پر جلد ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس لئے تحصیل دار بھی ایک عرصہ تک چشم پوشی سے کام لیتے رہے، اسی اثنا میں ایک سخت مزاج تحصیل دار کا تقرر ہوا۔ اس نے جب دیکھا کہ ان کے ذمہ کئی مہینوں کا ٹیکس جمع ہوگیا ہے اور وہ برابر انکار کئے جارہے ہیں، تو اس نے ایک پولس والے کو بھیجا کہ شیخ کو اس کے پاس حاضر کیا جائے۔ چنانچہ شیخ چاوکاڈ (Chavakkad) کی عدالت میں حاضر ہوئے اس نے شیخ سے ٹیکس ادا نہ کرنے کا سبب دریافت کیا اور بہت لعن وطعن کیا۔ شیخ کو بڑا غصہ آیا اور اس کے منھ پر تھوک دیا۔ سپاہی پکڑنے کے لیے قریب گئے تو ایک کو مار دیا اور دوسرے کو زخمی کردیا۔ اس پر سپاہیوں نے انہیں گرفتار کر کے حوالات میں بند کردیا اور ان کی نگرانی کے لئے چند سپاہی متعین کئے گئے۔ پھر ان کے خلاف مقدمہ دائر کیا گیا۔ جب تمام سپاہی لوٹ گئے تو خدا کی مشیت سے شیخ کسی طرح جیل سے نکل گئے اور اپنے شہر بلنکوٹ پہنچ کر جامع مسجد میں اعتکاف کیا تاکہ عبادت و ریاضت اور مراقبہ میں مشغول رہیں۔ صبح کو سپاہی جیل خانہ آئے تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ایسی سخت قید کے باوجود شیخ کیسے نکل گئے۔ سب کے سب طوق و سلاسل کے ساتھ اسی وقت بلنکوٹ آئے اور شیخ کے گھر کا محاصرہ کرلیا۔ اتنے میں شیخ کی طرف سے ایک قاصد آیا اور اس نے کہا شیخ مسجد میں ہیں، یہاں عورتوں اور گھر والوں کو پریشان نہ کرو۔ یہ بات سن کر سب نے مسجد کا رخ کیا۔ شیخ مسجد سے نکل کر گھر کی طرف آرہے تھے کہ پولس کا سامنا ہوا۔ پولس نے کہا کہ اب آپ کو کالیکٹ لیجایا جائے گا۔ یہ سن کر شیخ پھر مسجد میں داخل ہوئے اور چاشت کی نماز پڑھی اور دعا کر کے نکلے۔ لوگوں کو

---

(۲) ان کی یہ بات اب تک کیرلا میں مشہور ہے۔

معلوم ہوا تو ہر طرف سے جمع ہوئے اور سخت مزاحمت کی اور انہیں تنہا لیجانے نہیں دیا۔ ایک بڑی تعداد ان کے جلو میں چلی جس میں مختلف مذاہب کے لوگ شامل تھے۔ اسی حالت میں لوگ کالیکٹ کی عدالت عالیہ تک پہنچے۔ ہائی کمشنر نے شیخ کی یہ عظمت وجلال دیکھا تو خود آگے بڑھ کر تعظیم کی اور احترام کے ساتھ کرسی پر بٹھایا اور گرفتار کرنے والے دو سپاہیوں کو زخمی کرنے کے واقعہ کا انکار کرنے کے لئے کہا اور ایک روایت کے مطابق ان سے کہا کہ ٹیکس ادا نہ کرنے کا عذر بیان کردیں مگر ان کی غیرت ایمانی نے اس کو گوارا نہیں کیا۔ انہوں نے صاف انکار کردیا اور کہا کہ انہوں نے ہی سپاہیوں کو مارا ہے اور عمداً مارا ہے۔ تب اس نے کہا کہ اگر میں ان کے اقرار کے باوجود ان کے خلاف مقدمہ دائر نہ کروں تب قانون کی رو سے میں خود مجرم قرار پاؤں گا چنانچہ اس نے انہیں جیل میں ڈال دیا۔ جیل سے انہوں نے اپنے شیخ ومرشد شیخ علوی منفرمی کو چند اشعار لکھ کر بھیجے جن سے جیل میں ان کی مشقتوں نیز ان کے جذبات اور عزائم کا بھی کسی قدر اندازہ ہوتا ہے۔

وبعد فشريف السلام المؤبد — إلى حضرة العلوى شيخي و مرشدي

تريمي دار حضرمي شريف من — خلاصة أولاد النبي محمد

له في ترور نغادي في أرض منفرم — عيال ديار مع مقام و مسجد

سلام من المحبوس خدا مكم عمر — مريدكم العاصي الفقير المكمد

فصيّرني في الحبس صاحب تكّد — على ظلم نيبو صاحب و هو معتدى

فوكل بي حيوان كفر ليحرسوا — حذار ذهابي للمكان المبعد

وما في يدى من عدة آلة — و لو نحو سكين و غير المحدد

نفوس الورى للموت فالله خلقها — فموت سبيل الله خير لمقتد

دعائكم يا سيدى خير بغية — لأصلح في الدنيا وللفوز في غد(۱)

(ترجمہ) نیک خواہشات کے ساتھ سلام دوام پہنچے میرے شیخ ومرشد حضرت علوی کی خدمت بابرکت میں جو تریم (حضرموت) کے رہنے والے ہیں۔ سید ہیں۔ نبی ﷺ کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ترورنگاڈی (منفرم) میں جن کے اہل وعیال، گھربار

(۱) یہ پوری تفصیل تحفۃ الاخیار (مخطوطہ) سے ماخوذ ہے۔ مختصراً ان کے ٹیکس ادا نہ کرنے اور انگریزوں کے انہیں گرفتار کرنے کا ذکر المسلمون فی کیرالا، صفحہ ۹۱-۹۲ میں بھی موجود ہے۔

مقام اور مسجد ہے، اپنے کفش بردار، ذرۂ بے مقدار گنہگار مرید عمر کا سلام قبول ہو، جو اس وقت قیدی، دشمن کے ہاتھوں میں گرفتار، فقیر و لاچار اور رنج و الم کا شکار ہے۔ ظالم و جابر ٹیپو صاحب (۱) کے ظلم کی وجہ سے مجھے تکلڈی کے حاکم نے قید میں ڈال دیا ہے اور درندہ صفت کافروں کو میری نگرانی کے لئے متعین کیا ہے۔ خبردار جو میں ذرا دور جا سکوں۔ افسوس میں بے بس ہوں، میرے ہاتھ میں کوئی ایک ہتھیار بھی نہیں ہے۔ کاش کوئی کند چھری ہی ہوتی۔ تمام مخلوق کو اللہ نے مرنے ہی کے لئے پیدا کیا ہے۔ تو اللہ کے راستہ کی موت کتنی اچھی موت ہے۔ اے میرے آقا میں آپ کی دعا کا طلبگار رہوں تاکہ دنیا میں بھی صحیح راستہ پر رہوں اور آخرت میں بھی کامیاب ہو جاؤں۔

کچھ عرصہ کے بعد آپ کو رہائی ملی ۱۲۷۳ھ (۲) (۵۷-۱۸۵۶) میں آپ نے انتقال کیا۔ اس وقت آپ کی عمر نوے سال سے متجاوز تھی۔ آپ اپنے زمانہ کے بہت بڑے مفتی بھی تھے۔ اور کبار اولیاء اللہ میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ آپ کی کرامتیں اب تک کیرلا میں زبان زد خاص و عام ہیں۔ آپ مستجاب الدعوات تھے۔ بڑے بارعب، باوقار، پرجلال، عالی ہمت اور صاحب عزم و حوصلہ تھے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے معاملہ انتہائی بے لچک، کسی کی مطلق پروا نہیں کرتے تھے۔

سید فضل منفری، انگریزوں کے خلاف سازشیں اور جلا وطنی

شیخ علوی مذکور کے صاحبزادہ اور بڑے عالم و فاضل شخص تھے۔ ۱۲۴۰ھ (مطابق ۱۸۲۴ء) میں کیرلا (۳) میں پیدائش ہوئی۔ اور اپنے والد بزرگوار کی نگرانی میں پرورش پائی اور علماء کبار سے علم حاصل کر کے علم و فضل میں نام پیدا کیا اور معاشرہ میں ایک مقام بنایا۔ لوگ ان کو احتراماً "پوکویا تنغل" کہتے تھے جس کے معنی ملیالم زبان میں

---

(۱) ایک انتہائی ظالم و جابر کمشنر تھا آج تک کیرلا میں لوگ اس کو یاد رکھے ہوئے ہیں۔

(۲) تاریخ الابرار کے مصنف نے تاریخ وفات محرم ۱۲۷۳ لکھی ہے۔ جس کے مطابق ستمبر ۱۸۵۶ء ہوتا ہے جب کہ شیخ محمد علی موسلیار نے تحفۃ الاخیار میں ذوالحجہ ۱۲۷۳ھ درج کی ہے، جو جولائی ۱۸۵۷ء کے مطابق ہوتی ہے۔

(۳) یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضر موت میں پیدا ہوئے، پہلا قول زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ ان کے والد ۱۱۸۳ھ ہی میں ہندوستان آگئے تھے پھر دوبارہ ان کے یمن جانے کا ذکر نہیں ملتا۔

بڑے سید کے ہوتے ہیں (۱)

انہوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں (۲)، جن میں حلل الإحسان في تزئين الإنسان، بوارق الفطانة لتقوية البطانة، رسالة المسلم العالي لإدراك المعالي، السيف البتار على الملحدين والكفار، عدة الأمراء والحكام لإهانة الكفرة وعبدة الأصنام وغیرہ شامل ہیں۔

سامراجیت سے نفرت اور جذبہ جہاد موروثی تھا۔ آنکھ کھولی تو اپنے والد کو انگریزوں کے خلاف منصوبے بناتے اور لڑتے ہوئے پایا۔ اس لئے بچپن ہی سے انگریزوں کے خلاف ہونے والی کارروائیوں میں حصہ لینے لگے۔ وہ بہت ذہین، زیرک اور اعلیٰ درجہ کی سیاسی سوجھ بوجھ کے مالک تھے جیسا کہ بعد کے واقعات سے اندازہ ہوتا ہے۔ ابھی نوجوان ہی تھے کہ لوگوں نے انہیں جنگ آزادی کے قائد کی حیثیت سے جانا اوران کی قیادت تسلیم کی۔ ۱۸۴۳ء کی انگریز مخالف جنگ میں اپنے والد ماجد کے ساتھ شرکت کی اور خوب خوب دادشجاعت دی۔ اس وقت وہ اٹھارہ انیس سال کے نوجوان تھے۔ وہ بہت ہی نڈر اور انتہائی بہادر تھے۔ حق کے معاملہ میں کسی کی مطلق رعایت نہیں کرتے تھے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں بالکل رواداری کے قائل نہیں تھے۔ عدۃ الامراء والحکام درحقیقت انہوں نے انگریزوں کے رد ہی میں لکھی تھی اس میں انہوں نے الفاظ کے تیرونشتر سے ان پر خوب حملے کئے تھے اور مسلمانوں کو ان کے خلاف جنگ پر آمادہ کیا تھا۔ اس پر ایک ہنگامہ برپا ہوا یہاں تک کہ انگریزوں نے اس کتاب پر پابندی لگادی (۳) انگریزوں کو ان سے بڑا خطرہ محسوس ہوتا تھا یہاں تک کہ ضلع مجسٹریٹ نے کئی بار حکومت مدراس سے مشورہ کیا کہ انہیں جلاوطن کیا جائے۔ لیکن حکومت جنگ میں ان کی براہ راست شرکت کا کوئی ٹھوس ثبوت فراہم نہیں کرپائی جس کی

---

(۱) پو، ملیالم میں پھول کو کہتے ہیں اور کویا کے معنی سید کے ہیں اور تنغل بھی سید کو کہتے ہیں اس میں احترام زیادہ ہوتا ہے۔

(۲) تحفة الأخيار في تاريخ علماء مليبار (مخطوطہ مصنف) نیز دیکھئے المسلمون في كيرالا، صفحہ ۱۸۸

(۳) تحفة الأخيار في تاريخ علماء مليبار (مخطوطہ مصنف)

بنیاد پر قانونی طور پر جلا وطن کیا جانا ممکن ہو۔ آخر فروری ۱۸۵۲ء میں حکومت نے انہیں مالا بار سے جلاوطن کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان کے خلاف جو فردِ قرار داد جرم عائد کی گئی اس کی دفعات حسب ذیل ہیں :

(الف) ۱۸۰۰ء کی بغاوت میں ترورنگاڈی کی مسجد سے دو آدمیوں کو گرفتار کیا گیا اور یہ مسجد سید علوی کی تولیت میں تھی۔

(ب) ۱۸۴۰ء کی بغاوت میں کچھ باغی منفرم گئے اور انہوں نے سید سے دعا کی درخواست کی۔

(ج) جن لوگوں نے زمیندار نمبودری (۱) کے قتل کا بیڑا اٹھایا تھا، وہ جب ترورنگاڈی کی طرف بھاگے اور راستہ میں پولس نے انہیں گرفتار کر کے تفتیش کی تو انہوں نے کہا کہ ہم سید صاحب خدمت میں جارہے ہیں۔

(د) سید فضل نے لوگوں کو جمعہ کے دن کھیتوں میں کام کرنے سے روکا۔

(ہ) برہمنوں کا بچا ہوا کھانے سے بھی منع کیا۔(۲)۔

چونکہ حکومت نے جلاوطن کرنے کی ٹھان لی تھی، اس لئے اس طرح کے لیچر الزامات عائد کئے۔ ان میں تین الزامات کا تعلق ان کی ذات سے نہیں ان کے والد سے تھا اور دنیا کا کوئی قانون باپ کے بدلے بیٹے کو سزا دینے کی اجازت نہیں دیتا۔ ممکن ہے کہ ایسے انگریز دشمن مجاہد باپ کا بیٹا ہونا ہی انگریزوں کے نزدیک ان کی جلاوطنی کا جواز فراہم کرتا ہو۔ اور مؤخر الذکر دو الزامات بھی بظاہر ایسے نہیں معلوم ہوتے جن کی بنیاد پر کسی کو جلاوطن کیا جاسکے۔ مگر یہ انگریزی مفادات کے خلاف تھے اور انگریز اس حقیقت کو بخوبی سمجھتے تھے۔ اس لئے انگریزوں نے انہیں کو کافی سمجھا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ چونکہ شیخ سید فضل انگریزوں کے خلاف کارروائیوں کی سرپرستی کرتے تھے، اور انگریز مخالف پالیسی بنانے میں نہایت کمال رکھتے تھے اور انگریز ان سے تنگ آگئے تھے، اس لئے چاہتے تھے کہ کسی طرح ان کو جلاوطن کر کے ان سے نجات حاصل کریں۔ اسی میں وہ اپنی عافیت سمجھتے تھے۔ لیکن چونکہ سید موصوف انتہائی مہارت سے کام کرتے تھے، اس

(۱) اس کا قصہ آگے آرہا ہے۔

(۲) ملاحظہ ہو المسلمون فی کیرالا، صفحہ ۹۶

لئے انگریزوں کو ان کے خلاف کوئی قطعی ثبوت نہیں ملتا تھا۔ لہٰذا مندرجہ بالا فرد جرم عائد کی اور انہیں الٹی میٹم دیدیا۔ سید فضل کو جب یقین ہو گیا کہ ان کی جلاوطنی طے شدہ امر ہے تو انکی غیرت نے گوارا نہیں کیا کہ انگریزوں کے ہاتھ چڑھیں۔ انہوں نے از خود ہندوستان چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ آٹھ ہزار عقیدت مندوں نے پر پنگاڈی Parappanangadi تک ان کی مشایعت کی اور اپنے اس عظیم قائد کو آخری سلام کیا اور ڈبڈباتی آنکھوں سے الوداع کہا۔ اس طرح ملک وملت کا یہ بے لوث خادم ہمیشہ کے لئے ہندوستان سے رخصت ہوا اور ہندوستان اس کی خدمات سے محروم ہو گیا۔

ان کی جلاوطنی کے بعد مسلمان غیظ وغضب میں بھڑک اٹھے اور انگریزی حکومت کے خلاف انتہا پسندانہ کارروائیوں کا فیصلہ کیا اور بیس ہزار لوگوں نے کالیکٹ کے کمشنر کنول صاحب کے محل کا گھیراؤ کیا پھر محل کے اندر گھس کر اس کو قتل کر ڈالا۔

ہندوستان سے ہجرت کر کے اپنے سابق وطن تریم (حضرموت) گئے۔ وہاں چند دن قیام کر کے مکہ معظّمہ کا رخ کیا۔ حج وعمرہ سے فارغ ہو کر بہت سے عرب ملکوں کی سیاحت کرتے ہوئے مصر پہنچے۔ عباس پاشا خدیو مصر نے بڑی آؤ بھگت کی اور مصر میں قیام کی پیش کش کی مگر آپ نے معذرت کی اور مکہ روانہ ہو گئے (۱)۔ سلطان عبدالعزیز (۱۸۶۱ء-۱۸۷۶ء) کے زمانہ میں آستانہ (استنبول) گئے اور خلافت عثمانیہ سے روابط پیدا کئے۔ ان کی انتظامی صلاحیتوں کا دور دور تک شہرہ تھا۔ یہاں تک اہل ظفار (۲) نے

(۱) یہ تفصیل شیخ محمد علی موسلیار کے بیان کے مطابق ہے۔ جب کہ علامہ خیر الدین الزرکلی نے لکھا ہے کہ وہ ہندوستان سے ہجرت کر کے مکہ چلے آئے جو ان کے دادا کا وطن تھا۔ مگر ہمارے خیال میں علامہ زرکلی سے غلطی ہوئی ہے۔ اس لئے کہ ان کے والد سید علوی بن محمد حضرموت سے ہجرت کر کے اپنی نوجوانی ہی میں ہندوستان پہنچے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دادا مکہ میں نہیں یمن ہی میں رہتے تھے۔ ان کے دادا کا نام محمد بن سھل بن محمد بن احمد بن سلیمان بن عمر تھا۔ انہی کے ہم نام ایک یمنی عالم محمد بن سھل بن محمد بن احمد بن عبداللہ بن عبدالرحمٰن مکہ میں رہتے تھے اور انہوں نے ہندوستان کا سفر بھی کیا تھا (دیکھئے شمس الظہیر ۲/۵۳۵) چونکہ ان میں اور ان کے دادا کے نام میں کئی اجداد تک یکسانیت ہے۔ غالباً یہیں سے زرکلی کو وہم ہوا ہو واللہ اعلم۔

(۲) ظفار نام کے دو شہر ہیں۔ ایک شمالی یمن میں جس کو ظفار صنعاء اور ظفار الاشراف بھی کہتے ہیں۔ یہ ایک تاریخی شہر تھا۔ حمیری سلطنت کا پایۂ تخت تھا۔ اور ایک ظفار حضرموت اور عمان کے درمیان بحر عرب کے ساحل پر جزیرۃ العرب کے بالکل جنوبی سرے پر واقع ہے۔ یہی یہاں مراد ہے۔

سلطنت عثمانیہ کی تائید سے انہیں دعوت دی اور شعبان ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء میں انہیں ظفار کی حکومت تفویض کی۔ تمام قبائل نے ان کو اپنا حاکم تسلیم کیا اور ان کی اطاعت قبول کی مگر ان کے خلاف خفیہ سازشیں ہو رہی تھیں۔ یہاں تک ۱۲۹۷ھ (۱) مطابق ۱۸۷۹ء میں ایک قبیلہ نے ان کے خلاف بغاوت کر دی۔ انہوں نے مقابلہ کیا، انگریز اپنے اس قدیم دشمن کو ابھی نہیں بھولے تھے انہیں کھیل کھیلنے کا خوب موقع ملا۔ انہوں نے یہاں بھی اپنی کارستانی دکھائی اور باغی قبیلہ کا بھرپور تعاون کیا اور کیا بعید اپنی مدد کا یقین دلا کر بغاوت پر انہوں نے ہی آمادہ کیا ہو۔ نتیجۃً سید فضل کو شکست ہوئی، اور وہ مشہور ساحلی شہر مکلا چلے گئے اور وہاں سے استنبول کا رخ کیا (۲)۔ اور اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی بنیاد پر بہت جلد سلطان عبد الحمید (۱۸۷۶ء-۱۹۰۹ء) کے دربار میں بار پایا اور امراء و فضلاء سے پینگ بڑھائے۔ جن میں سید جمال الدین افغانی بھی شامل ہیں۔ ان کی تحریک کا دائرہ اثر وسیع کرنے میں ان کا تعاون کیا۔ اس سے پہلے وہ سلطنت عثمانیہ کے وکیل کی حیثیت سے کام کرتے تھے اور یمن و عمان میں سلطنت عثمانیہ کا اثر و نفوذ قائم کرنے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ استنبول پہنچ کر یہیں کے ہو رہے اور اسی کو اپنا وطن بنالیا۔ سلطان عبد الحمید نے ان کی قدر افزائی کی اور ان کو تمغہ عنایت کیا (۳)۔ اور بعض بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو منصب وزارت سے بھی سرفراز کیا (۴)۔ مگر وہ ابو الہدیٰ الصیادی کے حسد کا شکار ہوئے، جو دربار شاہی کا حاضر باش اور سلطان کے مزاج میں دخیل ہو گیا تھا۔ وہ ان کے پیچھے پڑ گیا۔ ان کے خلاف سلطان کے کان بھرتا رہتا تھا۔ امیر البیان علامہ شکیب ارسلان تحریر فرماتے ہیں :

مجھے ایک نشریہ ملا جو ابو الہدیٰ صیادی کی طرف سے شائع ہوا تھا اسمیں اس نے اپنے تین دشمنوں کی خوب خبر لی تھی۔ ایک امیر ظفار سید فضل علوی، دوسرے طریقہ شاذلیہ کے شیخ، شیخ ظافر الدین طرابلسی اور تیسرے سید جمال الدین افغانی۔ وہ تینوں سلطان

---

(۱) شمس الظہیرۃ میں ۱۲۹۶ھ لکھا ہے۔
(۲) دیکھئے الأعلام للزرکلی، ۵/ ۱۵۰، دار العلم للملائین. بیروت۔
(۳) دیکھئے شمس الظہیرہ، ۱/ ۳۰۹
(۴) ایضاً صفحہ ۱۴۷۔

کے مقربین خاص میں سے تھے۔ اس میں اس نے ہر ایک کو جی بھر کر گالی دی تھی (۱)

۱۳۱۸ھ (۱۹۰۰ء) میں سید فضل نے انتقال کیا۔

حسن میدین کرکل اوران کے مجاہدانہ کارنامے (۲)

حسن میدین کرکل عالم فاضل شخص تھے۔ ریاضی ان کا خاص موضوع تھا اور ریاضی کی تعلیم وتدریس ہی ان کا مشغلہ تھا۔ کثیر تعداد میں طلبہ ان سے ریاضی کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اس کے ساتھ انگریز دشمن خاندان سے ان کا تعلق تھا۔ ان کے خاندان کے ایک ان کے ہم نام مجاہد حسن کی قیادت میں ۱۸۰۶ء میں انگریزوں کے خلاف ایک عظیم معرکہ ہو چکا تھا۔ اس لئے مجاہدانہ جذبات ایک حد تک ان کے خاندانی تھے۔ ذرا طاقت فراہم ہوتے ہی انہوں نے انگریزوں کے خلاف زبردست جنگ چھیڑ دی۔ وہ مدرس تھے۔ اس لئے وہ بآسانی ملک کی آزادی کی اہمیت جتا کر طلبہ کے ذہن مین انگریزوں کے خلاف جذبات بھڑکا کر جنگ پر آمادہ کر سکتے تھے۔

۱۸۴۹ء میں ان کے زیر قیادت ضلع ملاپورم کے مشہور شہر منجیری (Manjeri) میں سخت بغاوت ہوئی۔ انہوں نے اوران کے ساتھیوں نے انگریزی حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے پورا زور لگایا، جس کے نتیجہ میں حکومت کو کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ ساتھ ساتھ انہوں نے عوام سے رشوت لینے والے انگریزوں کے حلیف ساہوکاروں اور حکومت کے عہدیداروں کو بھی نشانہ بنایا۔ حکومت نے ان پر پابندی لگائی کہ وہ کسی کو پڑھا نہیں سکتے۔ نیز ایک سرکلر جاری کیا جس میں لوگوں کو ان سے تعلیم حاصل کرنے کی ممانعت کر دی گئی۔ حکومت نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ ان جیسی محترم شخصیت پر چوری کا الزام لگا کر گھر کی تلاشی لی اوران کے والد کو گرفتار کر کے عدالت میں حاضر کیا۔ اوران کو بھی مسجد سے گرفتار کرنے کی کوشش کی۔ مگر وہ ان کے قبضہ میں نہیں آئے۔ انہوں نے ہتھیار ڈالنے

---

(۱) حاضر العالم الإسلامی ۲/۲۹۴

(۲) بظاہر شیخ حسن کرکل کے خاندان سے ان کا تعلق معلوم ہوتا ہے اور ممکن ہے کہ ان کے پوتے ہی ہوں اس لئے کہ شیخ حسن کرکل کے ایک لڑکے کا نام محی الدین تھا۔ ہوسکتا ہے کہ میدین اسی کی بگڑی ہوئی شکل ہو جیسا کہ کیرلا میں محی الدین کا عام تلفظ ہے۔

سے صاف انکار کیا اور موت تک مقابلہ کی قسم کھائی۔ ان کا جوش وخروش اور عزم و جرأت دیکھ کر مزید پندرہ آدمی اسی وقت مرنے پر آمادہ ہو گئے۔ اور انہوں نے عہد کیا کہ جب تک جان میں جان ہے انگریزوں سے مقابلہ کریں گے۔

انہوں نے پروگرام بنایا کہ پہلے انگریزوں کے ہوا خواہ ان با حیثیت ہندوستانیوں کو تہ تیغ کریں، عوام جن کے ظلم وستم کی چکی میں پسے ہوئے تھے اور جن کی وجہ سے مجاہدین آزادی کے لئے رکاوٹیں پیدا ہوتی تھیں۔ چنانچہ پروگرام کے تحت انہوں نے ۲۰/اگست ۱۸۴۹ء کو پانڈی کاڈ (Pandikad) میں واقع مشہور سود خور مہاجن نمبودری کے مکان کا رخ کیا جو اس وقت گھر میں موجود نہیں تھا۔ اس کا نوکر مقابلہ پر آیا جو مارا گیا۔

اسی طرح منجیری کا راجا جو بڑا ظالم تھا۔ اس نے مسلمانوں اور ہندوؤں سے زبردستی چندہ کر کے ایک مندر بنوایا تھا۔ اسکی زیادتیوں کی وجہ سے ہندو مسلمان سب اس سے نالاں تھے۔ ساتھ ہی وہ انگریزوں کا بڑا حلیف تھا اور مجاہدین کے کاموں میں رکاوٹیں ڈالتا تھا۔ اسلئے اسکو بھی پردہ سے ہٹانا وہ ضروری سمجھتے تھے چنانچہ اب اسکی باری تھی۔

وہ اسی مندر میں ایک سو برہمنوں کے ساتھ دھوم دھام سے جنم اشٹمی منا رہا تھا۔ مجاہدین کی یہ جماعت وہاں پہنچی اور مندر کا محاصرہ کیا۔ ان لوگوں کی جان لینا ان کا مقصد نہیں تھا، بلکہ وہ صرف راجا پر دھاک بٹھانا چاہتے تھے کہ انگریزوں کی حمایت و موافقت کا نتیجہ بہت سنگین ہو سکتا ہے اور اس لئے بھی دھاوا بولنا مناسب نہ سمجھا ہو کہ اس وقت راجا کے ساتھ بہت سے بے گناہ برہمن تھے، حملہ کے نتیجہ میں ان کو بھی نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ چنانچہ حملہ کرنے کے بجائے جو لوگ مندر میں موجود تھے ان سے مطالبہ کیا کہ امن کے ساتھ نکل جائیں۔ وہ سب نکل گئے۔ کسی کو مجاہدین نے نقصان نہیں پہنچایا۔ ایک خادم جو بہرا تھا وہ اشارہ سمجھ نہیں پایا اس کو البتہ کچھ چوٹ پہنچی۔ آٹھ دن تک مجاہدین وہیں پڑے رہے۔ یہاں تک انگریزوں کی فوج آ گئی تو دونوں میں سخت لڑائی ہوئی۔ ایک افسر سمیت چار انگریز فوجی مارے گئے اور باقی ماندہ فوج نے راہ فرار اختیار کی۔

اس واقعہ کے بعد مجاہدین کی جماعت میں کافی اضافہ ہوا۔ یہاں سے وہ انگاڈی پورم (Angadippuram) گئے۔ وہاں بھی زبردست جنگیں ہوئیں جن میں فریقین کا

کافی نقصان ہوا۔

انگریز مؤرخ لوگن (Loggen) مجاہدین کے جذبہ جہاد کے بارے میں لکھتا ہے :

پہلے مجاہدین نے بڑے پیمانہ فائرنگ کی۔ جب گولیاں ختم ہوئیں تو تلوار، چھری، کٹار اور تیروں، برچھوں، بھالوں سے کام لیا۔ زخمی ہو کر جب زمین پر گر گئے تو انہوں نے ہماری فوج پر نیزے پھینکے اور مقابلہ جاری رکھا، یہاں تک کہ بری طرح قتل کر دئے گئے۔ ان کے جوش وخروش کا یہ عالم تھا کہ میدان جنگ میں ایک کی ٹانگ ٹوٹ گئی جس کا علاج نہ ہو سکا مگر اس شدید تکلیف کے باوجود وہ سات دن تک اسی حال میں برابر لڑتا رہا اس کی خواہش بس یہی تھی کہ جام شہادت نوش کرنے سے پہلے کسی دشمن کو قتل کر دے۔

مزید لکھتا ہے کہ ان جنگوں کے بھڑک اٹھنے کے (باغی لیڈروں کے بیان کے مطابق) بہت سے اسباب تھے : غیر منصفانہ معاملات، عدالت کی طرف سے ان کے خلاف صادر کردہ ظالمانہ احکامات، جعلی دستاویزات، بغیر کسی سبب کے ان کا مال قرق کرنا اور گھروں کو خالی کروانا وغیرہ۔

ان جنگوں کی تفصیل دیکھنے کے بعد شاید کسی کو شبہ ہو کہ مجاہدین ہندوؤں کے بھی مخالف تھے اور ان کے خلاف جہاد کرنا چاہتے تھے۔ مگر یہی مؤرخ اس سلسلہ میں آگے وضاحت کرتا ہے :

باغی ہندوؤں کے مخالف نہیں تھے نہ انہوں نے ان پر کوئی ظلم کیا بلکہ یہ جنگیں سامراجیوں کے خلاف تھیں۔ اور صرف ان برہمن اور نائر زمینداروں اور سرمایہ داروں کے خلاف تھیں جو انگریزوں کے حامی تھے اور ان کو مدد پہنچاتے تھے۔ باغیوں کے بس میں تھا اگر وہ چاہتے تو ہندوؤں کو قتل کر سکتے تھے۔ (جیسا کہ منجیری کے راجا کے واقعہ سے بھی صاف ظاہر ہے) مگر انہوں نے ان کو کوئی گزند نہیں پہنچائی، نہ ان کے مندروں کی بے حرمتی کی اور نہ ان کو گرایا۔ (۱)

---

(۱) دیکھئے المسلمون فی کیرالا، صفحہ ۹۳-۹۴

سید کنج کویا

سید کنج کویا(Kunhikkoya Thangal) کیرلا کے مشہور واعظ تھے۔ دور دور تک ان کے وعظ کی شہرت تھی۔ لوگ کھنچ کھنچ کر ان کی مجالس وعظ میں آتے تھے اور استفادہ کرتے تھے۔ اس طرح ان کے پاس بہترین موقع تھا کہ اپنے مواعظ سے لوگوں میں انگریزوں کے خلاف جذبات پیدا کریں۔ انہوں نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ خود اپنے دونو جوان بیٹوں کے ساتھ میدان جہاد میں کود پڑے۔ حسن میدین کرکل نے انگریزوں سے جو جنگیں لڑیں ان میں وہ پیش پیش رہے اور حصول آزادی کے لئے اپنی پوری توانائی لگادی۔ (۱) لوگن کے سابقہ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب مجاہدین شہادت سے سرفراز ہوئے۔

(۱) المسلمون فی کیرالا صفحہ ۹۳، مصنف نے اسی کتاب میں دوسری جگہ (صفحہ ۱۹۸) سید احمد کنجی کویا ماشغل کے نام سے ایک عالم کا ذکر کر کے ان کی چار کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ممکن ہے کہ اس سے مراد یہی مذکورہ بالا واعظ ہوں۔ واللہ اعلم

باب دوازدھم

مختلف مقامات پر علماء کی متفرق سرگرمیاں

۱۔ مولانا ناصر الدین محمد مدراسی اور انگریزی حکومت کی مخالفت
۲۔ قطب ویلور مولانا شاہ عبد اللطیف قادری پر انگریز مخالفت کا الزام اور اسیری
۳۔ شاہ محمد سلیمان تونسوی اور انگریزوں کے تئیں ان کا موقف
۴۔ مولانا حافظ محمد علی خیر آبادی اور انگریزوں سے تنفر و بیزاری
۵۔ نواب فقیر محمد خان گویا اور جنگ آزادی کا منصوبہ
۶۔ مولانا عبد اللہ فیروز پوری پر مسٹر فریزر کے قتل کا الزام اور پھانسی
۷۔ مولانا محمود بخش کاندھلوی اور انگریزوں سے انتہائی بیزاری
۸۔ مولانا شاہ محمد ظہور الحق صاحب پھلواروی اور انگریزوں سے اظہار تنفر
۹۔ مولانا عظیم اللہ بہاری اور انگریزوں کے بارے میں انکا نقطۂ نظر
۱۰۔ خلیفہ نبی بخش خاں لغاری کا جذبۂ آزادی
۱۱۔ نواب غلام شاہ لغاری کا جنگ آزادی میں حصہ
۱۲۔ حضرت اخوند صاحب سوات اور ان کے مجاہدانہ کارنامے

مولانا ناصر الدین محمد مدراسی
اور انگریزی حکومت کی مخالفت

مولانا ناصر الدین محمد اہل نوائط سے تھے۔ کوکن کے علمی خانوادہ سے آپ کا تعلق تھا جس میں کئی پشتوں سے علمی و دینی سیادت رہی ہے۔ آپ کے والد قاضی نظام الدین احمد صغیر (المتوفی ۱۱۸۹ھ) کو نواب ارکاٹ محمد علی والا جاہ کے یہاں بڑا مقام حاصل تھا۔ انہوں نے زبور اور انجیل کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا اس وقت جب کہ انگریزوں کے تسلط کی بناء پر صوبہ مدراس میں عیسائیت کا بڑا چرچا ہونے لگا تھا۔ مولانا نظام الدین احمد نے عیسائی مبلغین کی روز بروز بڑھتی ہوئی طاقت کے پیش نظر عوام کو ان کے دین کی حقیقت سے روشناس کرانے کے لئے زبور اور انجیل کا فارسی میں ترجمہ کیا۔

مولانا ناصر الدین محمد انہیں غیرت مند اور باحمیت عالم دین کے فرزند ارجمند تھے۔ انہوں نے اپنے والد ماجد اور ارکاٹ کے دوسرے اساتذہ سے عربی اور فارسی کی تعلیم پائی تھی۔ والد کی وفات کے بعد نواب محمد علی والا جاہ نے ان کو ارکاٹ کی عدالت کا داروغہ مقرر کیا۔

مولانا ناصر الدین محمد انگریزی حکومت کے سخت مخالف تھے۔ انہوں نے نواب محمد علی والا جاہ کے نام ۳ر ربیع الاول ۱۱۹۹ھ کو ایک خط لکھا ہے جس میں انگریزوں کی شکایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ارکاٹ کے تمام باشندے انگریزوں کے ظلم و ستم سے نالاں ہیں کیونکہ ان لوگوں نے وہاں کی عمارتوں پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہے، اس لئے یہاں کے لوگ ہر وقت خدا سے دعائیں مانگ رہے ہیں کہ ان ظالموں کو یہاں سے نکالے''

مولانا محمد یوسف کوکن عمری اس خط کو نقل کر کے لکھتے ہیں کہ ان کے خط کے

اسلوب سے پتہ چلتا ہے کہ وہ انگریزوں کی بڑھتی ہوئی طاقت وحکومت کے سخت مخالف تھے اور انہیں نکالنے کی تدبیریں کرنا چاہتے تھے۔(۱)

مولانا ناصر الدین کا ۲۸؍رمضان ۱۲۰۶ھ (اپریل ۱۷۹۲ء) کو ارکاٹ میں انتقال ہوا۔ آپ کے فرزند عالی مقام مولانا محمد غوث شرف الملک بہادر (المتوفی ۱۲۳۸ھ) نے ''فتاویٰ ناصریہ'' کے نام سے آپ کے فتاویٰ کتابی شکل میں مرتب کئے ہیں۔ جنوب کے مشہور عالم قاضی بدر الدولہ علامہ صبغۃ اللہ مدراسی (المتوفی ۱۲۸۰ھ) انہیں مولانا محمد غوث کے صاحبزادہ تھے۔

قطب ویلور حضرت مولانا شاہ عبداللطیف قادری پر انگریز مخالفت کا الزام اور اسیری

خانوادۂ اقطاب ویلور کے پانچویں بزرگ حضرت مولانا سید محی الدین شاہ عبد اللطیف ویلوری ۱۲۰۷ھ میں ویلور میں پیدا ہوئے۔ مروجہ تعلیم سے فراغت کے بعد مدراس جا کر مولانا محمد باقر آگاہ اور ملا بحر العلوم عبد العلی وغیرہ سے استفادہ کیا۔ مزید تحصیل واستفادہ کے لئے حضرت شاہ عبد العزیز کی خدمت میں دہلی جانا چاہتے تھے مگر نہیں جا سکے۔ آپ پر یہ الزام لگا کہ اپنے مواعظ میں انگریز کمپنی کے خلاف مسلمانوں میں نفرت کے جذبات ابھارتے ہیں اور انہیں جہاد کی ترغیب دے رہے ہیں۔ انگریزی حکومت جہاد کا نام سنتے ہی بے چین ہوگئی، فوراً آپ کی گرفتاری کا وارنٹ جاری ہو گیا اور آپ کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کر کے چتور کے جیل میں آپ کو نظر بند کر دیا گیا۔ پچاس دن آپ نے اسیری میں کاٹے۔ جب معاملہ کی تحقیق کی گئی تو جرم ثابت نہیں ہوا اس لئے حکومت نے آپ کو باعزت بری کر دیا(۲)

(۱) خانوادۂ قاضی بدر الدولہ صفحہ ۱۴۱۔ آپ کے اور آپ کے خاندان کے مفصل حالات اس کتاب میں ہیں۔

(۲) مختصر تعارف خانوادۂ اقطاب ویلور صفحہ ۵۳، از محمد زکریا ادیب خاور راجکوٹی۔ واقعہ کی تفصیل اور پس منظر کے لئے دیکھئے اکتساب نظر صفحہ ۷۳ تا صفحہ ۷۸ از مولانا محمد ظہیر باقوی معروف بہ ڈاکٹر راہی فدائی۔ ڈاکٹر راہی فدائی کا یہ کہنا کہ مؤلف خانوادۂ اقطاب ویلور مولانا زکریا ادیب خاور نے اپنے کتابچہ میں اس واقعہ کو نظر انداز ہی کر دیا ہے صحیح نہیں ہے۔
جب آپ کی برأت ثابت ہوئی تو ملکہ وکٹوریہ نے آپ کی خدمت میں معذرت نامہ بھیجا۔ ==

اس واقعہ کے بعد آپ کبیدہ خاطر ہوئے اور ویلور کی سکونت کا ارادہ ترک کر کے شعبان ۱۲۶۰ھ میں حرمین کے لئے روانہ ہو گئے، مگر دو سال بعد ایک خواب کی وجہ سے ہندوستان واپس تشریف لے آئے۔ مکہ مکرمہ کے زمانۂ قیام میں شاہ محمد اسحاق دہلوی سے بھی آپ نے ملاقات کی اور شاہ صاحب نے آپ کو سند تحصیل عطا فرمائی۔ ۱۲۸۸ھ میں دوبارہ زیارت حرمین کے لئے تشریف لے گئے۔ اور حج سے فراغت کے بعد ۱۲؍محرم ۱۲۸۹ھ کو مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ (۱)

شاہ محمد سلیمان تونسوی اور انگریزوں کے تئیں ان کا موقف

شاہ محمد سلیمان تونسوی تیرہویں صدی ہجری کے بلند مقام صوفیائے کرام میں سے تھے اور پنجاب میں سلسلۂ چشتیہ کے نمائندے سمجھے جاتے تھے۔ مولانا عبدالحئی حسنی تحریر فرماتے ہیں :

انتهت إليه رئاسة الطريقة الچشتية فی حدود الهند الغربية الشمالية و فی پنجاب فی عهده (۲)

== حضرت قطب ویلور نے اس کے جواب میں ایک دعوت نامہ لکھا جس میں اسلام کی حقانیت و صداقت ثابت کی گئی تھی اور ملکہ وکٹوریہ کو اسلام کی دعوت دی گئی (خانوادۂ اقطاب ویلور صفحہ ۵۴) اس کے برخلاف مولانا محمد یوسف کوکن عمری اپنی کتاب ''عربک اینڈ پرشین ان کرناٹک'' میں لکھتے ہیں کہ ملکہ وکٹوریہ کو دعوت اسلام دینے کی وجہ سے غلط فہمی پیدا ہو کر حضرت قطب ویلور کو اسیر بنایا گیا تھا (ملاحظہ ہو اکتساب نظر صفحہ ۴۷)

ڈاکٹر راہی فدائی کی تحقیق یہ ہے کہ قطب ویلور کی رائے انگریزوں سے جہاد کی نہیں تھی (دیکھئے اکتساب نظر صفحہ ۶۵) نیز ان کا یہ بھی خیال ہے کہ جنوب کے علماء نے شمال کے علماء کے برعکس دعوتی مقاصد کے پیش نظر انگریزوں سے خوشگوار تعلقات رکھے اور ان کے خلاف جنگ سے کنارہ کش رہے مگر ان کی یہ رائے صحیح نہیں ہے۔ مبارز الدولہ کی بغاوت میں انگریزوں سے جہاد کرنے والے اور کیرلا کی تحریک آزادی کی قیادت کرنے والے بہت سے علماء کا تذکرہ گزر چکا ہے بلکہ رہائی کے بعد خود قطب ویلور کی ہجرت بھی اسی کو بتاتی ہے کہ وہ انگریزوں کے مخالف تھے، ورنہ باعزت رہائی کے بعد ہندوستان کی سکونت ترک کر کے مستقل طور پر ارادہ ہجرت کے ساتھ حرمین جانے کی کیا توجیہ ہو گی سوائے اس کے کہ وہ اب ہندوستان میں قیام صحیح نہیں سمجھتے تھے۔ ہجرت ان کے نزدیک ناگزیر ہو گئی تھی، اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔

(۱) حالات و کمالات کے لئے دیکھئے خانوادۂ اقطاب ویلور صفحہ ۵۲ تا صفحہ ۶۴

(۲) الإعلام (نزهة الخواطر) ۲۲۷/۷

وہ اپنے زمانے میں ہندوستان کے شمال مغربی حدود اور پنجاب میں سلسلہ چشتیہ کی امامت کے منصب پر فائز تھے۔

۱۱۸۴ھ مطابق ۱۷۷۰ء میں آپ کی پیدائش ہوئی۔ قوم افغان سے آپ کا تعلق تھا۔ تونسہ میں میاں حسن علی سے قرآن پاک اور فارسی کی تعلیم حاصل کی، اور لانگھ (تونسہ سے پانچ کوس مشرق کی جانب دریائے سندھ کے کنارے واقع تھا) جا کر مولوی ولی محمد سے فارسی درسیات کی تکمیل کی۔ کچھ عرصہ بعد کوٹ مٹھن تشریف لے گئے اور وہاں قاضی محمد عاقل سے نحو، صرف، منطق اور فقہ وغیرہ کی تعلیم حاصل کی۔ فقہ و حدیث میں آپ کو پورا عبور حاصل تھا۔ چودہ پندرہ برس کی عمر میں سلسلہ چشتیہ کے مشہور شیخ شاہ نور محمد مہاروی (المتوفی ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۰ء) خلیفہ حضرت شاہ فخر الدین دہلوی (۱۱۹۰ھ/۱۷۸۴ء) سے بیعت ہوئے اور ۲۱، ۲۲ سال کی عمر میں خلافت پائی اور پیر و مرشد کے حکم سے تونسہ میں اقامت اختیار کی اور مسند رشد و ہدایت بچھائی، اور نصف صدی سے زائد عرصہ تک اس کو روشن رکھ کر اور ہزاروں لوگوں کو مستفیض کر کے ۱۲۶۷ھ (۱۸۵۰ء) میں وفات پائی۔ (۱)

حضرت شاہ محمد سلیمان کے زمانہ میں برطانوی اقتدار نہایت سرعت کے ساتھ بڑھ رہا تھا۔ مختلف مقامات پر عیسائی مشنری اپنے مذہب کی تبلیغ و تلقین میں سرگرم تھے۔ ایک طرف وہ ملازمتوں کا لالچ دیتے تھے، تو دوسری طرف مذہب کا پرچار کر کے لوگوں کے دین و ایمان پر ڈاکہ ڈالتے تھے۔ لوگ سراسیمگی کے عالم میں فرنگیوں کی زیادتیوں کی آپ سے شکایت کرتے رہتے تھے۔ ایک دن مولوی محمد حیات دہلوی نے عرض کیا۔

بسیار مسلماناں را فرنگیاں از دین محمدی برگردانیدہ از ایمان خارج کردہ اند کہ ایشاں دین مسیحا از جہت صحبت اختیار کردہ اند (۲)	فرنگیوں نے بہت سے مسلمانوں کو دین سے برگشتہ کر کے ایمان سے خارج کر دیا ہے اور ان لوگوں نے فرنگیوں کی صحبت کی وجہ سے دین مسیحی اختیار کر لیا ہے۔

(۱) تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ مشائخ چشت صفحہ ۶۰۸ تا صفحہ ۶۶۶ (ندوۃ المصنفین) یا کتاب مذکور جلد پنجم صفحہ ۳۲۷ تا صفحہ ۳۸۲۔ (ادارہ ادبیات دلی، ۱۹۸۲ء)

(۲) نافع السالکین (ملفوظات خواجہ محمد سلیمان تونسوی) صفحہ ۱۴، مطبع مرتضوی دہلی، ۱۳۱۰ھ-۱۸۹۲ء

اس قسم کی خبریں سن کر آپ بے چین ہو جاتے اور فرنگیوں اور دوسرے بد مذہبوں سے بچنے اور ان کی صحبت سے دور رہنے کی تلقین کرتے ایک دفعہ فرمایا :

بہ گرسنگی و برہنگی گذاردن بہتر است از نعیم بدکیشاں (۱)	بھوکا اور ننگا رہنا ایسے بے دینوں کے احسان سے بہتر ہے۔

ایک دفعہ فرمایا ''بہ گرسنگی مردن بہ کہ در صحبت بد مذہباں نعیم یافتن'' (۲) یعنی ایسے بد مذہب لوگوں کی صحبت اور ان کی نوکری سے مر جانا بہتر ہے۔

جب ملتان پر انگریزوں کا قبضہ ہوا اور شاہ صاحب کو معلوم ہوا کہ انہوں نے وہاں اولیاء کے مقابر و مزارات کی بے حرمتی کی ہے تو شاہ صاحب نے سخت اضطراب کے عالم میں یہ شعر پڑھا۔

چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد
میلش اندر طعنہ پاکاں برد (۳)

یعنی اگر خدا کسی کی پردہ دری کرنا چاہتا ہے تو وہ شخص نیک لوگوں پر طعنہ زنی کرنے لگتا ہے۔

آئے دن انگریزوں کی زیادتیوں کی وجہ سے آپ بڑی گھٹن محسوس کرتے تھے اس لئے چاہتے تھے کہ پہلے لوگوں کو حب وطن کا درس دیں، چنانچہ آپ ''حب الوطن من الایمان'' جیسے اقوال سنا کر وطن دوستی کے جذبات پیدا کرتے (۴) اور پھر انگریزوں سے جہاد پر لوگوں کو آمادہ کرتے اور ان کی ہمت بندھاتے۔ ایک مرتبہ ایک شخص سے فرمایا :

فرنگیاں را تیر نمی زنی؟ آں شخص عرضداشت کہ مرا قدرت نیست شما مدد کنید۔	فرنگیوں کو تیر کیوں نہیں مارتے؟ اس نے کہا قدرت نہیں رکھتا، آپ مدد فرمائیں۔

اس پر آپ نے یہ شعر پڑھا :

(۱) نافع السالکین صفحہ ۱۴
(۲) ایضاً صفحہ ۱۴
(۳) ایضاً صفحہ ۱۴۶۔
(۴) دیکھئے نافع السالکین صفحہ ۱۰۱

کمان نرم باید کماندار چست
بوقت کشیدن آید درست(۱)

یعنی کمان نرم ہو تو کماندار کو چست ہونا چاہیے۔ ایسا ہے تو پھر کھینچتے وقت درست ہو جاتی ہے۔

اس طرح آپ عزم و ہمت سے کام لے کر اپنی قوت بازو پر اعتماد کر کے انگریزوں سے مقابلہ کی دعوت دیتے تھے۔

مولانا حافظ محمد علی خیر آبادی اور انگریزوں سے تنفر و بیزاری

مولانا حافظ سید محمد علی خیر آبادی، سلسلہ چشتیہ کے کبار مشائخ میں سے تھے۔ اودھ اور دکن میں چشتی سلسلہ کی اشاعت آپ ہی کی ذات بابرکات سے ہوئی۔ آپ شاہ محمد سلیمان تونسوی کے کبار خلفاء میں سے تھے۔ خیر آباد کے ایک علمی خاندان سے آپ کا تعلق تھا۔ آپ کے اجداد میں حضرت مخدوم سید نظام الدین الہدیہ (المتوفی ۹۹۳ھ) مشہور اولیاء اللہ اور متبحر علماء میں گذرے ہیں۔ شہنشاہ اکبر جن کا بڑا معتقد تھا۔ آپ حسنی سادات میں سے تھے۔ (۲)

حافظ محمد علی صاحب خیر آبادی ۱۱۹۲ھ (۱۷۷۸ء) میں بمقام کھیری پیدا ہوئے (۳) حفظ قرآن کے بعد مولانا عبدالوالی صاحب خیر آبادی سے جو اس زمانہ کے مشہور عالم تھے، شرح وقایہ تک تعلیم حاصل کی۔ پھر شاہجہاں پور میں کچھ عرصہ حصول تعلیم میں مشغول رہے۔ اس کے بعد دہلی جا کر شاہ عبدالقادر سے مشکوٰۃ پڑھی۔ پھر حرمین

---

(۱) نافع السالکین صفحہ ۱۴۶۔

(۲) آپ کے حالات کے لئے دیکھئے خیر آباد کی ایک جھلک صفحہ ۳۰-۳۲۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے حضرت شیخ سعد خیر آبادی (خلیفہ حضرت شاہ مینا لکھنوی) کو حافظ محمد علی صاحب کے اجداد میں بتایا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ بلکہ شیخ سعد آپ کے جد امجد مخدوم سید نظام الدین کے پیر تھے اور وہ قاضی قدوا کی اولاد میں تھے (خیر آباد کی ایک جھلک صفحہ ۲۷) حافظ صاحب کا پورا نسب نامہ مناقب حافظیہ میں موجود ہے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے واسطہ سے حضرت حسن بن علی بن ابی طالب تک منتہی ہوتا ہے۔ دیکھئے صفحہ ۲۷

(۳) خیر آباد کی ایک جھلک، صفحہ ۳۸

شریفین میں صحیح بخاری اور تونسہ میں صحیح مسلم کی سماعت کی۔(۱)

آپ کا زمانہ سیاسی اتھل پتھل کا تھا۔ مغلیہ سلطنت کی باگ انگریز اپنے ہاتھ میں لے رہے تھے۔ قیام دہلی میں حافظ صاحب نے اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کیا تھا۔ اس لئے وہ انگریزوں سے بہت سخت نفرت کرتے تھے۔ خانوادہ ولی اللٰہی سے ربط وتعلق نے ان کی انگریز دشمنی میں اضافہ کیا۔ شاہ محمد سلیمان تونسوی کی صحبت نے اس کو اور مہمیز کیا۔ چنانچہ جب آپ نے خیر آباد میں مسند بچھائی تو جہاں ہزاروں تشنگان معرفت کو سیراب کیا۔ وہیں حب الوطنی اور انگریز دشمنی کا درس بھی عام کیا۔ لکھنؤ سے قرب کی وجہ سے انگریزوں کی پرفریب سیاست کو سمجھنا ان کے لئے آسان تھا۔ وہ ان کے بڑھتے ہوئے قدم صاف دیکھ رہے تھے۔ ان کی شاطرانہ چالوں کے سامنے واجد علی شاہ نواب اودھ کی بے بسی بلکہ لاپروائی نے ان کو بہت بے چین کر دیا تھا۔ وہ واجد علی شاہ کو متنبہ کرتے اور فرائض منصبی یاد دلاتے رہتے تھے۔ جب تمام نصیحتیں صدا بصحرا ثابت ہوئیں تو حافظ صاحب خود لکھنؤ تشریف لاتے اور واجد علی شاہ سے کہلا بھیجا کہ ہم جنگ کے واسطے آئے ہیں۔ اگر تم کو طاقت اور بہادری کا دعویٰ ہے تو مقابلہ کرو۔ اور اپنے مریدوں کو حکم دیا کہ تلواریں لاؤ ہم جنگ کریں گے اور متفکر ہو کر فرمایا کہ میرے دل میں آتا ہے کہ اس رئیس سے تخت خالی کرادوں۔ ایک رات شاہ مینا کی درگاہ میں بیٹھے تھے فرمانے لگے "یہ تختہ کا تختہ الٹئے" ایک پیر مرد، ان کے پاس بیٹھے تھے۔ بار بار عرض کرتے تھے کہ ایسا نہ فرمائیں، آخر رئیس ہے۔ مگر آپ نے اور جوش میں آکر فرمایا "نہیں اب دباؤ" ایک دفعہ فرمانے لگے کہ اگر نصاریٰ کی عملداری ہو تو اس کی حکومت سے بہتر ہے۔(۲)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگریزوں کے اقتدار کے بارے میں کتنے متفکر تھے۔ وہ جانتے تھے کہ واجد علی شاہ کا تختہ نہ الٹا جائے تو انگریز الٹ کر اس پر قابض ہو جائیں گے (چنانچہ ایسا ہی ہوا) اس لئے وہ چاہتے تھے کہ اس وقت سے پہلے ہم خود کسی دوسرے قابل شخص کو حکمراں بنا کر انگریزوں سے مقابلہ کی طاقت پیدا کریں۔

---

(۱) مناقب حافظیہ، صفحہ ۷۵-۷۶

(۲) مناقب حافظیہ صفحہ ۲۱۱

وہ انگریزوں سے اس درجہ نفرت دلاتے کہ کوئی بوٹ بھی پہن کر آتا تو بہت نا خوش ہوتے اور فرماتے کہ یہ نصاریٰ کی وضع ہے۔ایک شخص میر محمد حسین خاں جو حضرت خواجہ مودود چشتی کی اولاد میں سے تھے۔اور اس وجہ سے حافظ صاحب ان کا پاس خاطر ملحوظ رکھتے تھے۔ایک دفعہ ان کا خط آیا جس میں ان کے نام کے ساتھ لفظ کلکٹر لگا ہوا تھا۔یہ سن کر اس قدر ناراض ہوئے کہ خط تک نہ پڑھا اور فرمایا کہ میں ایسے شخص کا خط نہیں دیکھتا جس کے نام میں انگریزی لفظ شامل ہو۔ایک مرتبہ ایک قریبی تعلق والے شخص نے اپنی نئی کوٹھی میں برکت کیلئے آنے کی دعوت دی آپ نے معائنہ کے بعد فرمایا مکان تو خوب بنایا ہے مگر مجھے پسند نہیں اس لئے کہ اس میں دروازے انگریزی وضع کے ہیں۔(۱)

حافظ صاحب نے ۱۹/ذی قعدہ ۱۲۶۶ھ (مطابق ستمبر ۱۸۴۹ء) کو وفات پائی۔

آپ کے ان جذبات کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ اگر آپ ۱۸۵۷ء کے معرکہ کے وقت حیات ہوتے تو یقیناً کوئی بڑا کارنامہ انجام دیتے۔

نواب فقیر محمد خان گویاؔ ملیح آبادی اور جنگ آزادی کا منصوبہ

فقیر محمد خاں گویاؔ تاریخ میں حسام الدولہ نواب فقیر محمد خاں بہادر تہور جنگ کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ملیح آباد کے آفریدی پٹھانوں سے ان کا تعلق تھا۔۱۲۰۰ھ کے آس پاس آپ کی پیدائش ہوئی۔پوری طرح مروجہ تعلیم حاصل کی۔اردو، فارسی، عربی تینوں زبانوں پر بڑی قدرت تھی نامہ مظفری کے مصنف کے بقول خاں صاحب (گویاؔ) کی لیاقت علمی کا یہ عالم تھا کہ عربی ایسی فصیح بولتے تھے کہ مادری زبان معلوم ہوتی تھی۔(۲)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت پختہ طور پر انہوں نے تعلیم حاصل کی تھی اور عربی پر قدرت اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ علوم شرعیہ سے انہیں خاص دلچسپی اور ان میں مہارت تھی، مگر بایں ہمہ علمی کمال انہوں نے خاندانی رواج کے مطابق سپہ گری کا پیشہ اختیار کیا۔تاہم علم سے رابطہ برابر باقی رہا۔انہوں نے ۱۲۵۱ھ میں ملا حسین کاشفی کی

(۱) مناقب حافظیہ صفحہ ۱۱۲۔یہ کتاب حافظ کے مفصل حالات اور ارشادات پر مشتمل ہے اسی کو بنیاد بنا کر پروفیسر نظامی نے تاریخ مشائخ چشت میں آپ کا جامع تذکرہ پیش کیا ہے۔

(۲) گویا اور خاندان گویا کی ادبی خدمات صفحہ ۴۲، از ڈاکٹر ناہید عارف (لکھنؤ)

مشہور کتاب انوار سہیلی کا ''بستان حکمت'' کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا۔ اس زمانہ کے اہل علم نے انہیں اس پر آمادہ کیا تھا۔ اس کتاب کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس زمانہ کی اردو نثر کی کلاسیکل کتابوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ فسانۂ عجائب سے پہلے ۱۲۵۴ھ میں یہ کتاب شائع ہوئی جب کہ فسانۂ عجائب کا سنہ اشاعت ۱۲۵۹ھ ہے۔ (۱)

آپ اردو کے ایک باکمال اور صاحب دیوان شاعر تھے۔ گویاؔ تخلص تھا۔ شیخ امام بخش ناسخ کے شاگرد تھے۔ مرزا قادر بخش صابر نے ان الفاظ میں ان کا تذکرہ کیا ہے'' لکھنؤ میں زبدہ امرائے نامی اور قدوہ کبرائے گرامی سے شمار کیا جاتا ہے۔ اس سواد میں مومنین پاک کی کثرت اور حضرات شیعہ کی افراط پر اس سنی عالی مرتبہ کا وجود نادر بل مغتنمات سے ہے۔ سخن اس کا الفاظ فصیح اور معنی غریب اور نکات برجستہ اور اشارات دلچسپ سے مملو ہے''۔ انہوں نے منتخب اشعار بھی دیئے ہیں۔ (۲)

گویاؔ، نواب امیر خاں کے رفیق خاص اور دست راست تھے۔ وہیں حضرت سید احمد شہید سے تعلق پیدا ہوا جو روز بروز گہرا ہوتا گیا۔ اسی زمانہ میں سید صاحب سے بیعت ہوئے تھے۔

اپنے ملک میں غلامی کی جڑوں کو مضبوط ہوتے دیکھ کر وہ بہت فکر مند تھے۔ آخر ان حالات نے ان کے دماغ میں انگریزوں کے خلاف ایک منصوبۂ جنگ کو جنم دیا۔ جس کا مقصد ایک عظیم فوجی طاقت فراہم کر کے انگریزوں سے فیصلہ کن جنگ کرنا اور ہندوستان کو غلامی کے چنگل سے نکال کر ایک پائدار حکومت قائم کرنا تھا۔ امیر خاں کی خواہش یہی تھی۔ اس لئے ان کی بھرپور حمایت حاصل تھی۔ پھر سید صاحب کی صحبت نے اس کو اور جلا بخشا۔

کہا جاتا ہے کہ اودھ کے نواب سعادت علی خان بھی اس منصوبے میں در پردہ شریک تھے۔ انہیں سے بالمشافہ گفتگو کے لئے ۱۲۲۹ھ میں بظاہر امیر خاں کے سفیر کی حیثیت سے لکھنؤ کا سفر اختیار کیا۔ کانپور پہنچ کر جب فقیر محمد خاں کو اطلاع ملی کہ انگریزوں کی سازش سے نواب سعادت علی خاں کو زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا، تو ان کے دل کو

---

(۱) ایضاً صفحہ ۲۴۹-۲۵۰

(۲) ملاحظہ ہو گلستان سخن صفحہ ۴۰۷

سخت دھچکا لگا۔ پھر بھی انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔ سوچا کہ نئے نواب اودھ غازی الدین حیدر کو اپنا ہم خیال بنانے کے لئے اودھ ہی میں قیام کیا جائے۔ اس خیال سے اپنے وطن ملیح آباد کا رخ کیا۔ کچھ دن آرام کر کے لکھنؤ آئے اور نواب معتمد الدولہ آغا میر کی وساطت سے غازی الدین حیدر سے ملاقات کی۔ آغا میر نواب صاحب کے معتمد خاص تھے۔ انہوں نے نواب صاحب سے فقیر محمد خاں کا تعارف کرایا۔ نواب صاحب بہت مسرور ہوئے اور اپنے یہاں ملازمت کی درخواست کی۔ بس کیا تھا، ان کی دلی مراد بر آئی۔ انہوں نے ملازمت کے لئے رضامندی ظاہر کر دی۔ بحیثیت رسالداران کا تقرر ہوا۔ دربار اودھ سے وابستہ ہو کر انہوں نے بہت جلد ترقی کی۔ نامہ مظفری کے مصنف کے بقول ''ان کی شان و شوکت، قدر و منزلت کی عام شہرت محتاج بیان نہیں ہے ...... خاں صاحب کی عنایت اور فیض صحبت کوئی معمولی بات نہ تھی ان کی لیاقت اور جاہ و جلالت اظہر من الشمس ہے''۔ اودھ آ کر اس تمام قدر و منزلت اور عروج حاصل کر لینے کے باوصف فقیر محمد خاں انگریزوں کے خلاف اپنے منصوبۂ جنگ کو عملی شکل نہ دے سکے۔ جس کا سبب یہ تھا کہ اس وقت اودھ کے سیاسی حالات اتنے ابتر اور شاہ اودھ انگریزوں کے چنگل میں پھنس کر اتنے بے بس ہو چکے تھے کہ اس قسم کے منصوبوں کی کامیابی کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ پھر بھی فقیر محمد خاں انگریزوں کی ریشہ دوانیوں پر کڑی نگاہ رکھتے اور کم از کم اودھ میں ان کی چالوں کو ناکام بنانے کی سعی کرتے رہے، اس زمانے میں انگریزوں کے خلاف جو تحریکیں چلیں ان میں در پردہ وہ حصہ لیتے رہے۔ غرض فقیر محمد خاں نے اپنی زندگی میں انگریزوں کے قدم اودھ میں جمنے نہیں دیے۔ ان کا انتقال ۱۸۵۱ء میں ہوا۔ ان کی وفات کے بعد ہی انگریزوں کو کھل کر کھیل کھیلنے کا موقع مل سکا۔ آخر انگریز اپنی چالوں میں کامیاب ہو گئے اور ۱۸۵۶ء میں آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ کو تخت سلطنت سے محروم کر دیا گیا اور پورے اودھ پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔(۱)

سید صاحب سے ان کی عقیدت مدت العمر قائم رہی اور تحریک کو بھی برابر ان کا تعاون حاصل رہا، سفر لکھنؤ میں وہ سید صاحب کے بہت کام آئے۔ آپ کے لئے بڑی آسانیاں فراہم کیں۔ انہی کی وساطت سے سید صاحب کی نواب آغا میر سے ملاقات ہوئی تھی۔

(۱) جعفر ملیح آبادی، تاریخ حقائق صفحہ ۱۱۱ تا صفحہ ۱۱۴

ملیح آباد کے پٹھانوں میں جذبۂ آزادی کو فروغ دینے میں ان کا بڑا حصہ ہے جعفر ملیح آبادی لکھتے ہیں :

ملیح آباد کے پٹھانوں میں سیاسی بیداری، جذبہ حریت اور انگریزوں سے بیزاری پیدا کرنے کا سہرا، آفریدی قبیلہ کے ایک سربراہ اور انیسویں صدی کے مشہور سالار اودھ نواب فقیر محمد خاں کے سر ہے۔ انکے بعد انکی اولاد ہی نے جنگ آزادی کی ہر تحریک میں یہاں کے عوام کی رہنمائی کی اور ملک وقوم کے لئے طرح طرح کی مصیبتیں جھیلیں (۱)

۱۲۶۸ھ (۱۸۵۲ء) میں گویا کا انتقال ہوا (۲) مشہور شاعر جوش ملیح آبادی آپ کے پوتے ہیں۔

مولانا عبداللہ فیروز پوری پر مسٹر فریزر کے قتل کا الزام اور پھانسی

دہلی پر انگریزوں کے تسلط کے بعد خواص وعوام میں بے چینی کا پیدا ہونا فطری بات تھی۔ اگر چہ بے غیرت مغل بادشاہ شاہ عالم نے اپنے آپ کو انگریزوں کے سپرد کر دیا تھا، بلکہ حالات نے ان کو اس کے لئے مجبور کر دیا تھا۔ مگر خاص شاہی خاندان میں بھی ایسے افراد تھے جو اس بے عزتی اور ذلت ورسوائی کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔ انہیں میں بادشاہ اکبر شاہ ثانی (۱۸۰۶ء-۱۸۳۷ء) کے صاحبزادے مرزا جہانگیر تھے۔ چنانچہ انہوں نے موقع ملتے ہی مسٹر ارچی بولڈ سیٹن برٹش ریزیڈنٹ پر طمنچہ بھونک دیا جس کی پاداش میں ان کو نظر بند کر کے الہ آباد بھیج دیا گیا جہاں ان کا انتقال ہوا۔ (۳)

اسی طرح ۱۸۳۲ء میں جب دہلی صوبہ ممالک مغربی وشمالی میں شامل کی گئی اور

---

(۱) جعفر ملیح آبادی، تاریخ حقائق صفحہ ۱۱۰۔ اس کتاب میں ان کے کچھ تفصیلی حالات اور خاندانی پس منظر کا بیان ہے۔ مختصر حالات جماعت مجاہدین صفحہ ۲۹۱، اور تاریخ ٹونک میں بھی موجود ہیں۔ خود جعفر ملیح آبادی نے "گویا صاحب سیف وقلم" کے نام سے ان کے حالات میں مفصل کتاب لکھی ہے اور ان کی صاحبزادی ڈاکٹر ناہید عارف کی مذکورہ کتاب "گویا اور خاندان گویا کی ادبی خدمات" دراصل پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے۔ اس میں انہوں نے کافی تحقیق سے گویا کے حالات وکمالات کا جائزہ لیا ہے۔

(۲) گویا اور خاندان گویا کی ادبی خدمات صفحہ ۱۹۷

(۳) واقعات دار الحکومت دہلی حصہ اول صفحہ ۲۹۱-۲۹۲

مسٹر ولیم فریزر گورنر جنرل کے ایجنٹ مقرر ہو کر دہلی آئے۔ مگر زیادہ دن وہ رہنے نہیں پائے کہ ۲۲؍ مارچ ۱۸۳۵ء کو ان کو قتل کیا گیا (۱)۔ مگر اس کا سخت بدلہ لیا گیا اور رائے سینا (موجودہ نئی دہلی) (۲) کے سینکڑوں میواتی اس کی پاداش میں قتل کیے گئے۔ پھر خواص پر غصہ اتارا گیا اور فیروز پور کے نواب شمس الدین خاں (۳) اور مولانا عبداللہ کو پھانسی دی گئی۔ (۴)

مولانا محمود بخش کاندھلوی اور انگریزوں سے انتہائی بیزاری

مولانا محمود بخش کاندھلوی، حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کے حقیقی بھائی تھے۔ اور خود بھی بڑے عالم اور زہد و تقویٰ میں یکتائے زمانہ تھے۔ علوم منقول اور معقول میں پوری دسترس تھی۔ بالخصوص تفسیر و حدیث میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ درس و تدریس کا بھی شغل تھا۔ دنیا سے بالکل منقطع، ہر وقت یاد الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔ آپ کے سوانح نگار کے بقول گویا ایک فرشتہ انسانی شکل و صورت میں نمودار ہے۔ ایسے مستجاب الدعوات تھے کہ دعا فوراً پوری ہوتی تھی۔ ۱۴؍ رمضان ۱۲۵۸ھ میں انتقال کیا (۵)۔ مشہور عالم اور بزرگ حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلوی (م ۱۲۸۳ھ) آپ ہی کے صاحبزادہ تھے۔

آپ کا تعلق اس خاندان سے تھا جس میں انگریز دشمنی عام تھی۔ حضرت مفتی الٰہی بخش اور ان کے صاحبزادے مولانا ابوالحسن حسن کاندھلوی کے حالات اور تحریک آزادی میں ان کی خدمات کا مفصل ذکر گزر چکا ہے۔ مولانا محمود بخش بھی انہی کے نقش قدم پر تھے۔ آپ انگریزوں سے سخت نفرت کرتے تھے اور ان سے انتہائی بیزار تھے۔ یہاں تک کہ ان کا چہرہ دیکھنا تک گوارا نہ تھا۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ بہت مشہور ہے۔

(۱) واقعات دارالحکومت دہلی حصہ اول صفحہ ۶۹۳

(۲) ملاحظہ ہو واقعات دارالحکومت دہلی حصہ دوم صفحہ ۵۶۲

(۳) یہ واقعہ ۱۸؍ اکتوبر ۱۸۳۵ء کا ہے (واقعات دارالحکومت دہلی، حصہ اول صفحہ ۶۹۳)

(۴) روزنامہ سب کا اخبار، نئی دہلی، شمارہ ۱۴؍ اگست ۱۹۹۷ء۔ مولانا عبداللہ کے بارے میں مزید کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

(۵) آپ کے مزید اوصاف و کمالات کے لئے دیکھیے حالات مشائخ کاندھلہ صفحہ ۳۰

انگریزوں کے ابتدائی دور میں کاندھلہ میں ایک جگہ پر ہندوؤں اور مسلمانوں کا تنازعہ ہوا کہ یہ ہندوؤں کا مندر ہے یا مسلمانوں کی مسجد۔ انگریز مجسٹریٹ نے فریقین کے بیانات سننے کے بعد تخلیہ میں مسلمانوں سے پوچھا کہ کیا ہندوؤں میں کوئی ایسا شخص ہے جس کی صداقت پر آپ اعتماد کر سکتے ہیں اور جس کی شہادت پر فیصلہ کیا جا سکے؟ انہوں نے کہا ہمارے علم میں کوئی ایسا شخص نہیں۔ ہندوؤں سے بھی اس نے یہی سوال کیا انہوں نے کہا کہ یہ بڑی آزمائش کا وقت ہے۔ معاملہ قومی ہے۔ لیکن پھر بھی مسلمانوں میں ایک بزرگ ہیں جو کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ شاید وہ اس موقع پر بھی سچی بات کہیں۔ پھر انہوں نے مولانا محمود بخش کا نام لیا، مجسٹریٹ نے چپراسی بھیج کر مولانا کو عدالت میں طلب کیا انہوں نے فرمایا کہ ''میں نے قسم کھائی ہے کہ فرنگی کا کبھی منہ نہیں دیکھوں گا'' مجسٹریٹ نے کہلوایا کہ آپ میرا منہ نہ دیکھیں لیکن ضرور تشریف لائیں۔ آپ کے یہاں تشریف لائے بغیر فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ مولانا تشریف لائے اور پیٹھ پھیر کر عدالت میں کھڑے ہو گئے تاکہ فرنگی پر نظر نہ پڑے۔ آپ سے دریافت کیا گیا کہ آپ کا اس بارے میں کیا علم ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ صحیح بات تو یہ ہے کہ یہ جگہ ہندوؤں کی ہے مسلمانوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ ہندوؤں کے حق میں فیصلہ کیا گیا۔ (۱)

اس واقعہ سے جہاں اسلام کی بے لوث اخلاقی تعلیمات اور مولانا کی اعلیٰ درجہ کی صداقت کا علم ہوتا ہے وہیں آخری درجہ میں ان کی انگریز دشمنی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اور وضاحت کی ضرورت نہیں کہ ایسے مقدس بزرگ کے اس رجحان کا عوام پر کتنا اثر پڑا ہوگا، اور انہوں نے اپنے اس رویہ سے خاموش طریقہ پر انگریز دشمنی کو کتنا فروغ دیا ہوگا۔

مولانا شاہ محمد ظہور الحق پھلواروی اور انگریزوں سے اظہار تنفر

مولانا شاہ محمد ظہور الحق اپنے عہد کے متبحر علماء اور بلند مقام بزرگوں میں تھے۔ ۱۱۸۴ھ (۱۷۷۰ء) میں آپ کی ولادت ہوئی۔ سولہ سال کی عمر میں درسیات سے فارغ

(۱) یہ واقعہ ان کے خاندان میں مشہور ہے، مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی نے بھی اس کو لکھا ہے نیز حضرت مولانا علی میاں نے بھی اسلامی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر صفحہ ۳۶۰ پر اس کو نقل کیا ہے۔

ہوئے۔ سند حدیث بذریعہ مکاتبت شاہ عبدالعزیز دہلوی سے حاصل کی۔ علوم ظاہری سے فراغت کے بعد ۱۲۰۰ھ میں اپنے والد شاہ نورالحق تپاںؒ سے بیعت ہوکر سلوک کی تعلیم مکمل کی۔ ۱۲۱۱ھ (۹۷-۱۷۹۶ء) میں والد صاحب نے اجازت عطا کر کے خانقاہ عمادیہ کا سجادہ نشین مقرر کیا۔ علم حدیث میں بڑا درک تھا۔ قرآن کے ساتھ ساتھ صحیحین کے بھی حافظ تھے۔ خانقاہی لوازم کے ساتھ تمام عمر درس وتدریس کا مشغلہ رہا۔ آپ کی تصانیف میں اعیان علم (منطق برزبان عربی) اورتسویلات الفلاسفہ (عربی) نہی عن المنکر، کسب النبی (اردو) تائید حق (ردشیعہ میں) وغیرہ ہیں۔ عربی فارسی اوراردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ۱۲۳۰ھ (۱۸۱۵ء) میں پھلواری کی دونوں خانقاہوں عمادیہ اور مجیبیہ میں اختلاف ہوا تو آپ پھلواری کی سکونت ترک کر کے پٹنہ آئے اور منگل تالاب کے پاس ازسرنو خانقاہ عمادیہ کی بنیاد رکھی۔ ۱۶/ ذی قعدہ ۱۲۳۴ھ (اگست ۱۸۱۹) کوآپ کا انتقال ہوا۔ جنازہ پھلواری لایا گیا اوروالد صاحب کے پہلو میں تدفین عمل میں آئی۔(۱)

آپ انگریزی اقتداراورانگریزوں کی ملازمت کے سخت مخالف تھے رسالہ کسب النبی کی ایک عبارت سے آپ کی ملّی غیرت اورانگریزوں سے نفرت کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :

> کوئی قاضی ومفتی فرنگی کا بن کرخلاف قرآن وحدیث کے آئین انگریزی پرفتوئی دینے لگا۔..... (۲)

چونکہ آپ ایک مستند خانقاہ کے سجادہ نشین تھے۔ جس کا عوام پر گہرا اثر تھا اس لئے آپ کی انگریزدشمنی کا عوام پر کتنا اثر پڑا ہوگا۔ اس کا اندازہ کرنا زیادہ مشکل نہیں۔

مولانا عظیم اللہ بہاری اور انگریزوں کے بارے میں انکا نقطۂ نظر

مولانا عظیم اللہ بہار کے ایک صاحب علم وفضل بزرگ تھے۔ موضع ہتھیا

(۱) آثارات پھلواری شریف، ازمولانا حکیم محمد شعیب، صفحہ ۳۰۰ تا صفحہ ۳۰۲۔ نیز اردونثر کے ارتقاء میں علماء کا حصہ صفحہ ۶۲۵-۶۲۶۔ نزہۃ الخواطر میں بھی آپ کے مختصر حالات ملتے ہیں۔

(۲) دیکھئے اردونثر کے ارتقاء میں علماء کا حصہ۔ صفحہ ۶۲۷

کانسرائے ان کا وطن تھا جو پھلواری سے دس بارہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ۱۲۱۱ھ (۱۷۹۶ء) میں پیدا ہوئے۔ عربی و فارسی کی مروجہ تعلیم پھلواری، پٹنہ اور کلکتہ میں حاصل کی۔ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا مشغلہ رہا۔ مسلمانوں کی اصلاح و تبلیغ کے لئے بہت کوشاں رہتے تھے۔ اس غرض سے کئی کتابیں بھی لکھیں جن میں معراج نامہ (اردو نظم میں) اور منتخب المسائل (اردو نثر میں) زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ معراج نامہ میں ۳۰۱۲ اشعار ہیں۔ ۱۲۷۹ھ (۱۸۶۲ء) میں آپ کا انتقال ہوا۔ (۱)

مولانا عظیم اللہ انگریزوں کے بارے میں بہت سخت موقف رکھتے تھے۔ اپنی کتاب منتخب المسائل (یہ کتاب انہوں نے ۱۲۵۳ھ/ ۱۸۳۷ء میں لکھی تھی) میں انہوں نے اپنے نقطہ نظر کا دو ٹوک اظہار کیا ہے۔ لکھتے ہیں ''فرنگیوں یا اوس کے نوکروں کی بنوائی ہوئی مسجد میں جو اوس نوکر نے نوکری کے درماہ (یعنی تنخواہ) سے بنوائی ہو، نماز پڑھنا مکروہ ہے'' (۲)

ان کے اس قسم کے فتووں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے انگریزوں سے نفرت پیدا کر کے کس حد تک ان کے خلاف لوگوں کے جذبات بھڑکائے ہوں گے۔

خلیفہ نبی بخش خاں لغاری کا جذبۂ آزادی

خلیفہ نبی بخش خاں لغاری قادری، سلسلہ قادریہ کے صاحب طریقت بزرگ تھے، حیدر آباد سندھ کے رہنے والے تھے۔

۱۱۹۰ھ/ ۱۷۷۶ء میں پیدا ہوئے۔ ادب میں مہارت تھی۔ سلسلہ راشدیہ کے بانی پیر محمد راشد روضے دھنی (م ۱۲۳۴ھ) سے خلافت پائی۔ شیخ محمد راشد کے صاحبزادہ پیر سائیں سید صبغت اللہ شاہ (م ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۲۱ء) جو ''حر'' تحریک کے بانی تھے، کے حلقہ میں بھی امتیازی مقام حاصل تھا۔

فرنگیوں سے نفرت میں ان کی صحبت کو دخل تھا۔ ۱۸۴۳ء میں جب سندھ پر فرنگیوں کا تسلط ہوا تو خلیفہ نبی بخش خاں پر بھی آفت آئی چنانچہ وہ اپنا آبائی وطن چھوڑ کر

(۱) اردو نثر کے ارتقاء میں علماء کا حصہ صفحہ ۱۳۱

(۲) اردو نثر کے ارتقاء میں علماء کا حصہ صفحہ ۱۳۳

قریب ہی دوسری جگہ چلے گئے۔

وہ اردو، سرائیکی، سندھی اور ہندی کے اچھے شاعر تھے۔ان کی نظمیں حب وطن اور جذبۂ جہاد سے سرشار ہیں۔

۱۲۸۰ھ مطابق ۱۸۶۳ء میں انہوں نے وفات پائی۔(۱)

نواب غلام شاہ لغاری کا جنگ آزادی میں حصہ

نواب غلام شاہ لغاری، وادی مہران کی نامور شخصیات میں سے تھے۔ دینی و دنیوی دونوں حیثیتوں سے ممتاز مقام پر فائز تھے۔۱۲۱۴ھ مطابق ۱۸۰۰ء میں آپ کی پیدائش ہوئی۔ جب انہوں نے آنکھیں کھولیں تو گردوپیش ہر نعمت کی فراوانی تھی۔ان کی پرورش نازونعم میں ہوئی لیکن تعلیم وتربیت کڑی نگرانی میں کی گئی۔ رئیس باپ نے منتخب اساتذہ اور ممتاز علماء کی اتالیقی میں اپنے فرزند ارجمند کو زیور تعلیم سے آراستہ کیا۔(۲)

ان کے والد غلام اللہ شاہ فقیر لغاری، فرمانروائے سندھ میر نور محمد خاں تالپور کے عہد میں عمر کوٹ کی گورنری کے عہدے پر فائز تھے۔ بیٹے کو ذہین اور ہونہار دیکھ کر انہوں نے اپنا معاون مقرر کیا۔اس طرح غلام شاہ لغاری کم عمری ہی سے امور سلطنت میں دخل رکھنے لگے۔۱۲۵۴ھ مطابق ۱۸۳۸ء میں جب ان کے والد نواب غلام اللہ شاہ کا انتقال ہوا تو ان کے فرزند نواب غلام شاہ کو علاقہ جاتی اور ریاست کچھ کا ناظم مقرر کیا گیا تاکہ وہ انگریزوں کے ساز باز کی نگرانی کریں۔۱۸۳۸ء جب فرنگی فوج کا ایک دستہ شاہ شجاع کو کمک پہنچانے کا جھوٹا منصوبہ دکھا کر سندھ میں موجود اپنے فوجیوں کو اناج اور رسد پہنچانے کی غرض سے دریائے سندھ سے ہوکر ضلع ٹھٹھ کے وکر بندر پہنچا تو ناظم ٹھٹھ نواب غلام شاہ نے خفیہ ذرائع سے اس کا پتہ چلا لیا اور ان کی حکمت عملی اور قبل از وقت موثر اقدامات سے فرنگیوں کی یہ سازش ناکام ہوگئی۔

اس زمانہ میں کرنل پاٹجر حیدرآباد میں انگریزوں کا سفیر تھا۔اس نے حکومت برطانیہ کو اس واقعہ سے متعلق جو رپورٹ بھیجی۔اس کے متن کا خلاصہ یہ تھا :

(۱) اردو کی ترقی میں اولیائے سندھ کا حصہ صفحہ ۲۰۹-۲۱۱، از ڈاکٹر وفا راشدی۔

(۲) اردو کی ترقی میں اولیائے سندھ کا حصہ صفحہ ۲۲۳

۲۷ رنومبر کو لفٹنٹ اسٹوک کا خط ملا کہ فوج دریائے سندھ کے دہانے پر پہنچ گئی ہے۔لیکن غلام شاہ جنہیں میر نور محمد نے ایک ماہ پیشتر وہاں بھیج دیا تھا۔انہوں نے نہ صرف اناج اپنے قبضے میں لے لیا بلکہ ہر قسم کی رسد کو فوج تک بھیجنے سے انکار کر دیا ہے۔(۱)

غرض نواب غلام شاہ لغاری ہمہ جہت خصوصیات کے مالک تھے، امور انتظامیہ کے ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ بلند پایہ نثر نگار، خوش فکر اور سخن سنج شاعر اور دل گداز کے حامل صاحب سلوک تھے۔فن طب سے خاص شغف تھا، ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء میں آپ نے انتقال کیا۔(۲)

حضرت اخوند صاحب سوات اور ان کے مجاہدانہ کارنامے

شیخ المشائخ مجاہد کبیر حضرت مولانا عبد الغفور صاحب جو اخوند صاحب (۳) سوات کے نام سے مشہور ہیں کی پیدائش موضع جبڑی وادئ سوات میں ۱۲۰۹ھ مطابق ۱۷۹۴ء میں ہوئی۔(۴)

آپ بچپن ہی سے حصول علم کی طرف مائل اور زہد و تقویٰ کی طرف راغب تھے۔ آٹھ سال کی عمر میں قرآن حفظ کر کے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے موضع گجر گڑھی ضلع مردان تشریف لے گئے۔اور اس دور کے مشہور عالم حضرت مولانا سید عبد الحکیم بخاری سے تعلیم حاصل کی۔ نیز مختلف جگہوں میں متعدد علماء کی خدمت میں رہ کر آپ نے فراغت حاصل کی اور علم میں رسوخ پیدا کیا۔(۵)

اس کے بعد ۱۲۳۱ھ میں موضع تورڈھیر ضلع مردان تشریف لے گئے اور حضرت مولانا محمد شعیب صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی۔مولانا محمد شعیب بڑے مجاہد تھے۔آپ نے

(۱) ایضا صفحہ ۲۳۴

(۲) ڈاکٹر وفا راشدی نے آپ کے منتخب اشعار بھی نقل کئے ہیں۔

(۳) اخوند معلم اور استاذ کو کہتے ہیں۔

(۴) تذکرہ صوفیائے سرحد صفحہ ۵۵۱۔موضع ولادت اور تاریخ ولادت کے سلسلہ میں اور بھی روایتیں ہیں۔دیکھئے احوال العارفین صفحہ ۹۸۔

(۵) حافظ غلام فرید نے اپنی کتاب احوال العارفین صفحہ ۹۹ پر اس کی تفصیل بیان کی ہے۔

دن سکھوں سے مقابلہ رہتا۔ اخوند صاحب بھی اسمیں شریک رہتے۔ یہیں آپ نے سواری اور لڑائی کے طریقے سیکھے۔ آخر مولانا شعیب ۱۲۳۸ھ مطابق ۱۸۲۳ء میں سکھوں سے جہاد کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ مولانا محمد شعیب نے اخیر وقت میں آپ کو چاروں سلسلوں میں اجازت عطا فرمائی۔ اس زمانہ میں آپ نے تورڈھیر سے چار میل کے فاصلہ پر دریائے سندھ کے کنارے موضع بیکی میں اقامت اختیار کی اور عبادت و ریاضت میں مشغول ہو گئے۔ آپ کی اسی گوشہ نشینی کے زمانہ میں حضرت سید احمد شہید بغرض جہاد تشریف لائے۔ چونکہ آپ سید صاحب کے مقاصد سے متفق تھے اس لئے ان کے ساتھ شامل ہوئے۔ سکھوں سے پنجرہ کے مقام پر جو پہلا معرکہ ہوا اس میں آپ شریک تھے۔ (۱)

۱۲۴۴ھ (۱۸۲۸ء) میں بیکی سے (۲) سے روانہ ہو کر یوسف زئی علاقہ میں موضع نمل اور وہاں سے موضع سلیم خاں تشریف لے گئے۔ یہیں پہلی مرتبہ لوگوں نے آپ کو اخوند کے لقب سے خطاب کیا۔ (۳)

پھر آپ نے مختلف علاقوں میں قیام کرنے کے بعد ۱۲۶۱ھ یا ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۴۵ء میں سیدو میں مستقل سکونت اختیار کی۔ جہاں طالبان حق کی تربیت کے ساتھ حفظ قرآن کا شعبہ، دارالعلوم، مجاہدین کا مرکز اور اسلحہ کا کارخانہ قائم کیا۔

جو شخص آپ سے بیعت کی استدعا کرتا اس سے شریعت محمدیہ کی تابعداری اور بدعات و رسومات بد سے بچنے کا عہد لیتے، اور اس کے ساتھ یہ عہد بھی لیتے کہ انگریز

---

(۱) غلام فرید، محولہ بالا صفحہ ۱۰۱

(۲) یہاں سے روانہ ہونے کا سبب کیا ہوا؟ مولانا غلام رسول مہر کے مندرجہ ذیل بیان سے اس پر روشنی پڑتی ہے۔ مہر صاحب لکھتے ہیں: سید صاحب کے عزم یورش کا حال اخوند صاحب کو معلوم تھا انہوں نے خان ہنڈ کو سید صاحب کا مخلص سمجھتے ہوئے یہ راز بتا دیا، خان ہنڈ نے سکھوں کو قبل از وقت خبردار کیا۔ اٹک کے جو مسلمان، شہر اور قلعے کو مجاہدین کے حوالے کر دینے کی تیاریوں میں شریک تھے، انہیں خوفناک سزائیں جھیلنی پڑیں۔ اور پنجاب پر کامیاب اقدام کی اسکیم ابتدائی مراحل ہی میں ناکام ہو گئی۔ اخوند صاحب کو اپنی اس نادانستہ حرکت پر اتنی ندامت محسوس ہوئی کہ بیکی سے مدت تک روپوش رہے (سرگزشت مجاہدین صفحہ ۳۳۶)

(۳) تذکرہ صوفیائے سرحد صفحہ ۵۵۱

دشمن اسلام کی نوکری اور ملازمت نہیں کرنی اگرچہ بھوک سے اور تنگدستی کی وجہ سے موت آجائے۔ اس کے بعد اگر کوئی شخص بیعت ہونے کے بعد نوکری کر لیتا تو اس کو خانقاہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔(۱)

انگریز ہوس ملک گیری کے سبب جب آگے بڑھنے لگے اور سرحد میں داخل ہو گئے یہاں تک کہ ۱۸۴۹ء میں پشاور اور اس کے مضافات پر قبضہ کر لیا تو اخوند صاحب کو تحفظ دین و شریعت اور آزادیٔ ملک و وطن کی فکر دامن گیر ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے سوات اور بونیر کے عمائدین کی ایک مجلس مشاورت طلب کی جس میں علماء و مشائخ، پیرزادے، امرا، روساء، خوانین اور سرداران قبائل جمع ہوئے۔ اس اجلاس میں دیر اور باجوڑ کے سرکردہ افراد بھی شریک تھے۔ آپ نے انگریز کے آنے والے خطروں سے سب کو متنبہ کر کے ان کے سامنے تنظیم ملت کا مسئلہ پیش کرتے ہوئے یہ تجویز رکھی کہ وہ اپنے اختلافات کو دور کر کے متحد و متفق ہو کر اپنے میں سے کسی ایک شخص کو امیر منتخب کر لیں اور پھر تنظیم ملت کا کام متفقہ طور پر اس کے سپرد کر دیا جائے۔ اس موقع پر آپ نے اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے جو تقریر کی تاریخ سوات کے مصنف نے اس کو ان الفاظ میں نقل کیا ہے آپ نے فرمایا:

> ''آپ لوگوں کو آنے والے خطرات سے غافل نہیں ہونا چاہئے۔ شرعی حکومت کا قیام ایک وقتی ضرورت ہی نہیں بلکہ یہ تو ایک قومی اور مذہبی فریضہ بھی ہے۔ برٹش اقتدار کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم منظّم اور متحد ہو جائیں۔ ہمیں اپنے خانگی اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر متحد ہونا چاہئے اور دشمن کے مقابلے میں ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بننا چاہئے۔ ان اغراض و مقاصد کے لئے ہمارے پاس شرعی حکومت سے عمدہ ذریعہ اور کوئی نہیں ہے جس کے ذریعے ہم متحد ہو کر اپنا تحفظ کر سکیں۔
>
> یاد رکھو! اگر اس موقع پر آپ لوگوں نے ذرا سی بھی غفلت کی تو پھر غلامی

---

(۱) احوال العارفین صفحہ ۱۰۲ و ۱۰۳

مقدر ہو چکی ہے اور اس سیاہ دیو کا لقمہ بننے سے پھر ہم بچ نہیں سکتے۔
ہمیں اپنے اعمال اور کردار کو بالکل اسلامی سانچے میں ڈھالنا چاہئے۔
خداوند کریم ہمارے ساتھ ہے۔''(۱)

لوگوں نے امارت آپ ہی کے سپرد کرنی چاہی مگر آپ کسی طرح تیار نہیں ہوئے کہ اس بارگراں کو اٹھائیں اور سید اکبر شاہ ستھانوی کا نام پیش کیا۔ سید اکبر شاہ صاحب سے لوگ واقف تھے۔ ان کی قابلیت اور خاندانی تقدس مسلم تھا۔ وہ مشہور بزرگ سید علی غواص عرف پیر بابا کی نسل سے تھے۔ نیز ان کے دادا سید زمان شاہ بھی اپنے وقت کے مشہور صوفی اور عابد تھے۔ علاوہ خاندانی خصوصیات کے سید اکبر شاہ صاحب کی شخصیت قبائل میں جانی پہچانی تھی۔ وہ عرصہ تک سید احمد شہید کے معتمد خصوصی رہ چکے تھے اور اس زمانہ میں مجاہدین کا مرکز انہی کے پاس ستھانہ میں تھا۔ وہ اس کی سرپرستی کرتے تھے۔ اس طرح وہ ایک مدبر سیاستداں اور تجربہ کار مجاہد بھی تھے۔ ان حیثیتوں سے وہ امارت کے لئے پوری طرح موزوں تھے۔ لہذا اخوند صاحب سوات نے ان کا نام پیش کر کے سب سے پہلے خود ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ آپ کو دیکھ کر سب نے سید اکبر شاہ صاحب کو امیر تسلیم کر لیا اور کسی نے کوئی اختلاف نہیں کیا۔ موضع غالیگی کو دارالخلافہ قرار دیا گیا اس طرح اخوند صاحب سوات کی جدوجہد سے سوات کی پہلی شرعی حکومت قائم ہوئی۔(۲)

غرض سید اکبر شاہ صاحب کو اس شرعی حکومت کا امیر اور اخوند صاحب کو شیخ الاسلام مقرر کیا گیا۔ آپ تمام مقدمات اور تنازعات کے شریعت کے مطابق فیصلے فرماتے تھے۔ سنت نبوی کے مطابق نظام حکومت چلنے لگا اور رسومات بد اور بدعات مٹنے لگیں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل ہونے لگا۔ تقریباً سات سال تک بڑی پر امن حکومت قائم رہی۔ حالانکہ انگریزوں نے ہر قسم کی چالیں چلیں کہ یہ اسلامی حکومت ختم ہو جائے اور اتحاد و نظم و ضبط بکھر جائے۔ اور اپنی خود غرضیاں بروئے کار لائی جائیں (۳)

(۱) تاریخ سوات صفحہ ۸۰-۸۱ ماخوذ از دیباچہ شاہ نفیس الحسینی بر کتاب احوال العارفین صفحہ ۳-۴
(۲) احوال العارفین صفحہ ۳-۴
(۳) ایضاً صفحہ ۱۰۴

لیکن بدقسمتی سے عین اس دن جب کہ ۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں جنگ آزادی کا بگل بجا اور اس جنگ کی اطلاعیں سرحد پہنچنے لگیں کہ ۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء کو سید اکبر شاہ کی زندگی کا چراغ گل ہوا۔ انگریزوں کو سرحد کی اس شرعی حکومت سے جو اندیشہ تھا سید اکبر شاہ کی وفات نے ان کی اس فکر کو ہلکا کر دیا۔ سر ہربرٹ ایڈورڈ کے الفاظ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انگریز اس امارت شرعیہ کو اپنے لئے کتنا بڑا خطرہ سمجھتے تھے۔ وہ لکھتا ہے :

''اگر سوات میں شرعی حکومت اور جنگ جو قبائل کا سربراہ (اکبر شاہ) زندہ ہوتا تو ۱۸۵۷ء کی جنگ کا نقشہ کچھ اور ہوتا'' (۱)

سید اکبر شاہ کی وفات کے بعد اس حکومت کا کوئی نظام باقی نہ رہا۔ چھ مہینے تک سید اکبر شاہ کے فرزند سید مبارک شاہ اس بکھرے ہوئے شیرازہ کو درست کرتے رہے، لیکن مخالفتیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ لوگ اخوند صاحب کو امیر بنانا چاہتے تھے، مگر آپ تیار نہیں ہو رہے تھے۔ نتیجۃً سید مبارک شاہ اور اخوند صاحب کے صاحبزادہ میاں گل عبدالخالق میں حصول اقتدار کے لئے کشمکش ہوتی رہی۔ کسی کو بھی اخوند صاحب کی تائید حاصل نہیں تھی، اس لئے حکومت قائم نہ ہو سکی۔ اخوند صاحب تنظیم ملت کی کوشش کرتے رہے یہاں تک کہ ۱۸۶۳ء میں سید صاحب کے مجاہدین اور انگریزوں میں زبردست جنگ چھڑ گئی جو تاریخ میں جنگ امبیلہ کے نام سے مشہور ہے۔ اخوند صاحب سوات نے اس جنگ میں ناقابل فراموش کارنامے انجام دیئے جن کا مفصل تذکرہ ان شاء اللہ تیسری جلد میں آئے گا۔

---

(۱) تذکرہ صوفیائے سرحد صفحہ ۵۴۴

بہاریں ہم کو بھولیں یاد ہے اتنا ہے کہ گلشن میں
گریباں چاک کرنے کا بھی اک ہنگام آیا تھا

مآخذ

(Bibliography)

[اس فہرست میں وہ کتابیں اور اخبارات و رسائل شامل ہیں جن سے اس کتاب کی تالیف میں براہ راست استفادہ کیا گیا ہے۔ ضمناً جن کتابوں کا حوالہ آ گیا ہے یا مزید معلومات کے لئے جن کتابوں کی کہیں نشاندہی کی گئی ہے وہ اس میں شامل نہیں۔ عام طور پر اردو محققین آج کل انگریزی کی تقلید میں ببلوگرافی (فہرست مراجع) اسی کے طرز پر تیار کرتے ہیں یعنی پہلے مصنف کا مختصر معروف نام یا نام کا آخری جز پھر مکمل نام، اس کے بعد کتاب کا نام اور سنہ اشاعت۔ عربی میں بھی جدید محققین اس طرز کو رواج دے رہے ہیں مگر یہ اردو اور عربی کے مزاج کے مطابق معلوم نہیں ہوتا، اس لئے ہم نے اپنی اس فہرست میں عام فہم اور آسان ترتیب اختیار کی ہے۔ کتابوں کے نام باعتبار حروف تہجی لکھ کر ان کے مصنفین و ناشرین کا پورا نام اور سنہ اشاعت درج کی ہے تاکہ عام قاری کے لئے سہولت ہو اور وہ ضرورت پر کتاب بآسانی حاصل کر سکے]

عربی

قرآن مجید

۱۔ الأعلام، خيرالدين الزركلی، دار العلم للملايين۔ بيروت۔ لبنان۔ الطبعة السادسة۔ ۱۹۸٤م

۲۔ الإعلام بمن فی تاريخ الهند من الأعلام (نزهة الخواطر)، الشيخ عبد الحی بن فخرالدين الحسنی، مكتبة دار عرفات، دارة الشيخ علم الله۔ رائے بريلی۔ الهند۔ ١٤١٢ھ / ١٩٩١م۔

۳۔ البداية والنهاية، الإمام ابن كثير أبوالفداء عماد الدين محمد بن اسماعيل بن عمر بن كثير القرشی الدمشقی (م ٧٧٤ھ) دار أبی حيان۔ القاهرة۔ ١٤١٦ھ / ١٩٩٦م

٤۔ تاريخ آداب اللغة العربية، جرجی زيدان، دار مكتبة الحياة۔ بيروت۔ الطبعة الثانية ١٩٧٨م

٥۔ تاريخ الأبرار ممن تدرس كتبهم فی ديار مليبار، محمد الفيضی بن البخاری المليباری، كاليكوت۔ كيرالا۔ الطبعة الأولىٰ ١٤١٥ھ / ١٩٩٥م

٦۔ تحريض أهل الإيمان علی جهاد عبدة الصلبان، الشيخ ابو يحیٰ زين الدين بن علی بن احمد الفنانی المليباری (م ٩٢٨ھ)، تحقيق و تعليق حمزة جيلاكودان الكركدام كونی، مع تحفه المجاهدين، مكتبة الهدیٰ كاليكوت۔ الطبعة الأولىٰ ١٩٩٦م

٧۔ تحفة الأخيارفی تاريخ علماء مليبار، الشيخ محمد علی موسليار (مخطوطه مصنف)

٨۔ تحفة المجاهدين فی أحوال البرتغاليين، الشيخ زين الدين بن محمد الغزالی بن زين الدين بن علی المليباری الفنانی (المتوفی بعد ١٠٢٨ھ) قدم له و حققه و علق عليه محمد سعيد الطريحی، موسسة الوفاء بيروت۔ لبنان۔ الطبعة الأولیٰ ١٤٠٥ھ/١٩٨٥م

٩۔ تحفة المجاهدين فی بعض أخبار البرتغاليين (نفس الكتاب المتقدم ذكره)۔
تحقيق و تعليق حمزة جيلاكودان الكركدام كونی، مكتبة الهدیٰ كاليكوت۔ ١٩٩٦۔

١٠ التفهيمات الالهية، شاه ولی الله الدهلوی، المجمع العلمی، دابهيل، سورت، ١٣٥٥ھ/١٩٣٦م

١١۔ حاضر العالم الإسلامی۔ تاليف لو تروب ستواردالأمريكی۔ مع فصول و تعليقات لأمير البيان شكيب أرسلان۔ دارالفكر العربی۔

١٢۔ سنن النسائی۔ الإمام أحمد بن شعيب النسائی، باعتنا الشيخ عبد الفتاح ابوغدة، دارالبشائر الاسلامية۔

١٣۔ سيرة عمر بن الخطاب، الامام عبد الرحمن ابن الجوزی، الطبعة المصرية بالأزهر۔

١٤۔ شمس الظهيرة فی نسب أهل البيت من بنی علوی، السيد الشريف عبد الرحمن بن محمد بن حسين المشهور، حققه و علق عليه تعليقات ضافية السيد محمد ضياء شهاب، عالم المعرفة للنشر و التوزيع، جده

السعودية، الطبعة الاولىٰ ۱٤۰٤ھ/ ۱۹۸٤م۔

۱۵۔ صحيح البخارى، الإمام محمد بن إسماعيل البخارى، ترقيم محمد فواد عبد الباقى

۱٦۔ صحيح مسلم، الإمام مسلم ابن الحجاج، ترقيم محمد فواد عبد الباقى

۱۷۔ فيوض الحرمين، شاه ولى الله الدهلوى، مطبع احمدى۔ دهلى ۱۳۰۸ھ۔

۱۸۔ المسلمون فى كيرالا، عبد الغفور عبد الله القاسمى۔ مكتبة اكمل، ملابرم (Malappuram) كيرالا۔ الطبعة الأولى، ۱٤۲۱ھ/ ۲۰۰۰ء۔

۱۹۔ المقاصد الحسنة فى بيان كثيرمن الأحاديث المشتهرة على الألسنة، الإمام شمس الدين محمد بن عبد الرحمن السخاوى المتوفى ۹۰۲ھ، دارالكتب العلمية، بيروت، لبنان۔ ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۹م

۲۰۔ مقدمة ابن خلدون، عبد الرحمن بن خلدون۔ تحقيق الدكتور على عبدالواحد وافى، دار نهضة مصر للطبع والنشر، الفجالة، القاهرة۔

فارسی

۱/۲۱۔ بیاض مولانا ابو الحسن حسن کاندھلوی، (قلمی) مملوکہ مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی۔

۲/۲۲۔ بیاض مفتی الٰہی بخش کاندھلوی (قلمی) مملوکہ مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی۔

۳/۲۳۔ بیاض مولانا رشید الدین خاں دہلوی (قلمی فوٹو اسٹیٹ) مملوکہ مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی۔

۴/۲۴۔ تاریخ قنوج، نواب سید صدیق حسن خاں، (قلمی) مخزونہ مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، حبیب گنج کلکشن، ف۳۲/۲۰۰

۵/۲۵۔ تاریخ گلزار آصفیہ، غلام حسین خاں، مطبع محمدی، ۱۳۰۸ھ

۶/۲۶۔ خزانۂ عامرہ، غلام علی آزاد بلگرامی مطبع نول کشور، کانپور، ۱۸۷۱ء

۷/۲۷۔ دیوان فارسی، مومن خاں مومنؔ، مرتب عبدالرحمٰن آہی، مطبع سلطانی لال قلعہ دہلی، ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۴ء)

۸/۲۸۔ رسالہ جہادیہ، مولانا ابوالحسن حسنؔ کاندھلوی، (مشمولہ جماعت مجاہدین) کتاب منزل، لاہور

۹/۲۹۔ سیر المتأخرین، غلام حسین طباطبائی، مطبع نول کشور لکھنؤ۔ ۱۸۹۷ء۔

۱۰/۳۰۔ صراط مستقیم (ملفوظات سید احمد شہیدؒ) جمع کردہ مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ، مطبع مجتبائی۔ دہلی ۱۳۱۴ء۔

۱۱/۳۱۔ فتاویٰ عزیزی، شاہ عبدالعزیز دہلوی۔ مطبع مجتبائی۔ دہلی۔ ۱۳۲۲ھ۔

۱۲/۳۲۔ کیفیت العارفین۔ سید شاہ عطا حسین گیاوی۔ مطبع منعمی، گیا (بہار) ۱۳۵۱ھ (۱۹۳۴ء)۔

۱۳/۳۳۔ مکتوبات امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی۔ مطبع مجددی منشی نبی بخش، امرتسر، ۱۳۳۱ھ

۱۴/۳۴۔ مکتوبات سید احمد شہید (قلمی) مخزونہ کتب خانہ ندوۃ العلماء، مختلف علوم فارسی، ۲۸۱۴/۳۴

۱۵/۳۵۔ مکتوبات سید احمد شہید (قلمی) مخزونہ کتب خانہ ندوہ العلماء، مختلف علوم فارسی، ۲۸۵۱/۳۵

۱۶/۳۶۔ مکاتیب سید احمد شہید، مکتبہ رشیدیہ لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۷۵ء

۱۷/۳۷۔ ملفوظات شاہ عبدالعزیز دہلوی، مطبع مجتبائی، میرٹھ، ۱۳۱۴ھ

۱۸/۳۸۔ منافع السالکین (ملفوظات شاہ محمد سلیمان تونسوی) مرتبہ امام الدین۔ مطبع مرتضوی، دہلی، ۱۳۱۰ھ (۱۸۹۲ء)

۳۹/۱۹۔ مناقب حافظیہ (سوانح شاہ حافظ محمد علی خیر آبادی)، مولانا غلام محمد ہادی خاں چشتی کشمیری۔ مطبع احمدی، کانپور۔ ۱۳۰۵ء

۴۰/۲۰۔ منظورۃ السعداء فی احوال الغزاۃ والشہداء، مولانا سید جعفر علی نقوی۔ (قلمی) مخزونہ کتب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ

۴۱/۲۱۔ وصایا الوزیر علی طریق البشیر والنذیر (وصایا وزیری)، نواب وزیر الدولہ محمد وزیر خاں۔ مطبع محمدی، ٹونک (راجستھان)، ۱۲۸۴ھ

اردو

(الف) کتابیں

۴۲/۱۔ آثار الصنادید، سر سید احمد خاں، اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۰۰ء

۴۳/۲۔ آثارات پھلواری شریف، مولانا حکیم سید محمد شعیب۔ خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف (پٹنہ)، ۱۹۴۷ء

۴۴/۳۔ آر ایس ایس : ایک مطالعہ، حارث بشیر، کوسموس بکس، نئی دہلی، فروری ۲۰۰۳ء

۴۵/۴۔ آر ایس ایس :تعلیمات و مقاصد، صلاح الدین عثمان، نسیم بکڈپو، لکھنؤ، ۱۹۹۳ء

۴۶/۵۔ آزادی کی تحریکیں، عبداللہ قدوسی، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۸۸ء

۴۷/۶۔ احکام العیدین، نواب قطب الدین دہلوی، مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۲۹۰ھ/ ۱۸۷۳ء

۴۸/۷۔ احوال العارفین، غلام فرید، نذیر سنز پبلیشرز، لاہور۔ ۱۹۷۹ء

۴۹/۸۔ اخبار الصنادید، مولانا حکیم نجم الغنی خاں رامپوری، رامپور رضا لائبریری رامپور۔ ۱۹۹۷ء

۵۰/۹۔ اردو کی ترقی میں اولیائے سندھ کا حصہ، ڈاکٹر عبدالستار وفا راشدی، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور۔ ۱۹۹۴ء

۱۰/۵۱۔ اردو نثر کے ارتقاء میں علماء کا حصہ، ڈاکٹر محمد ایوب قادری، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور۔۱۹۸۸ء

۱۱/۵۲۔ ارمغان فاروقی (نذر خواجہ احمد فاروقی) مرتبہ ظہیر احمد صدیقی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۸۷ء

۱۲/۵۳۔ اکتساب نظر، راہی فدائی، ابو الحسان اکاڈمی، کڈپہ (آندھرا پردیش) ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۱ء

۱۳/۵۴۔ اکمل التاریخ، محمد یعقوب ضیاء قادری بدایونی، بدایوں۔۱۹۱۶ء

۱۴/۵۵۔ الفاروق علامہ شبلی نعمانی، کتب خانہ حمیدیہ، دہلی۔۱۹۶۸ء

۱۵/۵۶۔ امداد المشتاق، مولانا اشرف علی تھانوی۔ ضمیمہ از مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی، مکتبہ برھان، دہلی۔۱۹۸۱ء

۱۶/۵۷۔ امیر الروایات، امیر شاہ خاں، (مشمولہ ارواح ثلاثہ) مکتبہ تالیفات اشرفیہ، تھانہ بھون (مظفر نگر، یوپی)۔

۱۷/۵۸۔ امیر نامہ، بساون لال شاداں، ترجمہ (از فارسی) سید سعید احمد، مطبع احمدی، ٹونک۔۱۲۹۹ھ

۱۸/۵۹۔ انقلاب اٹھارہ سو ستاون، مرتبہ پی سی جوشی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی۔ (دوسرا ایڈیشن) ۱۹۸۳ء

۱۹/۶۰۔ اوراق گم گشتہ، ترتیب وتہذیب رئیس احمد جعفری، محمد علی اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۸ء

۲۰/۶۱۔ برطانوی حکومت ہند، انڈرسن (ترجمہ برٹش اڈمنسٹریشن ان انڈیا) مترجم محمد الیاس برنی، جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد، دکن۔۱۳۳۷ھ/۱۹۱۹ء

۲۱/۶۲۔ برعظیم پاک وہند کی ملت اسلامیہ، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، مترجم ہلال احمد زبیری، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ کراچی یونیورسٹی، کراچی، (بار دوم) ۱۹۸۳

۲۲/۶۳۔ بلوچستان تاریخ کی روشنی میں، ملک محمد سعید دہوار، نساء ٹریڈرز، کوئٹہ،

پاکستان۔۱۹۸۵ء

۶۴/۲۳۔ بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہد آزادی (۱۷۵۷ء-۱۸۵۷ء) عبداللہ ملک، مجلس ترقی ادب، لاہور۔۱۹۶۷ء

۶۵/۲۴۔ پرتگیزان مالابار (ترجمہ تحفۃ المجاہدین) سید شمس اللہ قادری، مطبع احمدیہ، حیدرآباد دکن، ۱۹۳۷ء

۶۶/۲۵۔ تاریخ اولیاء تمل ناڈو، ڈاکٹر جاویدہ حبیب تمل ناڈو اردو پبلی کیشنز، چنئی، ۲۰۰۲ء

۶۷/۲۶۔ تاریخ بوندیلکھنڈ، منشی شام لعل دہلوی متخلص بہ عاصی، مطبع اجنٹی بوندیلکھنڈ، چھاؤنی لال نیا گاؤں، ۱۸۸۴ء

۶۸/۲۷۔ تاریخ تحریک آزادی ہند (جلد اول)، ڈاکٹر تاراچند، مترجم قاضی محمد عدیل عباسی، قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، دہلی (دوسرا ایڈیشن)، ۱۹۹۸ء

۶۹/۲۸۔ تاریخ ٹونک، محمد اعجاز خان، عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ راجستھان، ٹونک، ۱۹۸۳ء

۷۰/۲۹۔ تاریخ ٹیپو سلطان، محب الحسن، ترجمہ حامد اللہ افسر و عتیق صدیقی، قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، دہلی (دوسرا ایڈیشن)، ۱۹۹۸ء

۷۱/۳۰۔ تاریخ دعوت وعزیمت (حصہ پنجم) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ، (باردوم) ۱۴۰۹ھ/۱۹۸۹ء

۷۲/۳۱۔ تاریخ روہیلکھنڈ، خالد حسن خاں، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ۔۱۹۹۵ء

۷۳/۳۲۔ تاریخ سلطنت خداداد، محمود خاں محمود بنگلوری، ہمالیہ بک ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۳ء

۷۴/۳۳۔ تاریخ مدرسہ عالیہ، عبدالستار، سکریٹری ریسرچ اینڈ پبلی کیشنز مدرسہ عالیہ، ڈھاکہ، ۱۹۵۹ء

۷۵/۳۴۔ تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت (جلد دوم) سید ہاشمی فرید آبادی،

انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی، ۱۹۵۹ء

۷۶/۳۵۔ تاریخ مشائخ چشت، خلیق احمد نظامی، ندوۃ المصنفین، دہلی (طبع اول) ۱۹۵۳ء

۷۷/۳۶۔ تاریخ مگدھ (صوبہ بہار کی مکمل تاریخ)، فصیح الدین بلخی عظیم آبادی، انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی۔۱۹۴۴ء

۷۸/۳۷۔ تاریخ النوائط، نواب عزیز جنگ بہادر، عزیز المطابع، حیدرآباد دکن، ۱۳۲۲ھ

۷۹/۳۸۔ تاریخ ہند (برائے انٹر میڈیٹ) سید ہاشمی فریدآبادی، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن (طبع دوم) ۱۹۳۹ء

۸۰/۳۹۔ تاریخ ہند (حصہ سوم، جلد اول) عہد سلطنت انگلشیہ، منشی ذکاء اللہ دہلوی، مطبع مرتضوی، دہلی، ۱۸۷۹ء

۸۱/۴۰۔ تاریخ ہندوستان، منشی ذکاء اللہ دہلوی، مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ، ۱۹۱۹ء، عکسی ایڈیشن سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء

۸۲/۴۱۔ تاریخ ہند عہد برطانیہ، جے سی مارشمین، ترجمہ سید محمد عبدالسلام ایم اے علیگ، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن، ۱۹۲۳ء

۸۳/۴۲۔ تاریخی حقائق، جعفر ملیح آبادی، (ناشر مصنف) چوپٹیاں، لکھنؤ، ۱۹۹۴ء

۸۴/۴۳۔ تحریک آزادی، مولانا ابوالکلام آزاد، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۸ء

۸۵/۴۴۔ تحریک آزادی میں بہار کے مسلمانوں کا حصہ، تقی رحیم، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۸ء

۸۶/۴۵۔ تحریک آزادی ہند اور مسلمان، مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی، ترتیب خورشید احمد، اسلامک پبلیکیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ، لاہور، (چودھویں بار) ۱۹۹۲ء

۸۷/۴۶۔ تحریک ریشمی رومال (تحریک شیخ الہند)، مولانا سید محمد میاں، مکتبہ جاوید،

دیوبند، ۲۰۰۲ء

۸۸/۴۷۔ تحریک ہجرت : تاریخ افکار اور دستاویزات، مرتبہ شاہد حسین خاں، ادارہ تحقیقات وافکار وتحریکات ملی پاکستان، کراچی، ۱۹۸۹ء

۸۹/۴۸۔ تذکرہ حکومت المسلمین، محمد وحید اللہ بدایونی، (قلمی) مخزونہ رضا لائبریری رامپور (تاریخ نوابان ہند ۱۳۶)

۹۰/۴۹۔ تذکرہ صوفیائے سرحد، اعجاز الحق قدوسی، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۶۶ء

۹۱/۵۰۔ تذکرہ صوفیائے سندھ، اعجاز الحق قدوسی، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی ۱۹۵۹ء

۹۲/۵۱۔ تذکرہ علماء ہند، رحمان علی، ترجمہ از فارسی محمد ایوب قادری، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی، ۱۹۶۱ء

۹۳/۵۲۔ تذکرہ کاملان رامپور، احمد علی خاں شوق، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۸۶ء

۹۴/۵۳۔ تذکرۃ الکرام محمود احمد عباسی، محبوب المطابع برقی پریس دہلی، ۱۹۳۲ء

۹۵/۵۴۔ تزکیۃ العقائد، مولانا کرامت علی جونپوری (مشمولہ ذخیرہ کرامت) مطبع مجیدی، کانپور، ۱۳۳۴ھ/۱۹۰۴ء

۹۶/۵۵۔ تراجم علماء حدیث ہند، ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی، جید برقی پریس، دہلی، ۱۹۳۸ء

۹۷/۵۶۔ تلاش ہند، جواہر لال نہرو، مکتبہ جامعہ، دہلی۔ ۱۹۴۶ء

۹۸/۵۷۔ جماعت مجاہدین، غلام رسول مہر، کتاب منزل، لاہور

۹۹/۵۸۔ جنگ آزادی میں علماء کرام کا حصہ، سلمان علی خاں، مولانا محمد علی جوہر فاؤنڈیشن، لکھنؤ، ۱۹۹۸ء

۱۰۰/۵۹۔ جنگ آزادی میں مسلمانوں کی قربانیاں، حیدر علی نعمانی، ترجمہ محمد دلیر آزاد، دانش بک ڈپو، ٹانڈہ (ضلع امبیڈکر نگر یوپی) ۱۹۹۹ء

۱۰۱/۶۰۔ چراغ رہ گزر، خواجہ احمد فاروقی، گلستان پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۷۴ء

۱۰۲/۶۱۔ حالات مشائخ کاندھلہ، مولانا محمد احتشام الحسن کاندھلوی، نظر ثانی وحواشی مولانا محمد احترام الحسن کاندھلوی، دارالاشاعت، کاندھلہ، سنہ ندارد

۱۰۳/۶۲۔ حضرت سید احمد شہید اور ان کی تحریک اصلاح و جہاد، خلیق احمد نظامی، دار عرفات، دائرہ شاہ علم اللہ، رائے بریلی، ۱۴۱۱ھ/۱۹۹۱ء

۱۰۴/۶۳۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا فتویٰ دارالحرب تاریخی وسیاسی اہمیت، ابو سلمان شاہجہاں پوری، مجلس یادگار شیخ الاسلام پاکستان، کراچی، ۱۹۹۵ء

۱۰۵/۶۴۔ حیات حافظ رحمت خاں، سید الطاف علی بریلوی، نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۳۳ء

۱۰۶/۶۵۔ حیات طیبہ (سوانح مولانا شاہ اسماعیل شہید)، مرزا حیرت دہلوی، ثنائی برقی پریس، امرتسر (طبع دوم) ۱۹۳۳ء

۱۰۷/۶۶۔ حیات طیبہ، مرزا حیرت دہلوی، مکتبہ التوحید، نئی دہلی (جدید ایڈیشن) ۱۹۸۴ء

۱۰۸/۶۷۔ حیات ولی، محمد رحیم بخش دہلوی، المکتبۃ السّلفیہ، لاہور، ۱۹۵۵ء

۱۰۹/۶۸۔ خانوادۂ قاضی بدر الدولہ، محمد یوسف کوکن عمری ایم اے، دارالتصنیف مدراس، ۱۹۶۳ء

۱۱۰/۶۹۔ خطبہ صدارت صوبائی دینی تعلیمی کانفرنس منعقدہ بستی، ۳۰-۳۱ر دسمبر ۱۹۵۹ء و ار جنوری ۱۹۶۰ء، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

۱۱۱/۷۰۔ خیرآباد کی ایک جھلک، نجم الحسن رضوی خیرآبادی، نامی پریس لکھنؤ، سنہ ندارد

۱۱۲/۷۱۔ الدر المنثور فی تراجم اھل صادقپور معروف بہ تذکرہ صادقہ، مولانا عبد الرحیم زبیری صادقپوری، اضافہ و اشاعت مولانا عبد الخبیر صادقپوری، جماعت اصلاحی پٹنہ، (تیسرا ایڈیشن) ۱۳۸۴ھ/۱۹۶۴ء

۱۱۳/۷۲۔ راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ ایک مطالعہ، مختار انیس، جی کے اجنبیز پرکاشن، حضرت گنج لکھنؤ، ۱۹۹۸ء

۱۱۴/۷۳۔ رود کوثر، شیخ محمد اکرام، تاج کمپنی، نئی دہلی، ۱۹۹۱ء

۱۱۵/۷۴۔ روئیداد مجاہدین ہند، محمد خواص خاں، مکتبہ رشیدیہ لمیٹیڈ، لاہور، ۱۹۸۳ء

۱۱۶/۷۵۔ ریاست حیدرآباد میں جدو جہد آزادی (۱۸۰۰ء-۱۹۰۰ء) سید محمد جواد رضوی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۲۰۰۰ء

۱۱۷/۷۶۔ سراج الدولہ، محمد عمر (نورالہٰی)، انجمن ترقی اردو، دہلی ۱۹۴۶ء

۱۱۸/۷۷۔ سرگزشت مجاہدین، غلام رسول مہر، کتاب منزل، لاہور، ۱۹۵۶ء

۱۱۹/۷۸۔ سلطان جمہور حضرت ٹیپو سلطان شہید، مسلم ویلوری، ٹیپو خالد خاں ٹیپو منزل، بنگلور، ۱۹۶۱

۱۲۰/۷۹۔ سوانح احمدی، مولانا محمد جعفر تھانیسری، صوفی پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی لمیٹیڈ، لاہور۔

۱۲۱/۸۰۔ سیاست ملیہ، محمد امین زبیری، آتش فشاں پبلیکیشنز، لاہور۔ ۱۹۹۱ء

۱۲۲/۸۱۔ سیاسی تاریخ ہند، میجر جنرل سرجان میلکم، ترجمہ ابن حسن، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن، ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۲ء

۱۲۳/۸۲۔ سید احمد شہید، غلام رسول مہر، اشرف پریس لاہور۔

۱۲۴/۸۳۔ سید بادشاہ کا قافلہ، آبادشاہ پوری، مکتبہ ذکریٰ، رامپور، ۱۹۸۲ء

۱۲۵/۸۴۔ سیرت سلطان ٹیپو شہید، مولانا محمد الیاس ندوی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ، ۱۹۹۷ء

۱۲۶/۸۵۔ سیرت سید احمد شہید، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، نامی پریس لکھنؤ، (طبع اول) ۱۹۳۹ء

۱۲۷/۸۶۔ سیرت سید احمد شہید، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (اضافہ شدہ) مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ (آٹھواں ایڈیشن) ۱۹۹۴ء

۱۲۸/۸۷۔ سیرت مولانا کرامت علی جونپوری، مولانا عبدالباطن جونپوری، کریمی پریس، الہ آباد، ۱۳۶۸ھ

۱۲۹/۸۸۔ شاہ ولی اللہ اوران کا خاندان، محمود احمد برکاتی، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی۔ ۱۹۹۲ء

۱۳۰/۸۹۔ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، مولانا عبید اللہ سندھی، سندھ ساگر اکادمی، لاہور، ۱۹۴۵ء
۱۳۱/۹۰۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات، خلیق احمد نظامی، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۶۹ء
۱۳۲/۹۱۔ شیر ہندوستان ٹیپو سلطان چند تاریخی حقائق، خورشید مصطفیٰ رضوی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، نئی دہلی، ۱۹۹۸ء
۱۳۳/۹۲۔ صحیفہ ٹیپو سلطان محمود خاں محمود بنگلوری، ہمالیہ پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۷۱ء
۱۳۴/۹۳۔ علماء دیو بند کون اور کیا ہیں، مولانا ضیاء الرحمٰن فاروقی، دار الکتاب دیو بند (طبع چہارم) ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۲ء
۱۳۵/۹۴۔ علماء میدان سیاست میں، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، ترجمہ ہلال احمد زبیری، شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ کراچی یونیورسٹی، کراچی، ۱۹۹۴ء
۱۳۶/۹۵۔ علماء ہند کا شاندار ماضی، (جلد دوم وسوم) مولانا سید محمد میاں، کتابستان، دہلی، ۱۴۰۵ھ/۱۹۸۵ء
۱۳۷/۹۶۔ علم وعمل (وقائع عبد القادر خانی)، مولوی عبد القادر رامپوری، ترجمہ معین الدین افضل گڈھی، ترتیب و حواشی محمد ایوب قادری، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی، (طبع دوم) ۱۹۷۰ء
۱۳۸/۹۷۔ عہد بنگش کی سیاسی علمی اور ثقافتی تاریخ، مفتی ولی اللہ فرخ آبادی، ترجمہ حکیم شریف الزماں شریف اکبر آبادی، مرتبہ محمد ایوب قادری، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی، ۱۹۶۵ء
۱۳۹/۹۸۔ کاروان ایمان وعزیمت، مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، مکتبہ اسلام، لکھنؤ، ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء
۱۴۰/۹۹۔ کمپنی کی حکومت، باری، مکتبہ اردو، لاہور، (دوسرا ایڈیشن) تاریخ ندارد۔

۱۴۱/۱۰۰۔ گلستان سخن، مرزا قادر بخش صابر، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۲ء

۱۴۲/۱۰۱۔ گویا اور خاندان گویا کی ادبی خدمات، ناہید عارف، دانش محل، لکھنؤ، ۱۹۸۹ء

۱۴۳/۱۰۲۔ مآثر صدیقی موسوم بہ سیرت والا جاہی (سوانح نواب صدیق حسن خاں)، نواب علی حسن خاں، مطبع نول کشور، لکھنؤ، ۱۳۴۲ھ/۱۹۲۴ء

۱۴۴/۱۰۳۔ مجموعہ قصائد (سید احمد شہیدؒ کی منقبت میں کہے گئے تین قصائد کا مجموعہ)، مطبع مطبع الرحمٰن شاہجہاں آباد، دہلی محلہ خاص بازار، ۱۲۶۸ھ

۱۴۵/۱۰۴۔ مختصر تذکرہ حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی، مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی، مفتی الٰہی بخش۔ اکیڈمی، کاندھلہ (ضلع مظفر نگر، یوپی)۔ ۱۴۲۲ھ/۲۰۰۱ء

۱۴۶/۱۰۵۔ مختصر تعارف خانوادۂ اقطاب ویلور، محمد زکریا ادیب خاور راہچوٹی، انجمن دائرۃ المعارف دار العلوم لطیفیہ حضرت مکان، ویلور (تامل ناڈو)

۱۴۷/۱۰۶۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل، سید طفیل احمد منگلوری، (جدید ایڈیشن) حماد الکتبی، لاہور، تاریخ ندارد

۱۴۸/۱۰۷۔ مقامع المبتدعین، مولانا کرامت علی جونپوری (مشمولہ ذخیرہ کرامت) مطبع مجیدی، کانپور، ۱۳۳۴ھ/۱۹۰۴ء

۱۴۹/۱۰۸۔ ملابار و موپلا، مولانا آزاد سبحانی، دائرہ علمیہ، کانپور، تاریخ ندارد

۱۵۰/۱۰۹۔ ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، (جلد دوم) ثروت صولت، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۱۹۹۵ء

۱۵۱/۱۱۰۔ موج کوثر، شیخ محمد اکرام، تاج کمپنی، نئی دہلی۔ ۱۹۹۱ء

۱۵۲/۱۱۱۔ مومن شخصیت اور فن، ظہیر احمد صدیقی، غالب اکیڈمی، نظام الدین نئی دہلی، ۱۹۹۵ء

۱۵۳/۱۱۲۔ مقدمہ لکھنؤ کانفرنس، سید فضل الرحمٰن قاسمی، پھلواری شریف، مطبوعہ مدینہ پریس، بجنور

۱۵۴/۱۱۳۔ نظام الاسلام، مولانا محمد وجیہ کلکتوی، مطبع احمدی، کلکتہ (طبع دوم) ۱۲۵۹ء
۱۵۵/۱۱۴۔ نفثۃ المصدور اور ہندوستان کی شرعی حیثیت، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
۱۵۶/۱۱۵۔ نقش حیات (جلد اول) مولانا حسین احمد مدنی، محبوب پرنٹنگ پریس، سنہ ندارد
۱۵۷/۱۱۶۔ وقائع احمدی، سید حیدر علی، (قلمی) مخزونہ کتب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ
۱۵۸/۱۱۷۔ واقعات دار الحکومت دہلی، بشیر الدین احمد دہلوی، اردو اکادمی دہلی، ۱۹۹۵ء
۱۵۹/۱۱۸۔ ہماری اور ہمارے وطن کی حیثیت اور ترک وطن کا شرعی حکم، مولانا سید محمد میاں، الجمعیہ بک ڈپو، دہلی
۱۶۰/۱۱۹۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان، ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر، مترجم ڈاکٹر صادق حسین، اقبال اکیڈمی، لاہور، ۱۹۴۴ء
۱۶۱/۱۲۰۔ ہمفرے کے اعترافات، انجمن نوجوانان پاکستان، گارڈن ٹاؤن، لاہور، سنہ ندارد۔
۱۶۲/۱۲۱۔ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک، مولانا مسعود عالم ندوی، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۱۹۹۴ء
۱۶۳/۱۲۲۔ ہندوستان میں وہابی تحریک، ڈاکٹر قیام الدین احمد، مترجم محمد مسلم عظیم آبادی، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۷۶ء
۱۶۴/۱۲۳۔ ہندوستانی مسلمان ایک تاریخی جائزہ، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ۔ (بار سوم) ۱۹۹۲ء
۱۶۵/۱۲۴۔ ہندی مملکت برطانیہ کا عروج اور وسعت، سر الفرڈ لائل پی سی، ترجمہ سید محمد عبدالسلام ایم ایچ پی، جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن، ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۲ء

(ب) اخبارات و رسائل

۱۶۶/۱۔ روزنامہ جدید عمل لکھنؤ ۱۵/اگست ۲۰۰۱ء
۱۶۷/۲۔ روزنامہ راشٹریہ سہارا، لکھنؤ، متعدد شمارے

۱۶۸/۳۔ روز نامہ سب کا اخبار، نئی دہلی، ۱۴/اگست ۱۹۹۷ء

۱۶۹/۴۔ سہ روزہ دعوت، نئی دہلی، ۴/مئی ۲۰۰۲، ۱۰/مئی ۲۰۰۲، ۱۳/ستمبر ۲۰۰۲

۱۷۰/۵۔ ماہنامہ آج کل دہلی، اگست ۱۹۵۷ء جنگ آزادی نمبر

۱۷۱/۶۔ ماہنامہ برھان، دہلی، نومبر ۱۹۶۴ء، (مضمون حضرت شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز سے متعلق چند غلط روایات از مولوی محمد عضدالدین خاں ایم اے، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

۱۷۲/۷۔ ماہنامہ الفرقان، شاہ ولی اللہ نمبر، اشاعت دوم۔

۱۷۳/۸۔ ماہنامہ میثاق لاہور، جون ۲۰۰۲ء، (مضمون تحریک مجاہدین جنگ بالاکوٹ کے بعد از سید میر بادشاہ بخاری)

۱۷۴/۹۔ ماہنامہ نیا دور، لکھنؤ، اگست ۱۹۸۵ء، یوم آزادی نمبر (مضمون دکن کا مجاہد نواب مبارز الدولہ، از محمد محسن جواد)

۱۷۵/۱۰۔ الرحیم، حیدرآباد سندھ (سندھی) تیرھویں صدی ہجری کے مشاہیر سندھ، شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا سہ ماہی کتابی سلسلہ، جولائی ۱۹۸۸ء، شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدرآباد، سندھ۔

۱۷۶/۱۱۔ ششماہی الحرکہ، نئی دہلی (تحریک طلبہ عربیہ کا ترجمان) جلد نمبر ۱ شمارہ نمبر ۲، رجب تا ذی الحجہ ۱۴۱۸ھ مطابق نومبر ۹۷ء تا اپریل ۹۸ء (مضمون لوٹ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو (مسلمان اور تحریک آزادی) از ضیاء الدین صدیقی، اورنگ آباد)

۱۷۷/۱۲۔ ششماہی فکر و تحقیق، نئی دہلی جلد نمبر ۱ شمارہ نمبر ۲، جولائی تا دسمبر ۱۹۹۷ء (رسالہ قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو) (مضمون جدو جہد آزادی اور تحریک ولی اللّٰہی از موہن لال بنسل فیروز آبادی، دریافت و تدوین عابد حسن)

۱۷۸/۱۳۔ ملا عبدالرحیم رامپوری: کردار ساز، حریت پسند و مثالی استاد، از حکیم محمد حسین خاں شفاء، (غیر مطبوعہ مضمون)

۱۷۹/۱۴۔ حضرت حافظ شاہ جمال اللہ اور ان کا عہد: سیاسی وسماجی مطالعہ، از حکیم محمد حسین خاں شفاء (غیر مطبوعہ مضمون)

ان کے علاوہ مصنف کے نام ارباب علم وتحقیق کے کئی مکاتیب جن کا ان کے موقعوں پر حوالہ دے دیا گیا ہے۔

انگریزی

180/1. A Comprehensive History of India Vol. III by Henry Beveridge, London. 1860

181/2. A History of the Fara'id Movement in Bengal (1818-1906) by Muinuddin Ahmad Khan, Pakistan Historical Society, Karachi, 1965.

182/3. The History of India vol II by John Clark Marshman, London, Longman's, Green Readon an Dyeri. 1877.

183/4. Fall of the Mughal Empire, by Jadunath Sargar, Orient Longman Limited New Delhi, Fourth Edition, 1988

184/5. Secret Correspondence of Tipu Sultan, by Kausar Kabir. Light and Life Publishers New Delhi, 1980

185/6. The Encyclopadia of Islam Vol. II, Edited by B. Levves Ch, Pellant and J SSuhach, London, 1965.

186/7. The Great Revolution of 1857, by Syed Moinul Haq, Pakistan Historical Society, Karachi, 1968

187/8. Hindustan Times (Delhi) 7-5-2002

188/9. The Time of India 23-5-2002

☆☆☆

انڈکس

اشخاص

(الف)

(ن)

(و)

(ی)

مقامات

(الف)

(گ)

(ل)

(م)

کتب

(الف)

(ش)

آپ نے ایک نہایت اہم موضوع پر قلم اٹھایا ہے جس کے بارے میں ادھر ادھر سے متفرق باتیں تو کہی گئی ہیں مگر کوئی باضابطہ مربوط اور مستند تحقیق کی ہمت کسی نے نہیں کی۔ یہ کتاب نہایت مفید عالمانہ اور تحقیقی کتاب ہے۔ (پروفیسر نثار احمد فاروقی)

آپ نے اس کتاب میں بعض ایسی معلومات مہیا کی ہیں جو آسانی سے نہیں ملتی ہیں اور بعض کتابیں جو اکثر لوگوں کے علم میں نہیں ہیں۔ آپ نے یہ بہت اچھا کیا کہ جو سارے ہندوستان کے علماء کا ذکر کم وبیش تفصیل سے کردیا۔ آپ نے یہ بھی اچھا کیا کہ تحریک آزادی کی اصطلاح کو محدود معنی میں نہیں لیا، بلکہ اسے انگریزی حکومت اور انگریزی طرز وفکر اور قوانین کے خلاف علمی کاروائی کو بھی تحریک آزادی کا حصہ قرار دیا۔ (شمس الرحمن فاروقی)

آپ نے یقیناً بڑی محنت کی ہے اور علم ودین کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ (ڈاکٹر عبدالحق انصاری، سابق امیر جماعت اسلامی ہند)

یہ ایک اہم منصوبہ ہے جس پر آپ نے قلم اٹھایا ہے۔ مراجع کی فہرست دیکھ کر اطمینان ہوا کہ موضوع پر اہم کتابیں آپ کی دسترس میں ہیں۔ (ڈاکٹر مختار الدین احمد)

اپنے موضوع پر، خصوصاً اپنے دور کے لحاظ سے آپ کی یہ تصنیف بے حد مبسوط، جامع اور معلوماتی ہے اور آپ نے اس کے مشمولات ومباحث کے لئے حد درجہ مستعدی اور توجہ ومحنت سے معلومات یکجا کی ہیں اور ممکنہ غیر جانب داری کے ساتھ نتائج اخذ کئے ہیں۔ متعدد شخصیات وموضوعات آپ کی اس تصنیف کے ذریعے متعارف ہوئے ہیں۔

(ڈاکٹر معین الدین عقیل، شعبۂ اردو کراچی یونیورسٹی، کراچی)

آزادی سے متعلق آپ نے جو کتاب تحریر کی ہے وہ اپنے دامن میں معلومات کا خزانہ رکھتی ہے۔ بہت سے نئے گوشے نئے انداز سے سامنے آگئے ہیں۔ کتاب کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہے کہ آپ نے مواد اکٹھا کرنے میں کافی محنت، عرق ریزی، دیدہ وری سے کام لیا ہے علم وتحقیق کے مسافر کی جو آن بان ہونی چاہئے اس کتاب میں یہ وصف نمایاں ہے۔

(مولانا محمد رضوان القاسمی سابق ناظم دار العلوم سبیل السلام، حیدرآباد)

واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب اپنے موضوع پر بے نظیر ہے اور آپ نے جس اعتدال اور انصاف کے ساتھ تاریخ کا مطالعہ وتجزیہ کیا ہے وہ حد درجہ قابل قدر ہے۔ اگر یہ سلسلہ تحقیق کے ساتھ موجودہ زمانے تک مکمل ہوجائے تو بہت سی غلط فہمیاں دور ہوں گی اور صحیح حقائق سے شائقین روشناس ہوسکیں گے۔ (مولانا مفتی محمد سلمان منصور پوری، مدرسۂ شاہی، مرادآباد)

آپ نے ایک اہم موضوع پر کام کیا ہے۔ خدا آپ کو اس کا اجر عطا فرمائے۔ جو پہلو آپ نے لئے ہیں اور جس موضوع پر آپ نے تنہا کام کرڈالا ہے یہ پروجیکٹ ورک تھا اور کئی حضرات مل کر اس پر کام کرتے تب مکمل ہوتا، لیکن خدا نے آپ کو ہمت فرمائی اور آپ تنہا کامیاب ہوئے (ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی۔ رامپور)

کتاب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ پہلی بار جنوبی ہند کی علماء کی سرگرمیوں کو ایک مربوط اور مستند انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کی تصنیف میں بڑی محنت سے ہم عصر اور بعد کے ماخذوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ (پروفیسر اقبال حسین، شعبۂ تاریخ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

آپ نے ملت اسلامیہ کی طرف سے فرض کفایہ ادا کردیا۔ اس کتاب کی کون کون سے خوبی کی تعریف کی جائے۔ ثقہ وسنجیدہ زبان وبیان، بے حد عمیق مطالعہ، تحقیق وتدوین کے موجودہ معیار سے کہیں بلند میٹر ومسالہ، اب تک اس موضوع پر جس قدر لکھا گیا ہے اس پر آپ کی بھرپور نظر ہے۔ (حکیم محمد حسین شفا، سابق اسسٹنٹ لائبریرین رضا لائبری، رامپور)

ماشاء اللہ آپ نے بڑی عرق ریزی سے مواد اکٹھا کیا ہے، سلیقہ سے پیش فرمایا ہے۔ درحقیقت آپ نے اپنے موضوع سے نہ صرف انصاف کیا ہے، بلکہ اس کتاب کو تاریخی دستاویز وحرف تابندہ بنادیا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

آپ کی یہ گراں مایہ تالیف آپ کی محنت شاقہ، کثرت مطالعہ اور ورک وتدبر کی روشن دلیل ہے۔

(ڈاکٹر راہی فدائی، بنگلور)

کتاب کے مندرجات سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہت سی شخصیات کو آپ نے محفوظ کردیا ہے۔ شاید اس قسم کا کام پہلی مرتبہ ہوا ہے۔

(ڈاکٹر شعائر اللہ خاں ایڈیٹر ماہنامہ ضیاء وجیہ رامپور وصدر روہیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی)

Academy of Islamic Research & Publications
Nadwatul Ulama, P. O. Box. No. 119 Lucknow. 226007 U. P. India
Ph & Fax: 0522-2741539, E-mail: airpnadwa@gmail.com

Designed by Hamid Mob:9889654027 e-mail:hrhamid1962@gmail.com